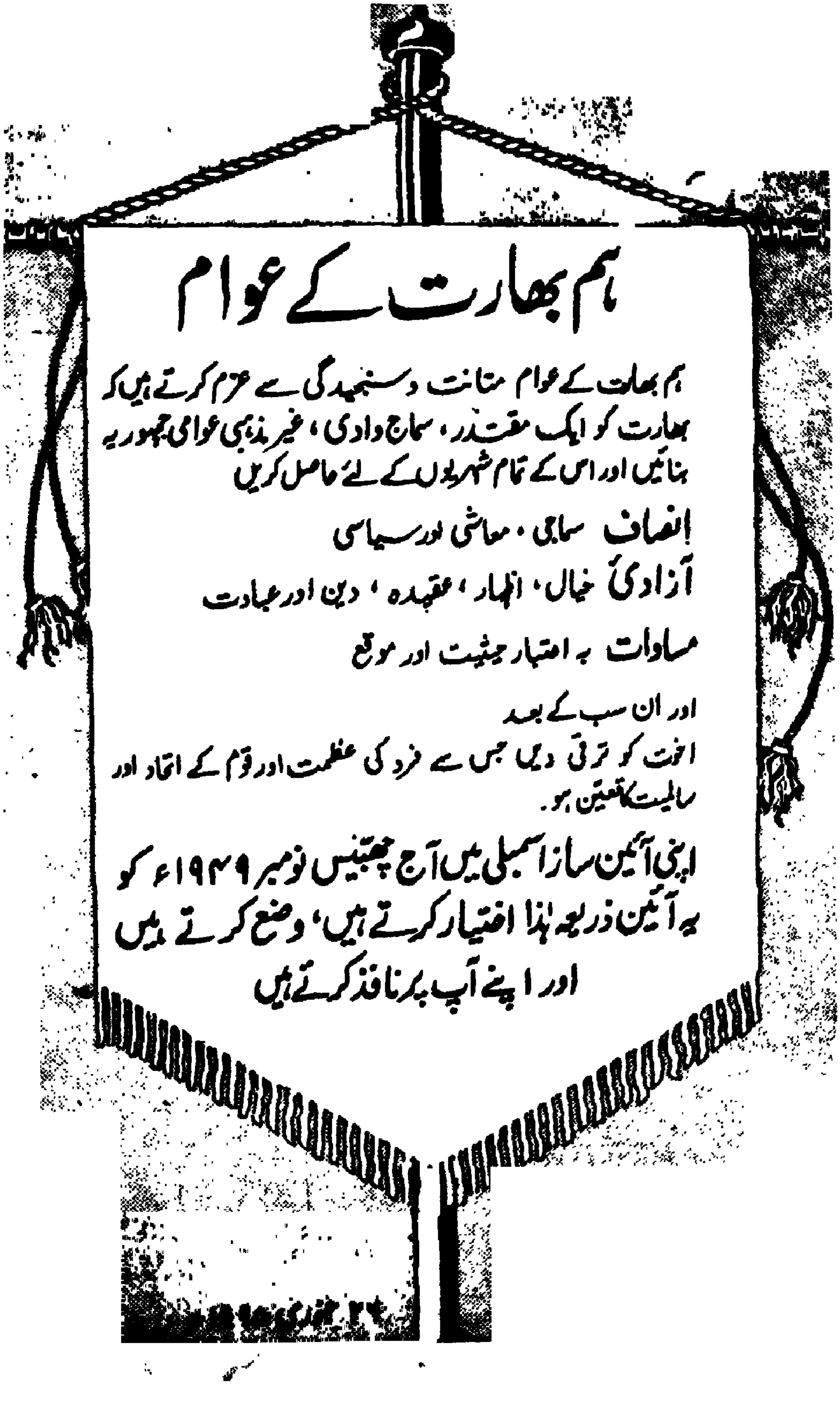
DUE DATE

Cl. No. ________ ______ *Acc. No.* ______________

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.




ہم بھارت کے عوام
ہم بھارت کے عوام متانت و سنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ
بھارت کو ایک مقتدر، سماج وادی، غیر مذہبی عوامی جمہوریہ
بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لئے حاصل کریں
انصاف سماجی، معاشی اور سیاسی
آزادیٔ خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت
مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع
اور ان سب کے بعد
اخوت کو ترقی دیں جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور
سالمیت کا تعین ہو۔
اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج چھبیس نومبر ۱۹۴۹ء کو
یہ آئین ذریعہ ہٰذا اختیار کرتے ہیں، وضع کرتے ہیں
اور اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۶واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد — ۶۶
شمارہ — ۱

فون: ۳۸۲۹۹۰۴

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۷ روپے

زرِ سالانہ ۷۵ روپے ◆ لائبریریوں سے ۹۰ روپے

شاعر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

فکرِ امروز

✻

ہم نے شعر کی روحانیت میں مادّی اختلاط سے ایک غلط چیز کا اضافہ کر لیا ہے۔ ہمارے خیالات ردیف و قافیہ کی پابندیوں میں محدود ہیں۔ ہمارے ذہن کا رخ الہام کدۂ حقیقت کی طرف نہیں ہم صنم کدۂ مجاز میں اپنی جبینِ فکر، رواسم رواج، تقلید، اور تائید کے خود ساختہ بتوں کے سامنے رگڑ رہے ہیں۔ ہمارا سر جھکا ہوا ہے، ہماری نگاہیں نیچی ہیں اور ہم نے بالکل بھلا دیا ہے کہ اس فضائے پست کے علاوہ جو ہمارے ذہن و خیال کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، کوئی بلند فضا اور بھی ہے جہاں ہمارے خیالات و احساسات کو پرواز کرنے کی اجازت ہے اور جہاں ان خذف پاروں سے زیادہ قیمتی تاروں کی معصومیت سے پیدا شدہ گوہر شاہوار ہم کو مل سکتے ہیں اور ہم روح القدس کی امداد و تائید سے ظلمت کدۂ عالم کو منوّر و تجلّی کر سکتے ہیں۔

[۲۹ نومبر ۱۹۳۰ء]

سیماب اکبرآبادی

SV02

رمضانُ المبارک
رُوح کی پاکیزگی کا مہینہ

شربت رُوح افزا

روزہ کی حالت میں تمام دن کچھ نہیں کھایا پیا جاتا،
اس لیے بدن میں پانی، شکر اور نمکیات کی کمی ہو جاتی ہے اور کئی
شکایتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ افطار کے وقت ایک دم پانی پینے یا بے سوچے
سمجھے کوئی بازاری شربت پینے سے قے، دست جیسی تکلیفیں بھی آگھیرتی ہیں۔
ان سے بچنے کے لیے افطار کے وقت یا رات کو کسی بھی وقت پیاس میں

صرف شربت رُوح افزا پیجیے



اگر آپ کو دودھ یا دہی کی لسی پسند ہو تو اس میں چینی کی جگہ
صرف روح افزا ڈالیے۔ روح افزا ملک شیک کے علاوہ
روح افزا سے آپ آئس کریم، فالودہ، کسٹرڈ، فیرنی (کھیر)
اور فروٹ سلاد بھی بنائیے!

افطار کے وقت رُوح افزا کو نہ بھولیے

۸۰ سال سے بھی زیادہ مدت سے
سب کا من پسند

شربت رُوح افزا

جڑی بوٹیوں، حیات بخش عناصر اور
قدرتی وٹامنز کا نادر مرکب

رُوح افزا کب استعمال کریں؟
رمضان المبارک میں افطار کے وقت یا رات کو کسی بھی وقت
پیاس میں۔ اس کے علاوہ گرمی کے موسموں میں پیاس،
تھکن، لُو لگنا، دردِ سر، چکر آنا، سستی، کمزوری دور کرنے میں۔

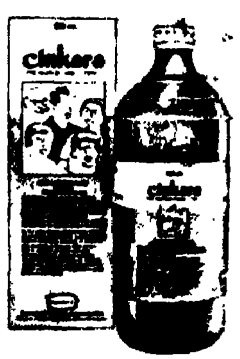
سنکارا

روزہ داروں کے لیے الکحل سے پاک،
لازمی بنیادی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب

عبادت و ریاضت کے اس خاص مقدس مہینے میں صحت و قوت کی
بحالی کے لیے سنکارا پیجیے اور معدہ کو طاقت حاصل کرنے کی نیت سے
غیر ضروری چیزوں سے نہ بھریے۔ سنکارا اس کے لیے بہت ہے۔
جدید سائنٹفک تحقیقات نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ سنکارا طالب علموں،
جوانوں، بوڑھوں، دفتر میں کام کرنے والوں، سخت قسم کی جسمانی محنت کرنے
والوں، عورتوں اور مردوں سب کے لیے ہر موسم میں یکساں مفید ہے۔

سنکارا پابندی سے پیجیے اور اطمینان سے روزے رکھیے!

رمضان المبارک میں سنکارا کے اوقاتِ استعمال: افطار، سحر اور تراویح کے
بعد: تنہا یا پانی یا دودھ میں ملا کر بڑوں کے لیے دو بڑے چمچے، کم عمر والوں کو
ایک بڑا چمچہ۔



170672
14.10.92

سنکارا
مشہور عالمی ٹانک
ہر موسم میں سب کے لیے

گھر بھر کی صحت کے لیے ہر موسم میں گھر کے ہر فرد کے لیے
[illegible]

ہمدرد

سرورق
شعر ـ اقبال
عمل
علام الہدیٰ
[بنارس]

شمارہ ـ ۱ [۱۹۹۵] جلد ـ ۶۶

ایک تحریر اور ۔ نئی نسل کے لئے

ترقی پسند اور جدیدیت کے مخصوص فریم ورک سے باہر جو ادب تخلیق ہوتا رہا ہے اس کی روح میں اترنے کا تنقیدی عمل ابھی باقی ہے ۔ یعنی وہ قلم کار جنہوں نے اپنے عصر کو اپنے طور پر جذب کیا محسوس کیا اور تخلیقی سطح پر اس کا اظہار کیا ۔ ترقی پسندوں اور جدیدیوں کی جو بھی فلسفیانہ اساس رہی ہو اور اپنے تمام منطقی دلائل و موقف میں یہ لوگ کتنے ہی حق بجانب ہوں ۔ لیکن مجموعی طور پر خدا بے زاری اور مادہ پرستی ہی کو تقویت دی گئی ۔ خدا ، کائنات اور اخلاق سے بے زار فلسفوں اور فلسفیوں کے اداکاری بگاڑی نے اردو شعر و ادب کو کتنا نقصان پہونچایا اور کتنا فائدہ ، یہ بحث ابھی باقی ہے ۔ تازہ کار نسل کی اجتماعی سوچ میں جو سوال بن رہے ہیں ، ان میں مادیت کے حوالے سے ، خدا ، کائنات اور اخلاق کی اپنی نئی جمالیات کا احساس ابھر رہا ہے ۔ وہ علمی و ادبی مسائل جو کل تک اہم تھے یا ہو سکتے تھے ، وہ یا تو ختم ہو گئے ہیں یا ان کی معنویت تبدیل ہو رہی ہے ۔ اب ترقی پسندی یا جدیدیت کوئی مسئلہ نہیں ۔ آفاقی اجتماعی مسائل کے ساتھ ، سرحدوں کے اندر ابھرنے والے علاقائی ، لسانی ، مذہبی اور تہذیبی مسائل کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے ۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اب ہمارے پاس معلومات کا جو ایک زبردست ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اور جو تاریخ بھی بنتا جا رہا ہے ۔ اس سے حال اور مستقبل کو کس طرح روشن کیا جائے ۔ جدید فلسفوں اور سائنس میں بھی فاصلہ کم ہوتا جا رہا ہے ۔ پوری دنیا بلکہ پوری کائنات ، انسان کے انفرادی اور اجتماعی لاشعور سے ہر لمحہ متحرک اور متغیر ہے ۔ ۲۱ ویں صدی کی دھمک میں کسی نئے عالمی تصور کے امکانات پر غور کیا جا رہا ہے لیکن پہلے ہمیں اپنے وسیع تر تجربوں سے اپنی غلطیوں کا ادراک کرنا ہے چوں کہ ہماری دسترس میں کچھ بھی نہیں سوائے قیاس آرائیوں کے لہٰذا جو قیاسات ابھر رہے ہیں ان کا شعور اور ان سے اکتساب ازبس ضروری ہے ۔ اس سے قبل کہ وہ معدوم ہو جائیں ۔ ترقی پسندی اور جدیدیت ، مابعد جدیدیت پر مکالمہ ضرور ہو لیکن ہمارا کلاسیکی ورثہ ابھی پوری طرح روشن نہیں ہوا ہے ۔ نئی نسل کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں ۔ مغربی فلسفہ مشرقی شعر و ادب پر بے طرح اثر انداز ہوئے ہیں ۔ گزشتہ چالیس سال کا ادب مجموعی طور پر ترقی پسند تحریک اور پھر جدیدیت کے تابع رہا ہے ۔ کیا ہمارے لئے ضروری تھا اور کیا غیر ضروری ، اس پر غور نہیں کیا گیا ہمارا تہذیبی ورثہ صدیوں پر محیط ہے اب ہمارا شعر و ادب کیا ہونا چاہئے ؟ ہمارے مسائل کیا ہیں ؟ ان کے تقاضے کیا ہیں ؟ ان موضوعات پر بہت صاف صاف مکالمہ اب ناگزیر ہو گیا ہے ۔ مذہب سے عاری ذہنوں کی اپنی سوچ چاہے کتنی ہی متاثر کرنے والی ہو ۔ افکار کی نہ دیدگی سے روشن خیالی اور دانشوروں کا کوئی بھی فلسفہ بنتا ہو ، خدا ، کائنات ، اور انسان کے بارے میں قطعی مثبت نہیں ۔ تشکیک ، ابہام اور پھر الجھاوے کو فلسفہ بنانا اور اپنے افکار کو فن کاروں پر حاوی کر دینے والی تنقیدی تحریروں میں نمونے کا عمل اب کمزور تر ہے ۔ ہمیں اپنے شعر و ادب کو سیاسی و سماجی سطحوں پر بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ آدمی کے کام کا کتنا ہے اور کتنا ضائع ہو جانے والا ہے ۔ شعر و ادب کا کام عصری حسیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ اس کی جمالیات کو بھی سنوارنا ہوتا ہے ۔ کیا ہماری جمالیات نے جدید ادب کو قبول کیا ہے ؟ کسی مخصوص فریم ورک میں سمویا جانے والا شعر و ادب کتنی دیر اور کتنی دور تک ہمارا ساتھ دے سکتا ہے ؟ ہم جس مشترکہ تہذیب و تمدن کی روایت میں جی رہے ہیں ، آزادی سے قبل اس روایت میں اردو کا اپنا کلچر تھا لیکن ایک حاوی کلچر میں سیکولرازم کا جو مفہوم تھا وہ آج نہیں ہے اب اردو کلچر کہاں رہا ؟ نام نہاد قومی یک جہتی کا خوف اور مغربی افکار کے زیر اثر تنقید اور اس تنقید کے تابع شعر و ادب میں سچ کے ذائقے نہیں ہیں ۔ فن کار ، اپنے مزاج اپنے کلچر اور اپنی روایت سے باہر تقلید اور فیشن کی ہوڑ میں کیا لکھ رہا ہے ۔ اس کے اثرات کیا مرتب ہوئے اور ہو رہے ہیں اس پر توجہ نہیں دی گئی ۔ ہماری روح ، ہمارا ذہن تو کچھ اور ہے اور ہم نے لکھنے پڑھنے کے کام کچھ اور کئے ہیں ۔ اب ایک بہت اہم سوال بلکہ بنیادی سوال یہ بن رہا ہے کہ کیا ہمیں اب بھی اپنی فرسودہ روش پر ہی گامزن رہنا ہے یا اپنے فکری زاویوں کو تبدیل کرنا ہے ۔ اپنے شعر و ادب میں ہم کیا تخلیق کر رہے ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں ۔ اس پر از سر نو غور کرنا ہے ۔ آزادیٔ فکر کا محور ، فلسفہ ، سائنس اور مذہب کے تضادات و تصادم سے ماورا ، ان کی یکجائی سے مرتب ہونا چاہئے ۔ خدا ، کائنات اور انسان کے باہمی ربط و تسلسل کی افہام و تفہیم کے نئے راستوں کو روشن کرنا ہے ۔ آدمی نے انسان کا قتل کر دیا اب آدمی کو اپنے ختم ہو جانے کا خوف شدید ہے ۔ خوف کی مختلف شکلیں پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے رہی ہیں ۔ خوف کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں مگر نجات کا راستہ ابھی موجود ہے اس سے قبل کہ یہ راستہ گم ہو جائے ، ہمیں اپنے شعر و ادب کے متن کا جائزہ لینا ہے اور ایک نئے ادبی کائنات کو خلق کرنا ہے ۔

احمد ہمیش

شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) جون ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشیدِ نو

عروسِ فطرت! مری نگاہوں پہ چھا رہا ہے شباب تیرا
لطیف پردوں سے جھانکتا ہے جمالِ زیرِ نقاب تیرا
سراپا محوِ آرائشِ مسلسل، مگر ترے جلووں کی روشنی میں
اک آئینہ ماہتاب تیرا، اک آئینہ آفتاب تیرا
مری حیات ہے مقدر سے تو، مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا
کہ طور پہ جا کے میں نے اک دن، الٹ دیا تھا نقاب تیرا

[illegible]

اگرچہ صبر آزما بہت ہے تری خموشی و پردہ داری
مگر ہے درسِ کشش تعقل سے، سکوت تیرا حجاب تیرا
جلال و جبروت نے نگاہوں میں زمیں مہر و ماہ لب و زباں پر
ہے کوہ و صحرا کی ہستیوں میں مدار کہ انقلاب تیرا
سبز تو لب عندلیب کیا ہے؟ یہ معلول تیری ہی بخششیں ہیں
نہ اختیاری کرم ہے تیرا — نہ اختیاری عتاب تیرا
ترے جلال و جمال ہی سے، ہے اعتدالِ نظامِ عالم
کہیں غضب بے پناہ تیرا، کہیں کرم بے حساب تیرا
جبیں سے دل تک بھری ہوئی ہے خلش ترے عشقِ جانگزا کی
تمہارے ارادے کو ہو مبارک — کہ درد دیکھا ہے جواب تیرا
ہے روحِ سیماب سازِ تیرا، تو گوش کش نغمہ ہائے پنہاں
ترے لب رگِ جاں بھی ہے پر سکتی ہے؟ اگر نفس میں اضطراب تیرا

فروغ سے ہے نشید نے بے نیاز و بیگانہ رہنے والے!
صدف کی غنچہ نمائیوں کو ہوا ہے تقسیم ہو اب تیرا

* علامہ سیماب اکبرآبادی [پیدائش: ۵ جون ۱۸۸۰ء - م: ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء] کی ۴۴ ویں برسی کے موقع پر علامہ کے غزلوں کے دیوان اوّل کلیمِ عجم [مطبوعہ: ۱۹۳۶ء] کی پہلی غزل کا عکس تحریر دیا جا رہا ہے۔ اشعار کی ترتیب میں تبدیلی اور ان میں ترمیم و تصحیح کے بعد اس غزل کو کلیمِ عجم کے دوسرے ایڈیشن [مطبوعہ: ۱۹۴۷ء] میں شامل کیا گیا تھا۔
[ادارہ]

دوہائیاں



راغب مرادآبادی

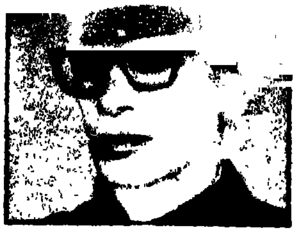
نیا مجھے، بدحواس لگتی کیوں ہے
پژمردہ و رہین یاس لگتی کیوں ہے
ہستا تھا، خدا سے، ایک بھوکا پیاسا
انسان کو، بھوک پیاس لگتی کیوں ہے

لفظوں میں نظر بند ہیں آہیں میری
حرفوں میں ہیں پرفشاں کراہیں میری
کہتے ہو تم اشعار جنہیں وہ ہیں دراصل
اے ہم نفسو، پناہ گاہیں میری

انسان کو پیدا ہی نہ کرتا اے کاش
خالی ہو شکم تو بے محل ہے، خوش باش
دوزخ کے عذاب سے ہے بڑھ کر واللہ
اے خالق ارض و آسماں، فکر معاش

جو زخم ہیں سینے میں، نہیں سِل سکتے
مرجھائے ہوئے پھول نہیں کِھل سکتے
اس دور میں ممکن ہے، خدا مل جائے
اس دور میں انسان نہیں مل سکتے

۱۴۔ ۱۱۵۱۔ ایف "بی" ایریا کراچی ۔ ۷۵۹۵۰ (پاکستان)



فضا ابن فیضی

سہل انگاری

کانٹوں سے جبیں پھولوں کی سہلاتا ہے
پتھر سے، سبک شیشوں کو ٹکراتا ہے
جس سے نہیں ہو پاتی ادب کی تخلیق
وہ نقد نگاری پہ اتر آتا ہے

اجزائے ترکیبی

نقاد ادھورے، تو ادھوری تنقید
تجزیہ کہاں کا، اور کیسی تنقید؟
کچھ داعیے، کچھ لاحقے، کچھ مفروضے
مبنی، انھیں اجزا پہ ہے ساری تنقید

برمحل

ژولیدہ خیالات، بیاں میں تعقید
فن پارے کی تحلیل میں کوری تقلید
تخلیق کے باطن میں سفر کرتی ہے
ہوتی ہے جو تنقید، حقیقی تنقید

سچا ناقد

لفظوں کو، معانی کی قبا دیتا ہے
ہم کو، نئی سمتوں کا پتا دیتا ہے
لاریب، کہ ہوتا ہے جو سچا ناقد
تنقید کو، تخلیق بنا دیتا ہے

جامع الصفات

تسوید بھی، تدوین بھی، تعلیق بھی آپ
تزئین بھی، توزین بھی، تطبیق بھی آپ
ہم کیا؟ بس قلم کا دردہ، قرطاس کی گرد
تخلیق بھی، تنقید بھی، تحقیق بھی آپ

ساخت و بافت

یہ زلف طرازی، یہی شانہ سازی
یہ آگ بھری لے ہے، اچغانہ سازی
ہنس بول کے، ناقد کے ستم بھی سہہ لے
یہ خانہ برانداز ہے، خانہ سازی

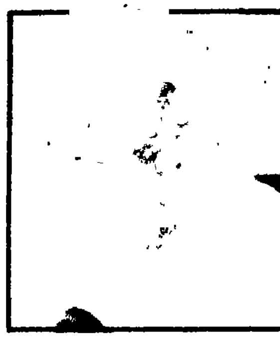
درمانِ بے درماں

ایسا نہیں، تنقید سے گھبراتے ہیں
تنقیص سے، تردید سے گھبراتے ہیں
کچھ ایسا ہے دمساز دوا کہ تسہیل کے بعد
ہم، معنت کی تبرید سے گھبراتے ہیں

خردہ گیر

ہو جنسِ قبول، یا متاعِ کاسد
محسود یہ اپنا ہے، یہ اپنا حاسد
آ ٹپکے، کہاں بیچ میں چھوٹ بھیئے، لوگ
فن کار ہے، خود اپنے ادب کا ناقد

مئو ناتھ بھنجن ۔ ۲۷۵۱۰۱ (یوپی)



محمد علی صدیقی

۵۔۹۲۔ اے، بلاک جے نارتھ ناظم آباد، کراچی (پاکستان)

اردو کے بین الاقوامی رسائل کا کردار

میرے مضمون کا موضوع ہے "برصغیر کے باہر اردو کے ادبی یا نیم ادبی رسائل کا اردو کے بین الاقوامی کردار میں حصہ"۔ ادبی جریدے کا مفہوم تو بالکل واضح ہے لیکن "نیم ادبی" جرائد کا لاحقہ خاصی وسیع CLASSIFICATION کا متقاضی ہے۔

یوں تو اردو زبان کی بین الاقوامی اہمیت تو برطانوی نوآبادیاتی نظام کی مضبوط گرفت کے زمانہ ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی تاسیس کا ایک مقصد وسیع سے وسیع تر علاقہ پر بالادست ہوتی ہوئی برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی نظام حکومت چلانے کی ضرورت ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس کالج کی بدولت اردو زبان کا بھی فائدہ ہوا۔ اردو نثر کی بنیاد رکھی گئی۔ فورٹ ولیم کالج سے مختلف علوم اور زبان و ادب پر بحث متن کے ساتھ بعض اہم کتابیں شائع ہونا شروع ہوئیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنی تصنیف "داستان تاریخ اردو" میں کپتان ہملٹن کی کتاب کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ واسکوڈی گاما کے دورہ دریافت ہند (۱۴۹۸ء) کے بعد ہی پرتگیزیوں اور مغربی ہند کے سواحل پر آباد ہندوستانیوں کے اشتراک سے ایک ایسی ملی جلی زبان وجود میں آنے لگی۔ جیسے ہملٹن نے اپنی کتاب (شائع شدہ ۱۷۱۰ء) میں تمام یورپ کے لئے مفید بتایا ہے۔ پرتگال کے بعد فرانس اور انگلستان بھی ہندوستان کے ساتھ تجارت کی خواہش میں سرگرداں ہندوستان پہنچے۔ انگلستانی تاجر بادشاہ جیمز اول کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے اجرا شدہ چارٹر کے بعد پہنچے۔ کپتان ہاکنس ۱۶۰۸ء میں سورت پہنچا۔ اور اس نے جہانگیر سے سورت میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کی۔ سورت کے علاوہ مچھلی پٹن (مسولی پٹم) کے مشرقی ساحل پر بھی ۱۶۳۲ء میں ایک کوٹھی کی اجازت حاصل کی گئی۔ اور پھر ۱۶۹۰ء میں مدراس کا شہر آباد کیا گیا اور انگلستان کے قومی سینٹ جارج کے نام پر فورٹ سینٹ جارج تعمیر کیا گیا۔ چارلس دوم نے نئے شاہی فرمان کے ذریعے کمپنی کو اپنا سکہ جاری کرنے کی اجازت دی اور چارلس دوم کی پرتگیزی شہزادی کیتھرائن سے شادی کے بعد انگلستان کو شہزادی کے جہیز میں بمبئی کا شہر حاصل ہوا۔

اردو زبان کے بارے میں جان فرائر نے اپنی کتاب میں ایک انگریز درویش ٹوم کریٹ کا ذکر کیا ہے جو ۱۶۱۶ء میں ہندوستان میں مقیم پہلا انگریز تھا جسے "ہندوستان زبان" پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ فرائر نے عہد اورنگ زیب کے شہروں کی زبان کے بارے میں لکھا ہے کہ ہرچند کہ دربار کی زبان فارسی ہے لیکن عوام "اندوستان زبان" بولتے ہیں جس کا کوئی باقاعدہ رسم الخط نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں اندوستانی زبان فارسی رسم الخط کے ساتھ ساتھ دیوناگری رسم الخط میں بھی لکھی جاتی تھی۔ اور اندوستانی زبان کا کوئی واحد رسم الخط نہیں تھا۔

اردو کی پہلی لغت ایک پرتگیزی کورج کیجو نے سورت کے شہر میں ۱۶۳۰ء میں بنائی جس میں فارسی، ہندوستانی انگریزی اور پرتگیزی الفاظ درج تھے۔ ہندوستانی الفاظ رومن اور گجراتی رسم الخط میں تھے۔ سورت ہی میں ۱۷۰۴ء کے لگ بھگ ایک فارسی پادری فرانکس تو مدنینس نے ایک لغت تصنیف کی جو دو حصوں پر مشتمل تھی۔ لغت ۵۰۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ اردو کا پہلا قواعد نویس جان جوشوا کیٹیلر تھا۔ جرمن پادری بنجمن شلز نے ۱۷۴۴ء میں لیپزگ (جرمنی) سے اردو قواعد کی کتاب "گرامیٹیکا انڈوستانو" کے عنوان سے لکھی۔ اس لغت میں سو سے زائد زبانوں کے حروف تہجی درج ہیں۔ پہلی باقاعدہ اردو لغت جسے فرگوسن نے ۱۷۷۳ء میں تحریر کیا جس کا نام "ڈکشنری آف دی ہندوستانی لینگویج" ہے اور یہی وہ سال ہے جب پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) کے بعد تغیر ہوئے۔ فورٹ ولیم کلکتہ مکمل ہوا۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں ٹیپو سلطان کی شکست (۱۷۹۹ء) کی خوشی میں ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ برطانیہ میں فورٹ ولیم

کالج کی طرح ہرٹ فورڈ کیسل HERTFORT CASTLE اور ہیلی بری HAILEY BURY کی بنیادیں ۱۸۰۵ء اور ۱۸۰۹ء میں رکھی گئیں۔ اور بعد میں وولوچ WOOL WICH ملٹری اکیڈمی ہی نے ہیلی بری کالج کی جگہ لے لی۔ ہیلی بری کالج کے فارغ التحصیل افسران نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے زبردست خدمات انجام دیں۔ اور بڑا نام پیدا کیا۔

موخر الذکر کالج میں سنسکرت، فارسی، عربی، ہندی، بنگالی، اور ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج میں السنہ شرقیہ کے پروفیسر جوناتھن اسکاٹ تھے۔ ہیلی بری کالج ۳۱ دسمبر ۱۸۵۷ء کو بند کر دیا گیا۔ اس سے ۲۰۵۵ طلبا فارغ التحصیل ہوئے جس میں بیشتر اردو کے فاضل تھے۔ ۱۸۱۲ء میں ہیلی بری کالج دوبارہ کھلا اور ۱۹۴۳ء میں یہ کالج امپریل کالج میں مدغم ہو گیا۔ لندن ہی میں ۱۸۱۸ء میں اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔ جس میں گلکرائسٹ نے اردو زبان و ادب سے متعلق ۱۰ کتابیں تصنیف و تالیف کیں مونیر ولیمز (۱۸۱۹ء - ۱۸۱۸ء) ایسٹ وک ایڈورڈ بیک ہاؤس (۱۸۱۴ء - ۱۸۸۳ء) مولوی مرزا خلیل اور مولوی عبدالسلام شعبہ شرقیہ ہیلی بری کالج میں ۱۸۰۹ء سے ۱۸۱۹ء تک پڑھاتے رہے۔ جان ڈوسن (۱۸۲۰ء - ۱۸۸۱ء) بیرن فان اشٹرنگ BERON VON STRENG جے ایف اولمن J.F. ULMAN سموئیل سلیٹر SAMUEL SLATER فٹز ایڈورڈ ہال FITZ EDWARD HALL تھامس ہونے THOMAS HONE جے ایف بلوم ہارٹ J.F. BLOOM HART آکسفورڈ یونیورسٹی میں ۱۸۵۹ء سے اردو کی تعلیم شروع ہوئی۔ اور پہلے پروفیسر جے چیمبرز J. CHAMBERS مقرر ہوئے۔ اور کیمبرج میں ۱۸۰۰ء سے اردو کی تدریس کے لئے انتظام شروع ہوا اور ۱۸۶۰ء سے میجر جے جی اسٹیفن کا تقرر ہوا۔ کیمبرج میں ۱۸۸۲ء کو بورڈ آف انڈین سول سروس قائم ہوا جو کیمبرج میں انڈین سول سروس کے طلباء کو کنٹرول کرتا تھا۔ اس کے علاوہ جان شیکسپیر ملٹری سیمنری ایڈز کوسب کراؤڈن سرے میں استاد مقرر ہوئے۔ گارسیں دتاسی نے اردو کی تعلیم شیکسپیر ہی سے حاصل کی۔ منشی حسن علی اسی جان شیکسپیر کے اسسٹنٹ تھے جن کی انگریز بیوی نے ۱۸۳۲ء میں OBSERVATIONS ON THE MUSLIM OF INDIA. نامی کتاب تصنیف کی۔ رچرڈ ہاٹن، چارلس یا ولر کاٹن ماتھر اور میجر رونلڈسن جس پر دتاسی نے ژورنل آزیاتیک JOURNAL ASIATIC جنوری ۱۸۳۲ء میں تبصرہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں وولوچ ملٹری اکیڈمی، ملٹری اکیڈمی سینڈ ہرسٹ کیمبرے ہیتم کالج، مرچنٹ کالج، ڈبلن وائین کالج، ونڈسر ایڈیزا کالج اسکاٹ لینڈ میں اردو کی تدریس کا انتظام تھا۔

یورپی مراکز میں اٹلی کے شہر نیپلز NAPLES میں مائل کالج آف ایشین انسٹی ٹیوٹ خاصہ مشہور ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۶۸ء میں قائم ہوا۔ لیکن اس کی بنیاد اٹھارہویں صدی کی ایک اطالوی کیتھولک مشنری ماتیو ریپا MATTEO RIPA نے رکھی تھی۔ جسے چینی سیمیناری کا نام دیا گیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں اسے یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا ہے۔ گارساں دتاسی کے زمانہ میں وہاں کامیلو تاگلیا بوئے CAMILLO TAGHLIA BUE اردو پڑھا رہے تھے ان دنوں ایسا ندرو یوسانی اٹلی کے مشہور اردو داں استاد ہیں۔ علاوہ ازیں ۱۸۹۵ء میں پیرس کی انقلابی حکومت نے لوئی لانگلے ۱۷۶۳-۱۸۲۴ء مارچ ۱۷۹۵ء میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ برن یونیورسٹی میں بھی اردو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اسپرنگر اس جامعہ کا فارغ التحصیل تھا۔ جس نے برطانوی شہریت اختیار کر لی تھی۔ اس پس منظر کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یورپ کی استعماری قوتیں برصغیر میں اپنے قدم جمانے کے لئے اردو یا ہندوستانی کی اہمیت سے واقف تھیں۔ ملک گیری اور عیسائیت کے فروغ کے مابین چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اس لئے عیسائی مشنریوں نے اردو سیکھنے اور سکھانے کے لئے مربوط کوششیں کیں۔ اٹھارویں صدی میں فرانس، جرمنی، اٹلی، انگلستان اور ڈنمارک کے مشنری اداروں نے اس ضمن میں بطور خاص اہم کردار ادا کیا۔

ہم اپنے مضمون میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے خصوصی کردار پر روشنی ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فورٹ ولیم کالج نے نہ صرف انگریز حکام کی ایک نسل تیار کی بلکہ ہندوستانیوں میں بھی یہ احساس پیدا کیا کہ اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں ہیں تاکہ رسم الخط کی بنیاد پر اردو کو مسلمانوں کے لئے اور ہندی کو ہندوؤں کے لئے قابل کشش بنایا جاسکے۔

بنگال کے دور بین دانشور طبقہ میں یہ احساس بھی جاگزیں کیا کہ اردو یا ہندوستانی جو شمالی ہند کے عوام کی زبان تھی۔ وہ اپنے فارسی رسم الخط کے باعث اسلامی اثرات کی حامل ہے۔ اور اس زبان کو شدھ کرنے کے لئے ہندوستانی کے ساتھ دیوناگری رسم الخط پر زیادہ سے زیادہ اصرار کرنا چاہیئے۔ شمالی ہند کا اردو پریس شروع سے ہی اعلیٰ ہندو طبقات کے افراد کی ملکیت تھی۔ اور یہ حقیقت بذات خود اس بات کا ثبوت ہے

کہ اردو شمالی ہند کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث تھی، اور دیوناگری لپی میں جدید ہندی اردو کی مصنوعی سیاسی حریف ہے۔ ۱۸۸۱ء میں ۷۰ فیصد اردو اخبارات ہندوؤں ہی کی ملکیت تھی۔ بنارس میں ۱۸۶۷ء میں لسانی تنازعہ کے بعد سے اس تعداد میں کمی ہوتی چلی گئی۔ اور منشی پریم چند کے زمانہ شباب ہی میں اردو زیادہ تر شمالی ہند کے مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی۔ ۱۹۰۰ء میں یوپی کے گورنر انٹونی میکڈونل کے عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں اردو کے ساتھ دیوناگری لپی میں ہندی کو سرکاری زبان بنانے سے اس عمل میں تیزی آگئی۔ اسی سے انجمن ترقی اردو کی تاسیس اور پھر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشن کے اجلاس منعقدہ ڈھاکہ ۱۹۰۶ء ہی کے ایک علاحدہ سیشن میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد تک پہنچی۔ اور اس طرح رسم الخط کے فرق کی بنیاد پر ایک ایسے سماجی اور ثقافتی نزاع کا سلسلہ شروع ہوا جو منجملہ دیگر اسباب کے دو قومی نظریے پر منتج ہوا۔

حیران کن بات یہ ہے کہ عین اس دور میں جب برصغیر میں احیاء پرست قوتیں اردو ہندی تنازعہ کی آگ پر تیل چھڑک رہی تھیں۔ برصغیر کے باہر ہندو اور مسلم حریت پسند اردو اخبارات و جرائد آزادئ ہند کے لئے قابل رشک مشترکہ جدوجہد میں مصروف تھے۔ اور آج بھی ہند و پاک کے مابین تمام تر سیاسی تنازعات کے باوجود برصغیر کے باہر یورپ، امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا سے جاری ہونے والے جرائد اور مجلوں میں برصغیر کی ثقافت کی متحدہ مشترکہ جھلکیاں نظر آتی رہتی ہیں۔ ہر چند کہ اب بنیادی عنصر "آزادی" کا حصول نہیں ہے۔ بلکہ آزادی کے حصول کے بعد ہجرت نصیب برصغیر کی برادریاں جس نوع کے ثقافتی بحران اور تہذیبی بیگانگی کا شکار ہیں اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سمندر پار برصغیری جرائد میں پہلے "آزادی" کا مطالبہ بلند ہوا کرتا تھا۔ اور اب یورپ اور امریکی جرائد اور مجلوں سے برصغیر کی یادوں کے نعرہ ہائے مستانہ بلند ہوتے ہیں۔ الغرض ان جرائد کے مواد CONTENT کی نوعیت بدل گئی ہے۔ "آزادی" کا نعرہ شعوری طور پر انقلابیوں کی تحریک کا ثمرہ تھا۔ اور ثقافتی بحران اور تہذیبی بیگانگی کا احساس ان برصغیری گروہوں کا خاصہ ہے جو اپنے آزاد سماجوں سے تلاش روزگار میں باہر گئے۔ ان میں سے بعض بن بلائے مہمانوں کی طرح گئے اور میزبان ممالک میں اپنے آبائی ملکوں اور ثقافتوں کے لئے ہدف ملامت کا سبب بنے۔ لیکن یہ سب کے سب بجا طور پر وطن کی یادوں میں گرفتار ہیں۔ حد یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے اضلاع کی دو تین ہفتوں پرانی جرائد سے متعلق خبریں بھی دل لگا کر پڑھتے ہیں۔ اور ذہنی طور پر اپنے "آبائی علاقوں" میں ہی رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان افراد کے یہاں میزبان سماجوں سے مفاہمت اور ان میں انجذاب کا عمل تعطل کا شکار ہے۔

اوپر بیان کردہ دو صورتوں میں پہلی صورت پر پہلے گفتگو ہونی چاہئے۔ میری مراد آزادی سے پہلے مغرب میں اردو کی ادبی اور نیم ادبی صحافت کے پس منظر سے ہے تاکہ مغربی ممالک میں ادبی و نیم ادبی صحافت کے پیش نظر جرائد کے بارے میں اجمالی طور پر گفتگو کی جاسکے۔ سمندر پار ممالک میں آزادی کی جدوجہد میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن (اسیر مالٹا) کے معتقد مولانا مقبول الرحمن سرحدی، شوکت علی بی اے بنگالی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے علاوہ متھرا سنگھ، بھگوان سنگھ، مولانا برکت اللہ بھوپالی، راش بہاری بوس، راجہ مہندر پرتاب وغیرہ وغیرہ نے اہم کردار انجام دیا۔ یہ حضرات چین، امریکہ، فرانس، جاپان، جرمنی، ترکی، انگلستان، کینیڈا، اور اسلامی ممالک میں گئے اور وہاں جماعتیں قائم کیں۔ ان انقلابیوں نے اردو پریس کے ذریعہ بڑے بڑے معرکے سر کئے۔

پہلا قابل ذکر اردو جریدہ قسطنطنیہ سے جاری ہوا۔ اور اس کا نام "ترجمان مشرق" تھا۔ یہ ۲۳ مارچ ۱۸۸۰ء میں ایک پندرہ روزہ جریدے کے طور پر جاری ہوا۔ جریدہ اردو اور عربی زبانوں میں نکلتا تھا۔ اور اس کے مالک اسکندر آفندی تھے۔ اسکندر آفندی ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۶ء میں دہلی اور لکھنؤ میں قیام کر چکے تھے۔ اور وہ ۱۸۵۷ء میں ان شہروں کی بربادی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے وطن واپسی پر ہندوستان میں انگریزوں کے مظالم پر سے پردہ اٹھایا۔ برطانوی حکومت اس جریدہ سے اس حد تک کبیدہ خاطر ہوئی کہ اس نے ۱۸۸۰ء میں عثمانی حکومت سے اس جریدہ کو بند کروا دیا۔

ترکی ہی سے "سلطان الاخبار" یکم جنوری ۱۸۸۰ء کو منشی سید قادر بخش کی ادارت میں جاری ہوا۔ قادر بخش ۱۸۵۷ء کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر ترکی چلے گئے تھے۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ لندن (انگلستان) سے پہلے "اردو جریدہ ہندوستان" اگست ۱۸۸۴ء میں جاری ہوا۔ یہ جریدہ اردو، انگریزی اور ہندی زبانوں میں نکلتا تھا۔ اس کے مالک راجہ رامپال سنگھ آنریری مجسٹریٹ پرتاپ گڑھ تھے۔ یہ جریدہ بھی ۱۸۵۷ء کی ہولناکیوں کے بیان کے لئے وقف تھا۔

مولانا سید محمود حسن اس لحاظ سے منفرد حیثیت کے مالک ہیں کہ انہوں نے انگریزی راج کے استبداد کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے پیش

جاپان، فرانس، امریکہ، اور اسلامی ممالک میں دفتر دیکھے۔ ۱۹۰۵ء میں چین سے "الیقین" نامی رسالہ اردو اور چینی زبان میں نکالا جو ۱۹۰۹ء تک جاری رہا۔ اس رسالہ نے چین میں بھی انقلابی خیالات کی تخم ریزی کی۔ امریکہ سے اردو کا پہلا جریدہ "ماہنامہ" سرکار آزادی" ۱۹۰۷ء میں نکلا۔ لالہ امرناتھ اس کے ایڈیٹر تھے اور اس جریدہ نے امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے والے ہندوستانیوں کے حقوق کے لئے آواز اٹھائی۔ اور آزادی ہند کے لئے بہت اہم کام کیا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی اپریل ۱۹۱۰ء میں نیویارک سے جاپان پہنچے۔ انہیں انگریزی، فارسی، عربی، اردو، ترکی، جرمنی، فرنچ اور جاپانی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ نے ٹوکیو یونیورسٹی کے شعبہ اورنٹیل لینگویجز میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی اور ۱۹۱۰ء میں ماہوار جریدہ اسلامی برادری ISLAMIC FRATERNITY جاری کیا۔ مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلی کے مئی ۱۹۱۱ء کے شمارہ میں اس رسالہ کی خدمات جلیلہ پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا۔ اس تحریر میں مولانا موہانی پر مولانا بھوپالی کے خیالات کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا بھوپالی ٹوکیو یونیورسٹی سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ اور وہ پیرس آ گئے۔ ۱۹۱۰ء میں لندن سے "سوراج" جاری ہوا۔ جو بنگالی، اردو، انگریزی اور ہندی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے مالک و ایڈیٹر بابو بین چندر پال تھے۔ کینیڈا سے بھی ایک انقلابی اخبار "ہندوئی" ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا۔ انگریزی اور اردو میں کینیڈا کے ہندوستانیوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ انقلابی تحریک کینیڈا ہی سے شروع ہوئی "گوماگاٹا"، جہاز کے واقعہ سے کینیڈا کے ہندوستانیوں ہندوستان آکر بغاوت کرنے کی تحریک ہوئی۔ "فرانس" میں چودھری رحمت علی پنجابی نے جو مولانا برکت اللہ بھوپالی کے ساتھی تھے۔ ۱۹۱۲ء میں انگریزی، فرانسیسی اور اردو زبان میں اخبار انقلاب جاری کیا۔

۱۹۱۲ء میں سیکرامینٹو میں ۱۳ مارچ ۱۹۱۳ء میں لالہ ہر دیال کی صدارت میں غدر پارٹی قائم ہوئی۔ جس میں مولانا برکت اللہ بھوپالی پیش پیش تھے۔ اس پارٹی کا آرگن "اخبار غدر" جاری ہوا جو اردو، ہندی، مرہٹی، اور گورمکھی زبانوں میں چھپتا تھا۔ "غدر" میں انقلابی نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں اسی زمانہ میں سروجنی نائیڈو کے بھائی ویرندر ناتھ چٹوپادھیائے نے پیرس سے ایک اخبار "تلوار" نکالا۔ ۱۹۱۴ء ہی میں ترکی سے ایک اور ہفت روزہ جریدہ شائع ہوا جو عربی، ترکی اور اردو میں شائع ہوتا تھا۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے ۱۹۲۵ء میں فرانس سے ایک جریدہ "الاصلاح" جاری کیا۔ جسے برطانوی حکومت نے ایک شمارہ کے بعد ہی بند کر دیا۔ روس سے بھی مہاجرین نے کئی جریدے نکالے جس میں آذربائیجان کے شہر باکو سے جاری ہونے والا "آزاد ہندوستان" نامی جریدہ خاصہ مشہور رہے۔ آزادی کے بعد مغرب یا سمندر پار ممالک میں "اردو جرائد مجلوں کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ لیکن ساٹھ کی دہائی میں یورپ اور امریکہ کی جانب تلاش روزگار یا تعلیم کی غرض سے بڑے پیمانہ پر نقل مکانی نے امریکہ، برطانیہ کینیڈا، اور پھر ستر کی دہائی میں ڈنمارک، ناروے، سویڈن، ہالینڈ، جرمنی میں برصغیر برادریوں کے بڑے اور چھوٹے گروپوں کو جنم دیا۔ پھر ان گروپوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کیلئے پاکستان اور ہندوستان کے سیاسی، نیم ادبی اور ادبی جرائد کے لئے ایک غیر متوقع مارکیٹ پیدا ہوئی۔ آج یورپ اور امریکہ کے علاوہ آسٹریلیا تک سے شائع ہونے والے "اردو جرائد جنوبی ایشیا" سے مغرب کی جانب سے بڑی سے بڑی "ہجرت" کے سبب سے ہیں۔ اور یوں لگتا ہے کہ یہ سلسلہ آج کے برصغیری نژاد بچوں کے سن بلوغت تک پہنچے۔ اور پچاس اور ساٹھ کی دہائی کے پہلی نسل کے تارکین وطن کی زندگی تک ہے۔ اس کے بعد وہی ہوگا۔ جو طاقتور تہذیب کا اژدھا کرتا چلا جا رہا ہے۔ یعنی برصغیری برادریوں کی جانب سے تہذیبی تشخص کی جنگ کے اختتام پر مکمل انجذاب کے دور میں داخل ہوتے اردو جرائد اور اردو مشاعرے اور سیمینار ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت دیار مغرب میں اردو جرائد کا دور عہد شباب کا دور ہے۔ جو تا دیر باقی نہیں رہ سکتا۔ ویسے بھی اگر شمالی ہندوستان کے مسلمان اردو اسکرپٹ زندہ رکھنے میں ناکام ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ تو پھر مغرب میں یہ توقع کیوں کر رکھی جا سکتی ہے۔ کہ وہاں اردو رسم الخط میں شائع ہونے والے جریدے تا دیر باقی رہ سکیں گے۔ بہر حال یہ کوئی نئی بات نہیں۔ دنیا بھر کے تارکین وطن کی کہانی ایک سی ہے۔ شروع کی دو تین نسلوں تک اپنے لسانی و تہذیبی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے بے پناہ جد و جہد جاری رہتی ہے۔ اور پھر بالآخر آہستہ آہستہ میزبان سماج میں انجذاب و ادغام کا غیر مرئی منطقی دور آ پہنچتا ہے۔ اور تیسری نسل پہلے دو نسلوں کی پہلی زبان FIRST LANGUAGE کو مادری زبان کے طور پر اپنا لیتی ہے۔ یہودیوں نے صرف اپنی مذہبی ضرورت کے تحت RABBIS کے ذریعہ US اور THEM "ہم اور وہ" کے شدید POLARISATION کو باقی رکھا جو یہودی مذہب کے اعتقادی اور سیاسی کلچر کا خاصہ تھا۔ انہوں نے عبرانی زبان کو اس طرح زندہ

کیاہے کہ جیسے وہ اپنی کثیر اللسانی POLYGLOT جمعیت کو ESPERANTO قسم کی کوئی زبان پڑھا رہے ہوں جس کی آوازوں سے DIASPORA کے طویل عرصہ میں ان کے کان آشنا ضرور رہے تھے لیکن وہ ان آوازوں کے معانی سے کٹ چکے تھے۔ وہ عبرانی زبان کے رسم الخط صرف و نحو اور لہجہ سے بھی بے بہرہ تھے۔ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں اردو رسم الخط کے چلن کی معدومی سے ایک خوف پیدا ہو رہا ہے کہ شاید مغرب کے اردو دوست بھی اپنے بچوں میں اردو کے لئے ایک ایسا جذبۂ پسندیدگی پیدا نہ کر پائیں گے۔ جو اردو کی بقا کا ضامن بن سکے۔ میں نے ذاتی طور پر یورپ اور امریکہ کے متعدد دوروں میں اس تلخ حقیقت کو محسوس کیا ہے کہ اردو ہندوستان کی طرح یورپ اور امریکہ میں "بوڑھوں کی زبان" بنتی جا رہی ہے۔ اس نوع کی بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد بس ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ایسی تجاویز اور تدابیر پر غور و خوض کیا جا سکے جو بظاہر یاسیت زدہ تاریک صورت حال میں روشنی کی کرن پیدا کر سکے۔ کسی زبان کی ترقی کا راز یہ ہے کہ وہ محض اپنے بولنے یا سیکھنے والوں کی لئے مذہبی ضرورت تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ بلکہ روزگار کی زبان اور ثقافتی ترجمان کے طور پر زندہ رہ سکے، اور برصغیر سے باہر کے ادبی اور نیم ادبی جرائد اور مجلّوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فی الحال۔ غالباً ایک مختصر المیعاد ثقافتی ضرورت کے پیش نظر زندہ ہیں۔ اس صورت حال میں یہ دعا ہی کر سکتے ہیں۔ کہ یہ میعاد کبھی "مختصر" نہ ہو اور ان جرائد کی "ثقافتی ضرورت" تا دیر باقی رہ سکے۔ اور یہ ایک ایسا فرض محال ہے جسے ممکن بنانے کے لئے بے پناہ تنظیمی جد و جہد کی ضرورت جس کی شدید خواہش باقی تمام خواہشوں پر حاوی آسکیں۔

اب میں برصغیر کے باہر ممالک سے نکلنے والے جرائد کے جائزہ کا آغاز انگلستان سے کر رہا ہوں کہ وہی ہمارے لئے مغرب سے ایک طویل تاریخی تعلق اور ربط کا سبب بنا جو ہمارے سماج میں انگریزی زبان کی زبردست اہمیت کے پیش نظر عبرت انگیز اور سبق آموز ربط ہے۔

لندن سے اس وقت دو اہم اردو اخبار "جنگ اور آواز" نکل رہے ہیں۔ جنگ کے ادبی صفحات بڑی توجہ سے پڑھے جاتے ہیں۔ لندن سے جنگ کا اجراء ساٹھ کی دہائی میں ہوا۔ اور اس وقت یہ اخبار نہ صرف انگلستان بلکہ بعض یورپی ممالک میں بھی مقامی اخبارات کے ساتھ ناشتہ کی میز پر دیکھا جا سکتا ہے۔ "آواز" ایک نیا اخبار ہے۔ اس سے پہلے روزنامہ "مشرق" بھی شائع ہوا کرتا تھا۔

ہفت روزہ جرائد میں وطن اور راوی، ماہناموں میں اجالا، اور اردو ادب، بھی شائع ہو رہے ہیں۔ میں ان جرائد کے نام گنوانے سے عمداً گریز کر رہا ہوں۔ جو اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ بہر حال ان جرائد کی حیثیت جگنوؤں کی سی ضرور ہے۔ جو تھوڑی ہی دور تک اردو کی روشنی پھیلاتے تو ہیں اس لئے ان جرائد کے ناشر بھی قابل مبارک باد ہیں۔

اب میں کینیڈا کی طرف آتا ہوں۔ کینیڈا کے برصغیر نژاد باشندوں نے برصغیر کی آزادی کے لئے شروع ہی سے بہت کام کیا ہے۔ ۱۹۱۱ء کے آخر میں جب مقدمہ سازش لاہور کا فیصلہ سنایا گیا تو عدالت کے کمشنروں نے اپنے فیصلہ میں لکھا جو "ہمدم" لکھنؤ شمارہ ۱۳ جنوری ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا کہ ہمیں اس مقدمہ کی شہادتوں سے معلوم ہوا ہے کہ کس طرح کینیڈا میں انقلابی تحریک شروع ہوئی۔ اور کس طرح اس نے ترقی پائی کامہ گاٹا ماروجہاز کے واقعہ سے کینیڈا کے کچھ ہندوستانیوں کو ہندوستان میں لا کر بغاوت کرنے کے منصوبے بنائے۔"

آخر اس سلسلہ میں بھگوان سنگھ اور بلونت سنگھ کو کس طرح بھلایا جا سکتا ہے! اول الذکر کینیڈا کی طرف سے ڈیلیگیٹ کے طور پر اس جلسہ میں شریک ہوا تھا جو لاہور کے بریڈلا ہال میں اگست ۱۹۱۲ء میں منعقد ہوا تھا۔

کینیڈا سے اس وقت اردو ادب پر انگریزی زبان میں سب سے وقیع جریدہ "اردو کناڈا" نکل رہا ہے اور اشفاق حسین کا "اردو انٹر نیشنل" جو برصغیر کے باہر شائع ہونے والے تمام جریدوں میں سب سے اعلیٰ معیار کا جریدہ تھا۔ دوبارہ زندہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کناڈا سے ماہنامہ "پاکیزہ" بھی شائع ہو رہا ہے۔ اور رضا الجبار صاحب کا جریدہ بھی۔ عابد جعفری روزنامہ "امروز" نکال رہے ہیں۔ اس اخبار کا ادبی ایڈیشن بطور خاص لائق مطالعہ ہوتا ہے۔

نیویارک (امریکہ) سے خلیق میاں اردو میں روزنامہ "ملت" نکال رہے ہیں جس کا ادبی صفحہ توجہ سے پڑھا جاتا ہے۔ "نیا دور" کبھی کبھی شائع ہوتا ہے۔ میامی سے ڈاکٹر بشیر احمد "کہکشاں" نکال رہے ہیں۔ لیکن امریکہ کے مختلف شہروں نے مشاعروں کے ساتھ ہونے والے محفلوں

کی تعداد خاصی ہے۔ اور ان مجلّوں کو بھی "ر۔ اکی" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ناروے سے سید مجاہد علی بہت پابندی کے ساتھ ماہنامہ "کارواں" منصور احمد ماہنامہ "پیام مشرق" اور جمشید مسرور ماہنامہ "بازگشت" نکال رہے ہیں۔ ڈنمارک سے پندرہ روزہ "وقار" پابندی سے نکل رہا ہے۔ یہ جریدے نیم سیاسی، نیم سماجی اور نیم ادبی ہیں اور ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ برصغیر نژاد گروہوں کے مسائل کی نوعیت کیا ہے۔ آپ سے اعتراف کرتا چلوں کہ بعض جرائد میں شائع ہونے والی رپورٹوں سے برصغیر کے بارے میں اچھی آرا قائم نہیں ہو پاتیں۔ اب میں آسٹریلیا کی طرف آتا ہوں۔ جہاں سے ایک جریدہ "بزم اردو" سڈنی سے نکل رہا ہے۔ کنیز فاطمہ اس جریدہ کی ایڈیٹر ہیں اور ڈاکٹر محمود ملک روح رواں۔ یہ جریدہ نیم ادبی اور نیم ثقافتی ہے۔ ایک قابلِ ذکر سہ ماہی "غالب" بھی ہے۔ جسے متین عباس نکالتے ہیں۔ سنا ہے کہ اب اس جریدہ کا باقاعدہ اجیا ہو رہا ہے۔

آخر میں جنوبی افریقہ کے شہر کیپ ٹاؤن سے شائع ہونے والے ایک مجلّہ "بزم ادب سوونیئر شائع شدہ ۱۹۹۲ء" کے دس سالہ شمارہ کا ذکر نہ کرنا بھی ناانصافی ہوگی۔ اگر افریقہ میں اردو کے سلسلہ میں ہونے والے کام کے لئے کالی داس گپتا رضا کی کتاب "مشرقی افریقہ میں اردو" کا مطالعہ کیا جائے تو افریقہ میں اردو کا چرچا برطانوی نوآبادیاتی نظام کے جلو میں نقل مکانی کرنے والے ہندوستانی کارکنوں اور تاجروں کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ آج اردو کا چرچا محض شاعروں تک محدود ہے۔ ماریشس بحر ہند میں واقع واحد ملک ہے جہاں کی آبادی ۲۰ فیصد مسلمانوں کے ۱۸۶ اسکولوں میں ۲۰ ہزار طلبا و طالبات باقاعدہ طور اردو پڑھ رہے ہیں یہاں پر اب اردو کے مجلّے شائع ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ماریشس کے مسلمان ہندوستان نژاد ہیں۔ بیشتر کا تعلق ہندوستان کے صوبہ جات گجرات اور مہاراشٹر سے ہے اور ان کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ لیکن اردو ان کی مذہبی ضروریات احسن طریق پر پوری کر رہی ہے بلکہ اسی طرح جس طرح جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں کی۔

مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے وقتاً فوقتاً متعدد ممالک میں اردو کی صورتِ حال کے بارے میں دلچسپ معلومات سے مزین مختصر کتابچے شائع کئے ہیں۔ جن کی خوبیاں تو بے شمار ہیں لیکن خرابی ایک ہی ہے۔ یہ کتابچے تازہ ترین معلومات کی شمولیت سے قاصر رہتے ہیں اور اشاعت پذیر ہوتے ہی "تاریخ" بن جاتے ہیں لیکن پھر بھی اردو کی بین الاقوامی حیثیت کے بارے میں کوئی مطالعہ ان کتابچوں کے بغیر ممکن نہیں ہو پائے گا۔ ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ بیرونِ ملک مقیم اردو شاعروں کے اب تک ۱۷۵ شعری مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ اوج کمال کے اشاعتی ادارے سے شائع شدہ سرور عالم راز کے شعری مجموعہ "شہر نگاراں" کے سرورق کو ان مجموعوں کے عنوانات سے سجایا گیا ہے۔ میرے خیال میں انگریزی اور ہندی کے علاوہ کسی تیسری زبان کے تارکینِ وطن نے اپنے بنیادی خطّے کے علاوہ کسی اور منطقہ سے اتنی بڑی تعداد میں شعری مجموعہ شائع نہیں کئے ہیں۔ برصغیر نژاد گروپ کے شاندار مجلّے تو بین الاقوامی اردو مشاعروں کے انعقاد کے موقع پر خلیج کے ممالک سے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن اب "ترجمانِ شوق" قسطنطنیہ (اجرا شدہ ۱۸۷۸ء) سلطان الاخبار قسطنطنیہ (۱۸۸۰ء) ہندوستان، لندن (۱۸۸۴ء) انڈین سوشلسٹ لندن (۱۹۰۵ء) سرکلر آزادی نیو یارک (۱۹۰۸ء) اور اخوتِ اسلامی (ٹوکیو ۱۹۱۰ء) سوراج (۱۹۱۰ء) اور "غدر" سیکرامینٹو (امریکہ) (۱۹۱۳ء) کی وہ روایت کہاں جو آزادی کے متوالوں کی ترجمان تھی۔ اب نسبتاً اچھے وقتوں میں اپنی پرانی یادوں کو تازہ کرنے اور اردو ادب سے کسی نہ کسی تعلق خاطر قائم رکھنے کی ایک خواہش ضرور ہے۔ یہ جرائد ہمیں مغرب کی حیرت انگیز سائنسی ترقیوں سے باخبر کرنے کے بجائے ہندوستان اور پاکستان کے فرقہ وارانہ اختلافات کے لندنی، ناروینی اور امریکی مفاد نظر آتے ہیں۔ ناانصافی ہوگی اگر یہ اعتراف نہ کیا جائے کہ ان جرائد میں برصغیر کی سماجی و سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں سے آگاہ کرنے کی کوشش بھی ہوتی ہیں۔ جو مقامی پریس کے لئے چنداں اہم نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ یہ جرائد برصغیر نژاد برادریوں کو مغربی تہذیب کے مثبت جمالیاتی اور فکری پہلوؤں سے روشناس کرائیں تاکہ ہمارے باشندے میزبان سماجوں میں ہمدردی، اور ستائش کی نگاہوں سے دیکھے جا سکیں۔ تقسیم سے پہلے کے اردو جرائد اور تقسیم کے بعد اردو جرائد میں ایک اور فرق ہے۔ برصغیر کی آزادی کے لئے اچھے وجید سے لئے آزادی کے حوالے جن ممالک میں پیش پیش تھے۔ وہ ترکی، انگلستان، امریکہ، کناڈا، چین اور جاپان تھے۔ آج

ترکی، چین، اور جاپان میں، اردو صحافت دم توڑ چکی ہے۔ اور انگلستان، امریکہ، اور کناڈا میں سرِ فہرست نار وے اور ڈنمارک میں دوسرے نمبر پر اور آسٹریلیا میں تیسرے نمبر پر ہے جس سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ جس ملک کے خلاف آزادی کی جدوجہد جاری تھی۔ برصغیر آبادی کی خاصی بڑی تعداد، تقریباً بیس لاکھ وہاں موجود ہے۔ اور اس آبادی میں پاکستان نژاد برصغیری ہی اردو کی ادبی اور نیم ادبی صحافت سے علم بردار ہیں۔ امریکہ کناڈا، اور آسٹریلیا میں بھی یہی صورتِ حال ہے لیکن جن ممالک میں برصغیری اپنے ممالک کی آزادی سے پہلے مقیم ہیں۔ اور نو آزاد سماجوں کا اہم حصہ ہیں۔ وہاں اردو ادب سے زیادہ مذہبی ضرورت کے طور پر رواج پا رہی ہے۔ جیسے کہ جنوبی افریقہ، ماریشس، کینیا، مڈغاسکر، بوٹسوانا، اور لیسوتھو، اور ان سماجوں میں زیادہ تر ہندوستان نژاد اردو سے محبت کرنے والے اردو کی ترقی کا سبب بن رہے ہیں۔ ماریشس میں اردو کی حیرت انگیز ترقی یعنی ملک کے ۲۰۰ اسکولوں میں اس زبان کی تدریس قرار پانا سماجی سائنس دانوں کے لئے لائقِ تحقیق مسئلہ ہونا چاہیئے۔ اور پاکستان میں افریقہ کے آزاد ممالک میں برصغیری نژاد افراد کی اردو کی بڑھتی ہوئی دلچسپی میں مددگار ثابت ہونے کے لئے ایک خصوصی تنظیم تیار ہونی چاہیئے جو مشینری ——— کے طور پر وہاں جائیں اور مقامی آبادی بغیر ضروری معاشی بوجھ بنے بغیر اردو کی تدریس میں معاون ثابت ہو سکیں۔ کاش جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی نے ماریشس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایک امتحانی مرکز کھولا ہے۔ اسی طرز پر ہماری جامعات بھی کچھ کام کر سکیں۔ اور اس کا دائرہ انگلستان، اور امریکہ و کناڈا تک بڑھا جائے۔ تاکہ وہاں اردو پڑھنے کی خواہش مند نئی نسل کو اسکولوں میں موجود سہولتوں میں اضافہ کی غرض سے ایک ایسا لائحہ عمل وضع کیا جا سکے۔ جو مقامی انتظامیہ کے لئے بھی قابلِ قبول ہو اور اردو کے ساتھ برصغیر کی تاریخ، فنون، اور فکری تحریکوں پر مشتمل ایک کثیر الجہتی انتخالوجی پیش کی جا سکے۔ جو انگریزی، امریکی اور کناڈا کے طالب علموں کیلئے بھی پرکشش ہو۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ اردو زبان میں دلچسپی برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ ❋

بین الاقوامی اردو رسائل و جرائد

❋

محرم علی صدیقی کے اہم مقالے میں اعداد
نئی بستیوں سے شائع ہونے والے ادبی و نیم
ادبی جرائد و رسائل کے نام دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے
بعض ایسے ہیں کہ نئے رسائل و جرائد کے نام اور پتے
شاعر کے بے شمار قارئین کے لئے شائع کئے جاتے
ہیں۔ اس گزارش کے ساتھ کہ ان رسائل و جرائد
سے نہ صرف ربط قائم کیا جائے بلکہ قلمی تعاون کے
ساتھ ان کی مالی اعانت بھی کی جائے۔ اردو کی
نئی بستیوں سے ابھی اور بھی رسائل و جرائد شائع
ہو رہے ہیں۔ جن کے پتے ہمارے پاس نہیں ہیں۔
ایسے رسائل و جرائد کے مدیران اور ان سے
وابستہ قلمکاروں سے التماس ہے کہ وہ
اپنے رسالے یا اخبار کا نام، پتہ اور دیگر
تفصیلات ارسال کریں۔ تاکہ اس فہرست کو
مکمل کیا جا سکے۔

[ادارہ]

ASHFAQUE HUSAIN,
EDITOR,
'URDU INTERNATIONAL'
4623, FULL MOON CIRCLE,
MISSISSAUGA,
ONTARIO, LUZ, 2NT.,
C A N A DA

M.E. SHAIKH,
EDITOR,
'RAWI'
RAWI HOUSE, UNIT 1.,
LEGRANS LANE,
BRADFORD BO7 INS

ATHAR RARZ
EDITOR,
'SADA'
24-A, FARM AVENUE,
STREATHAM,
LONDON SW16 2UT.

ANWER SHAIKH,
EDITOR,
'LIBERTY'
POST BOX NO. 918,
CARDIFF
GREAT BRITAIN
CF 2 UYP.

KANEEZ FATIMA
EDITOR
'BAZM-E-URDU'
21, BAULKHAM HILL ROAD,
NSW-2153
AUSTRALIA

MOHD. MUMTAZ RASHID,
EDITOR,
'KHAYAL-O-FUN'
POST BOX NO. 41.,
DRAWING SECTION
D O H A
STATE OF QATAR
(ARABIAN GULF)

HYDER QURESHI,
EDITOR,
'JADEED ADAB'
SUDRING-75,
65795-HATTERSNEIM
GERMANY

MRS. TANVEER ALI,
EDITOR,
'NIDA'
148)-CUBBLEGATE LANE
REYNOLDBURG
O H I O 43068
U.S.A

REHMAN SIDDIQUI
EDITOR,
'URDU LINK'
POST BOX NO. 351447,
LOS ANGELES
CA 90035 U.S.A

JAMEEL AHSAN,
EDITOR,
'MANZIL'
HAGALUNDSG, 42 7TR.,
17150 SOLNA
SWEDEN

W.A. SHAHEEN,
EDITOR,
'URDU CANADA'
POST BOX NO. 2276,
STATION D
OTTAWA ONTARIO,
CANADA KIP 5W4

JAMSHED MASROOR,
EDITOR,
'BAZGASHT'
LINDEBERGASEN 46A,
N-1068,
O S L O-10,
(NORWAY)

RAZA-UL-JABBAR,
EDITOR,
'DOOR DESH'
3311, KINGSTON ROAD
SUITE NO. 901,
SARBOROUGH ONT.
MIM IRI
C A N A D A

MR. RAHIM ANJAN,
EDITOR,
'MULAQAT'
18o, CHESTERLE BLUD
SCARBOROUGH
ONTARIO
MIW 2M9
CANADA

اکبر حیدرآبادی

میں دل کو غم کی کسوٹی پہ کس کے دیکھوں گا
بدن کی برف میں شعلۂ نفس کے دیکھوں گا

بصارتوں کے لئے جو عذاب پیہم ہے
وہ سارے سلسلے حرص و ہوس کے دیکھوں گا

جہادِ عمر نہیں اک تماشۂ اطفال
یہ کارزارِ عمر اپنی کس کے دیکھوں گا

بچا کے رکھی ہے سوغات جیب و داماں کی
ہیں کیسے موسمِ دل اس برس کے دیکھوں گا

کبھی خیالوں میں اپنے اسے بسا لوں گا
کبھی خود اس کے خیالوں میں بس کے دیکھوں گا

کھلی ہواؤں میں اکبر مجھے بکھرنا ہے
رہا ہوا تو نہ جانب قفس کے دیکھوں گا

30, TUFFLEY ROD, BRISTOL BS10 5EW
WESTBURY ON TRYM AVON U.K



بشیر بدر

دالانوں کی دھوپ، چھتوں کی شام کہاں
گھر سے باہر، گھر جیسا آرام کہاں

بازاروں کی چہل پہل سے روشن ہیں
ان آنکھوں میں مندر جیسی شام کہاں

میں اس کو پہچان نہیں پایا تو کیا
یاد اسے بھی آیا میرا نام کہاں

دن بھر سورج کس کا پیچھا کرتا ہے
روز پہاڑی پر جاتی ہے شام کہاں

چندل کے بستے میں سوکھی روٹی ہے
کاجو، کشمش، پستے اور بادام کہاں

لوگوں کو سورج کا دھوکا ہوتا ہے
آنسو بن کر چمکا میرا نام کہاں

اے-۱، بادشاہ اپارٹمنٹ، کوہ فضا، بھوپال-۰۰۱

مصطفیٰ کریم
5-CAMPTON CLOSE, SEALBY SCARBOROUGH
YO13 0QJ (U.K)

ٹوٹا ہوا پتّا

سعید کی آنکھیں اچانک کھل گئیں۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے دماغ کو کسی نے زور سے دبا دیا اور اس کی نیند جو کسی گاڑھے سیّال نشے کی طرح اس کے دماغ کے ہر خلئے میں بہہ رہی تھی۔ اسے کسی نے نچوڑ کر نکال دیا۔ بالکل اسی پانی کی طرح جیسے وہ کچن میں برتنوں کو دھونے کے بعد گیلے اسپنج کو نچوڑ کر نکالتا تھا نامکمل نیند کی وجہ سے اس کا سر بھاری اور ذہن پژمردہ تھا۔ اب سونا محال تھا ٹوٹا ہوا خواب دوبارہ نہیں جڑتا بے خبری کی مدہوشی پھر آسانی سے نہیں ملتی۔ کوشش کے بعد بھی نہیں نیند کا مختصر وقفے کے لئے آنا ضعیفی کی محرومیوں میں شامل تھا۔

سعید نے ٹیبل لیمپ جلایا اور گھڑی دیکھی۔ ساڑھے چھ بج رہے تھے ہر دن کی طرح نگاہ اپنے تکیے کے ساتھ رکھے دوسرے تکیے پر گئی اس کا سفید غلاف بے شکن تھا ایک گھٹی ہوئی آہ سعید کے منہ سے نکل گئی اس تکیے پر کبھی اس کی بیوی کا سر ہوتا تھا۔ اسے جگانا چاہتا تو اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو وہ نرمی سے ہٹاتا۔ بیوی کے جاگنے کی خواہش نہیں ہوتی تو وہ اس کے ہاتھ کو اپنے گرم گال کے نیچے رکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ۔۔ اگر جاگی ہوتا تو خاموشی سے اٹھ کر کچن سے چائے بنا کر لے آتی پھر دونوں بستر پر نیم دراز دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ دن کس طرح گزارنا ہے، کس سے ملنا ہے کہاں جانا ہے،

لیکن بیوی چار سال پہلے مر گئی تھی اور اس وقت سے اب تک ڈبل بیڈ پر ساتھ کی جگہ خالی تھی اب وہ تھا ـــــــ اور لمحہ لمحہ گزرتے ہوئے شب و روز کا اس پر بڑھتا ہوا بوجھ۔ گزشتہ رات وہ دیر تک بیٹے کے فون کے انتظار میں جاگتا رہا تھا اس کے بیٹے کو امریکہ میں اچھی نوکری مل گئی تھی اور وہ دفتر کی الوداعی پارٹی نیز دوستوں کو خدا حافظ کہنے میں مصروف ہونے کی وجہ سے ہر جمعہ کی رات کی طرح فون نہیں کر سکا تھا۔ جمعہ کی رات کو عموماً دونوں ایک دوسرے سے باتیں ضرور کرتے تھے۔ مختلف شہروں میں رہنے کی وجہ سے خیر سگالی کا یہی طریقہ تھا دونوں کے پاس۔ بیٹا جب فون کرتا تو بتاتا کہ ویک اینڈ پر کیا کرنے جا رہا ہوں پھر سعید کے پوتا پوتی اور انگریز بہو اسے ہلو کہتے اور اس کی خیریت پوچھتے۔ سعید کو احساس ہوتا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ویک اینڈ گزار رہا ہے۔ کچھ دیر کے لئے چہل پہل ہو جاتی اس کی زندگی میں۔ سعید کو یہ بھی گمان تھا کہ بیٹا امریکہ جانے سے پہلے اس ویک اینڈ پر ملنے کی اطلاع دے لیکن ایسا نہیں ہوا اس لئے سعید کو اذیتناک خالی پن کا احساس ہو رہا تھا اسے اس کا بھی صدمہ تھا کہ بیٹے نے اس کی تنہائی کا خیال نہیں کیا اور امریکہ جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن قصور درحقیقت سعید ہی کا تھا۔ بیٹے کے ہزار کہنے کے باوجود وہ ان کے یہاں یا اس کے قریب جا کر رہنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ سعید کا اپنا گھر موجود تھا جس کی سجاوٹیں اس کی مرحومہ بیوی کی یادیں تازہ کرتیں مکان کے باہر اس کا وہ باغ تھا جہاں گھنٹوں باغبانی کرتے ہوئے اس نے پسینہ بہایا تھا جب بیوی زندہ تھی تو وہ اکثر اس سے کہتا "اس چمن میں میرا خون پسینہ بن کر جذب ہوا ہے۔ اسی زمین میں میری جڑیں ہیں اس سے علیٰحدہ ہو کر میں زندہ نہیں رہ سکتا"

اسی گھر میں سعید کی اکلوتی اولاد اس کا بیٹا پلا بڑھا اور دولہا بنا تھا مددگار خاتون ایلس پابندی سے ہفتے میں تین دن آ کر گھر کی صفائی کر دیتی اور ہفتے بھر کا کھانا بنا کر فریج میں رکھ دیتی تھی جس گھر میں ماضی کی اتنی مسرتیں مترنم ہوں اسے ٹھکرانا ضروری نہیں تھی۔ بیٹے کی زندگی میں وہ کیوں مخل ہوتا اس تمام نظم اور ضبط کے باوجود جب بیٹے نے امریکہ چلے جانے کا معینہ فیصلہ کر لیا تو سعید کو ایک عجیب سی بے بسی کا احساس ہونے لگا۔ سعید ستّر سال کا ہو چکا تھا۔ موت کسی وقت

بھی آسکتی تھی اس کے بعد اسلامی طریقے سے اس کے کفن دفن کا انتظام بیٹے کی غیر موجودگی میں کیسے ہوگا ۔ مگر کسی بیماری نے مفلوج یا نیم مفلوج کردیا تو اس کے بعد کسی نرسنگ ہوم یا اولڈ پیپلز ہوم میں نیم بڈھوں کے درمیان زندگی گزارنے کے تصور سے سعید کو سخت گھبراہٹ ہوتی تھی ۔ اس لئے ادھر جب بھی بیٹے کا فون آتا تو سعید کو امید ہوتی کہ شاید بیٹا کہہ دے کہ اس نے امریکہ جانے کا فیصلہ ملتوی کردیا ہے لیکن اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی ۔ اور اب تو اس کی روانگی میں دس دن سے بھی کم مدّت تھی اس لئے گزشتہ رات بیٹے سے فون پر بات نہیں ہوئی تو سعید کے اضطراب میں اضافہ ہوگیا اور اب اسے غصّہ آرہا تھا بیٹے کی بے مروتی پر ۔ بیوی پر جو ایسی پریشانیوں میں اسے گھر اچھوڑ کر چلی گئی تھی ۔ اپنی مجبوری پر بھی وہ برہم تھا لیکن سُونے گھر میں تھا کون جس پر وہ غصّہ نکالتا بس سن سن کرتا سنّاٹا تھا اور اس کی سانس کی آمد و رفت کی آواز ۔

" آہ " بے چین خیالات کی بے چینی سے سعید کے مونھ سے آواز نکلی ۔ گرم لحاف سے اس نے پاؤں نکالے گھٹنے کے سخت جوڑ اسے آہستہ آہستہ کھلتے محسوس ہوئے " جس کا کوئی نہیں ہوتا ہے اس کا خدا ہوتا ہے "

سعید نے خود کو یقین دلایا اس نے سلیپر پہنے کرسی پر پڑا نیلا ڈریسنگ گاؤن اٹھا کر جسم پر ڈالا اور غسل خانے چلا گیا کچھ دیر بعد جب اس نے فلش کی زنجیر کھینچی تو پانی کی گھڑ گھڑاہٹ کے ساتھ اسے گھنٹی کی آواز سنائی دی سعید نے سمجھا شاید ٹیلیفون کی آواز ہے وہ تیزی سے باہر نکلا فون خاموش تھا دروازے کی گھنٹی ملک مین بجا رہا تھا ۔ سعید نے اسے کہہ رکھا تھا کہ ویک اینڈ پر اس کے یہاں مہمان ہوں گے اس لئے وہ آج پوچھ لے کہ اسے کتنی دودھ کی بوتلیں اور چاہیئے ۔ سعید نے دروازہ کھولا ۔ سامنے پستہ قد ملک مین سیاہ پل اوور میں ملبوس ، ہاتھ میں دودھ کی بوتل لئے ہوئے کھڑا تھا ۔

" گڈ مارننگ ۔ کتنی بوتلیں چاہیے ؟ "

" گڈ مارننگ ۔ بس ایک بوتل ۔ کوئی مہمان نہیں آرہا ہے "

" مجھے افسوس ہوا ۔ ذرا چہل پہل ہو جاتی آپ کے گھر میں "

سعید نے مونھ سکوڑ کر شانوں کو ذرا سا بلند کردیا جیسے اسے کوئی پرواہ نہیں کوئی آئے یا نہ آئے ۔ دودھ کی بوتل دے کر ملک مین چلا گیا ۔ صبح کی خاموشی میں اس کے ننھے ٹرک کی آواز دیر تک دور سے آتی رہی ۔ فریج میں دودھ کی بوتل رکھ کر سعید غسل خانے میں ہاتھ مونھ دھونے چلا گیا دل میں جو بے کلی تھی اس کی وجہ سے شیو کرتے وقت اس سے بد احتیاطی ہوئی ۔ ڈھیلے گالوں پر خراشیں پڑ گئیں اور ان سے خون کی ننھی بوندیں نکل آئیں ۔

" احمق " سعید نے خود کو زیر لب ڈانٹا اور ٹیشو پیپر سے اپنے زخمی گالوں کو صاف کیا ۔

کچھ دیر بعد سعید غسل خانے سے نکلا گھر سے باہر نکلنے والے دروازے کے پاس سے اس نے آج کا تازہ اخبار اٹھایا اور کچن واپس آکر ناشتہ بنانے لگا چند لمحوں میں کافی پوٹ میں ابلتی کافی کی خوشبو کچن میں پھیل گئی جن دنوں سعید کی بیوی زندہ تھی تو ہفتے یا دو ہفتے میں اس کے گھر مہمان ضرور آتے تھے سب ہی اس خوشبو کا ذکر ضرور کرتے جو کمروں میں خوشبو دان پر جلتے مہکتے تیل اور کچن میں مختلف ملکوں کی اعلیٰ کافی کی وجہ سے پھیلی ہوتی ــــ ہر گوشے میں فرحت کا احساس ہوتا سب کو ۔

" ہم آپ کی مہمان نوازی اور گھر کی خوشبو میں بسے واپس جا رہے ہیں " مہمان اکثر کہتے ۔

" پھر آئیے گا " سعید اور اس کی بیوی لوسی خلوص سے جواب دیتے ۔

خستہ ٹوسٹ کو کترتے ہوئے اور کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے سعید نے اخبار پر نگاہ ڈالی ۔ اس پر ۹ تاریخ دیکھ کر وہ چونک پڑا چار سال پہلے اس کی بیوی اسی تاریخ کو مری تھی ۔ اس کے بعد ہر مہینے کی اسی تاریخ پر بیوی کے مزار پر اس کے محبوب پھول گلدستے کی صورت میں پہنچانا ضرور رہتا تھا بارش ہو یا برف باری اس کی اس مخصوص سرگرمی میں رکاوٹ کبھی نہیں ہوئی تھی ۔

" برا ہو میری غائب دماغی کا میں تو بھول ہی گیا تھا کہ آج نو تاریخ ہے " سعید نے خود کو ملامت کیا ۔

کچن کے باہر کھڑکی کے قریب چیری بلوسم کی بے گل شاخوں پر صبح کا پھیکا اجالا پھیل چکا تھا ۔ سعید کو اپنے بیٹے کی یاد پھر آئی ۔ اس نے فون پر بیٹے کا نمبر ملایا

" ہیلو ــ رئیس "

" ہیلو ــ ڈیڈ ــ آپ نے مجھے بہت سویرے اٹھا دیا ۔ "

بیٹے کی نیند میں ڈوبی تھکی ہوئی آواز آئی ۔
" میں تمہارے فون کا انتظار کرتا رہا ۔ کیا تم لوگ ہمارے پاس نہیں آ رہے ہو ؟ "
" ڈیڈ ۔ میں معذرت خواہ ہوں رات کو میں بہت دیر سے واپس پھرا ۔ اب آنا ممکن نہیں ۔ گھر پر بہت سارے کام ہیں ۔ آفس والوں نے بہت جلد کام پر حاضر ہونے کے لئے کہا ہے ۔ اس لئے میں آپ کے پاس آنے کا پروگرام نہیں بنا سکا "
" ایک ہی دن کے لئے سہی آج آجاتے تو اچھا ہوتا ۔ ہم دونوں ساتھ تمہاری ماں کی قبر پر جاتے ۔ "
" ڈیڈ ۔ آپ ایک مدّت سے تنہا ماں کے مزار پر جاتے رہے ہیں اگر میں آج ساتھ نہیں ہوا تو کیا فرق پڑ جائے گا " بیٹے کی آواز میں جھلاہٹ تھی اسے اپنے باپ کی جذباتیت اچھی نہیں لگی تھی ۔

سعید چند لمحوں کے لئے چپ ہوگیا ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا اب کیا کہے ۔ اس نے رئیس کو اپنی شخصیت ابھارنے کا پورا موقع دیا تھا اس کے محسوسات اور اختلافات کا احترام کیا تھا ۔ اپنی بیوی کی یاد کا سہارا لے کر بیٹے کو مجبور کرنے کی کوشش پر سعید کو ندامت ہوئی

" ٹھیک ہے ۔ روتھ کو کہہ دینا وہ بچوں کے ساتھ میرے پاس آجایا کرے ۔ "
" وہ جب جاگ جائے گی تو میں کہہ دوں گا ۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ وہ موٹر وے پر ڈرائیو کرنے سے گھبراتی ہے ۔ آپ ہی آجایا کیجئے کبھی ان کے پاس ۔ بچے اکثر آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں ، "
بیٹے نے اس طلب کی شناخت کرلی تھی جس میں سعید کے ملنے جلنے کی خواہش پنہاں تھی ۔
" اچھا پھر خدا حافظ ۔ روتھ اور بچوں کو میری دعا دینا خط پابندی سے لکھنا ۔
" ضرور ڈیڈ ۔ " دوسری جانب سے فون رکھنے کی آواز آئی
سعید کو اب اس کاربرو سے باہر نزدیک کی کسی دوسری جگہ جانا محال محسوس ہوتا تھا بیٹا اور بہو کا گھر مانچسٹر میں ایک سو تین میل دور تھا وہاں جانے کے لئے پڑوسیوں کو کہنا کہ اس کے مکان پر نگاہ رکھیں ۔ بینک سے پیسے نکالنا ٹیکسی آرڈر کرنی ۔ ٹرین کے ہچکولوں میں سفر اس کے بعد بیٹے کے گھر میں ہر صبح چائے کے لئے بہو کے اٹھنے کا انتظار کرنا اور یہ بھی ممکن تھا کہ بہو کو کسی بھی کام سے بازار جانا ہوتا تو اسے پوتے پوتی کے لئے بے بی سیٹنگ کرنی پڑتی یہ سارے امکانات بیٹے کے گھر جانے میں مخل ہوتے تھے اور اس وقت بھی انہی تصورات نے بیٹے کے گھر جانے کی خواہش کچل دی

" ہوں ۔ میں وہاں جاؤں ؟ بچے یہاں آئیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ دوسرا گھر بھی ہے جہاں ان کی خاطر داریاں ہوتی ہیں ۔ یہاں تصویروں میں وہ اپنے باپ کا بچپن اور اپنی دادی کو دیکھیں گے تو انہیں اپنی تاریخ کا علم ہوگا ۔ "
" سعید بڑبڑا رہا تھا اور ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا رہا تھا ۔

سعید پانچ دہائیوں سے انگلستان میں مقیم تھا ۔ اسے اکثر محسوس ہوتا کہ انگلش کہاوت ـــــ انگریز کا گھر اس کا قلعہ ہے بالکل درست تھی ۔ جب تک ضعیفی نے اسے کمزور نہیں کردیا گھر کی دیواروں پر وال پیپر ہمیشہ اس نے خود تبدیل کیا تھا ۔ احاطے کی دیوار اس نے خود کھڑی کی تھی ، گھر کے اندر اس کی بیوی کا ڈیڑھ سو سال پرانا خاندانی پیانو تھا ۔

ہال کی دیواروں پر ٹنگی چوبی تختیوں پر کلمۂ شہادت اور خدا اور رسول کا لکھا ہونا ۔ ہر کمرے میں ٹیبل لیمپ اور ان پر خوبصورت شیڈ ۔ کمروں کی چھتوں سے لٹکتے چھوٹے بڑے شینڈ لیئر ۔ مکان میں اڑتی خوشبو کی طرح یہ سب بھی گھر کی انفرادیت تھے جن پاکستانیوں اور ہندوستانیوں سے سعید کی کبھی دوستی تھی وہ انگریز لوسی سے سعید کی شادی کے بعد اس سے دور ہو چکے تھے اور جب انہیں علم ہوا کہ کرسمس کیرول گانے لوسی گرجا گھر جاتی ہے اور اہتمام سے کرسمس مناتی ہے ، تو سعید کے غیر انگریز دوستوں کا اس کے گھر آنا جانا بالکل ختم ہوگیا ۔ پھر بھی سعید اور اس کی بیوی لوسی کو دوستوں کی کمی نہیں ہوئی اپنے شہر اور بین الاقوامی امدادی تحریکوں کے لئے چندہ جمع کرنے کی خاطر وہ دعوتیں کرتے ارد گرد کے گاؤں میں سالانہ میلے یا موٹروں کی بوٹ سیل پر اسکاربرو کے معذور بچوں کی بنائی مصنوعات فروخت کرتے ان کارروائیوں کے علاوہ شہر میں سعید کی نیوز ایجنٹ کی دکان

جسے وہ ریٹائر ہونے سے پہلے چلاتا رہا تھا اور جو سنیچر اتوار کے علاوہ ہر روز ساڑھے آٹھ بجے رات تک کھلی رہتی تھی جہاں اخبار کے علاوہ بہترین سگریٹ، سگار اور ویڈیو پر اچھی فلمیں سستی ملتی تھیں جب اس کی پرامن شخصیت اور کارگزاریوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسے جسٹس آف پیس بنا دیا گیا اور وہ چھوٹے موٹے مقدموں کے فیصلے کورٹ میں دینے لگا تو سعید کو یقین ہو گیا کہ وہ انگلش معاشرے میں جذب ہو چکا ہے لیکن اب بیوی کی وفات کے بعد شاذ و نادر کوئی اس کے گھر آتا تھا وہ خود کو ایک قلعے میں محصور محسوس کرتا جہاں ساری زینتیں بے جان محسوس ہوتیں چونکہ ان کے سراہنے والے اب نہیں آتے تھے۔ ماضی کی یادیں بھی اب خوش نہیں کرتیں کیوں کہ ان میں رنگ بھرنے والا مصور سعید کو الوداع کہہ کر ہمیشہ کے لئے جا چکا تھا۔

اور آج سعید اپنی بیوی کے مزار پر جانے کا ارادہ نہیں کرتا تو یہ دن بھی بے رنگ گزرتا جسے وہ اخبار، ٹی وی اور نیند کے سہارے کاٹتا۔

بے دلی سے دیر تک اخبار کی ورق گردانی کے بعد سعید قبرستان جانے کیلئے اٹھا۔ ہال کے دروازے کے پاس ڈاک پڑی تھی اس میں اس کے نام کا کوئی خط نہیں تھا بس اشتہارات اور رسیدیں تھیں جن پر جلدی جلدی نگاہ ڈالنے کے بعد سعید نے انہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیا وارڈروب سے جو سب سے نفیس سوٹ تھا اسے نکال کر سعید نے زیبِ تن کیا اور اوورکوٹ پہن کر قبرستان کی راہ لی سعید اسکاربرو کے جس علاقے میں رہتا تھا وہ شہر سے باہر خاموش جگہ تھی اس علاقے کا قبرستان آدھ میل کے فاصلے پر تھا وہاں وہ ہمیشہ پیدل ہی جاتا تھا دن پر بادل کا سایہ تھا اور خنک ہوا میں درختوں کے گرے ہوئے پتوں کے اڑنے کا شور۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا سعید اس چھوٹے بازار میں آگیا جہاں سڑک سیدھی قبرستان کو جاتی تھی وہ اس دکان میں داخل ہو گیا۔ جہاں سے ہفتے بھر کے کھانے کی چیزیں خریدتا تھا۔ دکان کے اندر اس کا مالک اور اس کی معاون عورت کھڑے تھے۔

"گڈ مارننگ مسٹر سعید" دوکان دار نے اخلاق سے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے پرانے گاہک سے اچھی طرح واقف تھا۔

"اچھا دن نہیں ہے" سعید کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ بولا۔ اس کے ساتھ کھڑی درمیانہ عمر کی عورت نے منہ بنا کر مصنوعی غم کا اظہار کیا جیسے بغیر دھوپ کے اس دن کا اسے شدید ملال تھا۔

"گڈ مارننگ۔ شاید شام تک دھوپ نکل آئے"

سعید نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ممکن ہے یہ صبح اور بھی خراب ہوتی میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔"

"منحنی دوکان دار جو نیلے کوٹ اور سیاہی مائل پتلون میں ملبوس تھا اس نے دریافت کیا۔

"مجھے کریسن تھیمم پھولوں کا گلدستہ چاہئے۔"

"یاد آگیا۔ یہ سارے پھول اس شہر کی بہترین نرسری سے آئے ہیں" دوکان دار کو پتہ تھا کہ اس کا پرانا گاہک اس تاریخ کو یہ مخصوص پھول خرید کر کہاں کا رخ کرتا ہے۔

پھولوں کی قیمت سعید نے ادا کی اور دکان سے باہر آکر اس نے اپنی راہ لی۔ دکان دار اسے جاتے ہوئے کچھ دیر تک دیکھتا رہا پھر اپنی معاون عورت سے بولا

"ابھی تک چھڑی کی طرح بالکل سیدھا ہے کیسے لمبے لمبے ڈگ بھر کر چل رہا ہے جیسے اس پر کوئی مصیبت نہیں آئی۔"

"زندہ رہنے کے لئے توانا بننا پڑتا ہے اور اس کی عمر کیا ہوگی؟"

"یہی ساٹھ پینسٹھ، پھر بھی کیسا اسمارٹ ہے۔ ایسے ہی مردوں سے جوان عورتیں شادی کرتے وقت عمر کا خیال نہیں کرتیں۔"

معاون عورت نے اپنے مالک کو جواب دیا

سعید ان آراء سے بے خبر آگے بڑھتا گیا۔ فٹ پاتھ پر زرد پتوں کے ڈھیر میں اس کے قدم دھنس رہے تھے۔ ساتھ کے گھروں میں درختوں کے تنوں پر سبز کائی کا غلاف تھا اور جھاڑیوں میں قمریاں خاموشی سے پھدک رہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی درخت سے ایک پتہ ٹوٹ کر سر یا گردن [illegible] تھا۔ ساتھ ہی سعید کو اس لمس کی یاد آتی جسے اپنی بیوی [illegible] کو اپنے سر یا گردن پر پا کر وہ محسوس کرتا تھا۔

[باقی صفحہ ۲۲ پر دیکھیے]



بشر نواز

ہائیکو

یہ ہائیکو ۵، ۷، ۵ کی پابندی کو ملحوظ رکھ کر کہے گئے ہیں۔ فعلن فعلن فع۔ فعلن فعلن فعلن فع۔ البتہ بعض جگہ، فع کی جگہ فعل، آیا ہے (تقطیع میں) ایک سبب خفیف بڑھتا ہے اس سے نہ آہنگ میں فرق پڑتا ہے نہ کوئی فنی سقم پیدا ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہمارے یہاں تسبیغ کا عمل عام ہے اور زحافات کی بیشی کی گنجائش رکھی گئی ہے (مگر کچھ اصولوں کے ساتھ)۔ جیسے اگر مصرع کے آخر میں مسلسل دو سبب خفیف واقع ہوں تو تنوع کے لئے فعلن سے فعلان بنا لیتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر مصرعوں کے آخری حروف سلیقے سے لائے جائیں۔ شاعر کو آہنگ کا شعور ہو تو زحافات لطف دے جاتے ہیں اور سبب کی کمی یا زیادتی محسوس ہی نہیں ہوتی۔ ہمارے یہاں میر نے یہ کام بہت کیا ہے۔ یہ دو ہائیکو دیکھئے: اپنا / اپنا اصول / جتنا تپتا موسم ہو / چھوٹے اتنا پھول / فعلن / اپنا / فعلن / اصول / فعل / ــ جتنا / فعلن / تپتا / فعلن / موسم / فعلن / ہو / فع ــ چھوٹے / فعلن / اتنا / فعلن / پھول / فعل۔ اس کے باوجود آہنگ میں کوئی گڑبڑ نہیں۔ اب تقطیع کے اعتبار سے دوسرا ہائیکو دیکھیں جس میں ہر مصرع تقطیع پر یوں اترتا ہے۔

پھولوں کا موسم / لہرایا ہے فطرت نے / رنگوں کا پرچم

پھولوں / فعلن / کا مو / فعلن / سم / فع / لہرا / فعلن / یا ہے / فعلن / فطرت / فعلن / نے / فع / رنگو / فعلن / کا پر / فعلن / چم / فع۔ یہ باتیں میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں ہائیکو کے وزن میں کچھ تبدیلی کرنا چاہتا ہوں، کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں، بس یہ کہ بجائے دو حروف کو ایک اکائی ماننے کے (جیسا کہ ہمارے عروض میں ہے) ایک حرف کو اکائی مانا جائے جیسے لفظ جب کے سیلبلز گنے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہائیکو کے پانچ سیلبلز، فعلن فعلن فع کے فاعلن ہوں گے یعنی آپ کا پہلا مصرعہ پانچ حرفی لفظ کا ہوگا یا پھر ایک لفظ سہ حرفی اور دوسرا دو حرفی۔ اس طرح ہائیکو کا دوسرا مصرعہ، حرفی لفظ پر مشتمل ہو، جس کا وزن ہے۔ اس طرح آپ کا ہائیکو یوں ہوگا! فاعلن / یمن پر / فاعلاتن / رنج اٹھا ہے / فاعلن / جل ترنگ / ــ اب اگر اس پر عنوان دے دیا جائے تو میرے خیال میں ہم جاپانی ہائیکو کی روح تک پہونچنے میں زیادہ کامیاب ہوں گے۔ کیوں کہ اس میں کفایت لفظی بھی ہے، زبان میں گرافک بھی ہے، ادریہ اسلوب چاہئے، ثلاثی اور مثلث سے الگ پیرائیہ بھی ہے۔ یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ابھی خود میرا ذہن بھی اس سلسلے میں صاف نہیں ہے اس لئے اس کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔

پھولوں کا موسم
لہرایا ہے فطرت نے
رنگوں کا پرچم

❖

ڈراس دن سے ڈر
جس دن حق میں پھولوں کے
شبنم ہو پتھر

❖

پت جھڑ کا موسم
سوکھے اڑتے پتوں کا
ہوا کہے ماتم

❖

اپنا اپنا اصول
جتنا تپتا موسم ہو
چھوٹے اتنا پھول

کیسا اپنا پن
تیز چلے جب آندھی تو
ٹوٹے ہر بندھن

❖

سوکھے جھرنے تال
اوڑھ کے اپنی خوشبو کو
جھومے کیسر کی ڈال

❖

ٹوٹا پھر تارا
دھرتی پر آکاش نے بھیجا
اپنا ہرکارا

❖

برسے پھر آنسو
دل کی زمیں سے پھر اٹھی
بھینوں کی خوشبو

سونے گھر میں شام
گرد بھری دیواروں پر
لکھوں تیرا نام

❖

کیسا فن کا مان
کوا راگ سنائے تو
کوئل بھوے تان

❖

قبروں پر کتبے
کتبوں پر کچھ نام لکھے
کیا جانے کس کے

❖

اڑی اڑی خوشبو
پھول کے کیسے یاد آئے
بیٹھی ہوگی تو



اصغر علی انجینیئر

ارنے کورٹ، دوسرا منزلہ، (ر) تو روڈ، سانتا کروز (ایسٹ) بمبئی ۵۵

اردو تنقید نئی سمت، نئی قدریں

ہر دور میں ادبی تنقید کی ایک سمت ہوتی ہے۔ اس کی کچھ قدریں ہوتی ہیں جو ادبی تنقید کی بنیاد بنتی ہیں۔ ہمیں آج کی ادبی تنقید کا بھی اس زاویئے سے جائزہ لینا چاہیئے۔ یہ بھی ممکن ہے، اور ایسا ہوتا بھی ہے کہ ایک ہی دور میں تنقید کی مختلف سمتیں اور مختلف اقدار ہوں۔ آزادی سے کچھ قبل اردو تنقید میں ہمیں دو بنیادی رجحان نظر آتے ہیں جمالیاتی تنقید اور ترقی پسند تنقید۔ جمالیاتی تنقید میں زیادہ بحث ادبی اور لسانی جمالیات سے ہوتی تھی۔ جمالیات کی سمت بھی اوپری طبقوں کی طرف ہوتی تھی یعنی جاگیردار طبقوں کا احساس جمال اور ان کے جمال کا معیار ہی ادبی جمالیات کا معیار قرار دیا جاتا تھا۔ اسی طرح اس طبقے کی زبان معیاری زبان اور اسی طبقے کے لسانی محاورے ادبی تنقید کا معیار قرار پاتے تھے۔ عوام کا معیار حسن اور ان کی بول چال کی زبان معیوب قرار دی جاتی تھی۔ عوام الناس ارذال سمجھے جاتے تھے۔ تنقید میں زیادہ تر ندرت خیال، احساس کی گہرائی، فکر کی پرواز، الفاظ کا حسن، محاوروں کا استعمال، زبان کی شائستگی کو بنیاد بنایا جاتا تھا۔ اور تنقید زیادہ تر شاعری تک محدود ہوتی تھی۔ افسانوی ادب کا وجود یا تو تھا ہی نہیں یا سے ادب کے دائرے سے خارج سمجھا جاتا تھا۔

ترقی پسند ادب ہماری صدی کی تیسری دہائی میں وجود میں آیا۔ یہ دراصل بغاوت تھی جاگیردارانہ اقدار اور اوپری طبقوں کے جمالیاتی معیار کے خلاف۔ پہلی بار ادب میں عوام کے دکھ درد کو جگہ ملی اور عوام کی زبان کو استعمال کیا گیا۔ اس بغاوت نے ظاہر ہے کلاسیکی ادبی حلقوں میں زبردست ہلچل پیدا کر دی۔ ترقی پسند ادب پر ظاہر ہے مارکسزم کا اثر غالب تھا اور اس میں ایک حد تک مذہب بیزاری کا رویہ بھی پایا جاتا تھا لیکن کئی اہم ترقی پسند مصنفین ایسے بھی تھے جو نہ مذہب بیزار تھے نہ وہ مارکسزم سے متاثر تھے۔ ترقی پسند تحریک کو ایک معنی میں ہم جمہوری اقدار کی تحریک بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے ایک بڑی کھیپ ایسے مصنفین کی پیدا کی جنہیں ملک گیر شہرت نصیب ہوئی اور اردو ادب میں ایک طرف روایتی ادب اور روایتی اقدار سے بیزاری تھی تو دوسری طرف نئے افکار اور جمہوری اقدار کی طرف رغبت۔

لیکن کل کی بغاوت آج کا عقیدہ DOGMA بن جاتی ہے اور اس میں بھی جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ بھلا ترقی پسند ادب اس کلیے سے کیسے مستثنیٰ رہ سکتا تھا۔ ترقی پسند ادب بھی دھیرے دھیرے جامد اور رو بہ زوال ہونے لگا۔ اس میں جو ایک تازگی اور کھلا پن تھا وہ ختم ہونے لگا۔ اور اس کی جگہ کمیونسٹ پارٹی کے DOGMAS نے لینی شروع کر دی۔ ادیبوں کا رول کیا ہوگا یہ بھی پارٹی نے اپنا اجارہ قرار دیا اسکے خصوصاً آزادی کے بعد، جب وطن کی آزادی کا نصب العین بھی ایک آدرش کی صورت میں نہ رہا، ترقی پسند ادب زوال پذیر ہونے لگا اس کی بغاوت کی لو مدھم پڑنے لگی۔ اور کچھ ترقی پسند ادیب سیاسی اسٹبلشمنٹ کی طرف بھی مائل ہونے لگے۔ تخلیقیت محض نعرے بننے لگی۔

یہی وہ دور ہے جب جدیدیت کا رجحان اردو ادب اور تنقید میں ابھرا۔ کچھ ترقی پسند ادیب بھی پارٹی کی گرفت سے تنگ آ کر جدیدیت کی طرف راغب ہونے لگے۔ کچھ عرصہ تک ایسا لگنے لگا کہ جدیدیت کا ریلا سب کچھ بہا کر لے جائے گا اور شاید یہ ترقی پسند ادب کی وہی درگت بنا دے گا جو ترقی پسند ادب نے کلاسیکی ادب کی بنائی تھی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اور ایک حد تک کچھ ادیبوں کی واپسی بھی ہوئی۔ دراصل جدیدیت جس شکل میں ہندوستان میں آئی وہ زبردست منفی رجحان رکھتی تھی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کا رویہ زندگی بیزار رویہ تھا۔ وہی ادب عظیم ادب ہوتا ہے جو اپنے اندر فکر کی روشنی اور مثبت قدریں رکھتا ہے۔ اور مشکل حالات میں بھی جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔

جدیدیت دراصل مغربی ممالک کی بغیر سوچی سمجھی نقالی تھی۔ یورپ میں دو عالمی جنگیں۔ ان سے پیدا شدہ تباہ حالی نے بعض ادیبوں میں زندگی کی طرف منفی رویئے کو طاقت بخشی۔ یہاں تک کہ ادب میں لغویت ABSURDITY کو بھی جگہ دی گئی۔ زندگی کو بے معنی اور مثبت اقدار کو لایعنی قرار دیا گیا۔ جدیدیت نے یہ رجحان ابھارا کہ تمام قدریں ایک دھوکا ہے۔ اور لفظوں کے کوئی معنی نہیں۔ قتل و خون ریزی اور اقدار کی نفی ہی زندگی کی ایک پائیدار حقیقت ہے۔ جدیدیت کی مغرب کی مٹی میں عالمی جنگوں کی تباہی کی وجہ سے کچھ جڑیں ضرور تھیں لیکن ہندوستان کے حالات میں آ کے ادب میں کوئی مقام ملنا نہایت دشوار تھا۔ اگر کچھ ادیبوں نے اسے اہمیت دینے کا فیصلہ کیا تو اس سے ہندوستانی سماج کی حقیقت نہیں بدل سکتی تھی اور جدیدیت کا وہی حشر ہوا جو ہونا تھا۔ اس نے ادب کو محض مایوسی پھیلانے کا آلہ کار ہی سمجھ لیا۔

یوروپ میں بھی عالمی جنگوں کی زبردست تباہی کے باوجود جدیدیت نہیں پنپ سکی تو بھلا ہندوستان میں کیسے پنپ سکتی تھی۔ یوروپ میں جیسے ہی حالات بدلے جدیدیت نے دم توڑنا شروع کر دیا۔ دوسری عالمی جنگ کی تباہی کے بعد امریکی سرمائے سے یوروپ میں تعمیر نو کا کام شروع ہوا۔ اور صنعت کاری کی رفتار پہلے سے بھی تیز ہو گئی۔ اس نے یوروپ اور امریکہ کو نئے حوصلے اور دولت کی فراوانی سے آشنا کرایا۔ مایوسی امید اور امید جلد ہی دولت کی فراوانی سے بدل گئی۔ نتیجتاً اس کا اثر ادبی رجحانات پر بھی پڑا اور ادب سے لایعنیت اور مایوسی بہت جلد مفقود ہو گئی۔ اب WAITING FOR GODOT (گودو کا انتظار) جیسے ڈراموں کی مغربی ادب کو کوئی ضرورت نہیں رہی۔

یوروپ اب جدیدیت MODERNISM سے ماورائے جدیدیت POST MODERNISM کی طرف رواں دواں ہو گیا اور پوسٹ ماڈرنزم نے ادب میں نئے رجحانات پیدا کئے۔ مایوسی اور لایعنیت کو میلوں پیچھے چھوڑ کر اب کثیریت PLURALISM کی اہمیت کا گن گان ہونے لگا۔ یاد رہے کہ مشرق میں تو پلیورلزم صدیوں سے پروان چڑھ رہا ہے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ مشرقی تہذیب کی بنیاد ہی پلیورلزم پر رہی ہے۔ دراصل ہم نے مغربی جدیدیت WESTERN MODERNISM کو اس طرح سینے سے لگایا کہ گویا ہماری عقلی نجات INTELLECTUAL LIBERATION اسی میں ہے یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم نے پلیورلزم کی اہمیت کو بھی، جو مشرقی تہذیب کی جان ہے، مغرب میں پوسٹ ماڈرنزم کے ذریعے دریافت کیا۔ آج یوروپ میں MAGIC REALISM (جادوئی حقیقت) جیسا رجحان ابھر کر آیا ہے جب کہ الف لیلہ اور سندباد جیسی داستانوں میں بھی یہ رجحان پہلے سے موجود تھا۔

آج مغربی ادب میں اس سماج میں دولت کی فراوانی اور سہولیات سے نئے خطرے پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ خطرے ہمارے ادب میں بھی تیزی سے داخل ہو رہے ہیں۔ اب مغربی سماج میں ادب محض تفریح بنتا جا رہا ہے۔ جب دولت کی فراوانی ہوتی ہے تو ادب میں تفریح کی طرف شدید رغبت پیدا ہونے لگتی ہے اور سارا زور وقتی اور فوری لذت INSTANT GRATIFICATION پر ہوتا ہے۔ وہ مصوری ہو یا رقص، شاعری ہو یا افسانوی ادب، فوری لذت ہی مقصد بن کر رہ جاتا ہے۔ موسیقی نے کیا صورت اختیار کر لی ہے یہ ہم ایم ٹی وی پر روز ہی دیکھ رہے ہیں۔ سیٹلائٹ ٹی وی نے سستی تفریح کی ایک زبردست صنعت مہیا کر دی ہے اور رائٹر کو اس میں معاوضہ بھی بہت ملتا ہے۔ آج ادبی رجحانات کو ایسے سستے تفریحی ادب سے سخت خطرہ ہے ادب کی تجارت اس بڑے پیمانے پر کبھی نہیں ہوئی جیسی کھلے عام آج ہو رہی ہے حکومت کی لبرلائزیشن (کھلی چھوٹ) کی پالیسی نے اس خطرے کو اور تقویت دی ہے۔

متوسط طبقہ جو مثبت اقدار کا حامل ہوتا ہے اس فوری لذت کی طرف کھنچ رہا ہے اور اب وہ ایسا ہی ادب چاہتا ہے۔ اس نئے رجحان کا مقابلہ آسان نہیں ہے۔ ہمارے ملک کے حالات نہایت پیچیدہ اور کئی تضادات کے حامل ہیں۔ ایک طرف سرمائے کو کھلی چھوٹ کی پالیسی سے دولت کی فراوانی بڑھ رہی ہے تو دوسری طرف غربت اور قیمتوں میں ہوشربا اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک دور ایسا تھا جب متوسط طبقہ احتجاجی ادب کی طرف راغب تھا اور مثبت قدروں کا حامل لیکن یہ طبقہ اب تیزی سے فوری لذت کی طرف راغب ہو گیا ———

——— اسے نہ جمالیات اور حسن پرستی کا احساس ہے نہ بنیادی اقدار کا۔ انسانیت کا فروغ اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ دولت کی فراوانی اور دولت کو فوری لذت کے لئے استعمال ہی اس کا مرغوب مشغلہ بن کر رہ گیا ہے۔

آج کی تنقید کو محض ساختیت، جدیدیت جیسی بحثوں میں پڑنے کے بجائے ہماری پیچیدہ سماجی حقیقتوں کا جائزہ لے کر ...

مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ پائیدار اور عظیم ادب نہ ساختیت STRUCTURALIZING کی بحث سے پیدا ہوتا ہے نہ فوری لذتیت سے ۔ پائیدار اور عظیم ادب کی بنیاد فکر کی روشن خیالی ، زندگی کی طرف مثبت رویئے ، بنیادی اقدار کی وکالت اور انسانی کردار کی داخلی کیفیت اس کے کرب و انبساط کی صحیح ترجمانی اور نفسیاتی دروں بینی سے مکمل واقفیت پہ ہوتی ہے ۔ عظیم ادب میں استحصال جبر اور ظلم کے خلاف احتجاج کی شدت بھی ضروری ہے ۔ بشرطیکہ اسے محض DOGMA یا جامد نظریہ نہ بنایا جائے ۔ عظیم ادب ہم میں دوسروں کے کرب و اضطراب کا شدید احساس بھی پیدا کرتا ہے ۔ انسانی کردار اور اس کا برتاؤ کسی نظرئیے کی گرفت میں نہیں آتا ۔ غالب جیسے عظیم فن کار نے ہر انسان کو ایک ورق تازہ قرار دیا ہے ۔ ایک فن کار اپنے فن کے ذریعے اس کردار ، اس کے داخلی کرب مسرت اور احساسات کو کامیابی سے اپنے فن کی پکڑ میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود فن کار میں دوسروں کے کرب اور دکھ درد کی طرف شدید حسیت اور ہمدردی ہو ۔

آج ہمارا سماج جن حالات اور تضادات سے دوچار ہے ، اس کے پیش نظر ہمیں فوری لذت فراہم کرنے والے ادب کی ضرورت نہیں جو صرف دولت مند لذت پرستوں کی ضرورت کو ہی پورا کرتا ہے ۔ بلکہ ایسے ادب کی ضرورت ہے جس میں سماج کے پس ماندہ طبقوں کے دکھ درد کا احساس ہو ، موجودہ حالات کے خلاف احتجاج ہو ۔ احتجاجی ادب آج بھی ہمارے لئے نہایت RELEVANT اور ضروری ہے ۔ ہمارے نقادوں میں بھی یہ SENSITIVITY بہت ضروری ہے ۔ آج ہمارے نقاد زیادہ تر اپنا وقت ان نظریوں پر (جیسے ساختیات وغیرہ) بحث کرنے میں ضائع کرتے ہیں جنہیں یورپ پیچھے چھوڑ کر آگے نکل چکا ہے ۔ ان نقادوں کو جو یوروپی اور دیگر مغربی تنقیدی رجحانات کے بڑے عالم ہوتے ہیں اور نظریوں پر بحث کرنے میں اپنا کمال دکھاتے ہیں ۔ ہماری سماجی حقیقتوں سے بے خبر نہ سہی انہیں نظر انداز ضرور کرتے ہیں ۔

عظیم ادب وہی ہے جو زندگی کی عظمت کو تسلیم کرتا ہو اور زندگی کو کسی بھی نظرئیے کی بیڑی نہ پہناتا ہو ۔ زندگی ہر اعتبار سے خود مختار ہے اور اس خود مختاری میں بھی بڑی منہ زوری بھی ہے ۔ اس حقیقت کا عرفان تخلیقی ادیب کو بھی ہونا چاہئے اور ادب کے نقاد کو بھی ۔ یہ نہ محض حقیقت نگاری کی پکڑ میں آتی ہے نہ جادوئی حقیقت کی پکڑ میں آتی ہے ۔ اسے شاید ہر ہیئت کے استعمال کے بعد بھی گرفت میں نہ لیا جا سکے ۔ نقاد میں اس شعور کا ہونا بہت ضروری ہے ۔ *

بقیہ صفحہ ۱۸ ۔ ٹوٹا ہوا پتا

قطار در قطار مزاروں کے درمیان چلتا ہوا سعید اپنی بیوی کی قبر کے پائینتی آکھڑا ہو گیا ۔ سفید پتھروں کی دیوار میں گھری قبر کی درمیانی زمین پر گھاس رات کی بارش کی وجہ سے بھیگی ہوئی تھی ۔ جہاں قبرستان کی حدیں تھیں وہاں بیچ میں سیکا مور اور ے پلس کے برہنہ درخت کھڑے تھے ۔ ان کے پتے جھڑ گئے تھے اور قبروں نیز پگڈنڈیوں پر اڑ رہے تھے ۔ فضا میں وہ مہک بسی تھی جو بھیگی جھاڑیوں اور گیلی مٹی سے اٹھ رہی تھی ۔ سعید نے گلدستے کو قبر کے وسط میں رکھ دیا اور گزشتہ ہفتے کے پرانے پھولوں کو سمیٹ کر اس پلاسٹک بیگ میں ڈال دیا جس میں وہ گلدستہ لایا تھا ۔ وہ دیر تک فاتحہ پڑھتا رہا ۔ میاں بیوی نے اپنے مذہبی شعائر کو برقرار رکھا تھا ۔ اگر دنیا میں اتنے سارے مذاہب ہو سکتے ہیں تو ایک مکان میں دو مختلف عقیدے بغیر کسی ٹکراؤ کے محترم بنائے جا سکتے ہیں ۔ سعید اور لوسی نے شادی سے قبل عہد کیا تھا جسے دونوں نے نبھایا ۔ فاتحہ ختم کرنے کے بعد سعید حسرت سے بیوی کے مزار کو چند لمحوں کے لئے تکتا رہا ۔

" اب ہمارے یہاں کوئی نہیں آتا لوسی ۔ ہمارا بیٹا بھی نہیں آتا ۔ تم تھیں تو بہت سارے لوگ آتے تھے ۔ "

سعید نے سرگوشیوں میں شکایت کی اس کے آنسو نکلے ۔ قریب کی جھاڑی سے ایک چڑیا اچانک اڑی اس کے اڑنے کی آواز اس کائنات کی گواہ تھی ، جس میں حرکت تھی صدائیں تھیں ۔ زندگی کے سکھ اور دکھ تھے ۔ *



ارشد محمود ناشاد

نگاہیں خواب منظر دیکھتی ہیں
مگر رستے میں دیواریں کھڑی ہیں

دیئے کی لَو مسلسل بڑھ رہی ہے
ہوائیں لڑتے لڑتے تھک گئی ہیں

وہاں میری گواہی کون دے گا
جہاں سچائیاں خوں چاٹتی ہیں

شجر بے پیرہن ہونے لگے ہیں
بہاریں خونِ تازہ مانگتی ہیں

پرانی پگڑیاں پیروں تلے ہیں
نئی نسلیں بغاوت کر رہی ہیں

● محلہ محمود نگر، مرزا ذوقہ، چونگی نمبر ۳ - اٹک کینٹ (پاکستان)



شاہد میر

پھول کھلا تو ہو گیا گھنا شجر آباد
جیسے اک مسکان سے سارا گھر آباد

اجلے تاروں کا نگر مٹی پیکر آباد
کس کے قدموں سے ہوئی راہ گزر آباد

سونا پن برسوں کا ہے لمحہ بھر آباد
میرے احساسات کا شہر نہ کر آباد

اس کے چہرے سے ہوئی میری نظر آباد
اجلے سورج نے کیا سارا نگر آباد

آنکھوں میں اک خوف ہے دل میں ڈر آباد
کہنے کو تو ہے میاں میر اگھر آباد

بیتے دن پرواز کے اب ہے گھر آباد
اڑتی چڑیا کے ہوئے جب سے پر آباد

سر میں سمائی تھی طلب کر لینگے گھر آباد
قدموں کے نیچے مگر رہا سفر آباد

جب سے کشتی ہو گئی پانی پر آباد
گم سم سے دریاؤں کی لہر لہر آباد

● کرشی وگیان کیندر، سروہج - ۴۶۴۲۲۸ (ایم پی)



نظام ہاتف

سجانے کیا کیا حشر، کیا محشر بپا ہوتے تھے مجھ
اس کے سب خفیہ اشارے ترجمہ ہوتے تھ

خوش دلی سے اس طرح ردِ عمل دیتا تھا
اس کے عرشی خواب سب تحت الثریٰ ہوتے تھ

تھی مرے کشکول میں کیا چہرگی بے چہرگا
جو بھی تھے روپوش چہرے رونما ہوتے تھ

مجھ میں اک امت تھی اور کنعان سا بیٹا
پھر بھی دستِ بددعا زنجیر پا ہوتے تھے مجھ

بحر میں تیرتا تھا بے نیازِ لمس
کیسے مد و جزر تھے ضربِ عصا ہوتے تھ

چار جانب دوڑتے رہنے کا عادی ہو گیا
جو بھی منصوبے تھے اس کے قہقہہ ہوتے تھ

مجھ میں گنجائش بھی تھی عفو و کرم کی
فیصلے جو سخت تھے سارے خطا ہوتے تھ

حدِ امکاں کی بھی جو ہے حدِ امکاں
آگ کے دریا گزر کر آبلہ ہوتے تھے مجھ

● ۱۴۴ - بی، ریلوے اسٹیشن کالونی - مراد

شرون کمار ورما

۱۱/۱۸۰، کوچہ ملیاں، امرت سر-۹ (پنجاب)

کڑواہٹ

راجن تمام کتابیں رکشہ میں لدوا کر گھر لے آیا تھا اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ پانچ سو کتابیں رکھی کہاں جائیں کرائے کے اس ڈیڑھ کمرے کے مکان میں اتنی جگہ تھی بھی کہاں ۔ فرش پر بوری بچھا کر تمام کتابیں قرینے سے رکھ دی گئی تھیں اور وہ سامنے بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا جیسے کسی عزیز کی لاش ہو وہ شوق وہ بے صبری جو کہانیوں کے انتخاب، ترتیب، کاغذ کی خرید، کتابت اور طباعت، پروف ریڈنگ اور جلد بندی تک لہو گرمائے تھا اب جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا وہ پیش لفظ جو ایک معروف و ثقہ نقاد کی خوشامد، چاپلوسی اور ناز برداری کے بعد، بمشکل تمام، ڈیڑھ صفحے تک پھیل سکا تھا ۔ اس پر ہنس رہا تھا ۔ اگر اس تحریر میں سے افسانہ نگار کا نام نکال دیا جاتا تو کسی بھی افسانہ نگار کی کتاب میں شامل کیا جا سکتا تھا ۔ اس نے سوچا یہ وہی سہرا ہے جو پیشہ ور شاعر دولہا اور اس کے اہل خاندان کے نام بدل بدل کر بیچتے رہتے ہیں ۔

کتابت اور طباعت کے دوران اس کے دوست نے مشورہ دیا تھا ۔

" بھابھی ٹھیک کہتی ہیں اس رقم سے فریج خریدا جا سکتا تھا گھر میں فریج کی ضرورت زیادہ ہے ۔ پہلے سے کتاب چھپوا رہے ہو، نکاسی کے بارے میں بھی سوچا ہے ۔

اسے دوست کی بات اچھی نہیں لگی تھی ۔ کتابوں کی بکری بھی مسئلہ ہو سکتا ہے یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا ۔ صاحب کتاب ہونے کا بھوت جو سوار تھا ۔ یہاں تک کہ اس نے بیوی بچوں کی جائز مانگیں بھی نظر انداز کر دی تھیں ۔ جب بیوی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی تو اس نے ناگواری اور تلخی سے ...... کہا تھا ۔ کیا میں اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتا خاوند اور باپ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آدمی اپنے لئے مر جاتا ہے ۔ وہ بیچاری اس کا مونھ دیکھتی رہ گئی تھی ۔ تب اس کے دوست نے کہا تھا ۔

" گھر جلا کر روشنی کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی صبح کا انتظار کرے "

راجن کو اس پل محسوس ہوا تھا جیسے سب اس کے دشمن ہوں اور وہ اب کتابوں کے سامنے بیٹھا یہی سب سوچ رہا تھا ۔ اس کا دوست جا چکا تھا ۔ بیوی چائے کا کپ دے گئی تھی ۔ چائے پیتے ہوئے اس نے سوچا ۔ کہاں اور کیسے بکے گی یہ کتابیں ۔ کتابیں سجاتے ہوئے اس کے دوست نے کہا تھا

" یار مقدمہ لکھوانے کے بجائے تم کتاب پر مقدمہ چلوا لیتے ۔ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ۔ "

" دل جلانے والی باتیں مت کیا کر ہر وقت، کبھی تو سنجیدہ مشورہ دے دیا کر، تو کیسا جانے ادب "

" بڑا بے ادب ہوں " اور وہ چلا گیا تھا

راجن بار بار کتابوں کو چھو کر سرورق کی ملائمت محسوس کر رہا تھا اس کی بیوی قریب سے گزری تو راجن نے روک کر کہا ۔

" اچھا اب یہ مونھ پھلانا بند کر دو ۔ میں تم پر سوت نہیں لے آیا سوچ کر بتاؤ کتابیں رکھی کہاں جائیں

" ایک ترکیب ہے ۔ "

" جلدی بتاؤ ۔ "

" میں بچوں کو لے کر مائکے چلی جاتی ہوں ۔ "

" پھر وہی کانٹے چبھونے لگیں جیسے میں نے کچھ چھین لیا ہے تمہارا ہے کیا ہے میرے پاس جو چھینوں گے ۔ " وہ مایوسی سے

بولی ... ببلو سوئیٹر کے لئے کہہ رہا ہے ، پنکی اسکول یونیفارم مانگ رہی ہے ، یہ ۔ اس نے پرانی بدرنگ ساڑی کا پلو پھیلا دیا ۔

"وہ سب بھی ہو جائے گا ۔" راجن نے کسی مجرم کی طرح کہا ۔

"مسئلہ کتابیں سنبھالنے کا ہے" اس نے کتابوں کی طرف دیکھا انکا سرورق خوبصورت اور معنی خیز تھا ۔ پشت پر اس کا نام سنہری حروف میں چمک رہا تھا اس کی کہانیوں کی روح جیسے سرورق میں سمٹ آئی تھی ۔

پاس کھڑے دونوں بچوں نے رائے دی کہ کتابیں بستروں والی پیٹی میں رکھ دی جائیں ۔

"اور بستر وغیرہ چھت پر پھیلا دوں ۔" بیوی نے کہا

"تمہیں ایک آرٹسٹ ، ایک فنکار کے جذبات کا ذرا بھی احساس نہیں ۔ کہانی کار کے لئے اس کی تخلیقات اولاد سے کم نہیں ہوتیں ۔

"آرٹسٹ کو بیوی بچوں کے جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہیئے ۔"

اسے بیوی کی یہ بات بری تو لگی ۔ لیکن وہ جھگڑا بڑھانا نہیں چاہتا تھا ۔ اس کی یہ کہانیاں ہر حلقۂ ادب میں پسند کی گئی تھیں ۔ بہت سے تعریفی خطوط آئے تھے ۔ مدیر حضرات نے فرمائش کرکے اپنے رسائل کے لئے کہانیاں منگوائی تھیں ۔ کتاب چھپوانے میں بھی اس نے عجلت سے کام نہیں لیا تھا ۔ دس برس کی مسلسل محنت اور لگن کا نتیجہ تھی یہ کتاب ۔ ورنہ کون یاد رکھے گا اسے ادب میں ۔

"کسی بکسیلر سے بات کرو ۔" بیوی نے صلاح دی

"ہمارے صوبے میں تو اب اردو پڑھتا کوئی نہیں کچھ پرانے لوگ رہ گئے ہیں جو اخبار سے آگے نہیں بڑھتے ۔"

"تو تم نے اس زبان میں لکھا ہی کیوں ، اور کیا سوچ کر اتنی کتابیں چھپوا لیں ۔

"دوسرے صوبے تو ہیں ۔"

"تو کیا دلی ، لکھنؤ جاؤ گے کتابیں بیچنے ۔"

اس نے بیوی کی طرف دیکھا اور سوچا ۔ یہ عورت کہتی تو ٹھیک ہے ۔ لیکن ذرا کھردرے اور کڑوے انداز میں ۔ شاید وہ اسے فضول خرچی یا اپنی حق تلفی سمجھتی ہو ۔ ایسے لوگ بھی تو ہیں جو اپنی کل کمائی جوئے ، شراب اور عورت کے چکر میں برباد کر دیتے ہیں ۔

"کروں گا کچھ نہ کچھ ۔"

وہ اپنے ایک رشتہ دار سے جو دکان بیچ کر کینڈا جا رہا تھا ، ایک ریک لے آیا جسے اسٹور کے کونے میں رکھ کر تمام کتابیں سجا دی گئیں ۔ اب سوال تھا کتابیں بیچنے کا ۔ اگر یہ قارئین تک نہیں پہنچیں تو کیا فائدہ ۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد کتاب کی قیمت پچاس روپئے رکھی تھی ۔ ایک پبلشر نے تو اسی روپئے تجویز کئے تھے ۔ بات معقول تھی ۔ اگر ساٹھ فی صد کمیشن دیا جائے تو صرف بیس روپئے اس کے ہاتھ آئیں گے ۔ مفت بھیجی جانے والی کتابیں تبصرے کے لئے دی جانے والی کتابیں ۔ اور ان پر بڑھتے ہوئے ڈاک خرچ کے بعد مشکل سے اپنی رقم بچتی تھی ۔

"ایک بار تو باہر جانا ہی ہوگا ، تاجران کتب سے ملنے ۔" اس نے جیسے خود سے کہا ۔

"بغیر ٹکٹ کے سفر کرو گے یا قرض لے کر ۔"

"تم مجھے جیل بھجوانا چاہتی ہو ۔"

"چھٹی پتر لکھ کر بات چلاؤ ۔"

یہ تجویز اسے معقول اور مناسب معلوم ہوئی ۔ اس نے تقریباً ہر بڑے پبلشر اور کتب فروش کو خط لکھے ۔ صرف ایک کا جواب آیا جوابی پوسٹ کارڈ نہ آنے کی صورت میں ہم ۔ جواب دینے سے قاصر ہیں ، تب اس کے دوست نے کہا

"یار کہانی کار ، تیرے لئے یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا ۔ دکان دار کے لئے صرف تجارت ہے ۔ تاجر کو بہرحال منافع چاہئے ادب بیچے یا بینگن ۔

"تم دوست ہو کہ ۔۔۔"

"سچا دوست ، بھلا چاہنے والا ، نہ صرف تمہارا بلکہ تمہارے بیوی بچوں کا بھی ۔"

"تم لوگ فن اور فنکار کی اہمیت نہیں سمجھتے سماج میں ۔"

"بے وقوفی کو 'فن' نہیں کہتے ۔ گھر میں ان کتابوں پر دیمک اور کاکروچ دعوت اڑائیں گے ۔ جاکر کتب فروشوں سے ملو" "اس کے لئے کافی رقم درکار ہوگی ، کرائے اتنے بڑھ گئے ہیں ۔"

"یہ تمہیں پہلے سوچنا چاہئے تھا ۔ ویسے میرے پیارے فنکار یہ تمہاری اردو اکاڈمیز ہیں، دوسرے سرکاری ادارے ہیں، لائبریریز ہیں، کس مرض کی دوا ہیں یہ سب ۔"

"اپنے اپنے ذاتی مرض کی ۔"

"سیاست ہی تو نہیں آتی مجھے ۔"

"تو جان من سیکھو، کوئی سفارش ڈھونڈو، خوشامد کرو چکر چلاؤ کوئی، اردو ادب و زبان کی ترویج و ترقی کے لئے کچھ تو کرو، کہیں نقب لگاؤ، کوئی گھپلا گھٹالا کرو، نرے ادب سے تو کچھ نہیں ہوگا ۔ مرزا غالبؔ کی طرح ۔ ہزاروں خواہش لئے اس جہان فانی سے کوچ کر جاؤں گا ۔

"میری پہونچ سے باہر ہے یہ سب کچھ، اور پھر میں نے تو ان باتوں کے خلاف لکھا ہے ہمیشہ ۔ مجھ پر تو الزام بھی ہے ۔ (ESTABLISH MENT) کے خلاف لکھنے کا، میں خوشامد چاپلوسی، رشوت، خواہش پروری کو سماج اور انسانیت کے لئے کلنک سمجھتا ہوں ۔"

"تو میری جان، دس بارہ کلو شکر میں ان کتابوں کا مربہ ڈالو اور ہر صبح نہار منہ بکری کے دودھ کے ساتھ کھاؤ، افاقہ ہوگا ۔ بیوی بچوں کو بھی کھلاؤ ۔ تمہارے آدرش اور مہان ہو جائیں گے یہ جو تم نے اتنے بڑے بڑے اصول بنا رکھے ہیں یہ سب دوسروں کو بتانے کے لئے ہیں عمل کرنے کے لئے نہیں،

"تم مجھے اس طرح ذلیل کروگے تو تمہاری قسم کتابوں کو آگ لگا دوں گا ۔"

"بہت اچھا کروگے ۔

"تم میرے دشمن ہو، جانی دشمن "

"میں دشمن ہوں کہ دوست، اس کا پتہ بعد میں چلے گا اس وقت جب بصد خلوص و احترام مفت بھیجی جانے والی کتابوں کے علاوہ تمام کتابیں گرد کی تہوں میں دبی تمہارا منہ چڑائیں گی اور تم ان کا ماتم کروگے ۔ پاگل ہو جاؤ گے تم انہیں دیکھ دیکھ کر ۔"

راجن خاموش رہا، سوچا جو ہوگا دیکھا جائے گا، ادبی طور پر زندہ رہنے کے لئے ادھر ادھر بکھری کہانیوں کا کتابی صورت میں محفوظ کر دیا جانا ضروری تھا ۔

اس نے دو دو کتابوں کے پیکٹ بنائے اور ان جرائد کو برائے تبصرہ، بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیج دیں ۔ جو اس کی کہانیاں خوش ہو کر شائع کرتے تھے ۔ کچھ کے جوابات آئے کہ باری آنے پر تبصرہ شائع ہو جائے گا ۔ دفتر میں کتابوں کا ڈھیر لگا ہے ۔ یعنی ملک میں آبادی کی طرح ادب بھی دھڑا دھڑ پیدا ہو رہا تھا ۔ ایک آدھ جگہ چند سطری تبصرے شائع ہو بھی گئے ۔ ادبی برادری اور دوستوں نے نجی خطوط میں کتاب کی تعریف بھی کی ۔ کچھ جرائد اس دوران بند ہو گئے ۔ ماہنامے سہ ماہی ہو گئے

اپنے دوست سے مزید ادھار لے کر پچیس کتابوں کا بنڈل بنا کر وہ قریبی شہر میں گیا جہاں پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور کتب فروش تھے ۔ دھوپ اور بنڈل کے بوجھ نے اسے تھکا دیا پھر بھی وہ خود کو گھسیٹتا ہوا ایک اخبار کے دفتر میں پہونچا سیکورٹی گارڈ نے اندر ہی نہیں جانے دیا بڑی منت سماجت کے بعد خاتون (RECEPTION IST) تک رسائی حاصل ہوئی ۔ اس نے انٹرکام پر مالک سے بات کی ۔ اس نے کہہ دیا کہ اخبار کا ایسی کتابوں سے کوئی تعلق نہیں ۔

وہ بنڈل اٹھائے پھر سڑکوں پر آ گیا ۔ کتابوں کی ایک دوکان میں گیا اپنے اور کتاب کے بارے میں تفصیل سے بتایا

"کسی کورس میں شامل ہے ۔"

"نہیں ۔ خالص ادبی کتاب ہے، کہانیوں کی "

"کہانیاں ۔ دکاندار نے خلال کرتے ہوئے کہا ۔ "کوئی نہیں خریدتا "

پھر وہی گرمی، دھوپ، پسینہ اور پیاس ۔ ہر ایک دوکان میں ۔ امتحان سے دس منٹ پہلے صابن سازی، امیر بنیں، کالا جادو اور ڈرائیونگ سیکھیں اور شیخ چلی کے لطیفے قسم کی کتابیں بھری تھیں ۔ ریڈیو اسٹیشن پر بھی وہ سیکورٹی کا چکر، پاس کے کمرہ اردو سیکشن میں گیا ۔ کمرہ خالی تھا ۔ پنکھا، کولر، ٹیوب لائٹ، ٹیبل لیمپ روشن تھے جس میں ریڈیو پر اعلان ہو رہا تھا ۔

"بجلی ضائع نہ کریں یہ دیش کی ترقی کے لئے ضروری ہے ۔

آخر ایک اونگھتے ہوئے چپراسی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کئی برس سے یہاں اردو کا کوئی آدمی نہیں آیا۔ میرا کھیت میرا گاؤں کے انچارج کو یہ عہدہ سونپا گیا ہے اور یہ کہ وہ اردو زبان نہیں جانتا

اور یہ کہ ان دنوں وہ طویل چھٹی پر تھا، فصل کی کٹائی کے سلسلے میں۔ وہاں سے وہ ٹی وی سینٹر گیا۔ فاصلے نے اس کی جیب ہلکی اور سر بھاری کر دیا تھا۔ وہی سیکیورٹی، پاس اور انچارج کی تلاش وہ اسے کینٹین میں ملا۔ ابھرتے ہوئے شاعروں کے ساتھ جو دیوناگری پسی میں غزل لکھتے تھے اور گھبل پڑھتے تھے

"میں صابر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

جس شخص نے ٹھنڈے مشروب کی بوتل لبوں سے ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مشکل سے کوئی ادبی شخصیت نہیں بلکہ شیئر دلال لگتا تھا۔

"فرمایئے۔ میں ہی ہوں۔"

راجن نے پھر وہی رام کہانی دہرائی۔ اس دوران وہ دونوں تک بند مسکراتے رہے اور وہ ان دونوں کو جانتا تھا۔"

"کبھی نام نہیں سنا آپ کا۔ پروڈیوسر نے اسے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔

"جی۔! راجن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا وہ ان چھوٹے بیوروکریٹس کے گھٹیا ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف تھا اس نے میز پر رکھے گفٹ پیکس کو دیکھا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"ہم اس طرح کتابوں پر تبصرہ ٹیلی کاسٹ نہیں کرتے" پروڈیوسر نے بے نیازی سے کہا۔"

آپ تھرو پروپر چینل کتابیں بھیجئے۔ ڈائریکٹر ہمارے سیکشن کو ریفر کرے گا ہم انہیں منظور شدہ ممبر کو بھیج دیں گے اگر قابل تبصرہ سمجھی گئیں تو۔ یعنی ماہرین کی کمیٹی ان پر غور کرے گی۔ یہ سرکاری ادارہ ہے۔ یہاں ہر کام طریقے اور اصول کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

راجن نے بنڈل اٹھایا اور پھر سڑک پر آ گیا۔ خود کو گھسیٹتا ہوا جب وہ ریلوے اسٹیشن پہنچا تو گاڑی پلیٹ فارم پر آ چکی تھی۔ وہ نڈھال سا اندر جا بیٹھا۔ گاڑی چلی تو اس نے آنکھیں موند کر ستانے کی کوشش کی ابھی طبیعت ذرا سنبھلی ہی تھی کہ بالٹی میں چنے کی دال، پیاز، ٹماٹر اور نیبو سجائے ایک لمبا پتلا شخص آ گیا۔ پہلے تو کسی نے ادھر توجہ نہیں دی جب ایک مسافر نے دال خریدی تو دیکھا دیکھی دوسرے بھی لینے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری بالٹی خالی ہو گئی۔ اور وہ راجن کے سامنے والی خالی سیٹ پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر ذرا سا مسکرایا پھر جواب تھپاکر آنکھیں موند لیں۔

جب گاڑی منزل مقصود پر پہونچی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ رکشہ اور دوسری سواری والوں نے ایک دم کرایہ بڑھا دیا۔ ایک تو گاڑی لیٹ تھی، دوسرے بھیڑ۔ اس نے سوچا استحصال کہاں نہیں ہوتا۔ دنیا ہمدردی نہیں، استحصال کے پہیوں پر چلتی ہے وہ رکشہ والوں کے ہاتھوں پریشان ہو رہا تھا کہ کسی نے پکارا۔

"بابو جی آجاؤ میرے ساتھ۔" وہی دال والا ایک تھری وہیلر میں اپنا سامان رکھے اسے اشارے سے بلا رہا تھا۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں نے کچھ دن ہوئے آپ کے محلے میں مکان خریدا ہے۔ آیئے بیٹھئے

وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا

"بکی نہیں کتابیں۔" اس نے پھٹے کاغذ سے جھانکتی کتابیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ میری تو چار بالٹیاں دال بک گئیں۔"

راجن نے خالی بالٹی میں چند دال کے دانے دیکھتے ہوئے سوچا۔ آئندہ وہ ایسی فاش غلطی نہیں کرے گا۔ ✱

بقیہ صفحہ ۳۵ سے شرط

سبب صرف اپنی آواز اور بے تکلفی کے انداز سے ہی پہچانا جا سکا، جو نئی پہچان اس نے اپنی بنائی تھی، وہ اس کے پاس ہی متھہرا رہا۔

دوسرے دن صبح وہ اپنے دوست کی لانڈری سے اپنی مخصوص خاکی پینٹ اور کھدر کی ہری شرٹ پہن کر اس کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا تو مسلسل بس ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا۔

"زندگی گزارنا اتنا مشکل نہیں ہے .... زندگی گزاری جا سکتی ہے .... بشرطیکہ .... بشرطیکہ ...." ✱

دانشوروں کے لئے ایک نظم

ابھی یہیں تھا، بس کچھ دیر پہلے تک تو یہیں تھا
یہیں میرے سامنے کرسی پہ بیٹھا
میری کسی بات پہ ہنس رہا تھا
کہاں ہے! یکایک وہ کہاں گم ہو گیا ہے!!
میں کمرے میں آتا ہوں
بجلی جلاتا ہوں
بستر میں، تکئے میں، چادر کی شکنوں میں،
مسہری کے نیچے
کرسی پہ، ٹیبل پہ، ٹیبل پہ رکھی ہوئی نوٹ بک،
پھیلے ہوئے کاغذوں،
قلم اور دوات میں
کھڑکی میں، کھڑکی کے پردوں میں، پردوں کے پھولوں میں
چھت میں، چھت کے پنکھے میں، پنکھے کے اڑتے پروں میں
دیوار میں، دیوار کے طغروں میں، طغروں کی دھولوں میں
طاق میں، طاق میں رکھی ہوئی موم بتی میں
موم بتی کے پگھلے ہوئے موم میں
ماچس میں، ماچس کی تیلی میں، تیلی پہ چپکے ہوئے
کالے بارود میں
کیا بتاؤں! کہاں سے کہاں تک اسے ڈھونڈتا
ہوں، ملتا نہیں ہے!

یاد آتا ہے،
کل رات کے آخری پہر نے جب شب سعل کا جگراتا
آنکھوں پہ رکھا تھا
نظم لکھی تھی میں نے!
دل کو بھائی نہیں
اس نے پھینک دی تھی
ڈسٹ بن میں
شاید اس میں کہیں ہو
ڈسٹ بن کو الٹتا ہوں
چھوٹے بڑے ان گنت ردی کے ٹکڑوں
میں اسے ڈھونڈتا ہوں۔
نظم تو مل جاتی ہے لیکن......
خیال آتا ہے
کل دوپہر لائبریری میں
شاعروں کی، ادیبوں کی
پرانے نئے دوستوں دشمنوں کی کتابیں پڑھی تھیں
کہیں ان میں تو وہ.....
بھاگتا ہوں
لائبریری کی ساری کتابیں الٹتا پلٹتا ہوں
ساعات تبدیل ہوتی ہیں
رات ڈھلتی ہے، سورج نکلتا ہے
لائبریرین، لائبریری میں گھستا ہے

میں اس کے پاس جاتا ہوں
اس کی اچکن میں، اچکن کی جیبوں میں
عینک میں، عینک کے پیچھے چھپی اس کی کمزور آنکھ میں
داڑھی میں، داڑھی کے بالوں میں
بالوں کے پیچھے چھپے اس کی بیوی بچوں میں
ہر جگہ ڈھونڈتا ہوں
لیکن وہی.....
تبھی تازہ، پرانی ہواؤں کے جھونکوں کے مانند
لائبریری میں کالج کے لڑکے اور ان کے لکچرر بھی آ جاتے ہیں
سینے میں امید کی لہر ہوتی ہے روشن
میں ان کے پاس جا کے ان کو اس کے بارے میں بتاتا ہوں
وہ دیر تک اس کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں
کیا نام ہے! ولدیت! ناک نقشہ! اس کا حلیہ!
محلہ! گاؤں! قصبہ! شہر، ملک!،
مذہب! قبیلہ! لباس اور قد!
صبح سے شام ہو جاتی ہے
وہ اس کے بارے میں ڈسکس ہی کرتے رہتے ہیں
یک بارگی کانپنے لگتا ہوں
میں غصے میں یوں کانپنے لگتا ہوں
کہ دیوانگی کے کسی ایک پل میں، ان سب کے آگے
اپنے بدن کے سبھی کپڑے اتار کے پھینک دیتا ہوں
وہ مجھ پہ ہنستے ہیں، ہنستے ہی چلے جاتے ہیں
میں بھاگتا ہوں، وہ بھی پیچھے مرے بھاگتے ہیں
میں رکتا ہوں، وہ بھی پیچھے مرے رکتے ہیں
یکایک ایک لڑکے کو
پتھر سمجھاتا ہے کچھ!
لڑکا زمین سے ایک پتھر اٹھا کے
مرے سر کو اپنا نشانہ بناتا ہے
اور پھر دیر تک
گونجتے قہقہے اور سنگ ملامت کی بارش
میں نڈھال ہو کے زمین پہ بکھرتا ہوں
تبھی کوئی چپکے سے
بالکل میرے پاس آ کے
کانوں سے مس کر کے
جس کا سایہ ہے، بدن ہے، نہ آکار ہے
میرے ماتھے پہ بوسہ سجا کے
بڑے پیار سے پوچھتا ہے
کسے ڈھونڈتے ہو
کیا کھو گیا ہے
میں اسے کیا بتاؤں!
کیا وہ خود نہیں جانتا ہے
خدا کھو گیا ہے!



محمد صلاح الدین پرویز

دعائے قنوت کا برقعہ

[افتخار امام صدیقی کیلئے ایک نظم]

افتخار امام!
تم اپنی آنکھیں کیوں دیکھنا چاہتے ہو!
آئینے اور دنیا کے چکر میں کس لئے پڑتے ہو!
تمہاری آنکھیں تو ہم دیکھ رہے ہیں،
مُردہ دیوتا کا الاپ آکاش
عزل دھرتی پہ سرسوتی کے پاؤں کی چھن چھن
نا معلوم مدت تک بنجر ہوتی ہوئیں،
چڑیلوں کی کوکھیں، بچھڑوں کے کوبے
آئندہ کی نیندوں پہ پھیلے ہوئے کہاسے
پرانے خوابوں کے ملبے پر اگے ہوئے
درویشوں کے نشیمن
آنکھوں میں موتیابند آتا ہے ہوئے
دعائے قنوت کا برقعہ اوڑھے
باسپٹل جاتی خدیجہ جیسی تمہاری ماں!
افتخار امام!
تم اپنی آنکھیں کیوں دیکھنا چاہتے ہو
تمہاری آنکھیں تو ازل دن سے
خالق سے بیاہ دی گئی ہیں
جس نے تمہیں اندر سے باہر تک سونا بنا دیا ہے
اور دنیا کو آئینہ
دنیا اس میں اپنی آنکھیں دیکھ رہی ہے تو دیکھنے دو
تم اپنی آنکھیں کیوں دیکھنا چاہتے ہو
تمہاری آنکھیں تو تمہاری نہیں ہیں۔

بالک باتیں

[محمد علوی کے لئے ایک نظم]

میرے دل میں ایک گھر ہے
اس گھر میں ایک چھوٹا سا بچہ رہتا ہے
وہ اپنی شربتی آنکھیں جب اِدھر سے اُدھر گھماتا ہے
تو سنسار کے، فراق و وصال والے
سارے کھلونے الٹ پلٹ جاتے ہیں
وہ اپنی توتلی زبان سے کچھ کہتا ہے
تو آسمان سے پریوں کی ٹکڑیاں
خوابوں کی ٹافیاں برساتی ہیں
اور شرارت سے بھرے غبارے زمین کی طرف اڑا دیتی ہیں
غبارے تو زمین سے آسمان کی طرف اڑتے ہیں
ہے نا عجیب بات

وہ ایسا ہی عجیب ہے
یا شاید ابھی نہیں جانتا ہے
لیکن گلے میں ایک بستہ ضرور ٹانگے رہتا ہے
اس بستے میں
جن، پریاں، شہزادیاں، بھوت، چڑیلیں، پھل پائیاں
پھول پتیاں، تتلیاں، جگنوؤں کی جھلملیاں
پرندے، جانور، لڑکیاں، لڑکے، جنگل، جنگل والیاں
اور جانے کیا کیا الم غلم... آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے رہتے ہیں
وہ جب چاہتا ہے انہیں نکال کے پڑھنے لگتا ہے
اور جب چاہتا ہے انہیں واٹر کلر میں بھگو کے
کاغذ پہ چپکا دیتا ہے
سنا ہے آج کل وہ بہت عجیب ہو گیا ہے
پہلے سے بھی زیادہ عجیب
اس نے میرے دل کے اوپر
اونچے اونچے پہاڑ بنا لئے
ان پہ ایک شہر بسا لیا ہے
شہر کے اوپر چھت ہے....
چھت کے اوپر آسمان!
اور وہ چھت پہ چڑھ کے
آسمان پہ ٹنگے ہوئے چاند کو لوٹ کے
رات میں

اپنے خوابوں کے مانجھے سے پتنگ اڑانا چاہتا ہے
میں نیند سے جاگ پڑتا ہوں
تو دیکھتا ہوں میری بچی، جس کی عمر ابھی صرف سات
سال ہے،

جو میری باہوں سے لپٹ کے سوئی تھی...
میرے سرہانے بیٹھی حیرت سے مجھے دیکھ رہی ہے!
مذاق! ابو آپ نیند میں کس بچے سے باتیں کر رہے تھے
بچہ! ہاں میں ایک بچے ہی سے تو باتیں کر رہا تھا
وہ... وہ... وہ تم سے بس ذرا سا ہی تو چھوٹا ہے
سات ماہ، سات ہفتے، سات دن، سات پل یا سات...
یہ کہہ کے میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں
اور میری بچی کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگتی ہے

ہم سفر تنہائی کے آخری پہر کی نظم[1]

[قرۃ العین حیدر اور شمس الرحمان فاروقی کے نام]

خالی کمرے میں بھیگی ہوئی ہوا منڈلاتی پھر رہی ہے
کسے ڈھونڈتی ہے!
اس کمرے کے باہر جو چند رنگ ہے
اس کے سائے میں ایک جھولا ابھی تک ہل رہا ہے
کوئی ابھی ابھی اٹھ کے گیا ہے
پھول چننے، اشوک واٹیکا میں
جس میں کلپتروکا بھی ایک پیڑ ہے
اس پیڑ کے پھول ایسے ہیں
جن کو سونگھنے سے ہر خواہش پوری ہو جاتی ہے
تو پھر اس کی بھی خواہش پوری ہو گئی ہوگی!
شیشم کے جھنڈ کے نیچے
اس نے ماچس کی ایک تیلی جلائی
وہاں کوئی نہیں... کوئی بھی نہیں... خواہش بھی نہیں!
دور سرخ اور تاریک رات میں ندی کے نزدیک پھولے
کاغذ کی ہری ناؤ بہہ رہی ہے
اس کے سینے پہ ایک دیا جل رہا ہے
تھوڑا سا متحیر اور بہت زیادہ خوفزدہ
کہاں جائے گی وہ ہری ناؤ!
میں تاریک اور غضبناک سمندروں کی روح ہوں
اگر وہ ندی میرے سمندر میں غرق ہو گئی
تو میں اسے تحفے میں کیا دوں گا!... ایک ازلی جنگل
جس کی راتوں سے لوگ بیکراں ہجر اور بیکراں درد پاتے ہیں
نہیں نہیں میں اسے اپنے سمندر میں غرق ہونے نہیں دوں گا
ندی کے کنارے،
بانسوں کی جھرمٹ اور مہندی کی باڑھ کے بعد
تلسی، برگد اور چندن میں بسا ایک گھر بھی ہوتا ہے
گھر کے باہر ناؤ بندھی رہتی ہے
اندر دیا جلتا ہے
اور اس کی روشنی میں
گھر میں پھول کھلنے لگتے ہیں
اور سانپ سو جاتے ہیں

تب وہ گھر سے نمودار ہوتی ہے
میرے سامنے سنہرے شہد کی اجلی رکھتی ہے:
مرا قبے سے سر اٹھاؤ
سنہرے شہد کی اجلی کھا کے
ان بہتی بانسری کی دھن پہ دیکھو
جیسے ناؤ بنا ندی کے بھی چلتی ہے
اور دیا بنا لو کے بھی جلتا ہے
میں جو عطر کے تھپیڑوں، چنبیلی کے پھولوں، بہتے
اور اس کی چاہت کے ناسٹلجیا میں گھر ہوا تھا
دیکھتا ہوں:
وکرمادتیہ کے زرد عقیق تخت سے
سرخ و سبز شعاعیں پھوٹ رہی ہیں
میں جل رہا ہوں... مجھے وہ بچا لی تھی
کتنی پراسرار ہے وہ!
کبھی ایک گل سبر کا پیڑ لگتی ہے
کبھی چاند کا خزاں آلود کنول
اس کے وجود سے کبھی جھیلوں کی شب شب سنائی
کبھی سنسان جنگلوں کا سناٹا
خداوند!
میں زور زور سے چلانے لگتا ہوں
تو میرا گڈریہ ہے... مجھے کوئی کمی نہیں
تو مجھے ہری چراگاہوں میں آرام سے
یا خاموش پانیوں کے کنارے سے
خاموش پانیوں کے کنارے تو ناریل کے سائے
ناریل کے سایوں میں گھر بنتا ہے!
لیکن خدا کا کوئی گھر نہیں ہوتا!
میں اسی طلب میں رام کی طرح چودہ برس کا بن باس
کروں کبھی تو مجھ سے کہہ دے
میں تمہارا گھر بن لوں گی!

---

[1] اس نظم کے استعاروں میں قرۃ العین حیدر اور شمس الرحمٰن فاروقی کے علاوہ شاید محمد صلاح الدین پرویز بھی ہے۔ یہ نظم اس لئے کہی گئی ہے جب تخلیق، عشق، اور دنیا ایک جیسے ہی نظر آتے تھے...

[م ص پ]

پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴۳، ریاض - ۱۱۴۱۲ (سعودی عرب)

عبدالصمد

۲۲، اے رینی گنڈھا، صداقت آشرم، پٹنہ ۱

شرط

دکان سے باہر آتے ہی اس کا بھیلا دروازہ ایک خاص ادا کے ساتھ خود بخود بند ہوگیا۔ اس نے مسکرا کر بند دروازے کے شیشوں پر اپنا ہاتھ پھیرا اور سامنے بہتی ہوئی دنیا پر ایک نظر ڈالی، دنیا، زندگی سے بھرپور، خوبصورت اور رواں دواں تھی۔ اور اس میں اس قدر حرارت تھی کہ اس میں ساری کثافتیں اور بدصورتی اگر تھیں بھی تو اب چھپ گئی تھیں۔ دکان کی اونچی سیڑھیوں سے فوراً اترنے کو اس کا جی نہیں چاہا اور وہ یونہی سامنے کے منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ شام بازار میں اتر آئی تھی اور اس کی پیشانی پر نیون لائٹ کی افشاں بکھر گئی تھی جس کی ہلکی رنگین روشنی میں اس کا سلیقے سے پریس کیا ہوا سوٹ اور سنہری دھاریوں والی ٹائی اور تازہ پالش کئے ہوئے جوتے چمک اٹھے تھے، اس کے دل کے اندر عجب گدگدی سی ہو رہی تھی اور جسم پر سہلانے والی مہک۔ نظر نہ آنے والی چیونٹیاں سی دوڑ رہی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا سیڑھیوں سے اتر کر سڑک پر آگیا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ سڑک پر کاروں، رکشہ، اسکوٹر اور سائیکلوں کا ایک ریلا بہا جا رہا تھا، پیدل چلنے والوں کا بھی ایک اژدہام تھا، سڑک پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، اس کا جسم بار بار کسی راہگیر سے مس کر جاتا، پسینے کی بو اور سانسوں کی گرمی ایک لمحے کے لئے اس کے اندر اتر جاتی اور وہ خاصا مکدر ہو کے سینٹ سے بسا ہوا رومال نکال کر ناک پر رکھ لیتا، اس طرح رومال کی خوشبو بھی آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی اس نے پینٹ کی بیک پاکٹ سے بغیر خوشبو کا ایک بڑا رومال نکالا اور آہستہ آہستہ کوٹ پر پھیرا تو اس پر گرد کی ایک ہلکی سی سیاہ پرت آگئی ——— اوہ، اس کا مطلب ہے، بازار کی گرد سے سوٹ کا ستیاناس ہی ہو جائے گا، جوتے پر بھی اتنی گرد آگئی تھی کہ اس کی چمک معدوم ہوتی جا رہی تھی، وہ ایک طرف کو کھڑا ہو گیا اور گزرتی ہوئی ہر کار کے اندر بڑی پُرامید نظروں سے دیکھنے لگا کہ شاید کوئی پہچان والا مل جائے تو لفٹ دے دے لیکن کاریں بڑی تیزی سے گزر رہی تھیں اور ان کے اندر بیٹھے ہوئے افراد اپنی ہی شامت میں گم تھے۔ جب اسی طرح کھڑے کھڑے کافی دیر ہو گئی تو اسے خیال آیا کہ کسی کار والے سے ان کی ایسی دوستی تو نہیں کہ وہ کار روک کر اسے لفٹ دے دے، دو ایک لوگوں سے جان پہچان ضرور تھی لیکن ویسی بھی نہیں کہ۔۔۔

اس نے ایک صاف ستھرے رکشے والے کو آواز دی، وہ رکا تو اس پر بڑی ہی نفاست سے بیٹھ گیا اور اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ رکشہ فوراً ہی بہتی ہوئی بھیڑ کا ایک حصہ بن گیا، تازہ ہوا نتھنوں میں آئی تو شام کی پُراسراریت بھی بڑھ گئی، بازار کی روشنیاں آنکھوں کو بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں، فضا میں شام، روشنی، زندگی اور خوشی کی رچی بسی خوشبو تیر رہی تھی، کتابوں اور رسالوں کی سب سے بڑی دکان آگئی تو اس نے رکشہ کو رکنے کو کہا اور اتر پڑا۔

"مجھے چھوڑ دیجئے، اس وقت کمانے کا وقت ہے۔"

رکشہ والا گمچھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بڑی لجاجت سے بولا، اسے شاید اتنے سوٹڈ بوٹڈ صاحب سے اتنے کم کرائے کی توقع نہیں تھی۔

"رکو ابھی ——— تمہیں پیسے کمانے ہیں نا، میں تمہیں چھوڑ کہاں رہا ہوں۔"

وہ بڑی نخوت سے بولا اور دکان میں داخل ہو گیا۔ دکان کے باہر اخباروں کے اسٹینڈ تھے جہاں پر کھڑے ہو کر وہ تقریباً سبھی اخباروں کی شاہ سرخیوں پر نظر ڈال لیتا تھا، اندر جانے کی تو ہمت ہی نہیں ہوتی تھی، ایک آدھ بار وہ اندر گیا بھی تو کسی نے اس کے آگے گھاس نہیں ڈالی، بلکہ اسے مونقوں کی طرح ادھر ادھر تاکتے ہوئے دیکھ کر سختی سے باہر جانے کو بھی کہا گیا، لیکن آج ——— آج کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اگرچہ دکان میں خاصی بھیڑ تھی اور تقریباً سبھی کاؤنٹر گاہکوں سے اٹے پڑے تھے، پھر بھی سبھی سیلزمین نے بیک زبان اس کا خیر مقدم کیا اور ایک کاؤنٹر پر کسی طرح اس کے لئے جگہ بنا دی اور یہ پوچھے بنا کہ اسے کیا چاہئے، ڈھیر ساری کتابیں، رسالے، اخبارات وغیرہ وغیرہ لا کر ڈال دئے، ان میں کچھ کتابیں تو ایسی تھیں جن کو دیکھنے اور چھونے کی خواہش عرصہ سے اس کے دل میں پل رہی تھی، بی اے کے بعد کی بیکاری نے اس کی تمام خواہشوں کو کچل ڈالا تھا اور اب تو یہ حال تھا کہ کبھی کبھار خواہش کی کوئی چنگاری سر بھی اٹھاتی تو وہ اسے فوراً

راکھ کے ڈھیر میں دبا دیا، اپنی پسند کی اتنی کتابیں اور رسالے سامنے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے جی بھر کے ہر مرغوب کتابوں پر اپنی انگلیاں پھیریں اور انھیں بار بار کھول کر ان کے اوراق کی خوشبو دیر تک اپنے نتھنوں کے اندر محسوس کی، اس وقت پڑھنے کا کوئی موقع تو تھا نہیں صرف دیکھنے اور سونگھنے کا موقع تھا، سو اس نے اس موقع کا خوب فائدہ اٹھایا، رسالوں کی رنگین تصویروں سے خوب آنکھیں کی نہ صرف سرخیاں دیکھیں بلکہ ٹیوٹوریل کے اہم حصوں پر بھی نگاہیں ڈال لیں۔ سیلزمین جسے خدمت میں بھیجا جا رہا تھا، وہ بار بار سوچ رہا تھا کہ کیا دکھاؤں، اس کی آنکھوں میں بڑی توقعات لہریں مار رہی تھیں لیکن اس کی جیب میں اتنی کہاں کتابوں اور رسالوں کے لئے پیسے کہاں تھے وہ بار بار رسالوں اور اخباروں کو الٹ پلٹ کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ دوکان میں آ تو گیا بڑی آسانی کے ساتھ۔ لیکن یہاں سے باہر جانا اتنا آسان نہیں، یہ جو چاروں طرف عزت اور احترام کے ساتھ آنکھوں میں امید کی جوت جلائے لوگ کھڑے ہیں انھوں نے کبھی اسے اسی دوکان سے دھکے مار کر نکال دیا تھا، اب بھی ایسا کرنے سے انھیں کس نے روکا ہے —— وہ ایسا کر سکتے ہیں، بالکل کر سکتے ہیں ....

اسے ایک آدھ چیز تو لے ہی لینا چاہئے یوں بھی اس نے ان کا اور اپنا اتنا وقت ضائع کیا ہے اور پھر اخلاقی تقاضہ بھی تو کوئی چیز ہے، اس نے کھڑے کھڑے اپنی جیب کی مشمولات کا اندازہ لگایا، پتہ چلا کہ ابھی تو پوری شام بلکہ پوری رات باقی ہے اور اتنے عرصہ میں اسے بہت کچھ کر گزرنا ہے، اس کے پاس پیسوں کے ساتھ ساتھ وقت کی بھی کمی ہے، اس نے ایک ہفتہ وار اٹھایا اور سیلزمین کی طرف بڑھایا۔

"آج بس یہی ——"

"کوئی بات نہیں سر، کوئی بات نہیں، آپ کی دوکان ہے، پھر تشریف لائے"

سیلزمین غیر معمولی اخلاق سے پیش آیا اس نے اپنے الفاظ ادا کرتے وقت اپنے سر کو خم کیا اور مسکرایا بھی، پھر اس نے دو روپے کے اخبار کو ایک ربن میں پیک کیا اور اس طرح اسے پیش کیا جیسے وہ کوئی انمول تحفہ پیش کر رہا ہو اور یہ کہ اس تحفے کو قبول کر کے وہ گویا ان پر کوئی احسان کرے گا۔

اس نے ایک شان بے نیازی کے ساتھ دس کا ایک نوٹ کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ یا فوراً ہی آٹھ روپے کے صاف ستھرے نوٹ اسے واپس کر دئے گئے اور وہ دوکان سے ایک فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا باہر نکلا، رکشہ والا سیٹ پر نیم دراز سویا ہوا تھا، اس نے اخبار کی نوک سے ٹھوکر لگا کر اسے اٹھایا، رکشہ والا ہڑبڑا کے اٹھ گیا، اس کے نیم عریاں جسم کے پسینے سے سیٹ چپک اٹھی تھی اسے یہ دیکھ کر گھن آ گئی اور اس نے بڑی ناگواری سے ناک بھوں چڑھا کر اسے سیٹ صاف کرنے کو کہا، رکشہ والا شرمندہ سا اپنے گمچھے سے سیٹ کو صاف کرنے لگا، پھر وہ بڑی ہی نفاست سے اس پر بیٹھ گیا، رکشہ آگے بڑھا تو اچانک اسے کپڑے کی دوکان نظر آگئی جس کے دائیں بائیں بڑے بڑے شیشوں والی الماریوں میں مرد اور دوسرے میں عورت کے شاندار کپڑوں میں ملبوس مجسمے کھڑے تھے، وہ دوکان فیشن ایبل کپڑوں کے لئے مشہور تھی۔ وہ کئی بار وہاں پر رک کر ان مجسموں پر للچائی ہوئی نظریں ڈال چکا تھا، وہ نظریں اس کے اندر ابھی تک کسی کونے میں پوشیدہ تھیں، ان نظروں کی پاداش میں دو بار اسے سیلز چوکیدار نے گھور کر اسے دیکھا تھی تو اسے وہاں سے ہٹ جانے میں عافیت نظر آئی تھی —— رکشہ رکوا کر وہ آہستہ آہستہ دوکان کی سیڑھیاں طے کرنے لگا، جب وہ دروازے کے پاس پہنچا تو مسلح چوکیدار نے فوراً اپنے اسٹول سے اٹھ کر اسے سلام کیا، اس نے سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے عورت اور مرد کے ملبوس مجسموں پر باری باری سے اچٹتی ہوئی نگاہیں ڈالیں اور چوکیدار نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو وہ بڑی شان سے اندر داخل ہوا۔

ایئر کنڈیشن کی خنکی اور خوشگوار فضا کے ساتھ ساتھ اندر مختلف خوشبو حسن و جوانی کے کئی حسین امتزاج، ریشمی ساڑیوں کی خوشگوار سرسراہٹ، کپڑے کے بڑے بڑے تھانوں کی قیمتی خوشبو اور دوکان کے کارکنوں کی شائستہ مسکراہٹ اور اخلاق : طور طریقوں سے جگمگا رہی تھی اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر آئیے صاحب، ادھر تشریف لائیے، بھئی صاحب کے لئے جگہ بناؤ وغیرہ وغیرہ جیسے پھول بکھیر گئے، کئی گاہکوں نے اسے دیکھ کر اپنے جسم چرانے کی کوشش کی، وہ بڑے اطمینان سے ٹہلتا ہوا ایک کاؤنٹر پر جا کر کھڑا ہو گیا، ایک سیلزمین نے آگے بڑھ کر اسے صوفہ پر بیٹھ جانے کی گذارش کی پھر بڑے اخلاق سے مسکرا کر بولا۔

"کیا دکھاؤں صاحب، سوٹ کے کپڑے، شرٹ، یا پھر ....."

ابھی کچھ جواب بھی دینے نہ پایا تھا یا سوچ نہیں پایا تھا کہ دوسرے کونے سے آواز آئی۔

"پوچھنے کی کیا بات ہے —— سوٹنگ، شرٹنگ، ساڑی وغیرہ سب سامنے رکھو، صاحب خود ہی پسند کر لیں گے ....."

سیلزمین نے سب قسم کے کپڑوں کے تھان کے تھان سامنے لا کر ڈال دئے پھر سب کپڑوں کو کھول کھول کر اسے دکھانے لگا اور ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات بیان کرنے لگا، اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کمپیوٹر میں پروگرامنگ کر کے ڈال دیا گیا ہو۔ وہ ایک ایک کپڑے کو ہاتھوں سے مسل مسل کر ایک ماہر گاہک کی طرح دیکھتا رہا، کہیں ان کا [illegible]

مطمئن سا رکشہ والے کے پاس پہنچا تو وہ رکشہ کھڑا کر کے غائب ہو چکا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں، چاروں طرف روشنیوں کا دریا سا بہہ رہا تھا اور اس میں چلتے پھرتے آدمی بے حساب جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے ——

"کہاں چلا گیا کم بخت — — — — "

وہ بڑبڑایا کس قدر لاپرواہ اور غیر ذمہ دار ہے یہ غریب آدمی۔ ابھی اس کی محنت کے پیسے باقی ہیں اور اگر میں اسے چھوڑ کر چلا جاؤں تو وہ آدمیوں اور روشنیوں کے اس سمندر میں۔ مجھے تلاش کرے گا — ؟

کبھی نہیں — — — — — ناممکن — — — — "

یہ لوگ زندگی گزارنے کا سلیقہ ہی نہیں جانتے، بس دوش دینا جانتے ہیں یا تو حالات کا، یا پھر اپنی قسمت کا، اتنی محنت کی ہے اس نے اور اپنا اتنا وقت لگا چکا ہے اس میں، لیکن دیکھئے ذرا لاپرواہی — — — — — —

وہ تو غنیمت تھا کہ یہاں پر زندگی کی خوبصورتی پر چہار طرف ناچ رہی تھی ورنہ وہ یہاں پر اس طرح بھوکے رکشہ والے کے انتظار میں کبھی نہیں ٹھہرتا۔ کافی دیر کے بعد رکشہ والا شان بے نیازی کے ساتھ ہنستا ہوا آپہنچا۔ اس نے بڑی خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا چائے پینے چلا گیا تھا حضور — "

رکشہ والا بڑی لجاجت سے بولا، وہ غصے کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

'سالے کو کھانے کو روزی نہیں اور چلا چائے پینے گئے تھے '

وہ رکشے پر بیٹھ گیا۔

"کہاں چلوں صاحب — ؟"

رکشہ والا بڑی خوش دلی سے بولا، میٹر بڑھنے کی حقیقت شاید اب اس پر واضح ہوئی تھی جس کے نتیجے میں اس کے اندر اور باہر روشنیاں سی جل اٹھی تھیں۔

"بس سیدھے چلتے رہو — — — — "

اس کے لہجے میں خاص رعونت تھی۔ یہ شہر بھی ایسا تھا کہ اس کے جسم کو چیرتی ہوئی ایک لمبی سڑک نکل گئی تھی، جو کچھ بھی شہر تھا، بس سڑک کے اس طرف یا اس طرف۔ ہر دس فرلانگ پر ایک چوراہا سا بن جاتا جس کے دونوں طرف پتلی پتلی سڑکیں اور پھر ان سڑکوں سے نکلتی ہوئی اَن گنت پتلی پتلی گلیاں اور ان گلیوں میں بسنے والے دبلے پتلے مدقوق، شہر کے باسی —— بس اتنا سا شہر تھا، تو ایک بڑی مٹھی میں سما جائے اس پر شہر والوں کو بڑا ناز تھا یوں شہر اور وہ شہر، بھاگر، دشال نگری وغیرہ وغیرہ —— دل کو بہلانے کے بہانے لوگوں کیسے کیسے نام رکھ چھوڑتے ہیں، جو چیرنے تو ایک قطرہ لہو کا نہ نکلے ..

رکشہ تو رفتار سے سیلاب میں بہا جا رہا تھا، رات بھیگتی جا رہی تھی اور

آہستہ آہستہ سلمہ ستارے سے مزین لباس پہن رہی تھی، اس کی کوئی واضح منزل نہیں تھی، منزل تو اصل شروع سے کوئی نہیں تھی، لیکن راستے میں اسے پڑاؤ ملتے گئے تھے اور وہ بڑھتا گیا تھا، رکشہ آگے بڑھتا جا رہا تھا لیکن اسے کوئی پڑاؤ دکھائی نہیں دے رہا تھا، یوں بڑی بڑی شاندار دوکانوں، تفریح گاہوں، سینما گھروں اور ہوٹلوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

ہوٹل پر اسے یاد آیا کہ اب اسے بھوک بھی لگ رہی ہے اور اسے کہیں بیٹھ کر کچھ کھا لینا چاہیئے،

لیکن کہاں —— ؟

اس کا لباس اور وضع قطع ایسی تھی کہ اب وہ صرف فائیو اسٹار یا تھری اسٹار ہوٹل میں ہی جا سکتا تھا، لیکن اس کی اندرونی جیب اس سے چپکے چپکے کہہ رہی تھی کہ وہ کسی ٹٹ پونجیا ہوٹل میں ہی جا سکتا ہے مثلاً حامد میاں کے ہوٹل، اس سے زیادہ آگے کی بات اسے سوچنی بھی نہیں چاہئے، وہ کشمکش میں پڑ گیا،

اس کا ظاہر اسے کسی بڑے ہوٹل کی اور کھینچ رہا تھا اور باطن حامد میاں کے ہوٹل کی طرف۔ ان دونوں کی جنگ کا فیصلہ ہوتے ہوتے تو رات بھی بیت سکتی تھی اور اس کے پاس اتنا وقت کہاں۔ اس نے سوچا اتنے اچھے کپڑوں اور سجاوٹ کے ساتھ معمولی ہوٹل کا معمولی کھانا ہضم ہی نہیں ہوگا اس کے لئے بہترین کھانا بھی ہونا چاہیئے، اس لئے اسے معمولی ہوٹل کا خیال دل سے نکال ہی دینا چاہیئے جب وہ یہ سوچ چکا تو اس کے باطن کی گرفت خود بخود اس پر کمزور پڑ گئی اور وہ کشاں کشاں کھنچا ہوا فائیو اسٹار ہوٹل کی طرف چلا گیا۔

لیکن فائیو اسٹار ہوٹل میں جانے کے لئے اس کی جیب میں دام کہاں تھے اور فائیو اسٹار ہوٹل کتابوں اور کپڑوں کی دوکان تو تھی نہیں کہ وہ کسی طرح اپنی عزت بچائے جائے، پھر — ؟

اسے اچھا کھانا کھانا ہی تھا کیونکہ وہ اپنے ظاہر اور باطن کو دو مخالف سمتوں میں نہیں جانے دینا چاہتا تھا اور اسے صرف اسی لائن پر سوچنا تھا۔

اچانک اسے یاد آیا، سیٹھ کرم سنگھ کی بیٹی کی شادی تھی، بڑے آدمیوں کی تقریب کی خبر سارے شہر کو ہو ہی جاتی ہے، اگرچہ اس کے لئے کارڈ بھی تقسیم ہوئے ہوں گے اور فائیو اسٹار ہوٹل میں شادی کی شرکت کے لئے کارڈ کا ہونا ضروری بھی ہوگا۔ اس کے پاس کارڈ کیا کارڈ کا پتہ بھی نہیں تھا سیٹھ کرم سنگھ کی بیٹی کی شادی اور اس کے پاس شرکت کا کارڈ — — — — — —

اسے اس مضحکہ خیز صورتحال کے بارے میں سوچ کر ہنسی آگئی، پھر فوراً ہی اسے دو بڑی دوکانوں کے تجربے یاد آ گئے اور اس نے مصمم ارادہ

کے نزدیک کر دیتا، کبھی لائٹ کے سامنے کر دیتا بہت احتیاط اور بے نیازی کے باوجود اس سے ایک حرکت ایسی سرزد ہو گئی جس کے لئے اسے وہ بہت شرمندہ ہوا، کیونکہ اس نے ایک کارکن کو مسکراتے ہوئے اور دوسرے کو آنکھوں سے اشارے کو منع کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا، لیکن وہ کیا کر سکتا تھا اس سے یہ حرکت بالکل اضطراری طور پر سرزد ہوئی تھی، اس نے بے ساختہ ایک نہایت خوبصورت اور قیمتی سوٹ کے کپڑے کو سونگھ لیا تھا ــ!

وہ دیکھ دیکھ کے ایک ایک کپڑے کو الگ ڈالتا رہا، سیلز مین بار بار پوچھ رہا تھا ــ

"کچھ اور دکھاؤں صاحب ــــــ؟ یہاں آپ کو اپنی پسند کے کپڑے ضرور مل جائیں گے ہم لوگ تو بس سیوا کرنا جانتے ہیں، جو کپڑے اس شہر میں کہیں نہیں ملیں گے وہ آپ کو یہاں مل جائیں گے صاحب..... آپ حکم تو کیجئے....."

کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ایک موٹا آدمی غور سے اسے دیکھ رہا تھا، اسے کبھی سوٹ کے کپڑے اور کبھی ساڑیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ پتہ نہیں اس کے اندر کی کونسی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے بھی کئی بار دوکان کے کارکنوں کے تجسس کو محسوس کرنے کی کوشش کی تھی اور کہیں کہیں شرمندہ کرنے کے احساس نے اس کے اندر سر اٹھایا تھا لیکن اس نے سختی سے دبا دیا تھا اصل میں وہ بھی مجبور تھا اس طرح کرنے سے اس کے اندر کی جو چیز مطمئن ہو رہی تھی وہ شرمندگی سے کہیں زیادہ ضروری چیز تھی اور اس کے اندر بہت دنوں سے پل رہی تھی ـ

اس نے تقریباً سبھی کپڑوں کو اٹھا اٹھا کر دوسری طرف یوں رکھ دیا جیسے اس نے ان سب کو ناپسند کر دیا ہو ـ اس کی اس حرکت سے کارکنوں کی پیشانیوں پر ذرا بل نہیں آیا اور وہ بہت خوش دلی کے ساتھ انہیں تہہ کر کے رکھتے گئے ساتھ ہی ان کی زبانیں مشینی انداز میں بولتی رہیں ــ

"کچھ اور دکھاؤں جناب ــــــ آپ کی پسند کی کوئی خاص چیز نکالوں ــ؟"

"آ....... رومال ہوں گے آپ کے پاس ــ؟"

اس نے قدرے لاپروائی سے دریافت کیا ـ

"رومال ــــــ؟ جی ہاں، جی ہاں بہت اچھے رومال ہوں گے، جناب، ایسے رومال تو اس شہر میں آپ کو ملیں گے ہی نہیں ــــــ اے نکالو، رومالوں والا ڈبہ......"

رومالوں کے نام پر وہ [illegible] خوش ہوئے جیسے سوٹ کے نام پر

اور رومالوں کے ڈبے کو بھی اسی خوش دلی سے نکالا جیسے.........

انھوں نے اس کے سامنے ہر قسم، ہر دام، ہر رنگ اور ہر سائز کے رومالوں کے ڈھیر لگا دئے

"رومالوں کی بھی ورائٹی ...."

وہ زیرِ لب بڑبڑایا لیکن رومال نکالنے والوں نے پتہ نہیں کیسے سن لیا اور مسکرا کر بولے ـ

"جی جناب رومالوں کی تو ایسی ورائٹی ہیں ہمارے پاس کہ دوسروں کے پاس سوٹ اور تھان نہیں ملیں گے ــ اگر آپ جیسے بڑے لوگ ہماری دکان پر آتے ہیں، آپ لوگوں کے لئے ہمیں رکھنا ہی پڑتا ہے ـ آپ لوگوں کی سیوا کرنا ہمارا دھرم ہے نا....."

اس نے آواز دے کر رومالوں کے اور بھی کئی ڈبے منگوائے، اس نے دل میں سوچا،

"لو بیٹا، ان اچھے خوبصورت رومالوں کو بھی خوب ٹھیک سے چھو لو، دیکھ لو، پھر کبھی موقع ملے نہ ملے......"

اس نے کپڑے، گہنے، جوتے وغیرہ تو بہت دیکھے تھے، ایک سے بڑھ کر خوبصورت، مہنگے اور نایاب، لیکن رومال اس نے اتنے خوبصورت اور قیمتی نہیں دیکھے تھے، سو اس نے جی بھر کے نہ صرف ان کا دیدار کیا بلکہ انھیں چھو کے اور سونگھ کے بھی دیکھا، آخر اس نے دو کم قیمت کے، نسبتاً معمولی رومال الگ کر لئے اور وہ سیلز مین سے بولا،

"انہیں پیک کر دیجئے ــ"

"بس یہ دو رومال......."

سیلز مین نے کچھ کہنا چاہا لیکن کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے موٹے آدمی نے اسے گھور کر یوں دیکھا کہ اس نے اپنی گاڑی فوراً دوسری پٹری پر ڈال دی ـ

"کوئی بات نہیں سر، آج رومال ہی سہی، آپ کی ہی دکان ہے، آپ کی پسند کی چیزیں ہمیشہ یہاں مل جائیں گی ــ آپ پھر یہاں تشریف لائیے [illegible]"

اس نے کاؤنٹر پر رومال کی قیمت ادا کی جو اس کی [illegible]

اور رومال کا پیکٹ لے باہر آگیا ـ

اب تک تو سارا معاملہ ٹھیک ٹھیک چل رہا تھا، لیکن [illegible] اس نے اتنے [illegible] کہ اس کی [illegible] لگ رہا تھا، گویا اس بوجھ کے بدلے اس نے [illegible] کی قیمت [illegible] زیادہ تھی، اس کا مطلب ہے صاحب [illegible]

کر لیا کہ وہ اس شادی میں ضرور شرکت کرے گا، اگر وہ کسی طرح اندر پہنچ گیا تو پھر اسے پہچاننے والا کون ہے ۔؟

اس نے رکشہ والے کو ہوٹل کی طرف جانے کی ہدایت کی، رکشہ والے کی چال اس وقت غیر معمولی تیزی تھی، شاید اسے بھی کوئی موہوم سی منزل کا خیال آگیا تھا۔ ہوٹل کے گیٹ پر رکشہ رک گیا، اس قسم کی چھوٹی سواریوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی، وہ اتر پڑا، پھر اس نے بیس کا ایک نوٹ رکشے والے کی طرف بڑھا دیا۔ رکشے والے نے ممنون ہاتھوں سے روپیہ لے لیا اور پھر اپنی دھوتی کی کانٹھ میں ریزگاری تلاش کرنے لگا۔

"رکھو، رکھو بقیہ پیسے دینے کی ضرورت نہیں ۔"

اس نے بڑی لاپرواہی سے کہا اور آگے بڑھ گیا، رکشہ والا اسے ــــ نہیں اس کی پیٹھ کو بار بار سلام کر رہا تھا ــــــ !

لابی تک جانے میں تو کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ فنکشن اندر ہو کے ہال میں ہو رہا تھا اور اس کے دروازے پر دربانوں سے کارڈ وصول کئے جا رہے تھے، وہ بڑی بے نیازی سے پینٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے آگے بڑھا دروازے پر غیر مقدم کے لئے کئی افراد کھڑے تھے، کارڈ وصول کرنے والے نے خاموشی کے ساتھ اپنا سوالیہ ہاتھ بڑھایا، اس نے گھور کر اسے دیکھا، اتنے میں غیر مقدمی پارٹی کے ایک شخص نے کارڈ وصول کرنے والے کو ایک ٹہوکا مارا اور آگے بڑھ کر بولا۔

"خوش آمدید جناب اندر تشریف لے چلئے، پارٹی اب شروع ہی ہونے والی ہے ـ ـ ـ ـ ـ ـ"

وہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی ہال میں داخل ہو چکا تھا، پیچھے کوئی کارڈ وصول کرنے والے سے کہہ رہا تھا ـ ـ ـ ـ ـ ـ

"آدمی پہچان کے بات کیا کرو، کارڈ اس لئے وصول کئے جاتے ہیں تاکہ کوئی معمولی اور فاضل آدمی اندر نہ گھس آئے، یہ کوئی قانونی عمل تو ہے نہیں ـ ـ ـ ـ ـ"

اس نے اطمینان کی ایک سانس لی اور اندر کی خوشبوئیں کھو گیا، کافی بڑا ہال تھا لیکن مہمان اتنے تھے پھر بھی چھوٹا دکھائی دے رہا تھا بہت سے لوگ بیٹھے تھے، اس سے زیادہ کھڑے تھے، ان کے بیٹھنے کی جگہیں بھی محفوظ تھیں، چاروں طرف دیواروں سے روشنیاں چھن چھن کر آ رہی تھیں اور ان روشنیوں کے ساتھ تیز موسیقی کی لہریں نکل نکل کر فضا میں تیر رہی تھیں، باوردی بیرے رنگین مشروبات سے بھرے خوبصورت ٹرے لئے گھوم رہے تھے، جس کے ہاتھ خالی دیکھتے اس کے سامنے رک کر تھوڑا جھک جاتے، اس کے سامنے بھی آئے اور اس نے ایک بھرا گلاس اٹھا کر گویا ان پر احسان کیا، ہونٹوں سے لگا کر ایک

گھونٹ بھرا، اُف، یہ کیا چیز ہے یعنی اس قدر بدمزہ اور تلخ اور شیشے کے اندر روپ دیکھو تو ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اس نے چور نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا لوگ اسی مشروب کو چسکیاں لے لے کر بڑی دلچسپی سے پی رہے تھے کسی کے چہرے پر بدمزگی اور کڑواہٹ نہیں تھی

اس کا مطلب ہے یہ شربت تلخ اور بدمزہ نہیں ہے اور اسے یہ سب لگ رہا ہے تو اس کے دماغ کا قصور ہے اور پھر جب وہ تازہ تازہ اپر سوسائٹی کا ممبر بنا ہی گیا ہے تو پھر اسے ان کے طور طریقے سیکھنے ہوں گے۔

اس نے پھر بڑے حوصلے کے ساتھ گلاس کو ہونٹوں سے لگایا، ایک گھونٹ، دو گھونٹ، پھر کوئی تلخ سا گولہ حلق میں پھنسنے لگا جس نے اوپر سے نیچے جانے کا راستہ ہی بند کر دیا اس نے گلاس پاس رکھی تپائی پر رکھ دیا، ابھی اس میں بے شمار گھونٹ مچل رہے تھے، اس نے تلخ گھونٹ سے ذہن ہٹانے کے لئے ادھر ادھر دیکھا، سبھی لوگ دو دو چار چار کے ٹولے میں بٹے ہشاش بشاش سے، سرگوشیوں میں مصروف تھے، گلاس سب کے ہاتھوں میں تھے، کوئی ان میں سے پی نہیں رہا تھا، دو ایک گھونٹ لیکر یا تو گلاس ہاتھوں میں تھے یا پھر تپائیوں کی خوبصورتی بڑھا رہے تھے،

"تو یوں بھی پئے جاتے ہیں اس قسم کے شربت ـ ـ ـ ـ"

اس نے اطمینان کی ایک سانس لی اور یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ اس تپائی کی طرف دیکھے گا بھی نہیں جس پر اس کا گلاس رکھا ہے۔ وہ دوسری رنگینیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اوپر منقش چھت پر بہت خوبصورت فانوس لگے تھے اور کاغذ کے رنگین پھول اس سلیقے سے لگائے گئے تھے کہ ان پر اصل ہونے کا دھوکہ ہوتا تھا، دیواروں کے اندر روشنیوں کا ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ رنگ برنگ شیشوں کے اندر کر دیکھنے والوں کی روح تک اتر جاتی تھیں، لوگوں کی مدھم مدھم سرگوشیاں فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر رہی تھیں، اس نے پاس کھڑے ہوئے لوگوں کی باتیں سننے کی کوشش کی، لیکن بے سود، ان کے منہ سے جو آوازیں نکل رہی تھیں وہ بھنبھناہٹ کی طرح صرف اس کے کانوں تک جا رہی تھیں، شاید ہر شخص صرف اپنے کانوں کے استعمال ہی کے لئے الفاظ نکال رہا تھا، ایسی صورت میں اس نے اپنے آپ کو بڑا کٹا کٹا سا محسوس کیا، فرار سے بھرا سا، ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ یہاں سے چلا ہی جائے کیا رکھا ہے یہاں کے ماحول میں، ہر آدمی اپنے آپ میں مگن، زبان سے الفاظ بھی نکالیں تو اپنے ہی کانوں کے لئے، بھلا ایک اچھا خاصا آدمی کتنا سمیٹ کر رکھ سکتا ہے اپنے آپ کو، لیکن اس کے سوٹ بوٹ اور ٹائی اور ان کے اثرات سے پیدا ہوئے SOPHESTI- اس کے سامنے CATION ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے ـــ نہیں

میرے سرکار، تمہیں معلوم، ایسا غضب نہ کیجیے۔ . . . . وہ سنبھل کر آنے والے لمحات کے لئے جیسے تیار ہو گیا،

او غضب نہیں . . . . تمہیں مخاطب ہوتے ہیں سامنے تو مت ہو، ان کی پرواہ کون کرتا، بس جلدی سے کھانا کھلا دیں فائیو اسٹار ہوٹل کا پھر ملے کہاں، یہ کہاں . . . .

اتنے میں جھومتے سے مالک پر سیٹھ وکرم سنگھ کی آواز ابھری، وہ دوسرے ہال میں جمع ہوئے تناول فرمانے کے لئے درخواست کر رہے تھے چلو اچھا ہے، جس مقصد کے لئے یہاں آئے تھے، وہ سامنے آ ہی گیا۔ ہال کے چاروں طرف ٹیبل لگے تھے اور ان پر انواع و اقسام کے کھانے سجے تھے جس کے سامنے جو ٹیبل پڑا، وہ وہیں پر پلیٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے تمام ٹیبل پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، کھانوں کے رنگ اور خوشبو سے اس کے منہ میں پانی بھر آیا، آج تو جی بھر کے اتنے اچھے کھانے ملیں گے آج وہ کھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا، اس نے دوسروں کی دیکھا دیکھی سامنے کی پلیٹ اٹھائی اور جلدی جلدی اس میں مختلف کھانے بھرنے لگا، لیکن پلیٹ تو آدھے ہی میں بھر گئی، ابھی تو بہت سے کھانے بکھرے پڑے ہیں اس نے بڑی مایوسی سے سر اٹھایا تو اکثر لوگوں کو اپنی طرف بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پایا، اچانک اس کی نگاہ ان کی پلیٹوں پر پڑی، ہر ایک پلیٹ میں دو دو تین تین نوالے سے زیادہ نہیں پڑے تھے یوں ساری کی ساری پلیٹیں، لگ بھگ خالی ہی پڑی تھیں ——— اس کی کنپٹیاں گرم ہونے لگیں اور اس نے جلدی سے بھیڑ میں گھس کر اپنی پلیٹ ایک ٹیبل کے نیچے رکھ دی اور دوسری پلیٹ لے کر اس میں تھوڑے سے سلاد اور ایک آدھ کٹلس لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا، اب اس کی طرف جھجکیں بھرے تیر نہیں آ رہے تھے اور سب اپنی اپنی دنیاؤں میں مست، پتہ نہیں کون سی ضروری سرگوشیوں میں مصروف تھے، دوسروں کی طرح اس نے بھی پلیٹ کی اتنی کم چیزیں بہت دیر میں ختم کیں، دوسری بار کچھ لینے کی اس کی ہمت نہیں پڑی، البتہ سویٹ ڈش جس طرح دوسروں نے لی ویسے اس نے بھی لے لی سبھی کھانے ٹیبل پر دھرے کے دھرے تھے اور لوگ پتہ نہیں کھانے کی کن چکنائیوں کو ہی، صاف کر رہے تھے ———

جتنا کھانا اس نے کھایا، اتنا تو وہ ایک نوالے میں کھا سکتا تھا، نہ اس کا پیٹ بھرا نہ جی، پھر بھی اس کے اندر ایک تشفی سی تھی، اطمینان کی ایک گہرا ہوا تھا جو اسے آسودہ کر رہا تھا۔ اس نے ابھی ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں شہر ہی نہیں، صوبہ میں نہیں، ملک کے ایک مشہور سیٹھ وکرم سنگھ کی بیٹی کی شادی کی دعوت کھائی تھی!

کھانے کا کیا ہے، کھانا تو وہ کہیں بھی کبھی بھی کھا سکتا ہے، جیسا رومیل کے ہوٹل کی بھنی دال اور چپاتیاں بھی کھا گئی ہیں، وہ تو سے ذرا آگے کھانا ہوا، ورنہ آج کا ہوٹل تو ایک ایسا دربار عام تھا جس کا فیض جو بھی کھٹے جاتا ابھی وہ وگ ——— کانی سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ اچانک اعلان ہوا کہ ہمارے چھوٹے ہال میں شادی کی رسمیں پوری ہو چکی ہیں جس میں چند قریبی رشتہ داروں نے حصہ لیا اور اب سبھی مہمانوں سے دولہا دولہن کو آشیرواد دینے کی درخواست ہے۔ آشیرواد ——— ! مقصد اس کا ماتھا ٹھنکا

یہ آشیرواد سیٹھ سنگھ کی بیٹی کی شادی کا نہیں تھا جس میں وہ پانچ روپے نذرانے کے دے آیا تھا اور ہفتوں ان پانچ روپیوں کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ یہاں قالین اور صوفوں پر خوبصورت ریشمی کاغذوں میں لپٹے بڑے بڑے لاتعداد تحفے دیئے تو ایسے لگے کہ جنہیں برسوں کیا زندگی بھر آدمی نہ بھولے — لیکن اس وقت مسئلہ یہ نہیں تھا۔

بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ ———

اچانک اسے خیال آیا کہ یہ اس وقت یہاں سے چلے جانے کا بہترین موقع ہے، کسی کو کچھ محسوس بھی نہ ہوگا اور وہ بڑے اطمینان سے ———

وہ ٹہلتا ہوا دروازے تک آیا۔ باوردی چوکیدار نے سر جھکا کر بڑے ادب سے دروازہ کھولا، سیٹھ وکرم سنگھ کے ارکان ابھی بھی مستعد تھے، ان کی آنکھوں میں اپنے لئے سوال دیکھ کر وہ مسکرایا اور بڑے سے بولا،

"بسکٹ گاڑی ہی میں رہ گیا، ڈرائیور کو بھی خیال نہیں آیا . . . ."

"ہم لا دیں جناب ——— ؟ گاڑی کا نمبر . . . ."

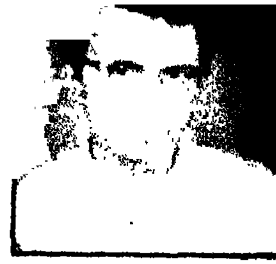
ان میں سے ایک نے کہنا چاہا۔

"ڈرائیور آپ کو نہیں دیگا نا ——— آدمی کا [illegible] ہے، یہ آدمی بڑے کام کا، ایک بار اس نے . . . . . ."

اچانک اسے خیال آیا کہ وہ کچھ فاضل ہی بول رہا ہے، جتنا اسے بولنا چاہیے، اور اب پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہوٹل سے باہر نکل آیا، رات کی تاریکی اور دودھیا روشنیوں سے نہایا ہوا [illegible] ہوٹل خوابوں کے محل جیسا لگ رہا تھا اور اس محل میں وہ دو تین گھنٹے بتا کر آیا تھا، اس کی زندگی کی یہ ایک بہت بڑی اور تاریخی کامیابی تھی۔

رات بھیگ چکی تھی، رکشے چلنا بند ہو گئے تھے اور سڑک پر [illegible] کی تعداد گھٹ چکی تھی، وہ تھوڑی دور آگے جا کر ایک بس اسٹاپ پر کھڑا ہو گیا رات کی آخری بس اسے چاندنی کے ہوٹل کے پاس اتار گئی اس کے [illegible] جو ایک گلی میں وہ رہتا تھا، جمال میاں کا ہوٹل ابھی کھلا تھا، پھر کیا تھا پیٹ بھر بھنی دال اور گرم گرم چپاتیاں مل ہی گئیں، [illegible]

[باقی صفحہ [illegible] پر]



راحت حسن

اب کی خاکِ زمیں سے آسماں ہوتا ہوا
لیں کو دیکھتا ہوں لامکاں ہوتا ہوا

سورج نے لگا دی ڈوبنے سے بیشتر
یکھتا ہوں ساری بستی کو دھواں ہوتا ہوا

چکے ہیں فصل ہم بھی صاحبوں کے کھیت میں
سنا ہے اب کے پودوں کو جواں ہوتا ہوا

سلک، ذاتِ بدلے ہیں نظر کی خوبیاں
زدوں کو دیکھتا ہوں بس نشاں ہوتا ہوا

ل پھیلاتی ہوا کا درد مجھ سے پوچھئے
یا ہوں آندھیوں کے درمیاں ہوتا ہوا

تے ہیں [illegible] زاویے [illegible] کے ملک میں
[illegible] بس اشاروں کو زباں ہوتا ہوا

پریم نشان، دودھ پور، علی گڑھ (یوپی)

پرویز اختر

ہر چند دوسروں سے تقاضہ کیا کریں
روشن کبھی تو خود بھی چراغ وفا کریں

ہر شخص اپنی ذات کی گہرائیوں میں گم
اس دشت بے کنار میں کس کو صدا کریں

بدشکل منظروں میں نظر آئے دل کشی
آؤ۔ بصیرتوں پہ کوئی تجربہ کریں

چارہ گروں سے لطف کی امید تو گئی
اب خود ہی اپنے زخم نمک آشنا کریں

ہر حال میں حیات مقدم ہے صاحبو
ہر حال میں مقابلہ حالات کا کریں

ہاں جانتے ہیں درد ہی دیتی ہیں خواہشیں
لیکن ہمیں بتاؤ کہ اس جی کا کیا کریں

یہ کاروبارِ عشق بھی پرویز ایک بار
سنجیدگی سے گر نہیں تو شوقیہ کریں

قاضی سرائے، چاند پور۔ ۲۴۶۷۲۵ (یوپی)



نعمان شوق

آگ کی لپٹیں اٹھیں کھڑکی سے روشندان سے
کھیلنا مہنگا پڑا ہے سرد آتش دان سے

ذہن پر چھانے لگا ہے خوشنما منظر کا سحر
سبز ملبے آ رہے ہیں اڑ کے نخلستان سے

مختلف ہے اس کی دلی سے ہمارا شہر کیا
کیوں اداسی مانگتے اب میر کے دیوان سے

بددعائیں لگ گئیں کیا جانے کس پھول کی
ہاتھ زخمی ہو گیا ٹوٹے ہوئے گلدان سے

جل چکے تیرے خطوط اور تیری تصویریں تمام
اب نہیں ڈرنا کسی سیلاب سے طوفان سے

پیاس کے ماروں کے تلوؤں سے لہو رسنے لگا
کوئی چشمہ پھوٹ ہی پڑتا ہے ریگستان سے

روکتی کیوں ہے مجھے پھولوں بھری یہ رہگزر
میں سلگتی ریت پر چلتا رہا ہوں شان سے

مٹی محلہ، آرہ۔ ۸۰۲۳۰۱ (بہار)

شاہد اختر

۲/۲۲۸ جوہی لال کالونی، کانپور۔ ۱۴

برف پر ننگے پاؤں

باہر سے اس مکان کی ہیئت جس قدر پراسرار نظر آ رہی تھی اندر آنے کے بعد نبیلہ کو اس پراسراریت کا اور زیادہ احساس ہوا۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے وہ اس کے مقابل کھڑی ہو کر بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ طے نہیں کر پائی تھی کہ دورِ پارینہ میں یہ کسی شہنشاہ کا محل تھا جو اب کھنڈر بنتا جا رہا ہے یا پہلے کھنڈر تھا۔ اب اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا کسی خوبصورت قصر میں منتقل ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ابھی کچھ دیر اور یہاں تک کہ اس بات پر غور و خوض کرنا چاہتی تھی مگر نہ جانے وہ کیا چیز تھی جو اسے اس بلند و بالا دروازے کی سمت متوجہ کر رہی تھی۔ آس پاس ایک پُرہول سناٹا، گراں بار خواب، اطراف سے آتی ہوئی مینڈکوں کی آوازیں شاید عمارت کے عقب میں تالاب بھی تھا۔ رات کی تاریکی میں یہ آواز خوف پیدا کر رہی تھی۔ محل کے صدر دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے قدموں کو اب روک پانا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ جب دروازے میں داخل ہونے کیلئے اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا اسی وقت نیم دروازہ چرچراتا ہوا کھل گیا۔ وہ چند ساعتوں کے لئے وہاں ٹھہری پھر بجلی کی سی سرعت سے آگے بڑھ گئی۔ آگے کشادہ ہال تھا جو پرانے دنوں میں ضرور دیوان خانہ رہا ہوگا۔ مگر اب اسے ڈرائنگ روم کا نام دیا جا چکا تھا۔ اب یہ طے کرنا کہ ان دونوں میں سے کیا ہے بڑا دشوار کام تھا۔ دیوار سے دیوار تک نرم اور دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ بڑے بڑے جھاڑ فانوس نقش و نگار والی چھتوں سے معلق تھے۔ فرنیچر کی ندرت اور رنگوں کی یکسانیت سے بھی خون کے عنصر نمایاں تھے۔ چھتوں میں تارِ عنکبوت سے بوسیدگی کی ترجمانی کر رہے تھے۔ فرنیچر کے علاوہ کمرے کے دروازوں پر بھی گرد کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں جیسے یہاں برسوں سے کوئی ذی روح نہ آیا ہو۔ نبیلہ ڈری سہمی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ تبھی کمرے میں وینس کے مجسمے کے پاس بیٹھی سیاہ رنگ کی بلی نظر آئی۔

اس کے دانتوں میں ایک موٹا سا چوہا جس میں ابھی زندگی کی رمق باقی تھی دبا ہوا تھا جیسے سعودی عرب امریکہ کے دانتوں میں۔ بلی کی چمکتی پیلی آنکھیں کار کی ہیڈ لائٹس کی طرح جل رہی تھیں۔ نبیلہ کو بلی سے خوف محسوس ہوا جبکہ بلی کے ساتھ کھیلنا اسے بہت پسند تھا۔ ایک سفید اور گلابی بالوں والی بلی تو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی حتیٰ کہ سونے کے وقت بھی بلکہ اسے چپٹائے بغیر نبیلہ کو نیند ہی نہیں آتی تھی۔ لیکن اس وقت یہ سیاہ بلی اسے خوف زدہ کر گئی جیسے وہ صرف بلی نہ ہو کر کسی فاحشہ کے بڑھاپے کا تصور بھی ہو۔ بلی اب تک اسے گھورے جا رہی تھی۔ جب نبیلہ کی آنکھوں نے اس طرف دیکھنے سے انکار کر دیا تو وہ دائیں طرف کے ایک کمرہ میں داخل ہو گئی جس کے دروازے پہلے سے وا تھے۔ اندر آنے پر اسے معلوم ہوا کہ یہ تو ایک وسیع و عریض ہال ہے بلکہ آگے جا کر اس نے سرنگ نما رخ اختیار کر لیا تھا۔ کچھ قدم اسی سمت چلنے کے بعد اسے میزوں پر کچھ رکھا ہوا نظر آیا۔ قریب سے دیکھنے کی خواہش نے اسے مجبور کیا۔ وہ کچھ قدم اور آگے بڑھی۔ پاس آ کر اس نے دیکھا کہ میزوں پر عورتوں کے سر رکھے ہوئے ہیں۔ لاتعداد سر... نگاہ کے آخری سرے تک صرف سر... ہی... سر... تھے... جن کے دھڑ غائب تھے۔ نبیلہ پوری طاقت بٹور کر چیخی۔ اس کی چیخ سن کر کمرے کے دروازوں کے پٹ کھل گئے۔ اس کی آواز کی بازگشت اس سرنگ نما ہال میں سنائی دے رہی تھی۔ آوازوں کا ارتعاش پا کر ٹنگے ہوئے بلب اور ہنڈے چھنک چھنک کی صدا کے ساتھ ٹوٹ کر فرش پر گرنے لگے۔ شیشے کے زمین پر گرنے کی آواز اور نبیلہ کی صداؤں کی بازگشت کے تصادم ایک بڑی بے ہنگم سی تیسری آواز وجود میں لا رہی تھی۔ جس جگہ وہ کھڑی ہوئی تھی دفعتاً وہاں کا فرش اچھل چکا تھا

زیر زمین بم پھٹا ہو۔ اس کے بعد تیزی سے پرس سے خون کا چشمہ بہہ نکلا، نبیلہ وہاں سے دیوانہ وار چیختی ہوئی باہر کی طرف بھاگی۔ ہال سے باہر تو وہ کسی طرح نکل آئی۔ پر محل سے باہر جانے کا راستہ بھول گئی۔ تازہ خون اس کے تعاقب میں فرش پر دوڑتا ہوا سر پٹکتی موجوں کا روپ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ وہ بھٹکتی ہوئی آپ ہی آپ باہر جانے والے راستے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ وہ اپنے شل ہوتے ہوئے اعضاء میں طاقت پھونک کر اور اپنی تمام قوت مجتمع کرکے دروازے کی سمت لپکی۔ دروازہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ بند ہونا شروع ہوا۔ اس سے پہلے کہ دروازہ بند ہو پاتا۔ وہ باہر نکل گئی۔ باہر آنے پر جب اس کی نظر سیڑھیوں پڑی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سیڑھیاں زمین سے متصل نہیں تھیں۔ تہذیبوں کی طرح زمین کا دامن   بھی ہاتھ سے چھوٹ جانے کی ان ہونیوں سے وہ نابلد تھی۔ اور اسی لئے حیرت زدہ بھی محل زمین سے اوپر اٹھ رہا تھا۔ جیسے جر ثقیل کی مدد سے کوئی اسے اوپر اٹھا رہا ہو۔ نبیلہ نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ زمین کی سطح اب انسانیت کی طرح بہت نیچے نظر آ رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ گاڑھا خون نیچے کی باریک درازسے باہر نکل رہا تھا۔ اس کے بعد مزید کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اس نے آنکھیں بند کیں اور نیچے جست لگا دی۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ بستر کے نیچے گری ہوئی تھی۔ سانسیں تیزی سے اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ آہٹ پا کر کیڈرک کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اسے سمجھتے دیر نہیں لگی کہ نبیلہ نے پھر کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ ایرکنڈیشن کمرے میں وہ پسینے سے شرابور تھی۔ کیڈرک اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ "کیا پھر۔۔۔ کوئی۔۔۔ خواب۔۔۔؟" "ہنہیں" بہت آہستہ سے اس نے جواب دیا۔ کچھ دیر خاموشی سے دونوں بیٹھے رہے پھر جب نبیلہ کی سانسیں بحال ہوئیں وہ اٹھی۔ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال اور غٹ غٹ کرکے پی گئی۔ بیسن کے پاس جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور واپس آکر صوفے پر نڈھال ہو گئی۔ کھلے ہوئے بالوں کو پیچھے ڈال کر چھت کو گھورنے لگی۔ کیڈرک اپنی جگہ بیٹھا سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے بھی وہ کتنی بار نبیلہ کو سمجھا چکا تھا۔ مگر وہ اپنے ذہن سے کہاں کچھ نکال پا رہی تھی۔

جس دن سے یوگوسلاوین نیشنل آرمی کے چار فوجیوں نے اس کی عصمت لوٹی تھی اسی دن سے وہ طرح طرح کے ہیبت ناک خواب دیکھنے لگی تھی ورنہ اس سے پہلے اس کی ایسی حالت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو بہت بہادر لڑکی ہوا کرتی تھی۔ بچپن سے اس کو شکار کا شوق تھا۔ گھنے جنگلوں میں بے خوف و خطر اکیلی چلی جایا کرتی تھی۔ کئی خطرناک قسم کے جانوروں کو اس نے مارا بھی تھا۔ جن کی کھالیں اب بھی اس کے ڈرائنگ روم کی زینت بنی ہوئی تھیں مگر اب کبھی کبھی وہ ان کھالوں سے ہی خوف زدہ ہو جایا کرتی۔ عصمت لٹ جانے کے بعد سے وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اور وہ لمحہ جب اس کے جسم کے مینار سے عزت کے نگینے نوچ گئے، وہ کسی طرح اس منظر کو بھول نہیں پا رہی تھی۔ حالاں کہ وہ اکیلی نہیں تھی جس کے ساتھ یہ سلوک ہوا۔ کم و بیش پچاس ہزار لڑکیوں، عورتوں کو پامال کیا گیا تھا۔ یہ تعداد بھی سرکاری ذرائع کی دی ہوئی ہے۔ غیر سرکاری آنکڑے تو اس سے کہیں زیادہ بتا رہے ہیں۔ جن کے پاک رحموں، میں حرام خون انڈیلا گیا۔ بہتوں نے تو یہ خون سڑکوں پر تھوک دیا مگر ہزاروں اب بھی ایسی تھیں جو اپنے اندر نفرت اور حقارت کے جذبوں کے باوجود خون کے یہ لوتھڑے اپنے اجسام سے علیحدہ کرنے میں ناکام رہی تھیں۔ اور یہ ناپاک قطرے احساس حقارت کے ساتھ ان کے بطنوں میں پرورش پانے لگے تھے۔

کیڈرک اور نبیلہ جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے تھے ایسا نہیں تھا کہ سراجیوں میں اچھے تعلیمی ادارے نہیں تھے۔ بس وہ پڑھائی کے ساتھ ہاسٹل کی زندگی سے بھی لطف اندوز ہونا چاہتی تھی اور اس کے لئے اسے ہائیڈل برگ سے زیادہ اور کوئی مناسب جگہ نظر نہیں آئی۔

کیڈرک نبیلہ سے ایک سال سینئر تھا۔ پڑھائی لکھائی میں وہ شروع سے ہی بہت تیز تھا۔ مگر جہاں تک زندگی کے تجربوں کا سوال تھا وہ نبیلہ کے پاس زیادہ تھے نبیلہ بھی عام مغربی لڑکیوں کی طرح جینس اور شرٹ پہننا پسند کرتی تھی۔ مگر اس کے باوجود مغربی تہذیب کی حمایتی نہیں تھی کیڈرک سے اکثر کسی بات پر بحث کرنے لگتی۔ دوران گفتگو اسے معلوم ہوتا کہ کیڈرک کو تو اپنے ملک کی تاریخ کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں۔۔ وہ نبیلہ کے سامنے اپنی جہالت ٹالتے ہوئے کہتا کہ دراصل میری پیدائش جرمن میں ہوئی۔ اوائل عمری کا وہ زمانہ جب اس طرح کی باتیں آسانی سے یاد ہو جایا کرتی ہیں۔ میں نے وہ وقت تو جرمن میں

ہی گذارا ہے۔ کیڈرک کے بے تکے جواب پر وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ پاتی۔ لیکن بات ختم ہونے سے پہلے وہ کیڈرک کو بتانا نہیں بھولتی کہ یہاں کی پوری آبادی کا سلاوی نسل ہے جس کو عرب مورخین صقالبہ کہتے ہیں اور ماضی قریب تک وہاں کے مسلم رہنما اپنے آپ کو ترک سلاطین کی رعایا سمجھتے تھے مگر وہ قومی اور نسلی تصور سے بالاتر تھے۔

مجھے ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کیڈرک اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا نبیلہ کچھ سوچ کر خاموش ہو جاتی۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگتے۔ نبیلہ لڑکوں میں آسانی سے گھل مل نہیں پاتی لڑکے اس کی اس عادت کو تکبر پر محمول کرتے اور پروردگار نے اسے شکل و صورت تو ایسی ہی دے رکھی تھی۔ اگر وہ مشرق کے کسی ملک میں پیدا ہوئی ہوتی تو عشاق کے الزامات میں صداقت ممکن تھی۔ مگر مغرب کے حسیناؤں کو اور تو سب کچھ ہوتا ہے۔ اپنے حسن پر غرور نہیں ہوتا۔ ورنہ وہ بنی نوع انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات کو اس سے حظ اٹھانے کی اجازت کبھی نہیں دیتیں۔ کئی لڑکوں نے نبیلہ کی طرف عشق کا لنگر اچھالا۔ مگر وہ ایسی کشتی تھی کہ کسی کے گھاٹ نہیں لگی۔ البتہ جس لڑکے پر اسے اعتماد ہو جاتا کہ وہ اس کا اچھا دوست ثابت ہو سکتا ہے۔ تو وہ اس سے دوستی کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں کرتی۔ لڑکا یہ سوچ کر اس طرح بھی اس کا قرب حاصل کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ نہایت صاف گو واقع ہوئی تھی۔ اور یہی سبب اپنے احباب کو بھی دیتی۔ کیڈرک نے جب پہلی بار نبیلہ کو دیکھا۔ تو وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ ذہانت کے نور سے دلکش اس کی نیلی آنکھوں نے کیڈرک کے ہوش و حواس کو لپیٹ کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ تو اس نے آفت کی اس پرکالا کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ سب سے زیادہ خوشی اسے یہ جان کر ہوئی کہ وہ سراجیوو کی رہنے والی ہے کیوں کہ وہ خود بھی سراجیوو کا ہی رہنے والا تھا۔

ایک دن نبیلہ روز کی طرح کلاس جانے کے لئے اپنے کمرے سے نکلی۔ لفٹ میں داخل ہوئی۔ اس سے پہلے کہ دروازہ بند ہو پاتا کیڈرک نہ جانے کہاں سے نکل کر لفٹ میں گھس آیا۔ نبیلہ نے سرسری طور پر اس کا جائزہ لیا۔ اسے یاد آیا کہ اس چہرے کو وہ اکثر کیمپس میں دیکھ چکی تھی۔ بلکہ ادھر کئی دنوں سے وہ اس کا تعاقب کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کہیں اس وقت بھی تو۔۔۔ اسی وقت کیڈرک نے نبیلہ سے پہلے ہی گراؤنڈ فلور کا بٹن دبا دیا۔ کیڈرک مسلسل نبیلہ

کو ہی گھورے جا رہا تھا۔ مگر نبیلہ اپنی نظریں ادھر ادھر گھمانے میں ہی مصروف رہی۔ مثلاً کیڈرک بول پڑا۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ تم میں اس قدر کیوں ہے۔؟ وہ چپ چاپ اس کا منہ تکتی رہ گئی۔ وہ اس بے موقع سوال کے لئے بھی ہرگز تیار نہیں تھی۔ وہ کوئی اچھا برا جواب دے پاتی کہ لفٹ رک گئی۔ کیڈرک جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گیا۔ دوسرے دن سے کیڈرک اور نبیلہ ہر جگہ ایک دوسرے کے ساتھ نظر آنے لگے۔ نبیلہ نے کیڈرک کو دل دیتے وقت یا اس کے بعد تک نہیں سوچا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ اور کیڈرک مسیحی سرب۔ تاہم ملک میں مسلمانوں اور سربوں کے مابین کھچڑی پک رہی تھی۔ اس بات سے بے نیاز ہو کر دونوں نے وعدہ کر لیا کہ پڑھائی ختم ہوتے ہی وہ شادی کر لیں گے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے مذہب کے متعلق خوب گرما گرم بحثیں کرتے۔ کیڈرک نے اسلام متعلق نبیلہ کی زبانی تھوڑا بہت سن رکھا تھا۔ بعض اوقات بڑے بے تکے سوالات کرتا۔ نبیلہ اپنے علم کی روشنی میں تفصیل سے اسے سمجھاتی۔ نبیلہ کو پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی بہت تھا۔ اس نے اسلامی تاریخ کے علاوہ اور بھی کئی مذاہب کی تاریخ کا باقاعدگی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ کیڈرک سے جب عیسائی مذہب سے متعلق عیسائی قسم کے سوال کرتی۔ اسلام اور عیسائیت کے سوال پر اپنے دلائل پیش کرتی تو کیڈرک کو ہتھیار ڈالنے میں بہت زیادہ وقت نہیں لگتا۔ بے کار کی بحث میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں یہ کہہ کر بات کا رخ موڑ جاتا۔ نبیلہ جانتی تھی کہ کیڈرک کے پاس اس کے سوالوں کا جواب نہیں کیڈرک بے چارہ اپنی خجالت مٹاتے ہوئے دوبارہ پھر گویا ہوتا۔ لگتا ہے شادی کے بعد تم مجھے مسلمان بنا کر ہی چھوڑو گی۔ اس کی اس بات پر نبیلہ زور سے ہنس دیتی۔ اس کے موتیوں سے دانت چمک اٹھتے۔ کیڈرک کو نبیلہ کی جو چیزیں بہت زیادہ پسند تھیں۔ ان میں ایک اس کی ہنسی بھی تھی۔ اس لئے نبیلہ کو ہنساتے رہنے کی تگ و دو کرتا رہتا۔ لیکن ادھر نبیلہ کی ہنسی کی کھنکھناہٹ توپوں کے دھماکوں میں کہیں معدوم ہوتی جا رہی تھی۔

ایک شام اس نے ریڈیو پر سرب حکمران کی تقریر سنی جس میں وہ اپنی قوم سے خطاب کر رہا تھا۔ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ یورپ کی تاریخ میں اس سے بیشتر اس ریڈیو اسٹیشن سے اتنے کھلے ہوئے بیانات کسی نے نہیں دیئے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر ہماری مقدس سرزمین سے مسلم کمیونسٹ اور بنیاد

لوگ نہیں جانتے تو ان سب کے سر قلم کر دیئے جائیں گے۔ آگے
وہ سرب ہو یا کروٹ جرأت و شجاعت کی دیومالائی شخصیات کی پیروی پر آمادہ
کرتا تھا۔ اپنے بڑا ڈیڈی میں وہ سربوں کو شتشل کرتا رہا اور اس میں
کامیاب بھی ہوا۔ گیوں کا موت کی شرح میں اس کے بعد مزید اضافہ
ہوا تھا۔ نبیلہ نے کیڈرک سے اس مہم کے خلاف آواز اٹھانے کو کہا۔
کیڈرک جانتا تھا کہ یہ اس کے لئے ممکن نہیں۔ اگر حکومت کو اس بات
کا شبہ بھی ہو گیا کہ وہ اس تشدد اور بربریت کے خلاف ہے۔
تو وہ اسے مار دینے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کریں گے۔ اپنی
پریشانی اس نے نبیلہ کو بھی بتائی تھی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس نے بغیر چوں
چرا کے اس کی باتوں کا یقین کر لیا۔ ورنہ وہ یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ تم اپنی
قوم کی اعانت کر رہے ہو۔ قبل ازیں کہ وہ کچھ لوگوں کو اس فاشزم کے
خلاف منظم کر پاتی، چند سفاک ہاتھوں نے اس کی آبرو کی پوٹلی چھین لی۔
جس کی وجہ سے وہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی۔

کمیونسٹوں کا مطلق العنان نظام جیسے جیسے کمزور پڑنا شروع
ہوا اور اس کی جگہ قومیت کی طاقتور آندھیاں لوجی بحال ہو رہی تھی ویسے
ویسے کمیونزم نظریہ رکھنے والے ادھر ادھر منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔
اس خانہ جنگی کے دوران نبیلہ کو احساس ہوا کہ قومیت بھی مغربی
دنیا میں پاسپورٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ لیکن اب یہاں کی
زمین چھوڑ کر جائے بھی تو کہاں... کس کے پاس... یہاں کی مٹی میں
اس کے اجداد کی ہڈیاں دفن ہیں۔ اور کسی روز ہمیں اسے بھی پیوند
خاک ہو جانا ہے۔ لیکن وہ ریفیوجی کیمپ میں مرنے کو تیار نہیں تھی اور
وہ سب کچھ کئے بغیر بھی جو اس نے چند دنوں میں سوچا تھا۔ یہی احساس
اسے اندر سے مسمار کرتا جا رہا تھا۔ رہ رہ کر اس میں نفرت کے آتش
فشاں پھوٹ رہے تھے۔ آبرو گنوانے کے بعد وہ کچھ باغی سی
ہو گئی تھی۔ مگر کمزور اس سے بھی زیادہ اور یہ وہ خود بھی جانتی تھی۔

ملک کے سردار اور اقوام متحدہ کے سربراہوں کے ہمراہ
امن اور خیر سگالی کے لئے بحث و مباحث ہو رہے تھے۔ اگرچہ
ابھی ابھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا لیکن مستقبل قریب میں بعید نہیں کہ
اتفاق رائے ہو جائے۔ وہ سپہ سالار جو ہٹلر اور اسٹالن کی تقلید
کر رہے تھے۔ ان کے یہ بیان کہ ہمارے فوجی آگ اور خون کے
دریا پار کر کے کہیں ٹھہر کر اگر عورت کی کچھ تلاش حاصل کر لیتے ہیں تو
اس میں قباحت کیا ہے؟ اعتراض اگر عورت کے مسلمان ہونے پر
ہے تو یہ مضحکہ خیز بیان ہے۔ عورت پہلے عورت ہوتی ہے....
صرف عورت... ممکن ہے کہ اس طرح کا نظریہ رکھنے والوں
کی فکریں تبدیل ہو جائیں۔ وہ بھی اس طرح سوچنے لگیں جس طرح
آج ہم سوچ رہے ہیں۔

نبیلہ کو بھی ایک ایسے ہی کسی دن کا انتظار تھا۔ ایک تو وہ اپنے
خوابوں سے اس قدر پریشان ہو چکی تھی کہ اس کی سوچنے سمجھنے کی
صلاحیت بھی مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے وہ رات دیر تک
جاگتی رہتی۔ آنکھ لگتی بھی تو کوئی آہٹ پا کر ایک دم سے بڑبڑا اٹھتی
ہزار کوششوں کے باوجود وہ ہراس کے عمیق غار میں خود کو گرنے
سے نہیں روک پا رہی تھی۔ آنکھ کھلنے کے بعد سارا سارا دن
خواب کے ریزے اس کے دماغ کے آس پاس سے گزرتے رہتے
اتنا بڑا فلیٹ جہاں ابھی دو سال پہلے تک اس کے والدین ساتھ
رہا کرتے تھے۔ لیکن ایک روز اس کی ماں کار ایکسیڈنٹ میں ماری
گئی۔ اور باپ سات ماہ قبل ایک فوجی کی گولیوں کا نشانہ بنا۔ اس دن
وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ڈیڈی سے طرح طرح کے سوال پوچھ
رہی تھی۔ ڈیڈی اسے پیار سے سمجھا رہے تھے کہ جب ایشیائی قبائل
جو دوسرے قبیلوں کی غارت گری سے عاجز آ کر مغرب کی طرف ہجرت
کر آئے تھے۔ اور وادیٔ بلقان میں دریائے ڈینیوب کے کنارے
خیمہ زن ہو گئے تھے۔ ان قبائل نے مدتوں اپنی انفرادیت،
اور مذہبی تشخص کو باقی رکھا۔ یہ قبیلے بھی کسی اور کے نہیں۔ سرب کروٹ
اور بوسنی کے تھے۔ ظاہر ہے کروٹ ابتدا سے ہی لاطینی عیسائیت
کے پیرو تھے۔ اور سرب یونانی کلیسا کے متبع تھے۔ ان دونوں کے
درمیان سخت معرکہ آرائی رہتی تھی۔ چنانچہ بوسنی قبائل نے ان
معرکوں سے تنگ آ کر ایک نیا مذہب اختیار کیا۔ جو بوگومل مذہب
کے نام سے مشہور ہوا۔ ڈیڈی کے یہ آخری جملے لفظ بلفظ اس کے
ذہن میں تازہ تھے۔ اس کے بعد وہ اچانک اٹھے اور باہر جانے کا
ارادہ ظاہر کیا۔ کتنا روکا تھا اس نے اپنے باپ کو لیکن باپ نے اس
کی ایک نہ سنی۔ یہی کہتا رہا کہ اب اس علاقے میں امن ہے۔ کچھ
نہیں ہوگا۔ اور پھر میں کون سا بہت دور جا رہا ہوں۔ یہیں سامنے
ڈپارٹمنٹل اسٹور تک ہی تو جانا ہے۔۔۔ یوں گیا۔ یوں۔۔۔ آیا۔
شفقت سے اس نے نبیلہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سیڑھیاں اتر گیا۔ ذرا دیر
بعد گولیوں کی تڑ۔ تڑ۔ چلنے کی آواز اسے سنائی دی۔ اس کا

دل دہل گیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی کمرے سے باہر نہیں جھانک سکی تھی اسے معلوم تھا کہ بندوق کا منہ کمرے کی طرف گھوم جائے گا۔ گولیوں کے تڑ۔۔ تڑ۔۔۔ چلنے کی آواز اس بار دوسرے لوگوں کو سنائی دے گی۔ اس کے بعد بھی لیے ڈیڈی کے لوٹ آنے کا انتظار کرتی رہی۔ جو پھر کبھی نہیں آیا۔ اکثر ذہن میں یہ خیال کچوکے لگاتا کہ پتہ نہیں کفن بھی نصیب ہوا یا جانوروں کا نوالہ بن گیا۔

مہینے بھر بعد نبیلہ کے سامنے ایک نئی مصیبت آکھڑی ہوئی۔ ایک بے جان پتھر جو قطرہ کی شکل میں اس کے جسم کی جھیل میں اچھالا گیا تھا۔ اس پر سبزہ نمودار ہونے لگا۔ حیرت و استعجاب سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس طرف تو اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اس نے فوراً کیڈرک کو خبر دی۔ کیڈرک نے کہا کہ ابھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ بیج کی جڑیں زمین میں پھیلیں اسے اکھاڑ پھینکو۔ یہ جواب سن کر وہ اور زیادہ پریشان ہوئی۔ اس نے کہا یہی تو میری کوکھ کے باہر بھی ہو رہا ہے اب تم وہی سب کچھ میرے اندر بھی دیکھنا چاہتے ہو۔۔!

”تو کیا تم اس بچے کو پیدا کرنا چاہتی ہو۔ کیڈرک نے جھنجلا کر سوال کیا۔

نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔ لیکن میں اسے مار بھی نہیں سکتی۔ مجھے اپنے جسم سے کراہیت ہو رہی ہے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کیڈرک لیکن میں یہ اسقاط نہیں کرا سکتی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کیڈرک نبیلہ کو عورت سے ماں بنتے دیکھتا رہا۔ نبیلہ اس کے شانوں پر سر رکھ کر دیر تک روتی رہی۔ کیڈرک سوچتا رہا کہ بچے کے ساتھ نبیلہ کو قبول کرنا خاصہ مشکل کام ہے۔ ایسی بات واضح طور پر نبیلہ سے کہہ سکنے کی ہمت بھی وہ اپنے اندر مجتمع نہیں کر پا رہا تھا۔ عجیب مخمصے میں وہ خود بھی پھنسا ہوا تھا۔ نبیلہ کو چھوڑنے کی اس سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ جب ڈیو کرینک یا سلنگ کچھ لوگوں نے اسے کہانی کر جبر ڈپٹنے کا حکم دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ ایک صرب کے لئے کسی مسلم لڑکی کے ساتھ اس طرح گھومنا پھرنا خود اس کے لئے نقصان کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس وقت کیڈرک نے نبیلہ کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ ساتھ تو وہ چھوڑنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ لیکن بچے سمیت نبیلہ کو تسلیم کرنے کے لئے وہ خود کو آمادہ نہیں کر پا رہا تھا۔

گھر آکر اس نے اپنی پریشان ماں کو بتائی کیڈرک سارے مشورے اپنی ماں سے ہی کرتا تھا کیونکہ اس کا باپ یوگوسلاویا کی قومی فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اور اکثر گھر سے باہر ہی رہتا۔ کیڈرک کی پرورش اور تربیت اس کی ماں کی زیر نگرانی ہوئی تھی۔ باپ نے تو کیڈرک کو جوان ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ شاید اس لئے کیڈرک اپنے باپ سے کچھ خفا سا رہتا تھا۔ اس کا باپ جن دنوں محاذ سے گھر آیا ہوتا کیڈرک اپنا بیشتر وقت گھر سے باہر گزارتا۔ اس وقت اگر ملک میں لڑائی نہ چل رہی ہوتی تو اس کا باپ آتش دان کے قریب بیٹھا شراب پی رہا ہوتا۔ اور وقفہ وقفہ سے فائر۔۔۔ شوٹ۔۔۔ کے آرڈر جاری کر رہا ہوتا۔ اور ماں حکم حاکم مرگ مفاجات، دوڑ، دوڑ کر سارے کام برابر سر انجام کر رہی ہوتی۔

کیڈرک نے کچھ دیر انتظار کے بعد ماں سے پھر پوچھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے!

حمل ضائع کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماں کے لہجے میں حکم واضح تھا۔ نبیلہ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو تمہیں وہ بچہ بھی تسلیم کرنا ہوگا۔

کیا تم سمجھتی ہو کہ ایک ایسے بچے کے ساتھ جو کسی دوسرے کا نطفہ ہو زندگی گزاری جا سکتی ہے؟ کیڈرک نے دوسرا سوال کیا۔

ہاں۔۔۔ اس میں مشکل کیا ہے؟! ماں اب بھی اپنے فیصلے پر اٹل تھی۔

لیکن کیسے؟ کیڈرک بھی بحث کے موڈ میں تھا۔

جیسے میں نے گزار دی۔ ماں کی آواز پُر اعتماد تھی۔ کیڈرک حیرت سے اپنی ماں کو دیکھتا رہا۔ ”مجھ میں اور نبیلہ کے پیٹ میں پل رہے بچے میں بہت فرق ہے۔ میں اس بچے کا باپ نہیں۔ جبکہ تم تو میری اپنی ماں ہو۔“

بے شک مگر تم یہ نہ بھولو کہ ماں بن کر اپنی کوکھ سے جنم دینا جس قدر مشکل کام ہے۔ باپ بن کر کسی بچے کو اپنا نام دینا اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جو کام تمہارا باپ نہیں کر سکا تم کرو۔ بات نکل ہی گئی ہے تو ایک اور انکشاف کر دوں۔ میں صرب نہیں ہوں۔ ایک نازی افسر ہوں جب ان کی قیادت میں روسی افواج جرمنی پر حملہ آور ہوئیں تو میری بھی عزت لوٹ لی گئی تھی تم اس لوٹ کا ثمر ہو۔ یہ سب تو شروع سے ہوتا آیا ہے۔ اور آخر تک ہوتا رہے گا۔ تم یہ سوچو کہ اگر اس وقت میں تمہارا اسقاط کرا دیا ہوتا تو ظاہر ہے تم اس وقت موجود نہ ہوتے۔ زندگی ایسے تمام واقعات سے بڑی ہے کیڈ۔۔۔ یاد رکھو کہ کسی انسان کی جان لینا ہی ناممکن

مالک کے بغیر بھی یہ پل سکتے ہیں کا رستا ابھی نا شہر ہے۔ مقصد تو دونوں کا اپنا مفاد ہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ممکن ہے تم میری بات سے اتفاق نہ کرو لیکن اگر تم اپنی پیدائش کو ناجائز سمجھتے ہو تو اپنے ہاتھوں سے اسے ختم کر دو۔ تمہارا مطلب میں کیوں پورا کروں۔ اس کے آگے کچھ اور بولنے سے پہلے کینڈرک نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکا گویا کہہ رہا ہو کہ میں سمجھ گیا میں سب سمجھ گیا . . . ."

گاڑی نکال کر وہ سیدھا نبیلہ کے پاس پہنچا۔ دروازہ پُش کیا تو وہ کھل گیا۔ نبیلہ کو وہ تھوڑی دیر پہلے جس طرح چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ کارپیٹ پر اسی طرح سو گئی تھی۔ کینڈرک اس کے قریب پہنچا کہ وہ ایک زوردار چیخ مار کر اٹھ بیٹھی اس کا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا کینڈرک کو اپنے پاس پاکر اس نے قدرے راحت کا سانس لیا۔ کینڈرک کی نظر نبیلہ کے سپاٹ شکم کی طرف گئی۔ نائلان کی ہلکی گلابی نائٹی کے نیچے اسے ایک بچہ بالکل واضح نظر آ رہا تھا۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بچہ کوئی اور نہیں وہ خود ہے۔ اور یہ بیٹا نبیلہ کا نہیں اس کی ماں کا ہے! ✻

محمد امین اعجاز



ایک رنگ سے بنی ہوئی تصویریں سب
پھر بھی کہتی جدا جدا تقریریں سب

سورج فنا آتی ہے مٹتی جاتی ہے
ریت پہ جیسے لکھی ہوئی تحریریں سب

دیکھ رہی ہیں خواب سہانے سب آنکھیں
ڈھونڈ رہے ہیں خوابوں کی تعبیریں سب

سب کی اپنی کچھ نہ کچھ مجبوری ہے
پہنے ہوئے ہیں پاؤں میں اک زنجیریں سب

جس میں جتنی وسعت تھی اتنا ہی ملا
نور ایک اللہ نور کی ہیں تنویریں سب

● حاجی منزل مومن پورہ [illegible] برہانپور، ایم پی ۴۵۰۳۳۱

متین انصاری



صدا اذان کی جب مسجدوں سے آتی ہے
گمان ہوتا ہے خوشبو گلوں سے آتی ہے

خلا نے کھول دیئے اپنے سامنے دروازے
مہک اذان کی کس کے پردوں سے آتی ہے

تمہاری یاد کے گھنگھرو بدن میں بجتے ہیں
تمہاری یاد بھی اب دھڑکنوں سے آتی ہے

تم اپنے پیروں کو رستوں سے باندھ کر رکھنا
صدا کچھ ایسی مجھے منزلوں سے آتی ہے

تری وفاؤں کا تجھ کو صلہ ملا ہے متین
خبر خوشی کی ترے دشمنوں سے آتی ہے

● ۲۲۳ مومن پورہ ـ پٹنہ ۴۴ ۴۱۱۰

جاوید راہی

◆

مرے سینے میں کوئی درد جگا، مری آنکھ کو پانی پانی کر
اے یارِ ستمگر کچھ لمحے، مرے دل میں تو مہمانی کر

کیا سوچ کے جانے سلطان نے، ایک مانگنے والے سے کہا
تو اپنا کاسہ دے مجھ کو، آ میری جگہ سلطانی کر

یہ میرا دل، یہ ان کا دل، تو ایسا کر لے جب آنا
یہ موم ہے اس کو پتھر کر، وہ پتھر ہے اسے پانی کر

اے یار جو مجنوں بننا ہے، تو قیس کے جیسا مجنوں بن
صحرا کو بنا مسکن اپنا، دنیا سے دو گردانی کر

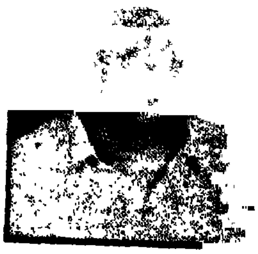
وہ کون تھا کیسا تھا راہی، اب چھوڑ یہ قصہ بیتے کا
جس یاد سے دل پہ ٹھیس لگے، اس یاد کو آنی جانی کر

● شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں توی

اشتیاق سعید

دکان نمبر ۱، مصطفیٰ منزل، پائپ روڈ کرلا (ویسٹ) بمبئی ۷۰

ہل جوتا



"بولوارے ... ارے جو کھوا" ٹھاکر رام پال کھیت کی مینڈ پر کھڑے چرواہے کی رٹ منہ کئے جو کھوا کی تلاش میں تھے کہ جو کھوا آواز سنتے ہی جو کھوا جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ ادھیڑ عمر، لاغر سا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی صرف لنگوٹ نما دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ اس نے آواز کی سمت ماتھے پر ہتھیلی کا چھجا بنا کر چندھیائی آنکھوں سے دیکھا۔ "ارے دُدا ہو دُدا.... بابو ساحیب!" اس کے لب بڑبڑائے اور ذرا پاتھر تھر کانپنے لگا۔ آواز نے دوبارہ آ کے کانوں سے ٹکرائی۔ جواباً اس نے حلق پہ ساری قوت لگا دی۔ "آوت ہوں بابو صاحب ... آوت ہوں" اور سرپٹ دوڑ پڑا۔ گھتی خاردار جھاڑیاں اور کھیت کی مینڈوں کو لانگتے پھلانگتے رام پال کے حضور پہنچ کر ہنگ چلے بیل کی مانند ہانپنے لگا۔

ٹھاکر صاحب آپے میں نہ تھے۔ کھینچ کے ایک زنّاٹے دار تھپڑ اس کے پچکے گال پر جڑ دیا۔

"سُکارے حرام جادہ ... ای بیلا ہو گئی ... گھام (دھوپ) سر پہ چڑھی آوا۔ پر کھیتن ماں۔ ابھی ہل ناہی پڑا۔ جا تو چھوڑ رکھیں کا ... کھانے کے تو اڑھائی سیر چاہی آور کام ... !"

ٹھاکر کے اس رویے سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور آواز بند ہو گئی۔ "بیر ماہے تو کا ہو ا ہری تو نا ہی نا ... ! چل بیٹی چھو، جلدی سے ہل بیل لے آؤ ..."

چار دن ہو گرا سینہائی ہوئے" "آج ہو جائے وہ بابو ساحیب"

"دھت سارے کھیتوا ٹھک جائی تب جوتبے" ای جان لے آج کو نو طرح کھیت جوتا جائے چاہی۔ جیا کی تیاری جیٹھے پارے"

جو کھوا آنکھوں کی نہر سوکھے پچکے گالوں سے کیت سینچنے گی۔ اور سوچنے پر پشیمان ہوئے جانے کتنے ہل ایک ساتھ چلنے لگے ... وہ سوچنے لگا۔ ہل جوتائی کا جو دن بھی کوئی جیون ہے ! بیلوں کے سنگ کام کرتے کرتے کیا ہم بھی بیل بن گئے ! اسے ہم تو جیٹھ بیساکھ کی چلچلاتی دھوپ، پوس ماگھ کی کڑاکے کی سردی چاہے ساون بھادوں کی بارش ہو اپنے شریر کو کشٹ دیتے ہیں۔ بدلے میں ملتا ہے کیا ؟ دو وقت کی روٹی ... وہ بھی بھر پیٹ نہیں۔

کہتے ہیں بارہ برس بیتے گھورے کے دن بھی پھرتے ہیں۔ دن بیتے ... وقت نے کروٹ لی۔ رفتہ رفتہ ہل جوتے روزی اگلنے شہروں کی سمت کوچ کرنے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی نائی، دھوبی، کمہار، بڑھئی لوہار وغیرہ بھی شہر سدھارنے لگے۔ ہل جوتوں میں سے جو گاؤں میں رہ گئے۔ وہ ہل جوتائی ترک کر کے مزدور ہو گئے۔ یعنی بھائی ختم کر کے دہاڑی پہ ہل جوتنے لگے۔ اس کارن دھیرے دھیرے بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں بجنا کم ہو گئیں۔ اور رہٹ کے نغمے خاموش ہوتے گئے۔ پھر ان کی جگہ پمپنگ سیٹ، تھریشر اور ٹریکٹر نے لے لی۔ یوں ہل جوتوں کی کمی کی تلافی ہوتی اور کام وقت سے پیشتر ہونے لگا ... ادھر کھادی گرام ادیوگ نے پاؤں پسارے ... جا بجا ہتھ کرگھے گڑ گئے۔ دریاں اور چادریں بُنی جانے لگیں۔ گرام پنچایت کا بول بالا ہوا۔ بینکوں سے مویشی اور مچھلی پالن کے لئے آسان قسطوں پر قرض منظور ہونے لگے۔ بلاک سے کسانوں کو بیج اور کھاد رعایتی داموں پر مہیا کی جانے لگیں۔

غرض کہ گاؤں میں پس ماندہ اور محنت کش طبقات خوش حال ہونے لگے۔ ان کی بہ نسبت اونچے طبقے کی مسند پر مہاجنی کا جال بچھائے بیٹھے گئے لوگ ناآسودگی کا شکار ہونے لگے۔ ہل جوتوں کو قرض دے کر سود کی صورت میں چوس چوس کے جو توندیں نکل آئی تھیں پچک گئیں۔

ٹھاکر رام پال کا بھی یہی حشر ہوا۔ کہتے ہیں ہاتھی مر گیا تو سوا لاکھ کا باپ دادا کی جاگیر تھی۔ کچھ پرانے روپے بھی تھے۔ سال دو سال بغیر کسی آمدنی کے کھاتے پیتے رہے۔ ہل جوتائی نہ ہونے کے بعد کھیت پرتی ہی رہے۔ کبھی جوتا تک نہ گیا جبکہ لوگوں نے مشورہ دیا کہ کھیت یونہی پڑے پڑے اوسر ہو جائیں گے ... جھاڑ جھنکاڑ اُگ آتی ہیں۔ ہل

چاہ اگر کچھ نہیں تو جو بھی ہو اے پیٹ تاکہ کھیتوں کا جو بن بنا رہے۔ یہ ٹھاکر صاحب وضع داری کی بلندی سے ان کی پستی دیکھنے والوں میں سے نہیں تھے وہ ہل جوتوں کو نظر کے جس زاویئے سے دیکھتے رہے تھے۔ حالات کے دائرے میں بھی وہ زاویہ چاہتے تھے نتیجتاً کئی بیگھ زمینیں شراب میں غرق ہو گئیں

باپ کی یہ گت دیکھ کر بیٹے جگپال کو اجداد کی ساکھ ڈگمگاتی محسوس ہوئی۔ ابتدا میں تو جوتے کھیت اور کچھ آمدنی کی بابت وہ غور کرنے لگا کافی غور و خوض کے بعد ٹریکٹر خریدنے کی بابت کرید لگائی پر کسی طرح باپ کو سمجھا بجھا کر ٹریکٹر خریدنے پر آمادہ کیا۔ بنجر زمینیں بکیں، اور ٹریکٹر آ گیا۔ پھر کیا تھا۔ سوکھی بنجر پڑی زمینیں نہر کے پانی سے سیراب کی گئیں۔ ٹریکٹر سے جوت جوت کے مٹی نرم بھربھری کر کے خریف کی فصل بو دی گئی۔ مٹی کی سوندھی سوندھی مہکاریں جب نتھنوں میں سرایت کرنے لگیں۔ اور اتھ پیروں نے شفقت آمیز مس محسوس کیا تو جگپال کو کھیتی سے انسیت ہو گئی۔ اور وہ فصل کا خوب خیال رکھنے لگا۔ حسب ضرورت کھاد پانی نیز دیگر جراثیم کش دوائیں مہیا کرتا رہا۔ آخر کار محنت رنگ لائی۔۔۔ فصل خوب ہوئی۔ اتنی کہ سارا گاؤں رشک کرنے لگا۔ لوگوں کی نگاہ میں وہ محنت و لگن کی تمثیل بن گیا۔ ہر سو اس کے چرچے ہونے لگے۔

وہ بھی اپنی کامیابی پر پھولے نہ سماتا تھا۔ پر جلد ہی اس کامیابی پر اوس پڑ گئی جب فصل کی کٹائی کے واسطے مزدوروں کا مسئلہ آن کھڑا ہوا۔

فصل تو جیسے تیسے بو دی گئی تھی پر اب کٹائی کیسے ہو؟ سبھی مزدور اپنے اپنے کھیت کاٹنے میں لگے تھے۔ دوگنی اجرت پر بھی راضی نہ ہوتے۔ بس یہی کہتے۔ "ٹھاکر بابو بڑا روزہ ہوت ہے۔ کہوں پانی برس جائی تو ہم لوگ کا کل سخت (محنت) پانی ہو جائی۔ دو دنی اوسوئی ہو جائے دو۔۔۔ دانہ بھوسا کھلیان سے اٹھ جائے تب آپ کا کٹیا کر دہل جائی۔"

نہ جانے یہ بات کیسے ٹھاکر صاحب تک جا پہنچی۔ وہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئے۔ "چمروٹن کی ای مجال۔۔۔ نیچ کہوں کے"۔ پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ کھیت جا پہنچے اور کسی دوشیزہ کی مانند جھومتی ناچتی فصلوں کو کرودھ کی آگنی دکھا دی۔ کھڑی فصل جل کے سواہا ہو گئی۔ جگپال باپ کے مزاج سے واقف تھا اس لئے چپ سادھ لی۔

ادھر گاؤں والے جگپال کی فصل دیکھ کر ٹریکٹر کی افادیت کا اندازہ کر چکے تھے وہ بھی اپنے کھیتوں کو بیلوں والے ہل کی بجائے ٹریکٹر سے جوتنے کی ترکیبیں لڑا رہے تھے۔ یہ خبر جگپال تک پہنچی تو اسے اپنے بیکار ہوتے ٹریکٹر کا استعمال اور آمدنی کا ذریعہ دکھائی دینے لگا۔ موقع کو غنیمت جان کر وہ ٹریکٹر کرائے پر جوتنے کے لئے پیش کر دیا۔ گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے انہیں اتنی آسانیاں میسر ہوئیں۔ کہ ایک ایک کر کے سبھی بیلوں والے ہل سے کھیت جوتنا ہی ترک کر دیا۔

مزدور ہل جوتوں نے بھی ٹریکٹر کی غرض و غایت محسوس کی اور خود کو مشینی دور کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔

جگپال کا کام بہر حال اس قدر بڑھا کہ کھانے تک کی فرصت نہ ملی۔ اس نے ٹریکٹر کا کرایہ بڑھا دیا۔ اور رقم ایڈوانس لینے لگا تھا اس پر بھی کام وقت پہ نہ ہو پاتا تھا۔ لوگ کھیتوں کی سینچ کر جتائی کے لئے منتظر رہتے۔ جو کھو ہل جوتنے کے پیشے بلیا نے بھی کھیت کی جتائی کے لئے ایڈوانس دے رکھا تھا پر اس کا نمبر ہی نہ آتا۔ جو بھی دن مقرر ہوتا اس دن ٹریکٹر کسی اور کے کھیت میں چلتا۔ اس طرح تین بار اس کے کھیت سوکھ چکے تھے۔ چوتھی دفعہ بھی جب وہی ہوا۔ تو وہ جھنجھلا گیا۔ اور جگپال کو تلاش کرتا حویلی جا پہنچا۔

ٹھاکر صاحب بیمار تھے۔ جگپال ان کی تیمار داری میں مشغول تھا بلیا کو دیکھتے ہی حیلے بہانے کرنے لگا۔ باپ کی بیماری کا سہارا لینا چاہا پھر بھی وہ نہ مانا بس ایک ہی رٹ لگائے رہا۔

"چاہے جو ہو بابو صاحب آج ہمارے کھیت جوتے جائی!"

ٹھاکر صاحب حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کے سائے لہرانے لگے۔ بلیا کی سوچیں سوالیہ علامات کا روپ دھارنے لگیں۔ جگپال باپ کی کیفیت تاڑ کر بلیا کو ان کے آگے سے ہٹانے کے لئے ٹھاکرانہ دھونس جمانے لگا۔

"چل بھاگ سالے۔۔۔ ناہی تو پٹک کے مار بچا بس لات۔۔۔ بیس دفعہ کہہ دینے بابا کا جی اچھا ناہی تو کہو میں ناہی آئت۔۔۔ جا کال پرسوں لے جوتا جائی"۔

بلیا کا پارہ چڑھ گیا۔ لپک کر جگپال کا گریبان پکڑ لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا۔

خبردار اب جو گریلائے۔۔۔ تالو سے جیبھ کھینچ لیب۔۔۔ اب سے کھیت سینچنے میں پیسہ لاگت ہے پیسہ! پیسہ حرام کا ناہی آئت! کان کھول کے سن لیو چاہے جو ہو کل ہمار کھیت جوتا جائی چاہے ٹھاکر جیئیں یا مریں!

اتنا سننا تھا کہ جگپال کے پیچھے تھے سے وہ ٹھٹھک گئی اور ٹھاکر صاحب جو کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے دھم سے بستر پر گر پڑے۔ اور ان کی نگاہوں کے آگے جو کھو کا چہرہ گھومنے لگا۔ *

مکتوبات

ستمبر ۱۹۹۴ء

"کتابی گھر" ۱۹۹۴ء، لکھنؤ

...ن:

...میں آپ کا اداریہ فکر و نظر کے نئے دروازے کھولتا
...ں مکتوبات میں اردو کے لئے انگریزی ہندسے استعمال
...وکالت کی گئی ہے۔ آپ نے ایک بار جو میرا پتہ عربی
...میں لکھا تو بیشتر دوستوں نے اسی کو اپنے یہاں
...لیا اور عربی کی نمبر یعنی ایک لکھے کو خط کے
...غلط سمجھا گیا ہے مکان کا نمبر ۱۴۹ لکھا گیا جس کی وجہ
...خط ملا ہی نہیں ملا۔

...س الرحمن فاروقی اور شہاب سرمدی (مرحوم) کے
...بہت اچھے لگے۔ افسانوں میں شکیل زبیری "حسن و جمال اور
...الدین کی تخلیقات میں نیا پن ہے۔ حسن جمال نے
...افسانے میں کئی جگہ راجستھانی بولی کا بہت خوبصورتی سے
...ل کیا ہے۔ نعیم ضیاء الدین نے ایک غیر ملک میں
...دنیا کے باشندوں کی زبوں حالی کو بہت موثر انداز میں
...ا ہے۔ شکیل زبیری نے بلاجی تبادل کے رسم و رواج اور
...کو پیش کیا ہے۔ اختر یوسف کا افسانہ نسبتاً کمزور ہے۔
...ج کی لہراتا ہے

...ح الدین پرویز:— P.O BOX · 4551 RIYADH (S.ARABIA)

تمہارا سارا دن بدن روشن ہوتا جا رہا ہے۔ ایک دن
...نے کا ارادہ، سارا عہد سے عہد کی مثال بن جائے گا۔ خدا
...وہ دن جلد آئے تم بہت اچھے مدیر ہو، بہت اچھے شاعر
...بہت اچھے مورخ ہو اور بہت اچھے انسان ہو۔ اتنے بہت
...اچھے تم میں کیوں شامل ہو گئے ہیں؟ نئے شمارے میں
...شمس فاروقی کا مضمون دیکھ کے بہت خوشی ہوئی۔ وہ
...سے نئے لکھ رہے ہیں۔ یہ باعث فخر ہے۔ یہ عہد فاروقی
...کا عہد ہے۔ میری ان سے گزارش ہے کہ وہ اس عہد کے
...میں "اس عہد کے ادیبوں" شاعروں اور منظر نامے
...بارے میں زیادہ سے زیادہ لکھیں۔ غالب و میر کو شعرا کے
...نے قبروں کی طرف بھی دھیان دیں۔ کسی بات سچ ہے
...دشمنوں کو کتنی ہی بری لگے۔ (میں نے تو انہیں بہت
...ب سے دیکھا ہے) نئے اردو ادب میں ان کی حیثیت
...تان میں خواجہ بصیری کی طرح ہے۔ فاروقی صاحب کو ادب
...کے بہکاوں نے بہت ستایا ہے اور اس کا اثر ان کی تحریر
...پا لیا ہے۔ اب وہ قلم کو مختصر کم ہلاتے ہیں۔ فاروقی
...کی پوچھنا چاہیے کہ کیا ابھی ان کی تحریر نہیں ہوا۔ ان کی سچ صرف
...ات سچ ہے لیکن وہ جو سچ صرف تو اور رہے ہیں "ان کے
...ان کی کیا رائے ہے؟ ایک اور آخری بات جو میں اس خط
...لیے فاروقی صاحب کو مخاطب ہوں (جو شاید میں ان
...سے نہیں کہہ سکتا) کہ وہ اپنے صاحب شاعروں اور ادیبوں
...شہادت۔ ہیرو یا کسم کے لوگوں پر مضامین لکھ کے"

ان کی تحسین کر کے انہیں خوش نہ کریں بلکہ خود ہی سے خوش ہوں۔
میں قسم کھا کے کہتا ہوں اگر ایسا ہو گیا تو کل زمانہ ان کو ایسے یاد
کرے گا جیسے آج ہم سعدی، حافظ اور خسرو کو یاد کرتے ہیں۔
غزلوں میں شاہد جنگیزی کی دونوں غزلیں اچھی ہیں۔ لیکن یہ
آج کل کی زیادہ تر دو غزلیں ایک سی کیوں لگتی ہیں؟ ڈری
ڈری "سہمی سہمی" مدیر شان دار "جو تکمہ ذہن شہاب سرمدی کا
سرمدی مضمون بہت معلوماتی ہے وہ صاحب علم و فن ہیں۔ علی
گڑھ کے وہ بھی ہیں شاید اب وہ بھی علی گڑھ والے نقاد
تو تنقید کے ٹھیکیدار بن جاتے ہیں" اور یہ مجذوب قسم کے فن کار
— ان کو تو حق جان کے بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس لئے
نہیں کہ تم شاعر کے مدیر ہو "لیکن یہ سچ ہے کہ تمہارا اداریہ
(خوب سیرت فن پارہ — ایک روشن دن کی مثال) بہت
لاجواب ہے۔ لکھتے رہو لکھتے رہو "شاعر زندہ باد—

کنور سین:۔ ای۔ ۴۳ ویسٹ پٹیل نگر۔ نئی دہلی۔ ۸

آپ کا اداریہ دیکھا — واقعی بہت اعلیٰ کاوش ہے۔ آپ
نے ایک تخلیقی کار نامہ سر انجام دیا ہے۔ اردو کی کس مپرسی کا رونا
چھوڑ کر فن پارے کی خصوصیات پر بات کرنا ہی مدیر کے لئے
واجب ہے۔ آپ کا اداریہ مدلل ہے اور باوقار بھی۔ میرا یہ عقیدہ
ہے کہ اچھا کام کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے بنیادی
اوصاف کی وجہ سے نشر ہوتا رہتا ہے اور اس کی جگمگاہٹ عقل کے
اندھوں تک کو نظر آجاتی ہے۔ ارفع فن پارہ اپنی طاقت آپ
ہوتا ہے اور اس میں سے روشنی اور اپنی ضو بکھیر کر رہتا ہے۔
نقادوں کا کیا ہے۔ میں ان کو تین زمروں میں بانٹتا ہوں۔

- وہ نقاد جس میں ذہانت ہے اور دیانت بھی
- وہ نقاد جس میں ذہانت تو ہے دیانت نہیں ہے
- وہ نقاد جن میں نہ ذہانت ہے نہ دیانت

تیسری قسم کے نقادوں کا ہجوم ہے جو اپنی جہالت چھپانے
کے لئے ہر تحریر کے متعلق گھڑے گھڑائے جملے لکھتا رہتا ہے۔
جیسے ایک نام نہاد پروفیسر نقاد جس بھی افسانے کی تعریف
کریں گے یہی کہتے دکھائی دیں گے:—

"اس افسانہ نگار کا ہر افسانہ اپنی دلکشی اور اسلوب اپنے
ساتھ لاتا ہے"۔

بہر حال میں نقاد کو تخلیق کار پر فوقیت نہیں دے سکتا۔
تخلیق کار کی تخلیق ایک ہیرا ہے۔ اور نقاد زیادہ سے زیادہ اس کا
پارکھ ہے۔ اس کی پرکھ کی کسوٹی کتنی سچی ہے۔ کتنی کھوٹی۔ یہ بات
اپنا وجود رکھتی ہے۔ گروہ بندی نقاد کے لئے سم قاتل اور انتہائی
مضر فعل ہے۔ لیکن اردو کے بڑے سے بڑے نقاد کو اس
سے مفر نہیں۔ اسی لئے اس کی کردار کشی اس کے سر چڑھ کر
بولتی ہے۔ جوہر تو ہیرا ہے وہ اپنی آب و تاب کے لئے نقاد کا
مرہون منت نہیں۔ تخلیق خدائی صفت ہے اور تنقید انسانی
وصف لیکن ذہانت اور ذہنیت کا فرق اس وصف کو بھی محض فعل
بنا کر رکھ دیتا ہے۔

کوئی بھی نقاد اردو میں لکھا جا رہے منظر کو دیکھتا ہو مجھے
کا موقعہ نہیں رکھتا۔ اس کا سبب ہے کہ وہ فعل ہے اس کا خیز
جن جو اسے شاعر کرنے کے دعوے سے زیادہ اثر لو لوز کل
کرتا رہتا ہے۔ ادب و آرٹ کسی اصول یا کسی کلیے یا کسی حد و
اربعہ کو نہیں مانتے۔ نقاد تو خود کسی فن پارے کا مطالعہ کرتے
ہوئے نکتے نکال سکتا ہے۔ یعنی فن پارہ نقاد کا بھی گرو
ہے۔ جو نقاد شاعر "مصور یا موسیقار گھوڑے کی لنگڑی لگاتا ہے
وہ اپنی تذلیل خود ہی کرنے کا گناہ کرتا ہے۔

آپ کے اداریے کے اختتام پر جو نظم ہے وہ انتہائی
ہنگامی احساسات کی حامل ہے۔ اس میں منفی اور مثبت کا
امتزاج ایک عجیب ہولناکی کو جنم دیتا ہے۔ اور اس ہولناکی کی
خاک سے زندگی کی پرچھائیں نظر آتی ہے۔ یہ نظم LYRICAL
OUTCRY کی ایک مثال ہے۔

حسن جمال کے افسانے صرف جنس نہیں اور رومان بھی
کی خوبی سے متاثر کیا۔ دونوں کو مبارکباد۔

مہدی پرتاپگڑھی:— پرتاپ گڑھ (یو۔پی)

آپ ادبی ضیافت کے لئے ہر ماہ نئی ڈشیں پیش کر رہے
آ رہے ہیں۔ اس بار بھی مشرقی افریقہ کی جدید شاعری اس سلسلے
کی ایک کڑی ہے۔ دور دراز بستیوں میں رہنے والے ادبا و
شعراء کے ادبی منظر ناموں کو اردو والوں سے روشناس کرانے
کی ذمہ داری آپ بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ ندا فاضلی
کے ترجمے بہت اچھے ہیں۔ زمین کی تہذیبی فضا کو جو کسی
خاص خطۂ ارض سے تعلق رکھتی ہے ہندوستان تک پہنچانا
آپ کا کارنامہ ہے۔

اس شمارے کے تقریباً سارے افسانے جنس کے محور
پر گھومتے ہیں۔ نعیم ضیاء الدین کے افسانے کی زبان بھی کہیں
کہیں بگڑی ہوئی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کا مقالہ شہریار کی نئی
شاعری "مختصر ہوتے ہوئے بھی اثر انگیز ہے۔ آپ کا اداریہ
"خوب سیرت فن پارہ" ایک روشن دن کی مثال" کے آخری
جملے الفاظ کے نئے معنی کی تلاش کی دعوت دیتے ہیں۔ الفاظ
کے وسیلے کے لئے سارے الفاظ اپنی معنویت کھو چکے ہیں۔ آج
کے فن کار کو پرانے لفظوں کے طے شدہ معانی کی حد بندیوں
سے نکلنے کی ترغیب اپنے آپ میں بھی ایک نئے فن کار کی
تلاش کا وسیلہ ہوگی۔

عشرت قادری:۔ مرکز ادب۔ ۶ ہم۔ اہل بلی ... ڈاہو پلی

شاعر وقت کی پابندی کے ساتھ موصول ہو رہا ہے اور آپ
کے مطالعے سے استفادے کا سلسلہ جاری ہے۔ تنقیدی
اور دوسرے موضوعات پر مضامین اور افسانوں کا انتخاب اور
معیار متوازن ہے۔ شاعری کا حصہ ضرور بہت زیادہ جدید
ہے۔ اگر وہ اسکول کی بنیاد جس روایت "رجحانات اور تحریکات
کے فروغ اور ترویج کے لئے رکھی گئی تھی" اس کی جھلک

بہر طور یہ باتیں ذہنی ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ آپ یہ فتویٰ صادر
کیجئے (یہ ممکن ہی نہیں ہے) تاہم نوک پلک
کے اعتبار سے (خاص طور پر) شعری حصہ ایسا رکھیے کہ بے شمار
قارئین کو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ شاعر کے علاوہ کوئی اور جریدہ پڑھ
رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ محسوس کیا وہ لکھ دیا۔ کچھ آخر والے
صفحات (مکتوبات) کی کمپوزنگ اتنی باریک ہوتی ہے کہ میں تو
پڑھ ہی نہیں سکتا۔

منظور ہاشمی :۔ اے۔ ندا احمد روڈ مسلم یونیورسٹی
علیگڑھ

آپ کی تحریر پڑھ کر بہت مزا آتا ہے۔ COMPACT
BRIEF اور TO THE POINT خاص طور پر اپنے
اداریوں سے آپ تخلیقی نثر کا نیا اور پر تاثیر اسلوب تشکیل دے
رہے ہیں۔ علاوہ موضوعات کے جو بذات خود اہم ہوتے ہیں
آپ کے الفاظ اور انداز اسے اور بھی اہم اور غور طلب بنا دیتے
ہیں۔ ادب اور زندگی کے لئے۔ تحریریں بہت روشن اور پائیدار
ہیں۔ ادھر شاعر متواتر حسن و معیار کی منزلیں سر کرتا جا رہا ہے۔
کم صفحات میں جاندار اور معنی خیز تحریریں اکٹھا کر رہے ہیں آپ
اچھا ہوا کہ آپ نے ساقی فاروقی صاحب کے مشورے پر شاعر
کے گٹ اپ اور صوری حسن کش میں تبدیلی نہ کی ورنہ ایک دو
شمارے تو دیدہ زیب اور بعد ازاں کم نکل پاتے۔ مگر اس کے
بعد اللہ حافظ ——— اسی طرح سادگی، صداقت اور پاکیزگی کے پائیدار
رونق اور تحریریں شائع کرتے رہیں۔ آگے بہت قریب
بہت بڑی فتح منتظر ہے۔

نور تعلیمی، پوسٹ نگر آباد، ضلع بدایوں۔ (یو۔پی)

شاعر شمارہ [illegible] کے صفحہ [illegible] پر اختر نسیم کی
غزل (مخطوطہ) کے تیسرے شعر کا مصرع اولیٰ "ایک گھر
نے لئے [illegible] کے کتنی بستے گھر" میں 'بستے گھر' کا استعمال
نسیم صاحب کا ذاتی ہو سکتا ہے، ہماری زبان کا نہیں۔ صفحہ نمبر
۳۰ پر ماہ طلعت زہدی کی غزل کے پانچویں شعر کے مصرعہ ثانی
میں لفظ تنہا کا 'الف' بحر سے خارج ہے۔ سرفراز شاکر کی غزل
(صفحہ نمبر ۳۵) کے مطلع میں لفظ 'نہ' کا تلفظ 'نا' ہے۔ اسی
صفحے پر سعدیہ روشن صدیقی کی غزل کے مطلع میں لفظ 'رحم'
کا تلفظ غلط ہے۔ اسی غزل کے پانچویں شعر کے مصرعہ اولیٰ
میں 'طلوع' کا 'ع' بحر سے خارج ہے۔

عبدالمجید بٹ :۔ شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر
شہاب سرمدی کا مقالہ "ہمارا لکش سنگیت" بہت اچھا لگا۔
مقالہ نگار نے اس اصطلاح کی جس خوبصورت طریقے
سے وضاحت کی ہے، سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ شمس الرحمان فاروقی
کا مضمون فنی اقدار کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن پتا نہیں فنی کی
اقداروں کو سمجھنے والے صاحبان عام فن پاروں پر اپنی رائے
دینے کا اظہار کیوں نہیں کرتے۔ شفق سوپوری کا مقالہ
SUBMIT [illegible] ہے۔ شفق کو میں پانچ سال سے ذاتی طور پر ایک
سے جانتا ہوں۔ اتنا بھی کہ وہ ان کو اپنا PATRON بھی
مانتا ہوں۔ شفق بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں اور اردو دنیا میں
اب ان کی ایک اچھی پہچان بنتی ہے۔ چونکہ "موسیقی" پر
انہوں نے پچھلا مقالہ ایک شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی
میں SUBMIT کیا ہے جو کہ ایک منفرد کام ہے۔ میری ان
سے استدعا ہے کہ دوسرے موضوعات پر بھی قلم اٹھائیں تاکہ
قاری، طلبہ و طالبات ان کی فنی بصیرت سے مستفید ہوں۔
● ماہ طلعت زہدی کی غزل بہت پسند آئی۔
● "مشرقی افریقہ کی جدید شاعری" ندا فاضلی کا مختصر تعارفی
مضمون ان شعرا حضرات کی نظمیں ترجمہ کی گئی ہیں۔ بہت اچھا
سلسلہ ہے اور یہ نظمیں ترجمہ نہیں بلکہ ORIGINAL معلوم ہوتی
ہیں۔

علی عباس امید ۹۴/۱۴۹، تمسی نگر بھوپال

شاعر کی اشاعتیں خوب سے خوب تر ہوتی جا رہی
ہیں۔ خوب سیرت فن پارہ تو واقعی روشن دن کی مثال ہوتا ہے
ندا فاضلی کے ترجمے اچھے ہیں۔ افریقی شاعری کے بارے میں
تعریفی نوٹ بھی کارآمد ہے۔ شہریار کی شاعری پر شمس الرحمان
فاروقی کا مضمون سیر حاصل ہے۔

ساجد حمید، سابامتی بلیا، ایس۔ ٹی۔ روڈ شیو گڑھ [illegible]
مشرقی افریقہ کی جدید شاعری کے تحت ندا فاضلی کی ترجمہ
کی ہوئی نظمیں دیکھیں۔ اس طرح کے تراجم کی اردو ادب کو
بے حد ضرورت ہے۔ جس سے ہمیں زمین پر بسنے والے
مختلف حصوں کے فنکاروں کے اندر جھانکنے کے مواقع ملتے
ہیں۔ ندا فاضلی کا ان نظموں پر نوٹ ان نظموں کو سمجھنے میں
معاون ہوتا ہے۔ اس شمارے میں شامل مضامین نظم و نثر
خوب ہیں۔ علی الخصوص شمس الرحمان فاروقی کا مضمون شہریار کی
نئی غزل پر اور شفق سوپوری کا موسیقی، جمالیات اور نفسیات
——— اس شمارے میں صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں، نظمیں
کیوں نہیں۔

عالم پرویز معرفت خلیق الزماں، محلہ کھنڈی سہسرام
رسالہ دن بہ دن خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اداریہ
خوب سیرت فن پارہ ——— ایک روشن دن کی مثال، بہت خوب
ہے۔ واقعی زندہ فن پارہ کبھی نہیں مرتا اور اس کی مثال
ہمارے قدماء ہیں جو آج بھی اپنے فن پاروں کی بدولت زندہ
ہیں۔ شفق سوپوری کا مضمون 'موسیقی، جمالیات اور نفسیات'
ایک فکر انگیز معلوماتی مضمون ہے۔ فاروقی صاحب کا مضمون
شہریار کی نئی شاعری ایک مکمل مضمون ہے۔ 'سیپ' اور 'افکار'
(پاکستان) نے اسے مکمل شائع کیا ہے۔ جدید افریقی شاعری کا
ترجمہ ندا فاضلی نے بہت عمدگی سے کیا ہے۔ امید کہ یہ سلسلہ
جاری رہے گا۔ دیگر شمولات بھی قابل ستائش ہیں۔

پرکاش فکری :۔ ہوائی ٹولی، ٹولی چوکی [illegible]
شاعر شمارہ نمبر [illegible] کے بعض مضامین توجہ طلب
توجہ کے طالب ہیں وہ درست فکر کی دعوت دیتے ہیں۔
تابش انصاری کا مضمون مرثیے کی ساجیات پر ایک نظر
دراصل ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی کی اسی موضوع پر سمتی کتاب
کا ایک جائزہ ہے۔ تابش انصاری صاحب کا یہ خیال بالکل درست
ہے کہ جو مسلمان وسط ایشیا سے اور عرب سے ہندوستان آئے
ان کی زندگی بالکل سادہ اور بے رنگ تھی اور ان کے یہاں
تہذیبی مناظر نہ ہونے کے برابر تھے۔ اور ہندوستانی باشندوں کی
زندگی اوّل تا آخر ہر قسم کے تہذیبی مظاہر سے بھری تھی۔ لہٰذا
یہاں کے تہذیبی رسوم ان کی بھی معاشرتی ضرورت بن گئے۔
عقیل رضوی اگر مرثیوں کے سماجی تفاعل میں ہندوانہ
رسم و رواج پر ماتم کناں ہیں تو کیا۔ ممکن تھا کہ اس زمین کی
مٹی سے جنم لینے والے یہاں کے تہذیبی اثرات سے خود کو
قطعی آزاد رکھ کر ایک ان دیکھے اور انجانے سماج کے عمل اور
رد عمل کی تصویر کشی کر لیتے۔ لہٰذا ایسے کے بیان میں وہ سادہ سے
رنگ غالب ہو گئے جو ہندوستانی مزاج کی جزئیات میں عام ہیں
اور اسے ہندوانہ قرار دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی یہ کہہ
دے کہ کسی مسلمان کا اپنے جواں سال بیٹے کی موت پر آنسو
بہانا قطعی غیر اسلامی ہے۔
عقیل رضوی کا یہ خیال بھی حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں
رکھتا کہ ہندوستان میں جن لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کیا
انہوں نے ہندوستان کی کسی رسم کو اپنی سماجی زندگی میں داخل
نہیں کیا۔ اور نہ یہاں کے موسموں اور تہواروں کی طرف کوئی
توجہ کی۔ عقیل رضوی نے یہ تحقیق نہیں اپنے کس ذریعے
کی بنا پر کیا ہے۔ راقم الحروف اس خطے میں رہتا ہے جہاں گھنی
عیسائی آبادی ہے۔ اسے تو صرف ان کی شادی رسوم میں جہاں
مذہبی احکام کی پاسداری ضروری ہے عیسائیت نظر آتی۔ باقی
سب کچھ ویسا ہی ہوتا ہے۔ عیسائی ان کے یہاں بڑھ چڑھ کر
ہوتا آیا ہے۔ اور ان کی سماجی تقریبوں نے نہ عیسائیت کا نام
ہوگا اور نہ انگریزوں کا ——— انسانی معاشرے میں مذہب کا
دخل ہے۔ مگر دنیا کے سارے مذاہب بھی یہ کام نہ کر سکے
عہد میں پھیلے ہوئے اپنے تمام پیروکاروں کو اپنی اپنی
کے رسم و رواج اور موسموں کی رنگا رنگی سے
وابستگی سے قطعی بے گانہ بنا دیں اور وہ اپنے
اور رسم و رواج میں اپنے گرد و پیش اور اپنی
کرنے لگیں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو ہندوستانی
آنحضرت اور اعلیٰ ورثاء کی نگی سے کیوں
اگر عقیل رضوی مرثیوں سے خوش ہونے
رنگ میں دو قتوں کے رنگ کو اور بادلوں بھرے
بھیگے خطوں میں ڈھونڈنے والے ہندو
مرگئی۔

ہیں اور ان کی معیشت تو دم کی حالت سے نکل رہی تھی اور
دن گزرنے کا کام ہے۔ یہ بات اس لئے بھی اہم ہے کہ ترقی
یافتہ ادب کے علاوہ بھی کسی بھی ادیبوں نے یکسر نہایت ہی پیش
قیمت اور بہت قابل قدر اضافہ کیا ہے اور اس طرح ترقی
یافتہ ادب کی کچھ کو توفیق دی ہے۔

انہوں نے اس دور حیات کو اتنا اجاگر کر دیا ہے اپنے اندر
پہلی سے کہ شاید اس کی جھلک کسی بات نہ ہو۔ ویسے کئی پیروں
کی اقتباسات نہیں ملتی۔ مگر بھی تو ''میں اگر زندہ'' کی
عبارت سے کھلا ہوا ہے۔ تو 'افسردہ' میں سرور نے بھی اپنے کو
چھپانے میں کچھ کم مہارت نہیں دکھائی ہے اور کہ آمد بھی عادت
ہو رہا ہے۔ ویسے قوم نے افسردہ رہ کر، وہ کو ترجیح دینے کا
واقعہ ضرور کسی کے سامنے بیان کیا ہوگا تب ہی تو بات یہاں
تک پہنچی۔

بلراج کومل نے اپنے تیز طرار مضمون میں بہت سی ایسی
باتیں کی ہیں جن کو سننے کو اس مصلحت اندیش زمانے میں
ہمارے کان ترس گئے ہیں۔ مگر چند برسوں سے ان کا یہ سوال
کہ یورپ میں جب یہ ہو رہا تھا اور وہ ہو رہا تھا اور یورپ جب یہ
کر رہا تھا اور وہ کر رہا تھا تو آپ کیا کر رہے تھے۔ بڑا عجیب سا لگا۔
پچھلے پچاس ساٹھ سال میں یہاں بھی بہت کچھ ایسا ہوا
جس نے ہمارے بہت سے مفروضات اور اعتقادات کو گہری
چوٹ پہنچائی ہے اور یہ بہت کچھ ہونے کا عمل جاری ہے اور
روز بروز اس کی رفتار تیز ہو رہی ہے۔ ان کا یہ مطالبہ کہ ہم
محسوس کئے بغیر کسی کے تجربات اوڑھ نہیں سکتے۔ مگر ہمارا
ملک اور ہمارا معاشرہ بھی تہذیبی قدروں کو متزلزل کرنے
والے تجربوں سے یکسر خالی نہیں۔ ہمارے اپنے بھی تجربے
ہیں اور ہمارا ادب ان ہی تجربوں کی دین ہے۔ 'جہنمت' و زندگی
قومی سے قومی کو جدا کئے' دلوں میں نفرت کا زہر بھرنے
اور پوری کی پوری آبادی کو مشکوک کرنے اور اس کو اس کی وجہ
کھو دینے والی سزا دینے کی نئی نئی مثالیں۔ یہاں بھی قائم
کی جاتی ہیں اور اس میں اضافے کی صورت تو عام ہے مگر اس کو
ختم کرنے کی سمت کوئی قدم نہیں اور یہ سب نہایت منظم
طریقے سے اور باقاعدہ تواتر سے عمل میں آ رہا ہے۔ شہر یہاں
بھی جلتے ہیں۔ تباہیاں یہاں بھی نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں۔ نسل
کشی یہاں بھی ہوتی ہے۔ ماس ریپ MASS RAPE کر کے نسل
ختم کا کام یہاں بھی ہوتا ہے جس کی ویڈیو گرافی بھی ہوتی
ہے۔ DEMOGRAPHIC تبدیل کرنے کی خواہش
یہاں بھی موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یورپ نے سب
کو ایک ہی بڑی جنگ میں جھیل لیا اور ہم نسلوں میں جھیل
رہے ہیں اور جھیلتے رہیں گے۔ جس طرح بوسنیا اور ہرزیگووینا
نے جھیل رہے ہیں۔ وہاں تو TRUCE اور CEASE FIRE
بھی ہوا ہے مگر یہاں TRUCE ہے نہ CEASE FIRE

بلراج کومل چند برسوں سے تو۔ سوئٹزر کر چکے۔ اب ذرا یہ
ان تھکی نکڑ والوں سے بھی کر دیکھیں اور دیکھیں کیا جواب ملتا

ہے۔ الغرض اس تبصرے کے مذکورہ تینوں مضامین تفصیلی
گفتگو کے متقاضی ہیں اور یہ تقاضا اداریہ ہو تو افسوس ہوگا۔

احمد سہیل: 321-WEST PALESTINE AVE. PALESTINE TX 75801 U.S.A.

مرثیے کی سماجیات پر ایک مختصر مضمون اس لئے سامنے آیا
کہ جس کتاب ہے اسی حدود میں رہ کر مضمون لکھا گیا ہے۔
تعلق ہے گزشتہ سال میں یہ کتاب پڑھ چکا ہوں۔ کتاب پڑھ کر
مجھے تو یہ احساس ہوا کہ کتاب کے مصنف کی سماجیاتی تربیت اور
مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ سماجیات سے عدم آگہی نے
اس کتاب کو نہایت ہی کمزور بنا دیا۔ کتاب کے مجموعی ڈھانچے
سے خوش جذبات کی بو آتی ہے۔ لگتا ہے کہ جیسے مرثیے کا فن
بنیادی طور پر احتجاج کا فن ہے۔ اردو میں تنقید کے نام پر جو
کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن سماجیات
کا مسئلہ تھوڑا سا مختلف ہے کیونکہ اس علم کی جمالیات اردو کے
لکھنے والوں کو سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ''ادبی سماجیات'' کے نام
سے جو کچھ اب تک منظر عام پر آیا ہے اس میں سماجیات والی
بات نہیں۔ معاشرہ، سماج اور عمرانیات، سماجیات دو مختلف
تصورات ہیں جن کو اردو کے سماجیاتی ادبی نقادوں نے اپنی کم
علمی کے سبب غلط رنگ دے دیا ہے اور یوں ''ادبی
سماجیات'' کی کئی طور پر غلط تقسیم کی جا رہی ہے۔ اگر اس کتاب کا
نام سماج اور مرثیہ 'مرثیے کا سماجی پس منظر' یا مرثیے کا تجزیاتی
مطالعہ'' ہوتا تو اس پر اعتراض کی گنجائش ذرا کم ہی ہوتی۔ لیکن
سماجیات کے ساتھ مصنف نے خاصی زبردستی کی ہے۔ مجھ
میں نہیں آتا کہ مرثیہ مذہبی چیز ہے یا تہذیبی نوعیت کا کوئی ادبی
مظہر! جہاں تک مرثیے کی سماجیات کے مطالعے کا تعلق ہے
عموماً اس قسم کے مطالعے مائیکرو، اسکوپک قسم کے ہوتے ہیں۔
جس میں مرثیہ نگار اس کے قاری اور سامعین کے تجربوں کے
درمیان ادبی جمالیات کی ترسیلیت کو دریافت کیا جاتا ہے۔ جس کو
سی رائٹ ملز ''سوشیالوجیکل امیجینیشن'' کہتے ہیں۔ یہی
سماجیاتی ترسیلیت کو عمرانیاتی ادبی نقاد استعمال کر کے اپنے مطالعے
کی ابتدا کرتا ہے۔ جس میں سماجی ضبط اور عقائد اور سماجی
تحریکات سب سے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اگر مرثیہ سماجی
حوالے سے صرف مذہبی جذبات کا عمل ہوتا تو جوش کے مرثیے
کس کھاتے میں جائیں گے۔ جن کی مذہبی وابستگی مشکوک
ہے۔ جوش کہتے ہیں

زمانہ ہے تجھ کو زمانے کا جوش
وہ کفر کی خاک چھانے کا جوش

یہی شاعر ایک طرف تو خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا تو
دوسری طرف یہ کہتا ہے ''ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں
حسین''۔۔۔ یعنی مرثیہ اور اس کی جمالیات تہذیبی ہے نہ کہ
مذہبی! دوسرا سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ مرثیہ واقعی سیاسی ٹول
کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ خاص طور پر پاکستان کے
پر گھٹن سیاسی ماحول میں مرثیے کی کیا شکل ہو گئی تھی۔ جبکہ
وہاں تین طویل مارشل لا لگے۔ مرثیے کا [illegible]

نظر سے جس بھی معاشرے میں ثقافتی نمو ہوتا ہے مرثیہ اس
کا تہذیبی رنگ اختیار کر جاتا ہے۔ جیسے میر انیس نے عربستان
کے میدان میں لڑی جانے والی جنگ کے نتیجے میں پیدا
ہونے والے تہذیبی مسائل کو ہندوستانی رنگ میں دکھا دیئے۔
نہیں معلوم میر انیس کس نوعیت کے تہذیبی انسان تھے؟ مگر
تنقیدی نقطۂ نظر سے قطع نظر جب بھی ان کے مرثیوں پر نظر
پڑتی ہے تو لگتا ہے کہ وہ مرثیہ صرف ایک [illegible] تھے۔ جس
کو اپنے فطری اظہار میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کو [illegible] کو موثر
اور جمالیاتی انداز میں ابلاغ کرتا آتا تھا۔

لیکن اب مرثیہ بیداری فکر کی کے الیے بن گیا:
جس مرثیہ نگار کا مرثیہ جتنا لوگوں کو رلاتا ہے وہ
دولت سمیٹتا ہے۔ اس کی مثالیں مشرق وسطیٰ [illegible]
میں پڑھے جانے والے مرثیے ہیں۔ کتاب [illegible]
تنقیدی جوہر تلاش نہیں کیا گیا۔ جو لوگوں میں [illegible]
سبب بنتا ہے اور سماجیاتی مغائرت اور تبدیلی [illegible]
دریافت کرتا ہے اور سیکولر سماج (جیسے ہندوستان)
مرثیے کی اساطیر ثقافت میں عملیاتی نوعیت کے جو [illegible]
ہے کیا مرثیہ اپنے اظہار میں ان عملیات سے [illegible]
محرم کے مہینے میں خاص طور پر دس دن مجالس اور اختتام پر
شام غریباں برپا ہوتی ہے۔ تاریخ کے اس المیے پر حال کے
تناظر میں نئے انکشاف ہو سکتے ہیں۔ کتاب میں کربلا کو [illegible] ذکر
کیا گیا ہے جس کو عموماً مذہبی نوعیت کی کتاب [illegible] ہے۔
اصل میں یہ کتاب ''عملی سماجیات'' کی کتاب ہے
روایت کی حرکیات سے متعلق ہے جس میں مذ[illegible]
جذباتی واقعے کی المناکی و مماثلت نسل در نسل
عمرانیاتی نقطۂ نظر سے نفسی حیاتیاتی میکانکیت ہوتی
حیاتیات کا میکانی رجحان مرثیے کی سماجیات میں تصور
سامعین کو [illegible] ہے۔ وظائفی تقرب مرثیے کے سماجیات
میں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ وظائفی میکانیت
جمالیات مفہوم 'ابلاغ' افراد کے درمیان حسن اتصال
جمالیاتی تزکیہ 'موضوعی طہارت اور ایک یا ایک سے زیادہ
ساختیے کی نشاندہی کرتی ہے۔ جس میں اہم نکات عموماً یہ ہوتے

(۱) مرثیے کے حیاتیاتی وجود یا اس کا جواز
(۲) مخصوص ذہن کے سامعین افراد پر مرثیے کے اثرات
(۳) مرثیے کے متن سے منسلک والے معاملات
(۴) ظلم و استبداد کے خلاف مرثیے کا ردعمل (بغاوت / مزاحمت وغیرہ)
(۵) کسی سماجی ماحول میں مرثیے کی قبولیت اور عدم قبولیت
(۶) مرثیے کا عمل سماجیات وظائفی نقطۂ نظر سے جزوی ساختیاتی استحکام کا سبب ہوتا ہے۔
(۷) فکری ساختیہ مرثیہ مساوات اور عدل کے درمیان فرق کو واضح کرتا ہے۔

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰

شاعر

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۶واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد ــــ ۶۶
شمارہ ــــ ۴

فون: ۳۸۲۹۹۰۴

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۵ روپے

زرِ سالانہ ۷۵ روپے — لائبریریوں سے ۹۰ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے — معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر ــ ۱۵ پونڈ

فکرِ امروز

مشاعروں کا نصب العین تفریح اور تضیع اوقات کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اوّل شب سے آخر شب تک مسلسل غزل خوانی اور دماغ کاوی کا کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہو تو مجھے بتایا جائے اگر یہ کہا جائے کہ وہی تحفظِ زبان ان مشاعروں کا مقصد ہے تو میں عرض کروں گا کہ زبان آج کل کے مشاعروں میں بنتی نہیں بلکہ بگڑتی ہے۔ مبتدی شعراء غلط محاورے، غلط بندشیں، غلط ترکیبیں اکثر و بیشتر نظم کر جاتے ہیں۔ سننے والے سنتے ہیں مگر کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ ان اغلاط کی اصلاح کی طرف توجہ کرے اور ہمت سے کام لے کر زبان یا محاورہ کی غلطی پر روشنی ڈالے۔ عوام کو تو ان باتوں سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ رہے منتہی شعرا، تو وہ اس خیال سے خاموش ہو جاتے ہیں کہ اگر کسی کے شعر میں کوئی نقص نکال دیا جائے تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی اور عیب جو، عیب بیں، حاسد، کینہ توز، خود پسند، نکتہ چیں اور خدا جانے کیا کیا سرِ محفل سننی پڑیں گی۔ جب سوسائٹی کا یہ حال ہے تو فرمائیے اصلاح کیوں کر ہو۔

[خطبات شاعری ـ ۲۰ر فروری ۱۹۴۶ء]

سیماب اکبرآبادی

ادبستان - دین دیال روڈ - لکھنؤ
۷/ اکتوبر ۵۸ء

محترمی - تسلیم

ترانۂ دل کا ایک نسخہ جو آپ نے از راہِ عنایت مجھے بھیجا ہے وصول ہوا - شکریہ قبول فرمائیے - غزل گوئی میں آپ کا مرتبہ مسلّم ہے - ملک کے بہت سے بڑے اہلِ دل شاعر اور اہلِ نظر نقاد آپ کے کمال کو خراجِ تحسین پیش کر چکے ہیں - اب اس باب میں کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے -

آپ نے دریافت فرمایا ہے کہ کتابیں بشرطِ منظوری مقابلہ کہاں بھیجی جائیں گی اور کتنی تعداد میں - نیز آخری تاریخ کب تک ہے - افسوس ہے کہ یو-پی گورنمنٹ کا اعلان میری دسترس میں نہیں ہے - غالباً جناب حیات اللہ صاحب نے آپ کو ضرور ان تفصیلات سے مطلع کر دیا ہوگا - رہی منظوری کی شرط اس کے بارے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا - منظوری کا انحصار کمیٹی کے ممبروں کی متفقہ رائے پر ہے -

امید ہے مزاجِ سامی بخیر ہوگا - والسلام

نیاز آگین
سید مسعود حسن رضوی

سید مسعود حسن رضوی ادیب [بنام] دل شاہجہانپوری

● مسعود حسن رضوی ادیب [پ: ۱۸۹۳ء - م: ۱۹۷۵ء] کے اس خط پر مکتوب الیہ کا نام درج نہیں ہے لیکن مذکورہ خط اظہار صبائی (شاہجہانپور) نے ارسال کیا ہے جو دل شاہجہانپوری پر تحقیقی کام کر چکے ہیں۔ خط میں مذکور "ترانۂ دل" سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دل صاحب کے شعری مجموعے کا نام ہے - [ادارہ]

اپنی بات

ہم عصر اردو ادب نمبر

✽

قارئین! ہم نے جنوری ۱۹۹۵ء کے شمارے میں اعلان کیا تھا کہ جون میں خاص نمبر کی بابت جلد شائع کی جا رہی ہے۔ ہماری ہر ممکن کوشش بھی یہی تھی کہ اعلان کے مطابق ہم عصر اردو ادب نمبر شائع ہو جائے لیکن شاعر کو وقت پر شائع کرنے کی جستجو میں کم حجم کے کئی شمارے منتشر و تقسیم شائع کرنے کی بے انتہا مسرتوں نے آپ کو شامل کرتے ہوئے خاص نمبر کو دو تین ماہ کے لئے مؤخر کر دیا گیا ہے۔ شاعر کے بے شمار قارئین ہمارے اس فیصلے کا خیر مقدم کریں گے۔ ہم خاص نمبر کے تمام ابواب کی تفصیلات دنیا بھر کے ہم عصر ادب کے شمارے میں اعلانات کے متعلق دیتے رہیں گے۔ لہٰذا ۱۹۹۵ء کے شمارے میں اردو شعر و ادب کے اولین عالمی محاذ کی تکمیل و تحریک اور اہم مقالات پیش کئے جائیں گے آپ یقین کیجئے کہ اب تک اردو ادبی رسائل کی تاریخ میں کوئی ایسا ادبی تجربہ نہیں کیا گیا جو ہم شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ عمل کر دکھانے کی توفیق دے۔ ادبی رسائل کی کسی بھی خاص اشاعت اور اس کی سمت ہائے رفتار کو کسی بھی علمی و ادبی پرداخت سے آپ کی بھرپور مدد اور تعاون درکار ہے ـــــــــــ

ہم عصر اردو ادب نمبر — شاعر کی اشاعت سازی کو مزید مستحکم کرے گا۔

معزز قارئین! آپ نے ماہنامہ شاعر کے ہر شمارے سے استفادہ کیا ہے۔ بحیثیت قاری آپ کا بھی فرض ہے کہ اپنے شاعر کا انتظار کیا کیجئے۔ ہمیں اس کا شدید احساس ہے۔ کیونکہ خاص نمبر کی اشاعت میں تاخیر کے سبب ہمارے کئی پرچے وقت پر نہ آ سکے اور بہت سے قارئین نے شاعر کو زبردست نقصان پہنچ رہا ہے۔ کیا آپ ہمارے اس کی تکمیل کے لئے اس کا حصہ بن کر بطور تعاون پیش کریں گے۔

ـــــ شاعر کے آپ کا فرض بھرا اور تو ہو جاتا ہے۔

ـــــ خود کے شاعر کا انتخاب کیجئے۔

ـــــ خاص نمبر کی تفصیلات کے ساتھ ہمیں مکمل تعاون کی یاد دہانی کیجئے۔



محمد اظہار الحق

نذر — ۲

سفر کسی ڈھنگ کا ہو اور سواری نہ ہو
روانہ ہوتے وقت پوٹلی میں
زادِ اسباب کے علاوہ
دعائیں ڈال لینا
جیب پڑھ کر ہاتھ نہیں پھیلانے پڑتے تھے

جب راہ میں قبرستان پڑے
آدھا دائیں طرف اور آدھا بائیں طرف ہو
قبروں پر کوئی رنگوں کے چیتھڑے لٹک رہے ہوں
قدم آہستہ رکھنا
اکڑ کے نہ چلنا
دعا کا ورد پڑھنا

جب دور و نزدیک کوئی گوٹھ کوئی ڈھوک نہ ہو
کھانا پکانے کیلئے برتن کی ضرورت نہیں پڑے گی
آٹے کے چاروں طرف گیلی مٹی لیپ لینا
تھوڑی دور جھاڑی جلا کر بھون لینا
پانی ہاتھوں کے پیالے سے پینا اور گلہ نہ کرنا
جو راستے میں کام کر رہے ہوں
ان پر برکت بھیجنا
اگر اصرار کریں تو ایک پل بیٹھ جانا
باپ دادا کا نام نہ بتانا
سب دادا رو پڑیں

نظم

گھنے پڑشت خوں پہ بور اور اونچے پہاڑ
ہری جھاڑیاں اور سبزے کی ٹولی تہیں
سڑک کے کناروں پہ کھمبوں کے تار
ہوا سے بلیں سرسرائیں
رسیلے جھکوروں میں وہ تیز نٹ کر بس سوئی جائیں
کسی ایک کو پیاس لگ جائے تو سب کے سب
کھیلتے مسکراتے
نشیبی چٹانوں میں بہتے ہوئے میٹھے جھرنے کی جانب چلیں
اور ہاتھوں کے پیالوں کو اک دوسرے کے لبوں سے لگا دیں
کبھی کوئی بس آئے اور جو بھی اترے
محبت سے احوال پرسی کرے اور اسباب سر پر دھرے
گاؤں کا راستہ لے
کبھی کوئی چرواہا کندھے پہ لاٹھی رکھے اور ہاتھوں کو لاٹھی پہ لٹکائے
آہستہ آہستہ ریوڑ لئے گذرے
اور پوچھتا جائے "کیوں جی کہاں جا رہے ہو؟"
کبھی دور کے کھیت سے ایک مدھر تان اٹھے اور سب بھول جائیں
کہ کیا کہہ رہے تھے
پھر اک بس رکے اور آبا نظر آئیں اور
کنکروں اور تکیے دل کی دلچسپ معصوم بازی کو سب بھول جائیں
کوئی زین گھوڑے پہ کسنے لگے کوئی سامان اٹھائے
شہر سے آنے والے پھلوں کی مہک ہر طرف پھیل جائے
کھلونوں کی جھنکار دل میں عجب گدگدی سی مچائے
حویلی کے چوبی منقش بڑے در پہ دادی کھڑی منتظر ہوں

آٹھ بجنے کو ہیں
ناشتہ کب سے تیار ہے
آج آفس نہیں جائیں گے کیا

سوغات کی کوئی مقدار متعین نہیں

سوغات کی کوئی مقدار متعین نہیں
نہ ہی اس کا وزن کیا جا سکتا ہے۔
گھر کا سارا اثاثہ
یا منہ اندھیرے واپس آتے ہوئے بے اختیار دعا
مشرقِ بعید سے آئی ہوئی
خوشبودار قہوے کی تھوڑی سی پتی
یا گلے میں سے مفید ترین چیز
یورپ میں رہنے والے کسی ہم وطن کیلئے اچار کی بوتل
یا الائچیوں کی پڑیا
جلدی میں لکھا ہوا ایک خط
یا پتھر پر رکھا جانے والا تازہ پھول
تو ان پوشش سے ڈھکے ہوئے سر
یا قید خانے میں پکانے کیلئے مسور کی دال
ٹیک لگانے اور پتے جھاڑنے کیلئے عصا
یا تندکوٹھڑی میں پھل
یا پنیر میں ملا ہوا ذرا سا زہر۔
سوغات کی کوئی مقدار متعین نہیں
نہ ہی اس کا وزن کیا جا سکتا ہے۔

تلخ نوائی

چار کانیاں[1]

میں جب مٹی کی کوٹھری میں داخل ہوا
تو وہ چاروں
آلتی پالتی مارے
چار کانیاں کھیل رہے تھے
مجھے یاد نہیں کہ فرش کس چیز کا تھا
ان میں سے ہر ایک نے باری باری سر اٹھا کر مجھے دیکھا
اور پھر کھیلنے لگ گئے
دیکھتے دیکھتے ان کی شکلیں بدل گئیں
اجسام متغیر ہو گئے اور شناختیں الجھ گئیں
میں وہیں کھڑا ہوں
یورپ کے ساحلوں سے لے کر
قبرستان کی تاریک پہاڑیوں تک

چار کانیاں وہیں پڑی ہیں
سرکنڈے، چاقو سے چرے ہوئے۔
مگر وہ چاروں کہاں ہیں؟

[1] ایک کھیل جو اٹک (کیمبل پور) کے علاقے میں سرکنڈوں سے کھیلا جاتا ہے۔

۶ خط - باتیں ہزار

شمارہ ۱۰۰ ● ۱۱-۱۲

سلیم شہزاد ● ۳۲۳ منگل وار وارڈ، مالیگاؤں، ۴۲۳۲۰۳

آپ نے اداریے میں ایسا موضوع چھیڑ دیا ہے جسے محض آزادیٔ ذہن، مذہبیت، سیکولرازم اور جمہوریت وغیرہ اصطلاحوں کے سہارے چند پیراگرافوں میں تشفی طور پر بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے جگہ جگہ آپ کی مفروضیت مبہم سی ہو گئی ہے اور اس کا پہلا ثبوت اداریے کے سرخی سے ہی مل جاتا ہے یعنی "نہیں سے ہاں کا ممکن"، ایک ایسا لسانی ساختیہ ہے جسے غلط زبان کا نمونہ ہونے کی وجہ سے وجدان قبول نہیں کرتا، یہاں "ممکن" (صفت) کی بجائے امکان (اسم) لکھنے کی ضرورت تھی۔ آزادیٔ ذہن میں آپ بھلے ہی مذہب بیزاری کو شامل نہ کریں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مذہب بیزاری کے بغیر آزادیٔ ذہن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس سے آپ کی مراد ادب و فن میں آزادیٔ فکر و اظہار ہے تو مذہب کو اس میں شامل کر کے آپ آزاد نہیں رہ سکتے۔ اس لحاظ سے آپ کا مفروضہ پہلے ہی قدم پر مشکوک ہو گیا۔ یہ عقیدہ ہے کہ انتہا پسندی یا انتہا پسند عقیدہ (اور عقیدہ ایک مذہبی اور سیاسی تصور ہے) ادب و فن کی آزادانہ تشکیل و تعبیر کو محدود کرتا ہے۔ یہ سچی بات آپ نے اداریے کے قوسین میں کہی ہے۔ لیکن اصول، نظریے اور عقیدے کو یکجا لانے سے آپ کی بات غیر واضح ہے۔ آپ کا ایک فقرہ "صدیوں پر محیط مذہب بیزاری" (جسے اداریے کے خاتمے پر آپ نے چھ سو سالہ قرار دیا ہے) محل نظر ہے۔ کیوں کہ یہ تصور صدیوں پر ہرگز محیط نہیں بلکہ ایک صدی پرانا اور وہ بھی مخصوص ذہنوں مثلاً آپ کے سائنس دانوں، دانشوروں اور ترقی پسندوں وغیرہ تک محدود واقعہ ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مذہب بیزاری نے سائنس کو مالا مال کیا اور دانشوری کی ایک نئی تعریف کو جنم دیا تو عرض ہے کہ مذہب بیزاری ممکن ہے کہ دانشوری کی ایک نئی جہت ہو (میں اسے جہالت کی ایک نئی جہت سمجھتا ہوں) لیکن سائنس تو مذہب کے ساتھ بھی مالا مال ہوا ہے اور خدا اور عقیدے کی پشت پناہی کے ساتھ بھی کائنات کے حقائق تلاش کرنے والوں نے فطرت کے قوانین دریافت کیے ہیں۔ اس کے لیے مذہب بیزاری کبھی شرط نہیں رہی جیسا کہ آپ کے جملے سے مترشح ہے۔

آپ کے مفروضے کے مطابق اگر ہندوستان میں جمہوریت ناکام ہے تو یقیناً اس سیاسی نظام میں کچھ خامیاں اور کمزوریاں ہوں گی بلکہ کسی خطۂ زمین پر کوئی سیاسی نظام اگر کامیاب بھی ہو تو ضروری نہیں کہ وہ خامیوں اور کمزوریوں سے یکسر پاک ہوگا۔ یعنی سیاسی نظامات کا یہی وصف ہوا کرتا ہے کہ وہ خامیاں اور کمزوریاں رکھنے کے باوجود کامیاب اور نہ رکھنے کے باوجود ناکام ہو جاتے ہیں ——— یہ صورت حال بالذات سیاسی فلسفوں کو متاثر نہیں کرتی۔ البتہ انھیں ماننے والوں کے سبب سیاسی ادارے کامیاب اور ناکام ہوتے ہیں۔ کمیونسٹ اور اسلامی ممالک میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

آزادیٔ ذہن کا مفہوم واضح کرتے ہوئے بھی آپ کی گنجلک بیانی باقی رہتی ہے۔ مثلاً خدا کے تصور کے تعلق سے جب بات کی جائے تو تمام اور عقیدے سے انکار نا ممکن ہوگا۔ لیکن آپ کا اعراف لفظی خدا کائنات مذہب عقیدہ، فلسفہ، نظریہ، سبھی کچھ سمیٹ لینا چاہتا اور تکرار خیال کا باعث بنتا ہے۔ مذہبی، لسانی اور جغرافیائی حد بندیوں سے ماورا اور چھوٹے بڑے کی تفریق سے قطع نظر آدمی کو آدمی سمجھنا ایک مذہبی (بلکہ اسلامی) تصور ہے، وہ شاعر اسی کے ذریعے ادب و فن میں اس تصور کی اگر آپ ترویج کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تو لائق ستائش ہے آپ کی فکر مگر واضح رہے کہ اس عمل میں آپ تمام مذاہب، تمام عقائد، تمام فلسفوں اور تمام مادی تجربوں کو یکسر ناقابل اعتبار قرار نہیں دے سکتے۔

آپ نے ایک بہت اچھی بات کہی کہ خدا، مذہب اور اخلاق سے آزادی کا تصور ہی دراصل آدمی کو غلام کرتا ہے (بناتا ہے) لیکن خدا، مذہب اور اخلاق سے وابستگی کا تصور آپ کو آزادیٔ ذہن کا پروانہ بھی نہیں دیتا۔ اس ذیل میں اخلاق یا اخلاقیات کا تصور تو ایک آفاقی انسانی تصور تسلیم کیا جاسکتا ہے یعنی حق ہر انسان کے لئے حق اور باطل باطل ہی ہے۔ لیکن آپ کی تحریر میں بار بار خدا کا ذکر آنے کے باوجود کہیں اشارہ موجود نہیں کہ یہ کس مذہب کا خدا ہے کیوں کہ دنیا کے تمام مذاہب میں خدا کے تصور میں اختلاف سے آپ انکار نہیں کرسکتے۔ واضح کیجئے کہ آپ نے اپنا تصور کیا ہے اور اپنے اداریے کے ذریعے آپ آزادیٔ ذہن کے سلسلے میں کس خدا کی پشت پناہی قبول کرسکتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ زیرِ نظر اداریے میں آپ نے ایسا موضوع منتخب کرلیا ہے جس کے کلیدی کو الف کو اعتقادی طور پر بیان کرنا آپ کے بس میں نہیں پھر مذہب میں (خصوصاً میرے اور آپ کے مذہب میں) صرف خدا کو ماننا کافی نہیں بلکہ رسالت اور شریعت بھی پوری اہمیت کے حامل ہیں جو یقیناً آپ کے آزادیٔ ذہن کے تصور پر روک لگانے والے عوامل ہیں۔ اپنے اداریے میں آپ جن کی طرف ملتفت نہیں ہوئے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی ساری بحث نظری، عمومی، جمہوری اور سیکولر بحث ہے لیکن اس پر گل افشانیٔ گفتار کے لمحے میں آپ کو اپنی اعتقادی، اخلاقی اور مذہبی پوزیشن بھی واضح کرنی چاہیئے تھی کہ اگر مدیر مذہب اور ادب و فن کے تناظر میں کوئی مسئلہ پیش کرتا ہے تو یہ اس کے لئے لازمی ہے۔

اپنے پہلے جملے میں آپ فرماتے ہیں کہ آزادیٔ ذہن میں مذہب بیزاری کا مفہوم ہرگز شامل نہیں۔ لیکن آپ کو اقرار ہے کہ یہی مظہر دانشوری اور آزادیٔ ذہن کا علامیہ بھی ہے۔ چنانچہ اسی قول محال نے آپ کے تصورِ خدا کو ابہام کے پردوں میں چھپادیا ہے ورنہ آپ کا تصورِ خدا یقیناً وہ نہیں ہے۔ جو اداریے میں آپ نے بیان کیا ہے اور جسے آپ لفظ معنی متن اور زبان جیسے عوامل کی طرف موڑ لے گئے ہیں۔ اس موڑ پر ایک اختلاف پھر سر اٹھاتا ہے کہ آپ کے خیال میں خدا اور کائنات کے اسرار تک رسائی کے لئے عقل حواس اور وجدان لفظ و معنی ہی کے دشمن ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کائنات کے اسرار تک رسائی کے لئے لفظ و معنی سے یہ خدمت لی جاسکتی ہو۔ لیکن خدا کے اسرار تک رسائی کے لئے لفظ و معنی عقل، حواس اور وجدان کی مدد نہیں کرتے۔

یہاں آپ زبان کے نوساختیات کی رو سے متن (وجود) اور معنی (تصورِ خدا) کی بحث اٹھاتے ہیں۔ لیکن یہ لفظی گورکھ دھندا آپ کا ہو یا کسی ماہر لسانیات اور ماہر ساختیات وغیرہ کا۔ بے کار محض کی ذیل میں آئے گا کیوں کہ (میرا اور آپ کا) خدا جو لفظ و معنی کا خالق ہے اپنی تخلیق کے جال میں گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔ اداریے کے اختتام پر آپ کے مطالبات میں کوئی نیا پن نہیں۔ پھر یہاں نفی سے اثبات کے امکان پر فلسفیانہ بحث کرتے ہوئے آپ معلوم سے نامعلوم کی طرف نکل کر بحث کو بالکل مخالف رخ پہ لے آتے ہیں۔ کیا نفی و اثبات اور معلوم نامعلوم بالترتیب ایک دوسرے کے مترادف ہوسکتے ہیں؟ ۔ پس معلوم ہوا کہ خدا مذہب اور فلسفے اور عقیدے وغیرہ کا ناصاف تصور آپ کے اظہار میں رکاوٹ بنا ہے۔

اشعر نجمی، بلاک نمبر ۲، مسجد کوارٹر، شاستری نگر، جمشید پور - ۵

واقعی شمارہ نمبر ۱۷ کے اداریہ کا موضوع اہم بھی ہے اور شدید بحث طلب بھی ہے۔ حالاں کہ ہمارے یہاں اس قسم کے موضوعات پر قلم اٹھانا کفر تصور کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ اندیشہ ہمیشہ تعاقب میں رہتا ہے کہ کہیں ہم پر بھی نظریہ سازوں کی اشتہاریت کا الزام نہ آجائے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یاروں نے بھی اجتہاد اور انحراف کی آڑ میں اب تک یہی کیا ہے۔

آپ نے اپنے اداریہ میں موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے اس سے متعلق تقریباً تمام اہم نکات کی طرف توجہ کی ہے جو بلاشبہ لائق تحسین ہے۔ مبارکباد۔

آپ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ مذہب بیزاری نے دانشوری کی ایک نئی تعریف کو جنم دیا ہے۔ پڑھے لکھے فیشن ایبل حلقوں میں

مذہب سے بیگانگی کا رویہ عام ہے اور اسے روشن خیالی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ اس بات کے اعتراف میں شرم اور جھجک محسوس کرتے ہیں کہ وہ معاشیات اور ادب سے ناواقف ہیں۔ وہی حضرات اس بات کا اظہار بڑے فخر سے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ مذہب کے معاملے میں بالکل کورے ہیں۔ یا یہ کہ وہ ان قصوں اور مسلوں سے آگے نہیں بڑھے جو دوران تعلیم ان پر نصاب بنا کر تھوپ دیئے گئے تھے ان رجحانات کے فروغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرد کے اندر خلاء میں معلق ہونے کا احساس دوبالا ہو گیا۔ دوسری طرف ماضی میں جن صحت مند مذہبی روایات سے ہمارا ایک تخلیقی رشتہ تھا وہ بھی تقریباً ٹوٹ گیا۔ مذہب پر گفتگو کرتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مذہب صرف نظریاتی عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ انسان اور زندگی کے باہمی نامیاتی تعلق کا ایک فعال پہلو ہے۔ لہذا زندگی کے اس سرچشمے سے کٹ جانا اور اسے بے معنی قرار دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ میرا مادی پیکر بے معنی ہے۔

فرائڈ کا یہ نقطۂ نظر کہ مذہب ایک قسم کی اعصابی بیماری ہے، درست نہیں کیوں کہ اوّل تو یہ کہ مذہب کے سلسلے میں اس قسم کے بنے بنائے نظریات کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ ہمیں مذہبی رویوں اور ان کے گہرے مفہوم کا قریب سے مطالعہ کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ اور جہاں تک کسی آدرش کا اعصابی بیماری میں تبدیل ہو جانے کا سوال ہے تو پھر تنہا مذہب ہی کیوں۔ بلکہ زندگی کا کوئی بھی پہلو اعصابی بیماری کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ مثلاً فلسفہ پُرشوش اور گوناگوں مسائل سے پُر اس دنیا کی حقیقت سے ایک صاف ستھرے ہم آہنگ نظام کی طرف فرار کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اسی طرح سائنس ایک بے لچک اور سخت گیر عقیدہ بھی بن سکتی ہے۔ جس کی مدد سے انسانی جذباتی مسائل اور بے یقینی کی فضا سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے عہد میں ذہین اور پڑھے لکھے حلقوں میں سائنس کو مذہب سے زیادہ قبولیت کی سند حاصل ہے۔ اور اس کے مفروضوں کو شک و شبہ کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس لئے گمان غالب ہے کہ مذہب کے مقابلے میں سائنس ہی زیادہ تر زندگی کی بے یقینی سے ایک قسم کے اعصابی فرار کا وسیلہ بنتی ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ سائنس نے انسان کو فطرت کی غلامی سے نجات دلائی ہے۔ لیکن میرا یہ بھی ماننا ہے کہ اس نے توازن، ذہنی استحکام اور اخلاقی وحدت کا شیرازہ بکھیر کر انسان کو خود اپنا ہی غلام بنا لیا ہے۔ لہذا انسانی خود غرضی اور ہوس پرستی کے نتیجہ میں سائنسی ارتقاء کے بطن سے تہذیبی انتشار نے جنم لیا۔ ہر شخص اپنا بکھرا ہوا وجود لئے کٹی پتنگ کی طرح لایعنیت کی راہ پر سرگرم سفر ہے۔ تو کیا لافردیت اور لاشخصیت کی سطح پر جینا انسانیت کی سب سے بڑی تذلیل نہیں ہے؟۔

دراصل مذہب پر یہ اعتراض یا اس قسم کے سیکڑوں اعتراضات نہ صرف حقائق سے مکمل بے خبری کا ثبوت ہیں۔ بلکہ نا شعوری بدنیتی کی واضح مثال بھی ہیں۔ ورنہ بخوبی ہم یہ دیکھ سکتے ہیں بلکہ دیکھ بھی رہے ہیں کہ مذہبی بے تعلقی نے کس طرح منفی رجحان کو فروغ دیا ہے یہی سبب ہے کہ آج ہر تصور زندگی کی طرف تشکیک اور بے یقینی کا عام رویہ کارفرما نظر آتا ہے۔ حالاں کہ انسانی زخموں کی چارہ جوئی میں مذہب نے جو تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ بھی ہماری نظر کے سامنے ہے۔ لیکن احسان فراموشی اور بد دیانتی کی انتہا یہ کہ انسان اپنی خباثت اور درندگی کا جواز مذہب کے اندر تلاش کرتا نظر آ رہا ہے۔ اس پردے کے پیچھے جھانکنے کی کوئی کوشش بھی نہیں کرتا ہے کہ مذہب جو کبھی مثبت اور تعمیری طرز حیات کی علامت تھا۔ موجودہ دور میں باہمی بغض و عناد، تنگ دلی، رجعیت و منفیت کا آلۂ کار کیوں بنا دیا گیا۔ کوئی یہ بتلانے کی زحمت نہیں کرتا ہے کہ کس طرح منفی اور متعصبانہ تعبیر و تفسیر نے ہر مذہب کو غیر انسانی و غیر اخلاقی قدروں کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ کس طرح مذہب کی تذلیل خود اہل مذہب کے ہاتھوں ہوئی ہے اور کیسے پیران مذہب کی ساموسیت نے مذہب سے بے تعلقی پیدا کی۔ لیکن ان باتوں پر غور کرنے کی فرصت کسے ہے کہ سبھوں پر سیاسی مصلحتیں حاوی ہیں۔ لہذا بہتر یہ سمجھا گیا کہ مظلوم کو ہی ظالم قرار دے دیا جائے اور یوں تمام قصہ ہی پاک ہو گیا۔ یعنی مذہب جو خود مصلحتوں اور ذاتی مفادات کے ہتھیاروں سے لہولہان تھا۔ اسے ہی مورد الزام ٹھہرا دیا گیا۔ اور اس طرح سارے مباحث یا اصلاحات کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا جن کے امکانات روشن تھے۔

آپ نے درست فرمایا ہے کہ ہندوستان کی نام نہاد جمہوریت نے مذہب بیزاری کو سیکولرزم کا نام دے کر جس طرح اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے، وہ شرمناک بھی ہے اور کسی حد تک خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ مذہب فرد کو موضوعیت عطا

کرتا ہے۔ موضوعیت سے محروم ہو کر فرد ایک زندہ اور دھڑکتا ہوا وجود نہیں رہ پاتا ہے بلکہ "روبوٹ" بن جاتا ہے۔ اور وہ لاشخصی اور لاانسانی سطح پر جینا شروع کر دیتا ہے۔ اپنے کٹر پن اور تنگ دلی سے فرد کی یوں بے خبری جمہوریت کے لئے سمِ قاتل ہے

بلاشبہ آپ نے ایک نہایت ہی اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ امید ہے کہ اس طرح کے دوسرے موضوعات بھی آئندہ آپ کی توجہ کا مرکز بنیں گے۔

کاوش عباسی

● پوسٹ بکس نمبر ۲۹۰۱۱، ریاض ۱۱۴۶۱ - سعودی عرب

آپ کا اداریہ "نہیں سے ہاں کا ممکن" پڑھا۔ مگر افسوس کہ دل اس سے متفق نہیں ہو سکا۔ آپ نے اپنے ایک پہلے اداریے (اداریہ جون ۱۹۹۴ء۔ کائنات، آدمی، نظریے اور زندگی۔ میں نے اس اداریے کی آخری دو تین سطریں چھوڑ کر، آپ کو داد و مبارکباد بھیجی تھی) کے آخر میں بھی مذہب کی بات رکھی تھی۔

میرے خیال میں یہ ایک مشکل حکایت ہے۔ آپ نے سائنس اور خیال پسندی کو دو یکساں گھروں جیسا بنا دیا کہ پہلے کچھ مدت آدمی نے سائنس کے گھر میں گزار لی۔ اب کیوں نہ دوسری گلی میں سامنے کے خیال پسندی کے گھر میں آباد ہو جائے۔ افسوس کہ برصغیر کا ذہن ماضی کی کٹ حجتیوں سے باز نہیں آتا۔ پتہ نہیں اسے بچپن اور لڑکپن کے دیومالائی اور آسمانی تصورات میں ایسا کیا کچھ نظر آتا ہے کہ ارد گرد کی دیو ہیکل مادی دنیا کا اس پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ ہماری فلاکت، حقارت، پس ماندگی اور کسمپرسی اسی وجہ سے ہے۔ میں اسے GLOBAL INFERIORITY کہتا ہوں۔ یہ ایک وسیع و بلیغ اصطلاح ہے۔ جو ہماری جغرافیائی اور ماحولیاتی (سماجی عوامل سے کہیں پہلے) کی فطرت کو ہم پر واضح کرتی ہے۔ خیال پسندی اس دور کی فکری کیفیت کا نام ہے۔ جب انسانی ذہن پر انکشاف و علم کی بجائے اسرار و حیرت اور ان کی روحانیات کی حکمرانی تھی۔ دیومالائی اور سماوی تصورات قرونِ وسطیٰ کے فرد و معاشرہ کا مقدر تھے۔ جب کہ سائنس آج کے تاریخی طور پر بلند تر فرد و معاشرے کے وجود کا لازمی حصہ ہے۔ آپ ان دونوں میں سے کسی کو اپنی ذاتی مرضی سے جب چاہیں اختیار نہیں کر سکتے۔ ان کا فیصلہ خود زمانہ کرتا ہے۔ افسوس کہ ہم بار بار یہ ثابت کرتے رہتے ہیں کہ ہم برصغیری دراصل قرونِ وسطیٰ کی کوئی مخلوق ہیں۔ جو اتفاق سے آج کے نئے زمانے میں جی رہی ہے۔

خدارا ہم سے آپ سترھویں، اٹھارویں صدی والے پادریوں جیسی باتیں نہ کریں۔ بلکہ آپ اپنے مذکورہ جون ۱۹۹۴ء کے اداریے پر قائم رہیں۔ کوئی MADE - EASY یا تن آسانی آج کے مختلف خیال انسان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اسی سلسلے میں اپنا ایک قطعہ گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔

صاف مکرنا جھوٹے خواب تھما دینے سے اچھا ہے
سامنا کرنا ریت میں سر کو چھپا لینے سے اچھا ہے
اک بحر متلاطم ہے اگر ازل تو اس کے تھپیڑوں کی
مار میں رہنا ساحل پر کشتی کھینچنے سے اچھا ہے

آج برصغیر میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ، سماجی پسماندگی، تاریخی ویرانی، انفرادی کمتری، اور ہمارے وجودوں میں زندگی کی کمی ہے۔ ہم بڑے لوگ پیدا نہیں کرتے۔ ہم ہمیشہ سے ایک کمتر خود بند اور سڑاند جیسی صورت حال میں جیتے رہے ہیں، ہمارے ردعمل کامل، فطری صاف سیدھے نہیں بلکہ کمپلیکس اور الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہماری فطرت سے کاملاً جڑی ہوئی اور زندگی سے بھرپور آزاد خیالی اور روشن فکری ہی ہمارے لئے کوئی نیا پیغام لا سکتی ہے۔

اس عہد کے موضوع یا نظریے کے حوالے سے میں بھی آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ پچھلے پندرہ بیس سالوں کے شعر و ادب کو ہی لیں۔ چلیں افسانے کی بات کرتے ہیں۔ ان پندرہ بیس سالوں میں میں نے جتنے افسانے پڑھے ہیں۔ بلکہ میرا مطلب ہے کہ غالب رجحان کے طور پر جتنے اردو افسانہ نگاروں کے افسانے چھپے ہیں (سوائے چند بیرونِ پاک و ہند یعنی مغرب کے اردو افسانہ نگاروں کے) ایک

وہنوں میں کچھ کچی پکی لڑکیوں اور عورتوں کے افسانوں کے) مجھے ایک افسانہ ایسا یاد نہیں جس میں محبت یعنی لڑکا، لڑکی یا مرد، عورت کی محبت اور اس کی رنگ بکھیرتی سرخوشی یا اداسی موضوع ہو۔ پچھلے پندرہ بیس سال کیا تھے؟ پچھلے پندرہ بیس سال ترقی پسند تحریک کے زوال، تقریباً خاتمے اور اس کی مخالف جدیدیت اور آزاد زندگی کے نظریات کی فتح اور غلبے کے سال تھے۔ جن میں اکثریتی طور پر ان ہی نظریات پر مبنی شعر و ادب کا چرچا رہا بلکہ حکمرانی رہی تو کیا ترقی پسندی پر جائز و ہمہ گیر تنقید کرنے کے بعد اس کے مخالف رد عمل میں جو متاعِ آخر ہمیں پائی تھی وہ یہ جھکے بے آب تھی۔ وہ یہ "ابدی و آفاقی ہدایت" تھی کہ ہمیں زندگی کو محبت سے خالی کر دینا تھا اور سانسے لینا محض سر کے بل کھڑے ہو کر گزارنا تھا۔ ان ہی سالوں میں تنقید کو لیں۔ ان سالوں کی ایک سب سے بڑی مثال شمس الرحمٰن فاروقی ہیں۔ انہیں اپنی کسی تحریر میں، کسی مضمون میں، یا اب دیکھے میں، محبت اور محبت کی گرمی کا کوئی پہلو قابلِ اعتنا نہیں لگا۔ یہ خود میر تقی میر کے اعلانیہ دیوانے بنے ہیں۔ میر تقی میر کون ہیں؟ کیا ہیں؟ عشق و محبت اس کے دکھ سکھ، زندگی کے سخت روز و شب اور ایک مکمل انسان کے دردِ محبت سے لبریز دل کی ٹھوکریں، میر کی پوری زندگی ہیں اور ان کا پورا موضوعِ سخن ہیں۔ مگر یہ (یعنی شمس الرحمٰن فاروقی) شعر و ادب پر حتیٰ کہ میر پر تنقیدی تحریریں ایسی بے دلانہ ترشی اور ایسی جھنجھلاہٹ سے لکھتے ہیں۔ جیسے ان کے لئے ایک فن پارہ، ایک دھڑکتے دل کی ہشت پہلو روداد اور اس میں انسانی شرکت کی آواز نہ ہو بلکہ کوئی فکری جھگڑا یا گل کا مقدمہ ہو اور یہ اس جھگڑے یا مقدمے کی ایک سیاسی پارٹی کے طور پر اپنا جبری نکتہ نظر یا "نکتہ نظر" بیان کر رہے ہوں یا جیسے یہ شعر و ادب میں کوئی نسخۂ کیمیا یعنی کمسٹری کا کوئی کیمیکل نکالنے میں لگے ہوں۔ میرے بھائی یہ زندگی نہیں ہے، زندگی محض زندگی پر سوچنے کے لئے نہیں ہے بلکہ زندگی گزارنے کے لئے ہے۔ زندگی پگھلے ہوئے جذبات کی ایک مہربان ودیعت ہے۔ اور ادبی اظہار ان پگھلے ہوئے جذبات کا نور ہے۔ وہ لوگ جن کے پیچھے جھگڑے اور جھنجھلاہٹ کی گرد سے اٹے ہوئے اور جن کے وجود حجرہ جاتی تیاگ اور مدرسانہ کور ذوقی کے کفن میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ان کے دل اس نور سے عاری ہیں۔

ان مجرد، عاری اور بوجھل بے آب لوگوں کو میں اس قابل نہیں سمجھتا کہ یہ ہمہمی سے سرشار، دھڑکتی زندگی پر یا اس کے بارے میں کوئی سوال قائم کریں۔ پرانے ترقی پسندوں پر ہر فطری اور جائز آزادانہ رد تنقید بجا۔ مگر اس ایک اساسی معاملے میں تو وہ جیت گئے وہ جب تک جانے رہے معقول رہے۔ انہوں نے شعر و ادب میں محبت اور زندگی کی گرمی کو قائم رکھا، خواہ اس طرح کہ "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ"، "یا وہ میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے"، "یا وہ تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا"، "یا وہ ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"، "یا وہ ...." انہوں نے اپنے انقلابی سفر میں بھی اپنی یا اپنے جنسِ مخالف کو اپنے ہم قدم رکھا۔ پچھلے پندرہ بیس سالوں کے شعر و ادب نے وہ انسان دیا۔ اس کے پاس دل نہیں ہے۔ جنس مخالف کی محبت نہیں ہے۔ عشق کی سرشاری نہیں ہے، زندگی کی گرمی نہیں ہے، وہ تو بس سر کے بل کھڑا ہو کر اور بے روح و بیزار الجھنوں میں پھنسا ہوا عجیب سا ایک مخمصہ ہے، محرومی و احساس کمتری کا مارا ہوا، ہند و پاک کا ماضوی، متوسط طبقے کا فرد زندگی کی ہمہمی سے عاری، کسی کمپنی کے یا حکومتی دفتر کا سیلن زدہ کلرک ہے۔ جس کے پاس بگڑی ہوئی خود کلامی کی بے رنگی و پریشانی تو ہے مگر لکھے ہوئے مکالمے کی کھلی آواز کی گرمی و شادمانی نہیں ہے۔

اس کے مقابلے میں میں نے حال ہی میں، مذکورہ مدت کے دوران کے امریکہ اور مغرب کے افسانہ نگاروں کی، آج کے انسان کی زندگی سے بھرپور ایسی کہانیاں پڑھی ہیں کہ زندگی پر دوبارہ ایمان آ جائے۔ طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ مغرب کے معاشرے کے تجارتی پن، نفسا نفسی اور فرد میں [illegible] اور اس ایک مشینی پرزے میں ڈھل جانے کا پروپیگنڈا کرنے والے غلط پسند فکری ڈبوں کو یہ ضرور غور و فکر سے پڑھنی چاہیئے۔

آخر ہم ایسے بد مقدر کیوں ہیں؟ ہم ایسی فکری زود رنجیوں کو کیوں پالتے ہیں جو ہمیں زندگی کے گوشت اور خون ہی کا منکر بنا دیتی ہے۔ ہمیں [illegible] بلکہ صدیوں از زندگی کی ترنگوں سے عاری و محروم رکھتی ہیں۔ ہمارے قلب و ذہن ایسے کیوں ہیں جو مجسم زندگی پر زندگی کی پرچھائیں کو ترجیح دیتے ہیں؟ ہم میں زندگی کے لطف کی امنگیں نہیں ہیں؟ ہم سولہ سال کے ہوں یا بیس سال کے یا تیس، چالیس، پچاس سال کے، کیا سب سے پہلے لطف اور زندگی کی دھڑکنوں کا سیدھا یا گھوم پھر کر کیا آخری مرکز مرد، عورت کی کشش اور محبت نہیں؟ لیکن ہم نے تو پچھلے پندرہ بیس برس [illegible]

تو میں پوچھتا ہوں کہ سب افسانہ نگار اگر شادی شدہ تھے تو انہیں بیوی سے، نوجوان تھے تو کسی لڑکی سے (یا اگر لڑکی افسانہ نگار رہی ہے تو لڑکے سے) یا غیر شادی شدہ تھے تو عورت سے، التفاتِ محبت اور عشق کے دکھ سکھ کا کوئی تعلق نہیں رہا یا انہیں رہتا تھا۔ کیا انہیں واقعی صدا قیاس کی جلن رہتی تھی اور کبھی زندگی پر پیار نہیں آتا تھا۔؟

اقتدار امام صدیقی صاحب! آپ میں تو محبت اور زندگی کی گرمی ہے۔ آئیں، ہم زندگی کی پرچھائیں بننے کی بجائے مجسم زندگی کا اثبات کریں۔ آئیں ہم ماضی تشخیصوں، کیمیائی نسخوں اور بے حیات جھنجھلاہٹوں کو چھوڑ کر، شعر وادب میں محبت اور زندگی کے چلن کو دوبارہ عام کریں۔ ایسے کہ سکھ ہو تو زندگی کا، دکھ ہو تو زندگی کا، جئیں تو زندگی نہ جی سکیں تو بھی زندگی۔ کیونکہ زندگی کے ہر سوال کا جواب، آخر کار، بہتر اور زیادہ بھرپور زندگی ہی ہے۔!

سو میرے نزدیک تو صدیقی صاحب۔ شعر وادب میں زندگی کے موضوعات وسوالات یہی ہیں نہ کہ دہنیں سے بان کا ممکن،، جیسی ایک نئی تاویل اکر۔

مناظر عاشق ہرگانوی

کوہسار، برہم پورہ، بھاگلپور۔ ۸۱۲۰۰۱ - بہار

بدر عالم خلش کا مضمون ہضم نہیں ہو سکا۔ انہوں نے اپنے تئیں مخلص ہونے کی کوشش کی ہے لیکن ہانس گیورگ گدامر HANS GEORG GADAMER کو انہوں نے اچھی طرح نہیں پڑھا ہے۔ اس کی کتاب TRUTH AND METHOD (1975) وہ ضرور پڑھیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو گوپی چند نارنگ کی کتاب ،، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات،، کا دو جزو ضرور مطالعہ کریں۔ نارنگ نے گدامر سے بھی بحث کی ہے۔ گدامر تفہیمیت کو موضوعی یا معروضی عمل کے طور پر نہیں دیکھتا وہ اس نکتے ،، کھیل ،، کی تمثیل لاتا ہے کہ کھیل میں ہم کھیل سے باہر نہیں رہتے بلکہ اس کا حصہ ہو جاتے ہیں۔

PLAYING IS A PERFORMANCE OF WHAT IS NO

OBJECT BY WHAT IS NO SUBJECT

تفہیمیت ایک کھیل کی طرح ہے جیسے ہم کسی ڈرامے میں حصہ لے رہے ہوں۔ کیونکہ کردار جو اپنے رول کو سمجھنا چاہتا ہے اور وہ اپنے رول کو ڈرامے کا حصہ ہو کر ہی پوری طرح سمجھ سکتا ہے۔ زندگی کا بڑا ڈرامہ جس میں ہم سب شریک ہیں۔ تاریخ ہے۔ کیونکہ انسان تاریخ کے اندر وجود رکھتا ہے گدامر کہتا ہے کہ تاریخ کی روایت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اندر سے سمجھا جائے۔ تفہیم کا عمل ہمیشہ اندر سے شروع ہوتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ کبھی کبھی روایت کو سمجھنا ضروری نہیں بھی ہوتا تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ شعور کبھی کبھی غیر تاریخی اور خود اساس ہوتا ہے۔ جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ گدامر کا مرکزی مبحث یہی ہے کہ فن پارہ کسی بندھے بندھائے بنڈل کے طور پر وارد نہیں ہوتا۔ اس کے معنی پڑھنے والے کی تاریخی حالت پر منحصر ہیں۔ لیکن ادبی مطالعے میں تاریخ کو شامل کرنے کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے یہ ایک طرح سے مارکسیت کو خود مارکسیت کی سطح پر انگیز کرنے کی کوشش ہے۔ گدامر کا کارنامہ یہ ہے کہ خالص موضوعیت اور خالص معروضیت، منشائیت اور ردّ منشائیت۔ ماضی کی عقیدت اور حال کی اہمیت، یا متن کی بالادستی اور قاری کے کردار میں جو قطبیت POLARISATION اور پریشان کن تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے اسے ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس مشکل کام کے لئے اس نے بیچ کی راہ کا انتخاب کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ تاریخی شعور تصادم اور عدم تکمیل سے پیدا ہوتا ہے۔ متن اور لمحہ معاصر کی کشمکش اس کا حصہ ہے۔

بدر عالم خلش نے گدامر کا نام جارج گدامر لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔ جرمن زبان میں ھابیج کے مترادف نہیں۔ بلکہ تلفظ میں آتا ہے اس کا پورا نام میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ اسی طرح ایڈمنڈ ہوسرل اصل تلفظ ہے۔ خلش صاحب نے اڈمنڈ سرل لکھا ہے۔ اس کا عہد ۱۸۵۹ء - ۱۹۳۸ء ہے۔ یہ محض مظہریاتی دبستان تنقید کا ہی نہیں۔ بلکہ مظہریت PHENOMENOLOGY کو فلسفیانہ طور پر قائم کرنے والا پہلا فلسفی ہے۔ دراصل مظہریت ایک ایسا فلسفیانہ رویہ ہے جو معنی اخذ کرنے کے عمل میں دیکھنے والے PERCEIVER

کے تفاعل پر زور دیتا ہے۔ ہوسرل کی رو سے فلسفیانہ جستجو کا موضوع یہ ہے کہ ہمارے شعور میں کیا کچھ ہے نہ یہ کہ دنیا میں کیا کچھ ہے۔ شعور ہمیشہ کسی نہ کسی شئے کا ہوتا ہے۔ میں کسی نہ کسی شئے کا شعور ہمیں اپنے شعور کے ذریعے حقیقت، معلوم ہوتا ہے۔ ہوسرل مزید کہتا ہے کہ جو مظاہر PHENOMENA ہمارے شعور میں ہیں۔ انہیں کے ذریعہ ہم اشیا کی اصل اور ان کی صفات کا تعین کرتے ہیں۔ مظہریت کا دعویٰ ہے کہ وہ انسانی شعور اور مظاہر کی اصل نوعیت سے آگاہ کرتی ہے۔ مظہریت کا فلسفہ دراصل اس خیال کی بازیافت کی کوشش تھی کہ ذہن انسانی تمام معنی کا مبدا اور ماخذ ہے۔ ادبی تنقید میں اس فکری رویے سے نقاد کے موضوعی عمل پر نہیں بلکہ قرات کے اس عمل پر توجہ ہوئی کہ متن کی مدد سے مصنف کے ذہن و شعور کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ مظہریاتی تنقید کے نزدیک ادب شعور کا ایک فارم ہے اور تنقید کا کام اس فارم کا تجزیہ کرنا اور اس میں مصنف کے تہ نشیں شعور کی نشان دہی کرنا ہے۔

خلش صاحب نے ہائیڈیگر کا نام لیا ہے۔ لیکن گدامر کے بعد اس کا نام لکھ کر غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ ان کی جانکاری کے لئے عرض ہے کہ ہائیڈیگر کی بصیرت سے کام لینے اور اس کی فکر کو آگے بڑھانے والوں میں گدامر اہمیت رکھتا ہے۔ گدامر نے پیش تفہیم FOREUNDERSTANDING کی جو اصطلاح پیش کی ہے وہ ہائیڈیگر ہی کی ہے۔ ہائیڈیگر کا مسئلہ اتنا علمیاتی EPISTEMOLOGICAL نہیں جتنا وجودیاتی ONTOLOGICAL ہے۔ کیوں کہ اس کے لئے تفہیم جاننے KNOWING کا نہیں، ہونے BEING کا مسئلہ تھی۔ اسی لئے کتاب (1927) BEING AND TIME میں تفہیمیت، جستجو INQUIRY کا طور بھی ہے اور وہ چیز بھی جس کی جستجو کی جا رہی ہے۔ ہائیڈیگر کا شمار قاری اساس نقاد READER-ORIENTED CRITIC میں ہوتا ہے یہ تفہیمیت HERMENEUTICS کے دائرۂ عمل میں آتا ہے۔

خلش صاحب نے شلائرماخر اور ڈلتھی کا بھی نام لیا ہے۔ شلائر کا پورا نام فریڈرخ شلائرماخر FRIEDRICHSCHLEI - RMACHER اور ڈلتھی کا ولیم ڈلتھی تھا۔ یہ دونوں ہی تفہیمیت کے علمبردار تھے۔ یہاں میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تفہیمیت صدیوں پرانا فلسفہ ہے۔ جو از سر نو معرض بحث میں آگیا ہے۔ مغرب میں جس تفہیمیت کا آغاز قدیم متون کو پرکھنے اور ان کے حقیقی معنوں کے جاننے کے لئے ہوا تھا۔ آج اسے مختلف علوم میں تفہیم کاری کے کام کے لئے برتا جاتا ہے۔ اور اس کا چلن مذہبیات کے علاوہ تاریخ، سماجیات، قانون اور علوم انسانیہ کے مختلف شعبوں میں ہو رہا ہے۔ شلائرماخر نے تفہیمیت کو کسی بھی نوع کی تفہیم کاری کے لئے برتنے کی راہ کھولی اس نے اصرار کیا کہ مسئلہ فقط قدیم متون کو سمجھنے کا نہیں بلکہ تفہیم کے عمل کا ہے۔ وہ گرامر، تاریخ، تقابل، ہر زاویے سے معنی کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی شلائرماخر کا شاگرد رشید ولیم ڈلتھی ہے۔ جس نے تفہیماتی فکر کو آگے بڑھایا۔ اور ڈلتھی کے ہی نکتہ STUDIES OF MAN کو وجودیت کے مشہور فلسفی مارٹن ہائیڈیگر نے اپنایا۔

ان تمام پہلوؤں پر تفصیلی باتیں ہو سکتی ہیں جن کا یہاں موقع نہیں ہے۔ میں خلش صاحب سے ایک بار پھر گزارش کروں گا کہ وہ نارنگ صاحب کی کتاب ضرور پڑھیں اور مناسب سمجھیں تو میری کتاب "گوپی چند نارنگ اور ادبی نظریہ سازی" کا بھی مطالعہ کریں۔ ان کے اس جملے سے میں قطعی متفق نہیں ہوں۔ کہ ہمارے ادب کے آس پاس نئے نئے نظریات کی چہل پہل کیا۔ ہلکی سی آہٹ بھی نہیں سنائی دیتی۔

اردو ادب میں ہی کتنے نظریات گزشتہ پانچ دس سال سے چہل قدمی کر رہے ہیں اور ان پر بحثیں ہو رہی ہیں۔ دیگر علوم کی بھی بے شمار کتابیں اردو میں شائع ہو رہی ہیں۔ ترقی اردو بورڈ، بک ٹرسٹ انڈیا اور پاکستان میں مقتدرہ قومی زبان تجارتی انتظامیات، صنعتی نفسیات، علم حشرات الارض، جدید فلکیات، کمپیوٹر پروگرامنگ اور جینیات وغیرہ موضوعات پر کتابیں شائع کر رہے ہیں۔

بدر عالم خلش
مکان نمبر ۲ - بلاک نمبر ۳، شاستری نگر کدمہ، جمشید پور - ۵

گرامی نامہ موصول ہوا۔ ساتھ میں مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کا خط بھی ملا۔

پہلی قرأت میں ہی بھانپ گیا کہ "وہ زبان کچھ اور بولتے پیرہن کچھ اور کہتی ہے"۔ دوسری بار ذرا ٹھہر ٹھہر کر پڑھا۔ متن مکتوب بناوٹ کے لحاظ سے پیچیدہ اور گاڑھا ہونے کے باوجود صاف و شفاف نظر آیا۔ دل نے کہا کہ نہیں، یہ SILK جیسا گل پور کا نہیں تھا۔ چونکہ مناظر عاشق خط میں نارنگ صاحب کا ذکر بار بار آیا ہے اس لئے میں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتابوں کو دوبارہ الٹنا پلٹنا شروع کیا۔ یقین کیجئے وہ میرے لئے نہایت بے یقینی کا لمحہ تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ "قاری اساس تنقید: مظہریت اور قاری کی واپسی" کے ص ۲۶ تا ص ۳۶ کی کئی عبارتیں مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے خط میں بقدر ضرورت تقدیم و تاخیر کے ساتھ من وعن نقل کرلی ہیں اور مذکورہ کتاب کا اپنے خط میں قطعی ذکر نہیں کیا ہے۔ خط کے آغاز میں جہاں انہوں نے "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کا ذکر کیا ہے اس کے فوراً بعد بڑی پرفریب ہنرمندی سے ایک جملہ جڑ دیا ہے "نارنگ صاحب نے گدامر سے بھی بحث کی ہے" تاکہ قاری کا ذہن نارنگ صاحب کی تازہ ترین تصنیف "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کی طرف منعطف ہو جائے اور وہ صاف بچ نکلیں۔

"قاری اساس تنقید" کی جن عبارتوں سے انہوں نے بغیر حوالوں کے اپنے خط کو سجایا ہے۔ وہ یکے بعد دیگرے دو ابواب "علم تفہیم" اور "مظہریت" کے عنوانات کے تحت ص ۲۶ تا ص ۳۶ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں دونوں ابواب کی XEROX شدہ نقل ارسال کر رہا ہوں۔ سہولت کی خاطر علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں کے جائے وقوع کی نشاندہی میں کئے دیتا ہوں۔

۱ :- "گدامر تفہیمیت کو موضوعی یا معروضی عمل کے طور پر ...... موضوع حاضر کی کشمکش اس کا حصہ ہے"
قاری اساس تنقید ص ۳۰ ص ۲۹۔

۲ :- "دراصل مظہریت ایک ایسا فلسفیانہ رویہ ہے .... مصنف کے تہ نشیں شعور کی نشاندہی کرتا ہے" ایضاً ص ۳۴-۳۵

۳ :- "ہائیڈگر کی سی بصیرت سے کام لینے اور اس کی فکر ...... وہ چیز جس کی جستجو کی جا رہی ہے" ایضاً ص ۲۸ اور ص ۲۹

۴ :- "مغرب میں جس تفہیمیت کا آغاز ...... تشکیل کرتا ہے" ایضاً ص ۲۷

۵ :- "تشکیل کرتا ہے" سے آگے عبارت میں تھوڑی سی تحریف کی گئی ہے جو اصل مفہوم کے لئے ہلاکت خیز ثابت ہوئی ہے۔

کسی کی فکری کاوشوں سے اثر قبول کرنا یا انہیں بطور استدلال اپنے کام میں لانا برا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کسی مضمون سے بعض حصوں کو مستعار لینا بھی جرم نہیں ہے۔ شرط ہے کہ اصل مضمون کا حوالہ متن میں دے دیا جائے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو عبارتوں کے ساتھ واوین کا التزام رکھا جائے اور حاشیے پر یا مضمون کے آخر میں وضاحتی نوٹ دے کر اصل ماخذ کا اعلان کر دیا جائے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کا ہے جو پڑھنے کی ETHICS کا لحاظ رکھتے ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ادب میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو دوسروں کی تحریروں سے صفحے کے صفحے اور پیراگراف کے پیراگراف اغوا کر لیتے ہیں اور ان مغویہ الفاظ کو اپنی ملکیت بتاتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ دوسروں کو حقیر گردانتے ہوئے انہیں مطالعے کا مشورہ دیتے ہیں یہ دانشورانہ بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے۔

"مال مسروقہ" سے اختلاف کرنے کی مجھے ضرورت ہی نہیں۔ کیوں کہ گدامر کے حوالے سے نارنگ صاحب نے کھیل کی تمثیل کی جو بات کہی ہے وہ راقم السطور کے معروضات اور پیش کردہ انگریزی اقتباسات سے متصادم نہیں ہے۔ ثبوت کے لئے نارنگ صاحب کا یہ جملہ کافی ہے "زندگی کا بڑا ڈرامہ جس میں ہم سب شریک ہیں، تاریخ ہے، کیوں کہ انسان تاریخ کے اندر وجود رکھتا ہے"۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ —— HERMENEUTICS کے لئے نارنگ صاحب نے "تفہیمیت" کی اصطلاح وضع کی ہے۔ لیکن میری نظر میں شرحیات مناسب ترین متبادل ہے۔ تفہیمیت کی اصطلاح پر پہلا اعتراض تو یہ وارد ہوتا ہے کہ تشریح کو تفہیم سمجھ لینا کھلا مغالطہ ہے۔ تفہیم تشریح کا کل نہیں بلکہ جزو ہوتا ہے یعنی تشریح INTERPRETATION کا عمل تفہیم UNDERSTANDING پر ختم نہیں ہو جاتا۔ تشریح معنی کی دی ہوئی حالت سے آگاہ ہو جانا نہیں ہے بلکہ اس آگہی کے "زبان" کی گرفت میں آجانے کا نام ہے۔ یہاں زبان سے میری مراد اظہار کی ایسی ہیئت سے ہے جس میں ممکن ہو خواہ وہ صوتی ہو یا عبارتی، اشارتی ہو یا علامتی SIGN - LANGUAGE تشریح کا عمل تفکر بالجہر THINKING ALOUD

ہے اور یہ تفہیم اضافہ ابہام دونوں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ محض متن کے جہانِ معنی کی سیر کرنا نہیں ہے بلکہ ان مشاہدات کو معروضیانا اور انہیں اظہار پیرایہ میں منتقل کرنا ہے۔ ماہر شرحیات وہ صوفی نہیں ہے جو مقامات میں کھو جاتا ہے بلکہ مختلف مدارج تفہیم سے گزرتے ہوئے وہ اپنی فتوحات سے آگاہ کرتا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ تشریح کے لئے اس کا رسائی پذیر ACCESSIBLE ہونا لازمی امر ہے۔ لیکن ہائیڈگر کی طرح گڈامر بھی تشریح کو تفہیم کا BY-PRODUCT سمجھتا ہے۔ گڈامر کے نزدیک تشریح، تفہیم کی مبیّن شکل ضرور ہے۔ لیکن اس کے باوجود تفہیم فی نفسہٖ مکمل تشریح ہے بقول گڈامر " تشریح تفہیم کے بعد وقوع پذیر ہونے والا توضیحی عمل نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ تفہیم ہی تشریح ہوتی ہے۔ چنانچہ تشریح محض تفہیم کی ظاہری شکل ہے " — (TRUTH AND METHOD, SHEED & WARD, LONDON P.274)

اور یہ بات ہائیڈگر نے BEING AND TIME میں پہلے ہی کہہ دی ہے۔
(BASIL BLACKWELL, LONDON P.190)

ہائیڈگر اور گڈامر کا نظریہ لیس MEANING سے BEING اور BEING سے MEANING تک کی تگ و دو ہے۔ کیوں کہ اس پر ماورائیت کا شدید غلبہ ہے۔ گڈامر کے نظریے پر رچرڈ روٹی اور یرگن ہابرماس اور جب بڑھ کر امیلیو بیٹی EMILIO BETTI نے تنقید کی ہے۔

امیلیو بیٹی کا خیال ہے کہ گڈامر کا نظریہ صرف عملِ تفہیم کی نوعیت سے بحث کرتا ہے۔ کامیاب تشریح کے کیا لوازم اور امکانات ہیں؟ صحیح تشریح اور غلط تاویل میں ہم کس طرح فرق کریں گے؟ جیسے سوالوں سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ بیٹی کا کہنا ہے کہ شرحیات کو وجودیاتی سے زیادہ منہاجیاتی ہونا چاہیئے۔ ہابرماس کی شرحیات جدلیاتی ہے۔ اس نے متن کی جگہ انسانی عمل کا مطالعہ اور تجزیہ کر کے سماجی حرکیات کی شرح پیش کی ہے۔

مختصر یہ کہ آج HERMENEUTICS کی حیثیت ایک ایسی ٹکنولوجی KUNTSLEHRE کی ہے۔ جس کا کام متن کشائی کے نت نئے اصول اور طریق کار ایجاد کرنا اور انسانی علوم (وہ علوم جن کا تعلق انسانی تجربات سے ہے) پر ان کا اطلاق کرنا ہے اور یہ طریق کار اور اصول، کسی ایک نظریے، خواہ وہ مظہریاتی ہی کیوں نہ ہو، کے تابع نہیں ہو سکتے۔ میرے دعوے پہ حجت یہ ہے کہ HERMENEUTICS کے آخر میں IES - کا لاحقہ جس امتیازی تفاعل کو درشاتا ہے وہ ACOUSTICS جیسے الفاظ میں SEMANTICS ' MNEMONICS ' AESTHETICS ' SEMIOTICS پہچانا جا سکتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جب ہم تفہیم یا تفہیمیت بولتے ہیں تو گویا ہم پہلے یہ فرض کر چکے ہوتے ہیں کہ قرأت کا عمل یک طرفہ اور انفعالی ہے۔ پھر نہ متن سیّال رہ جاتا ہے اور نہ قاری فعّال۔ برخلاف اس کے شرحیات بول کر ہم قاری کے اس کار پیدا وار اور عاملانہ کردار کو نمایاں کر دیتے ہیں جو کہ اس کا حق ہے اور یہ حق اسے مائل بہ قاری نظریات نے دیا ہے۔ رولاں بارت ہو لے یا ولف گانگ ایزر یا ہینس روبرٹ یاؤس منجملہ سبھوں کے خیالات کا لبِّ لباب یہی ہے کہ ہر قاری دورانِ قرأت متن کی از سرِ نو تدوین کرتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ مترجم نہیں نصف مصنّف بن جاتا ہے۔ لہٰذا شرحیات کو تفہیمیت کہنا قاری کو اس کے منصب سے برطرف کر دینے اور اس کے فعّال کردار کی نفی کر دینے کے مترادف ہے۔ یہ تو سبب چند جملہ ہائے معترضہ " تفہیمیت " بجائے " شرحیات " کے بارے میں۔

گوپی چند نارنگ کے الفاظ کو بے دخل کر دینے کے بعد مناظر عاشق کے خط میں بچا ہی کیا ہے کہ اس پر صفحات سیاہ کئے جائیں اور کچھ نہیں، کا غذ کی گرانی کا خیال آتا ہے لیکن جواب ادھورا رہ جائے گا تو کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ نہ ہو پائے گا۔ میں نے [illegible] (جرمن میں [illegible] لکھا جاتا ہے) کے تلفظ میں انگریزی زبان کی پیروی کی ہے۔ کیوں کہ ہمارے کان اور زبان انگریزی سے زیادہ آشنا ہیں اور جرمن سے بہت کم۔ اس لئے صوتی اعتبار سے بھی انگریزی جرمن کی بہ نسبت ہم سے زیادہ قریب ہے۔

انگریزی [illegible] زبان ہے جس میں تلفظ کے علاقائی معیارات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصول سعی اقل PRINCIPLE OF LEAST EFFORT کے مطابق۔ انگریزی تلفظ فوراً مقبول ہو جاتا ہے۔ ایک ادب ہی نہیں بلکہ دیگر GEISTESWISSENSCHAFTEN (معاف کیجیے گا)، یعنی انسانی علوم HUMAN SCIENCES میں بھی افکار و نظریات کا تبادلہ انگریزی کے توسط سے ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ ہی نہیں۔ ایشیائی زبانوں کا ادب بھی انگریزی کے ذریعے ہی ہم تک پہونچتا ہے۔ ہندوستانی ماہر ترسیل ایک پدمسی ALIQUE PADAMSEE کا کہنا ہے کہ ہمارے ملک میں متوسط طبقے کے پچیس کروڑ سے زائد افراد انگریزی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی کو ہندوستانی متوسط طبقے کی زبان کہا گیا ہے۔ ہم HAMBURG کو ہیمبرگ ہی بولتے ہیں ہیمبورگ نہیں۔ BENZ کو بینز اور NAZI کو نیزی کون بولتا ہے؟ GUNTER کو عام طور پر گنٹر پڑھا جاتا ہے۔ حالانکہ G کے بعد U املائی نشان ہے اس لئے گ کو ہونٹوں کی گولائی کے ساتھ کھینچتے ہوئے پڑھا جانا چاہیئے۔ سو کی ایک بات، ہم جرمنی کو جرمنی ہی کیوں بولتے ہیں اور لکھتے ہیں؟ ڈیوئش لینڈ تو دور رہا المانیہ بھی نہیں بولتے۔

WEBSTER'S NEW WORLD DICTIONARY OF AMERICAN LANGUAGE 2ND EDITION (SIMON & SCHUSTER) 1986, WEBSTER'S NEW COLLEGIATE DICTIONARY 1990, LONGMAN PRONUNCIATION DICTIONARY (LPD) BY J.C. WELLS, 1990

جیسی مستند ڈکشنریوں میں GEORGE کا تلفظ جارج اور ججارج دیا گیا ہے۔ یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ جرمن میں گیورگ پڑھا جاتا ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی مزید اطمینان کرنا چاہیں تو KARL BRUEL کی جرمن انگریزی لغت میں GEORGE اور GEORG دونوں کا تلفظ انگریزی میں جارج اور جرمن میں گیورگ GEORGIA کا تلفظ انگریزی میں جورجیا اور جرمن میں گیورگیا دیکھ سکتے ہیں۔

طول کلامی سے کیا فائدہ۔ میرا مدعا صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ جارج کو غلط کہنا غلط ہے اور جس طرح گیورگ صحیح ہے اسی طرح جارج بھی صحیح ہے بلکہ اصح ہے۔ یہی حال HUSSERL کا ہے۔ یہاں بھی انگریزی تلفظ کو مقدم سمجھتے ہوئے میں نے ہسرل لکھا ہے ہُسرل نہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ابھی جہاں جہاں ہرگانوی لکھا گیا ہے اسے ہَرگانوی پڑھا جائے۔

کیا میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی سے پوچھ سکتا ہوں کہ جب "تفہیمیت صدیوں پرانا فلسفہ ہے"، تو پھر "وہ از سر نو معرض بحث میں آگئی ہے"، لکھنا کہاں تک درست ہوگا؟ جب کہ وہ درجن بھر کتابوں کے مصنف بھی ہیں، "دیگر علوم کی بے شمار کتابیں اردو میں شائع ہو رہی ہیں۔"، کا کیا مطلب ہوتا ہے، ہو چکی ہیں یا ہونے والی ہیں؟ اگر ہو چکی ہیں تو وہ جدید فلکیات، کمپیوٹر پروگرامنگ، مصنوعی ذہانت، علم حشرات الارض اور تجارتی اقتصادیات کی دو چار کتابوں کے حوالے کیوں نہیں دیتے؟ اور بیچ بحث میں پاکستان کہاں سے آگیا؟ کیا ہندوستان میں پاکستانی کتابیں، عطاء اللہ خاں عیسیٰ خیلوی کے کیسٹ کی طرح عام لوگوں کو دستیاب ہیں؟ آخری سوال یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے یہ خط لکھ کر شرحیات کے تاریک گوشوں کو منور کر دیا؟۔

13003 NEW AUSTIN CT.
HERNDON VA 22071 USA

ستیہ پال آنند

اس شمارے میں (اور اس سے پیشتر ایک اور شمارے میں) کراچی سے احمد ہمیش کا خط متوجہ کرتا ہے۔ آپ نے پہلے خط کو بغیر حاشیے کے شامل کرنے کے بعد احمد ہمیش کے نئے مکتوب کو بھی بجنسہ شامل کر کے موصوف کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ احمد ہمیش صاحب نے آپ سے شکایت کی تھی کہ آپ نے انہیں اور رسالہ تشکیل، کو نظر انداز کیا، جب کہ (اخلاقاً ہی سہی) آپ کو نہ صرف ان کے خط کا جواب

دینا چاہئے تھا۔ کیوں کہ اس میں کئی اہم نکتے اٹھائے گئے تھے۔ بلکہ حتیٰ المقدور، شاعر کے صفحات میں تصرف کی مجبوریوں کے باوجود، تشکیل، ہر چند سطروں میں تبصرہ شائع کرنا چاہئے تھا۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ کراچی سے درجنوں کی تعداد میں چھپنے والے ماہانہ اور سہ ماہی جرائد ایک ہی روش پر گامزن ہیں۔ لیکن تشکیل نے اپنے لئے ایک الگ راہ منتخب کی ہے اور شاید اردو میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو مخالفت کے باوجود اپنی دھن میں مگن ان راہوں پر چلتے چلے جاتے ہیں۔ جو پر خار بھی ہیں اور جن پر چلنے والے چھالوں کی تپک سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔

میں احمد ہمیش کو اس لحاظ سے اپنی قبیل سے مانتا ہوں کہ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہوتے ہوئے بھی تنازعوں کے تجربے میں بڑھے ہیں۔ چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصہ پہلے انہوں نے وہ باتیں کیں اور ان امور پر اصرار کیا، جن کی نشان دہی کچھ لوگ آج کر رہے ہیں۔ پاکستان میں REDISCOVERING THE PAST کے NOSTALGIA ناسٹیلجیا، کی جو ہر دس بیس برس پہلے شروع ہوئی (جمیل الدین عالی، دوہا) (ڈاکٹر وزیر آغا، فہیم اعظمی وغیرہ، ہندوی دیومالا اور اساطیر) اور جسے نفسیات کے ماہر PARAMNESIA کا نام دیتے ہیں، اس سچائی کی پیروی انڈیا میں سب سے پہلے اسی نوجوان (تب احمد ہمیش پچیس چھبیس برس کے تھے) نے کی۔ آج سردار جعفری، پروین شاکر پر نظم لکھتے ہوئے وید یا اپنی سے اشارہ اور تلمیح کے طور پر حوالہ منتخب لیتے ہیں۔ لیکن پچیس چھبیس برس پہلے تک کی اردو شاعری میں (فراق کو چھوڑ کر) کتنے شاعروں نے ہندوستان کی اس تہذیب سے رشتہ جوڑا جو کئی ہزار برس پرانی ہے؟ انہیں دجلہ اور فرات تو یاد رہے۔ لیکن گنگا، جمنا، اور برہم پتر بھول گئے؟ سنگ تراشی کے فن کے استعارے کے طور پر آذر کو تو زندہ رکھا، لیکن جنوبی ہند، راجپوتانہ اور اڑیسہ کے قلعوں، محلوں اور مندروں کے سنگ تراشوں کو مردوں میں بھی شمار نہیں کیا۔ اگر ماضی سے واسطہ رکھا بھی تو چند سو برس کی اس منحنی سی، چھوٹی سی تاریخ کے ساتھ ہی اپنے مغرب کے قیام کے دوران میں نے تفہیم کی جس سطح کو دریافت کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کی، احمد ہمیش بہت پہلے ہی اس کی طرف اردو والوں کی توجہ مبذول کروا چکے تھے۔ یعنی انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کے ادب کی تاریخ کہیں نہ کہیں جا کے اپنے قدیم ماضی سے خود کو جوڑ دیتی ہے اور رجحانات کی تبدیلیوں کو قدیم روایت سے منقطع نہیں کرتی۔ اس کے برعکس اردو ادب کی تاریخ اپنے ماضی کے ساتھ انصاف نہیں کر سکی۔ غلط لسانی تفریق اور اصناف کی غلط تقسیم سے ہمارے محققین نے اپنے قدیم ماضی کو دریافت نہ کر کے ایک بہت ہی مختصر اور ذیلی ماضی پر اصرار کیا۔ یعنی ایک نہایت ہی فرضی ماضی قریب ہمارے شعر و ادب کے مقدر پر مسلط ہو گیا۔ اور اس ماضی قریب کو انگریزوں کی برصغیر پر حربی فتح اور فورٹ ولیم کالج کی سازشی کارکردگی کے زیر اثر مرتب کیا گیا۔ مجھے احمد ہمیش کے علیگڑھ کے دنوں میں ان کے ساتھ ہوئی ایک ملاقات یاد ہے۔ جب ایک شام انہوں نے شد و مد کے ساتھ یہ باتیں کیں۔ اور بعد میں احباب نے (نام نہیں گنواؤں گا) کہا: وہ خبطی ہے، سڑی ہے نہ معلوم خود کو سمجھتا کیا ہے!"

اس بار اکتوبر ۱۹۹۲ء میں امریکہ میں سردار جعفری صاحب سے میری بات چیت ہمیں ایک ایسے موڑ پر لے آئی۔ جہاں سردار نے ترکی کے مشہور زماں مصنف ناظم حکمت کا حوالہ دیا۔ اور کہا کہ ناظم حکمت نے ایک بار ان سے (سردار جعفری) پوچھا کہ کیا برصغیر کے شاعروں (ان کا مطلب اردو شاعروں سے تھا!) کے پاس اپنا آہنگ نہیں ہے کہ وہ عربی اور فارسی شاعری کے آہنگ کی کفالت پر ہی بھروسہ کرتے ہیں؟ ۔ سردار جعفری عزیز دوست ہیں اور ترقی پسند ہونے کے باوجود غایت ایمان دار اور کھلے دل اور کھلے دماغ والے ہوشمند انٹلکچوئل ہیں۔ جب میں نے پوچھا "وہ پھر آپ نے کیا جواب دیا؟" ، تو انھوں نے بغیر کسی پیش و پس کے کہا۔ "اس وقت تو مجھے ان کی بات نہ پوری طرح سمجھ میں آئی اور نہ ہی میں نے اس کا جواب دیا، لیکن آج محسوس کرتا ہوں کہ اس میں کتنی صداقت تھی۔"

جو بات سردار جعفری اور دوسرے ہوشمند اہل نظر آج کھلے دل سے ماننے پر تیار ہیں۔ وہ بات احمد ہمیش نے چوتھائی صدی پیشتر منوانے پر اصرار کیا تھا۔ افسوس، صد افسوس، اردو کی تقدیر بھی کس روشنائی سے عبارت کی گئی ہے۔ ایک طرف تو ان معززات

کی سطحی اور [illegible] رفت میں ایک کمتر اور کم مایہ ماضی اور اس کی کھوکھلی روایات اور دوسری طرف ترقی پسند تحریک اور اس کے ذیلی رجحانات کے زیر اثر قدیم ماضی کا قلع قمع۔ بہت کم لوگ ۱۹۶۰ء کے دہے میں ایسے تھے جنہوں نے اس محتاجی سے اتفاق نہیں کیا۔ احمد ہمیش ان میں سے ایک تھے۔ سنسکرت کے ورثے "امیر خسرو، کبیرداس اور بیدل سے ناتا جوڑنے والا یہ انسان جب پاکستان پہونچا تو وہاں کی ہوا بھی اسے راس نہیں آئی۔ لاہور، پنڈی اور کراچی کی ادب مافیا LITERARY MAFIA کب کسی ایسے شخص کو پنپنے دیتی ہے جو کسی ایک گروپ یا گروہ کے ساتھ منسلک نہ ہو۔ اگر آپ ایک گروپ کے رسائل و جرائد میں لکھتے ہیں تو دوسرے گروپ کے ارباب بست و کشا آپ کو بلیک لسٹ کر دیتے ہیں، لیکن احمد ہمیش نے "تشکیل" کے میڈیم سے نہ صرف ادب مافیا کے چہرے سے نقاب اتارنے کی سعی کی۔ بلکہ ان سب ESTABLISHED INTERESTS کو بھی للکارا۔ جو ریڈیو، ٹی وی، سرکاری اداروں، اشاعتی گٹ بندیوں میں بندھے ہوئے مزاروں پر مجاوروں کی طرح بیٹھے ادب کی کمائی کھا رہے ہیں۔ حالت وہاں بھی وہی ہے جو ہمارے ملک میں ہے۔

احمد ہمیش سے مجھے بھی ہزار اختلافات ہیں۔ ان کے لہجے کی درشتگی، قلم کی کاٹ اور خیالات کی دھار کبھی بار ناگوار گزرتی ہے لیکن اس اللہ کے بندے نے کچھ چیزیں ایسی لکھی ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔ "مکھی" کا ذکر بہت ہوا ہے۔ لیکن توجہ کے قابل وہ کہانی مجھے لکھتی ہے "اور وہ فریاد کی لے" بھی ہیں۔ "داستان پیش دل" کی نصف درجن سے زائد اقساط اس قلم کی کاٹ کی گواہی دیتی ہیں جو بیک وقت زہر کی طرح کڑوی بھی ہے اور قند کی طرح میٹھی بھی۔ آج نثری نظم کے عنوان سے ایک صنف شعر کے وجود کو "شاعر" کے مدیر نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن احمد ہمیش نے جب اس صنف میں طبع آزمائی کی تو ان کا مذاق اڑایا گیا۔ کچھ دوستوں کا یہ کہنا کہ احمد ہمیش کا شعری سفر ختم ہو گیا۔ ان کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔ "تشکیل" بہت سے احباب کو انڈیا میں ڈاک کے اخراجات کی وجہ سے نہیں بھیج سکتے۔ اس لئے لوگوں کو ان کی نئی تخلیقات کے بارے میں کما حقہٗ واقفیت نہیں ہے۔ لیکن وہ لگاتار لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ادبی بت شکنی میں ان کے حملے محمود غزنوی سے کم تعداد میں نہیں ہیں۔ یہی بت شکنی میرا اشعار بھی ہے

بقیہ صفحہ ۴۰ "میں دل کی بات کہوں گا"

ضرور دل کا ساتھ چھوڑ دیا ہوگا۔

چنانچہ پھر وہ آئے، ویسی ہی زرق و برق پوشاکوں میں ملبوس اپنی اپنی تختیاں سینے پر سجائے ہوئے۔ انہوں نے تالا کھولا اور اندر داخل ہوئے۔ اور پھر وہ، جنہوں نے اس کا آسمان چھینا تھا یوں ہم "بکم" کھڑے تھے جیسے ان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔

وہ بدستور سنگی سل پر بیٹھا تھا، زنجیریں اور بیڑیاں بدستور اس کے ہاتھوں اور پیروں میں پڑی تھیں۔ اندھیرا ویسے ہی چاروں طرف موجود تھا۔ دیواریں اسی طرح ایستادہ تھیں اور ان پر چھت بھی موجود تھی۔ اس کے باوجود وہ وہاں نہیں تھا۔ اپنا جسم وہ چھوڑ کر وہ انہیں صاف جل دے کر نکل گیا تھا۔ اور اس کی آواز پھول سے نکلتی تھی فضا میں چاروں طرف اور مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک اور زمین سے آسمان تک بدستور گونج رہی تھی۔

"میں دل کی بات کہوں گا۔"

"میں دل کی بات کہوں گا۔"

"میں دل کی بات کہوں گا۔"

Change in the Address of 'Shair'

Readers of the 'Shair' are hearby informed that with effect from 1-5-1995 the address of 'Shair' is changed. Kindly use the new addres for all your correspondences and remaltances of annual subscription

The New Address is

For Correspondences
'Shair' Monthly
P.O.Box No. 3770
Girgaon H.P.O
Bombay 400 004

For Moneyorder and Registered Articles
'Shair' Monthly
202-228, Dinath Building,
P.B.Marg, Bombay 400 004.

عرفان صدیقی



دیوانے کیسے بندۂ زر بن گئے تمام
اچھا، تو ایک دشت میں گھر بن گئے تمام

وہ لمس تھا کہ پھر سے نمو کا بہانہ تھا
جو نقش تھے سو بارِ دگر بن گئے تمام

سوچا تھا اُس کے جسم سے کیا کیا معاملہ
دیکھا تو یہ ہوا کہ نظر بن گئے تمام

دریا بھی تھے کسی کے اشارے کے منتظر
اُس نے کہا تو راہگزر بن گئے تمام

اک بوند سے بجھانے چلے تھے زمیں کی پیاس
ناچار ہم بھی دیدۂ تر بن گئے تمام

طے ہو چکے جب آبلہ پائی کے مرحلے
لوگ آئے اور شریکِ سفر بن گئے تمام

ہم کون تازہ کار تھے ملکِ سخن کے بیچ
کچھ زخم تھے جو حرفِ ہنر بن گئے تمام

عظمت منزل، حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ!

فصیح اکمل

تشنہ لب جذبوں کی تازہ داستاں رکھ آئے ہیں
اُس جبیں پر رات ہم اک کہکشاں رکھ آئے ہیں

عشق کی حیرت، سکوتِ راز کی گہرائیاں
بند مٹھی میں ہم اُس کی آسماں رکھ آئے ہیں

جسم کی نازک حویلی ہے حصارِ خواب ہے
اُس کے دل میں وہ چراغِ جاوداں رکھ آئے ہیں

پھول سے ہر شاخ پر لکھ آئے ہیں اپنا نام ہم
ہجر کی رگ رگ میں قربت کی زباں رکھ آئے ہیں

خواہشوں کے بت تراشیدہ جسم کے محراب میں
اُس کی نم آنکھوں میں کچھ پرچھائیاں رکھ آئے ہیں

شام کے آنچل میں ٹانک آئے ہیں کچھ اشکوں کے پھول
صبح کے دامن میں کچھ انگڑائیاں رکھ آئے ہیں

● فلیٹ نمبر ۴/۱، بی ٹائپ، سی بلاک، پبلک کوارٹرز [illegible]

ش۔ صغیر ادیب
65 BLACKBURN STREET. BLACKBURN
BB1 7NOT LANCS (U.K)

میں دل کی بات کہوں گا

دھوپ آہستہ آہستہ دیواروں سے نیچے اتری، آنگن میں پھیلی کھلے راستے اندر داخل ہوئی اور پھر رینگ رینگ کر نہایت مکاری اور کمینے پن کے ساتھ اس کے پیروں کی طرف بڑھنے لگی۔ تب وہ ڈر گیا۔ ایسا کیوں ہر روز یہی ہوتا ہے۔ ہر روز سورج نکلتا ہے۔ دھوپ چڑھتی ہے اور دیواروں سے اتر کر صحن میں داخل ہو جاتی ہے اور اس کے پورے وجود کو جھلسا کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے بدن میں سر سے پاؤں تک چنگاریاں بھر دیتی ہے اور پھر سورج اس کی آنکھوں میں اتر آتا ہے اور لاوے کی وہ ساری ندیاں جو اس کے جسم کے اندر دوڑ رہی ہیں کھول، کھول کر آتش سیال بن جاتی ہیں۔ اس کی زبان پر جنگل آگ آتے ہیں جو اس کے تالو کو لہو لہو کرتے رہتے ہیں۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا ہے۔ ہر چند کہ ٹھنڈے اور میٹھے اور روح پرور اور حیات افروز پانی کا پیالہ اس کے سامنے دھرا ہے لیکن وہ پانی نہیں پی سکتا۔ کیونکہ اس کے اور پیالے کے درمیان جو فاصلہ ہے اسے اس کے ہاتھ طے نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں زنجیریں اور بیڑیاں پڑی ہیں، اور یہ زنجیریں پتھر کی ایک وزنی سل سے پیوست ہیں، لہٰذا وہ نہ چل کر پیالے تک جا سکتا ہے اور نہ گھسٹ کر اور نہ لیٹ کر، جب وہ اپنے پورے جسم کی لمبائی سے لیٹ جاتا ہے اور ہاتھ پھیلاتا ہے تو بھی اس کا ہاتھ پیالے سے چند انچ پیچھے ہی رہ جاتا ہے۔ دراصل ان لوگوں نے اسے محبوس اور پابہ زنجیر کرنے کے ذمہ دار ہیں، جان بوجھ کر پیالہ اتنی دور رکھا ہے کہ اس کا ہاتھ وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ اس طرح وہ اسے ترسانا چاہتے ہیں، سزا دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظروں میں وہ "مجرم" ہے۔ اور گو اس نے چوری نہیں کی، قتل نہیں کیا، نہ اپنی روح بیچی۔ نہ دل بیچا، نہ منافقت کی اور نہ غیبت کا مرتکب ہوا پھر بھی وہ "مجرم" ہے۔ ان لوگوں نے اس سے کہا تھا۔ تم دل کی بات سنتے ہو۔ دل کی بات کہتے ہو۔ اور دلوں میں جوت جگاتے ہو لہٰذا تم مجرم ہو ایسا مت کرو۔ مگر وہ نہیں مانا، دل کی بات سنتا رہا اور کہتا رہا اور دلوں میں جوت جگاتا رہا۔ تب انہوں نے کہا تم سزا کے مستوجب ہو، اور انہوں نے اسے محبوس کر دیا۔ پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں زنجیریں ڈال دیں۔ ... اور پانی سے لبریز پیالہ سامنے دھر دیا۔ اور اس سے کہا۔

"دیکھو یہ پیالہ سونے کا ہے اور اس میں ہیرے اور موتی جڑے ہیں اور اس میں ٹھنڈا میٹھا اور معطر پانی بھرا ہے۔ اگر تم دل کی بات سننا اور کہنا چھوڑ دو تو یہ پیالہ تمہارا ہو جائے۔ ورنہ تم ترسو گے..... ساری عمر ترسو گے۔

مگر کیا واقعی وہ ترستا ہے؟ ہر چند کہ اس کے ہونٹوں پر دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ زبان پر جنگل آگ آتے ہیں۔ اور جسم کے اندر صحرا تپنے لگتے ہیں۔ مگر وہ ترستا بالکل نہیں ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ ایک بار جھک گیا تو پھر اٹھ نہ سکے گا۔

اس کی وہ گردن جو اسے بلند و بالا اور پر افتخار بناتی ہے، ہمیشہ کے لئے خمیدہ ہو جائے گی۔ اور چونکہ اسے خمیدہ سر ہونا گوارا نہیں، اس لئے نہ وہ ترستا ہے اور نہ ہی پرواہ کرتا ہے دور ہی دور سے ہیرے موتی سے مرصع جڑے ہوئے پیالے کو دیکھتا ہے اور پھر حقارت سے مسکرا دیتا ہے۔

دھوپ رینگ کر قریب آ گئی۔ اور اس کے پیروں کو چھونے لگی۔ اور گو ہر روز کی طرح وہ ڈرا۔ مگر ہر روز کی طرح اس نے پرواہ نہیں کی۔ اپنی زنجیریں سمیٹ کر سنگی سل پر بیٹھ گیا، اور گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ مسکرا

، آنکھوں کی قندیلیں دھندلائی ہوئی تھیں، اور اس کے بدن پر پڑھا
لباس، جو کبھی خلعت فاخرہ تھا اب تار تار ہو گیا تھا۔ رنگ برنگے
ہندسے اور میلے چیتھڑوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ان چیتھڑوں
س کا بدن یوں جھانک رہا تھا جیسے قبرستان میں بارش سے کھل جانے
قبروں سے سالخوردہ ہڈیاں جھانکتی ہیں۔ اس نے معاً نظریں جھکائیں
پنے بدن کو دیکھا۔ بدن کی پور پور کو دیکھا۔ ایک ایک خم اور
ایک عضو کو دیکھا اور تھوڑا سا حیران ہوا۔ کیا یہ بدن میرا ہے؟
ی آنکھوں میں شک و شبہ تھا۔ ہاں، شاید میرا ہی کا ہے۔ مگر میں ایسا تو
ھا۔ میرا وہ بدن جسے میں جانتا ہوں، بالکل مختلف تھا۔ بڑا صاف
صاف، حسین و وجیہہ، دیوتاؤں کی طرح پر شکوہ۔ جسم کے اندر خون
ریاں بہتی تھیں اور میں بڑا قد آور تھا۔ قد آور تو خیر اب بھی ہوں
میرے بدن کو کیا ہوا؟ یہ کرشمہ آخر ہوا کیسے! میں یکایک بدل
یک لخت وہ ہنسا۔ نہیں، یہ غلط ہے۔ میں بدلا تو خیر بالکل نہیں ہوں
بھی وہی ہوں۔ اب بھی دل کی بات کہتا ہوں، دل کی بات سنتا
ں۔ اور لوگ اب بھی میری باتیں سننے کے مشتاق رہتے ہیں۔ تو گویا
بدلا نہیں، اب بھی وہی ہوں۔ ہاں میری جسمی ہیئت ضرور بدل گئی
۔ وہ پھر ہنسا اور اس نے زور زور سے زنجیریں بجائیں۔ تاہم
سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جسمی شکل و صورت کی کوئی اہمیت نہیں
حباب محض ہے ہاں، آدمی اپنے "میں" میں سب کچھ ہوتا ہے
میں اپنے "میں" میں اب بھی وہی ہوں، جو تھا۔

ایسا نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ سے مقہور و معتوب تھا۔ نہیں پہلے
بڑا محترم تھا۔ اس کی راہ میں آنکھیں بچھی تھیں۔ اور
کے لئے قصیدے کہے جاتے تھے۔ صرف اس لئے کہ کیونکہ اس
دل کی بات سننے اور کہنے کا فن سیکھ لیا تھا اور لوگ ہجوم در ہجوم
کی بات سننے کے لئے جمع ہو جاتے تھے، مگر پھر کیا ہوا کہ کچھ
ن کا ایک گروہ اس سے بدظن ہو گیا۔ اور انہوں نے ہاتھوں
پتھر اٹھا لئے۔ اور اسے لہو لہو کرنے کی ٹھان لی۔ تاکہ وہ خاموش
لے۔ مگر انہیں یہ علم نہیں تھا کہ نہ ہوا کو روکا جا سکتا ہے
نہ خوشبو کو اور نہ روشنی کو اور نہ اس زبان کو خاموش کیا
سکتا ہے۔

دل کی بات کہتا ہے۔ چنانچہ پھر انہوں نے اسے محبوس اور پابہ
زنجیر کر دیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ دکھ اٹھائے گا تو خود ہی اس

راستے پر آ جائے گا جو وہ اس کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ مگر ایسا
نہیں ہوا۔ کیونکہ اس نے نہ منحرف ہونا سیکھا تھا اور نہ منافقت کرنا
وہ بدستور دل کی بات کہتا رہا۔ اور ہزاروں لوگ جو دیواروں کے باہر
جمع ہو جاتے تھے، بدستور اس کی بات سنتے رہے۔

دھوپ آگے بڑھی، پہلے اس کے پیروں کو چھوتی رہی۔ پھر بدن
سے لپٹ گئی۔ مگر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ دھوپ کی آتشیں لپلپاتی زبان
نے اس کے بدن کو چاٹنا شروع کیا۔ اس کے ناخنوں کے کنارے چٹکنے
لگے۔ پلکوں کے اندر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اور سارے جسم پر ابھری
ہوئی نیلی رگیں کچھ اور موٹی ہو گئیں کچھ اور نیلی ہو گئیں۔ اور ہر
چند کہ وہ دل ہی دل میں متوحش ہو رہا تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس
کڑی بے حس و بے رحم دھوپ کی حدت اس کے وجود کو ریزہ ریزہ
کر ڈالے یا اس کے بدن کو پگھلا کر رکھ دے، ایسا ہونا ناممکن تو
نہیں تھا۔ پتھر مارنے اور مصلوب کئے جانے کی رسم آج بھی زندہ
ہے، زہر آج بھی پینا پڑتا ہے اور حسینؑ ابن علیؑ کی پیاس آج بھی
نہیں بجھی ہے، تاہم اس نے اپنے دل کا خوف چہرے پر نہیں
آنے دیا۔ کیونکہ اس نے بہرحال جھکنا نہیں سیکھا تھا۔

آخر کار دھوپ ہار گئی۔ سر جھکا کر تھک گئی۔ اور پھر شرمندہ
ہو کر پیچھے لوٹ گئی۔ پہلے صحن سے نکل پھر آنگن سے اور پھر دیوار پہ
چڑھ کر چپ چاپ کہیں روپوش ہو گئی۔ آنگن میں سائے طویل ہونے
لگے۔ یہ سائے دھیرے دھیرے بڑھتے جائیں گے۔ روشنی آہستہ
آہستہ معدوم ہوتی جائے گی۔ پھر اندھیرا خلاؤں میں اترنے
لگا اور آہستہ آہستہ پھیلتا جائے گا بڑھتا جائے گا۔ اور پھر ہر سو چھا جائے
گا، ہر شے کو نگل جائے گا۔ جیسے قبر لاشوں کو نگل لیتی ہے۔ مگر وہ
اسی طرح بیٹھا رہے گا۔ کیونکہ اس کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی
ہیں۔ اور وہ کہیں نہیں جا سکتا ہے۔ ہر روز اس طرح ہوتا ہے
کہ وہ گھور اندھیرے میں چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے اور رات
اس کے چاروں طرف سنسناتی رہتی ہے۔ سانپوں کی طرح اس
کے وجود کو ڈستی رہتی ہے۔ ان لوگوں نے اسے کوئی چراغ بھی
نہیں دیا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ اندھیرے سے نفرت
کرتا ہے۔

اسے تو دراصل روشنی سے اور خوشبو سے اور ہوا سے اور زندگی
سے محبت ہے۔ اور وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اندھیرے میں

محسوس ہوگا۔ کیا تو ڈر جائے گا یا سسک سسک کر آخر کار مر جائے گا۔ لیکن وہ بالکل خوفزدہ نہیں ہے۔ گو اسے اندھیرا پسند نہیں، تاہم وہ اندھیرے سے ڈرتا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جس طرح اس نے پتھر کھائے اور اس کے زخم خود بخود مندمل ہو گئے اور اس نے زہر پیا اور زندہ رہا۔ اور جس طرح اس نے زنجیروں کی جھنکار کو موسیقی سمجھ کر لطف اٹھایا اسی طرح وہ اندھیرے کو جھیل جانے کا فن بھی جانتا ہے۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ صحن کے باہر کھلا آسمان موجود ہے، زندگی کی طرح خوبصورت اور پر شکوہ اور آسمان پر ستارے موجود ہیں۔ جو امیدوں کی طرح تمام رات جگ مگ جگ مگ کرتے رہتے ہیں۔ وہ جب اندھیارے میں ساری رات بیٹھا آسمان اور جگمگاتے ستاروں کو دیکھتا رہتا ہے۔ جب تک آسمان موجود ہے اور آسمان پر ستارے موجود ہیں تب تک زندگی موجود رہے گی اور امیدیں زندہ رہیں گی، اور تب تک اندھیرا اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔

مگر ابھی تو اندھیرا بہت دور ہے۔ ابھی تو یہ ہوگا کہ رات کے آنے سے پہلے وہ لوگ آئیں گے۔ ہر روز کی طرح یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی گردن میں خم پیدا ہوا یا نہیں اور پھر ہر روز کی طرح وہ مایوس ہوں گے۔ اور کوئی نیا ستم ایجاد کریں گے۔ اس نے زنجیروں کا ڈھیر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور سوچنا شروع کیا کہ اب وہ کون سا ستم آزمائیں گے۔ کونسا نیا تیر اپنے ترکش سے نکالیں گے۔ پہلے انھوں نے اسے پا بہ زنجیر کیا۔ پھر روشنی سے محروم کیا۔ پھر پانی کیلئے ترسایا۔ نتیجاً وہ دریدہ اور درماندہ ہوا۔ کمزور و ناتوان اور لہو لہو ہوا۔ پھر بھی اس کی گردن میں لچک پیدا نہیں ہوئی۔ سوال یہ کہ اب وہ کیا کریں گے؟ کیا اس کا سر قلم کریں گے۔

اور پھر وہ لوگ آ گئے۔ بڑے شاندار لوگ تھے۔ انہوں نے زرق و برق لباس پہن رکھے تھے۔ ریشم و حریر سے بنے ہوئے موتیوں سے مرصّع اور سونے چاندی کے کشیدہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے سینوں پر روپہلی تختیاں لگا رکھی تھیں جن پر سنہری حروف میں بڑے خوبصورت الفاظ درج تھے۔ وہ صحن میں آ کر اس کے مقابل کھڑے ہوئے اور تمسخر آمیز نظروں سے اسے گھورنے لگے۔ یوں جیسے وہ کوئی تماشا تھا۔ پھر اس شخص نے کہ جس کے سینے پر "خدمت" کا بورڈ لگا تھا، کہا

"باہر لوگ اب بھی موجود ہیں اور اب بھی تمہاری باتیں سننے کیلئے بیتاب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیوں۔؟"

وہ تیز نظروں سے انہیں گھورتا رہا اور خاموش رہا۔

"دیکھو تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے" اس نے کہا جو "عالم" تھا۔ "تم کتنے روشن تھے۔ اب بجھ گئے ہو۔ کتنے زندہ تھے اب زندہ درگور ہوئے جا رہے ہو۔ آخر اس ضد سے کیا حاصل۔ یہ تو نادانی ہے۔"

وہ پھر چپ رہا۔

"ہاں، یہ نادانی ہے" جس کے سینے پر "دانا" لکھا تھا اس نے کہا۔ "تمہیں" لفظوں کی حرمت عزیز ہے مگر الفاظ نے آج تک کس کا ساتھ دیا ہے۔ تم جانتے ہو، ہم سے بہتر جانتے ہو کہ ان لوگوں کا کیا حشر ہوا۔ جو لفظوں کے تقدس کے لیے لڑتے رہے۔ لفظوں نے انہیں کچھ نہیں دیا۔ ماسوا دکھ اور محرومی کے اور تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ لفظ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔

مگر وہ پھر بھی چپ رہا۔

"تم کہتے ہو کہ لفظ اٹل ہے۔ یہ ناسمجھی کی بات ہے" وہ جو "زمینا" تھا گونجتی ہوئی آواز میں بولا۔ "لفظ اٹل نہیں ہوتے۔ ان کے معنی بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے لفظوں کو دوست نہیں سمجھنا چاہیے۔ تم بھی اس روش سے باز آ جاؤ۔

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ مگر کچھ نہیں کہا۔

"ہم تم سے اور کچھ نہیں چاہتے۔" اس نے کہا جس کے سینے پر "وفا" کی تختی آویزاں تھی۔ "ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تم وہ لفظ کہنا چھوڑ دو جو تمہارا دل کہتا ہے بلکہ وہ لفظ کہو جو ہم تمہیں دیں گے۔ یہ لفظ خوبصورت ہوں گے اور ان سے تمہیں سب کچھ ملے گا۔ ریشم و حریر کے لباس اور زر و جواہر اور جاہ و حشمت اور دولت اور امارت اور۔۔۔ وہی عزت و احترام جو ہمیں حاصل ہے۔

وہ اتنی دیر سے خاموش تھا اور ان کی باتیں سنتا رہا تھا مگر اب یکایک ہنسنے لگا، زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی میں تمسخر تھا اور تحقیر۔ دھیرے دھیرے اس کی ہنسی بلند ہو کر قہقہے میں بدل گئی۔ پھر اس کے قہقہے کی گونج سے در و دیوار تھرّا اٹھے فضا کانپنے لگی۔

اور تب وہ لوگ ڈر گئے اور خوفزدہ ہو کر صحن کے دوسرے

کوسنے میں چلے گئے اور اسے کینہ توز نظروں سے گھورنے لگے۔ وہ دیر تک ہنستا رہا اور ان کا تمسخر اڑاتا رہا۔ پھر جب وہ خاموش ہوا تو اس نے کہا جس نے "خدمت" کا بورڈ اپنے سینے پر لگا رکھا تھا۔

"کیا تمہیں یاد ہے کہ تم کب سے بھوکے ہو؟"

اس نے دھیرے سے زنجیر بجائی۔ مسکرایا۔ مگر چپ رہا۔

"نہیں، تمہیں یاد نہیں ہوگا۔" راہنما نے کہا۔ "مگر بہت وقت ہوگیا ہے۔ اتنا کہ اب تم شمار ہی نہیں کر سکتے" "اور اگر تم دل کی بات کہتے رہو گے تو اور ابھی نہ جانے کب تک اپنے پیٹ پر ظلم کرو گے"

پھر وہ کہ جس کے سینے پر "خدمت" کی تختی آویزاں تھی۔ آگے بڑھا اور اس نے مہکتی ہوئی، مرغن اور خوش رنگ غذاؤں سے بھرا ہوا تھال پانی کے پیالے کے پاس رکھ دیا۔ اور مکاری سے مسکرا دیا "یہ کھانا تمہارا ہو سکتا ہے۔"

اس نے کہا۔ اور پھر وہ سب کے سب اپنے ریشمی لبادوں کو سنبھالتے ہوئے واپس چلے گئے۔

وہ خاموش بیٹھا ہوا، جلتی ہوئی نظروں سے کھانے کے تھال کو گھورتا رہا۔

اور پھر ویسا ہی ہوا جیسا کہ ہر دن ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے روشنی معدوم ہو گئی۔ یوں جیسے زندگی ختم ہوتی ہے جیسے خوبصورتی فنا ہوتی ہے اور جیسے خزاں میں درخت برگ و ثمر سے محروم ہوتے ہیں۔ ویسے ہی روشنی بھی تحلیل ہو گئی اندھیرا دم بدم بڑھنے لگا۔ مگر وہ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ اور آسمان کو گھورتا رہا۔ ہر چند کہ وہ بہت تھک گیا تھا اور اس نے چاہا بھی تھا کہ اٹھے اور معمول کے مطابق اپنی زنجیریں سمیٹ کر سنگی سل کے چاروں طرف چکر لگائے۔ مگر اب اس میں اٹھنے کا یارا نہیں رہا تھا۔ کیونکہ اب اس کا جسم بے حد خستہ و درماندہ ہو چکا تھا۔ زنجیروں نے اس کے ہاتھوں کو اور بیڑیوں نے اس کے پیروں کو کاٹ ڈالا تھا۔ اور لہولہو کر دیا تھا۔ اس کے بدن کے اندر بگولے دوڑ رہے تھے۔ اور ذہن میں الاؤ جل رہے تھے وہ جانتا تھا کہ ٹانگیں اب اس کے جسم کا بوجھ نہیں سہار سکیں گی لہٰذا اٹھنے کی کوشش کے باوجود نہیں اٹھا۔ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور آنکھوں کی قندیلوں کو جلائے رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ تاکہ آسمان کو دیکھ سکے جو زندگی کی طرح بے پناہ اور لازوال ہے۔ اور ستاروں کو دیکھ سکے جو امیدوں کی طرح بے شمار اور خوبصورت ہیں اور کبھی نہیں مرتے ہیں، ہمیشہ جگ مگ جگ مگ کرتے رہتے ہیں۔

مگر یہ کیا؟ یکایک وہ حیران ہوا اور متوحش ہو کر ان لوگوں کو گھورنے لگا۔ جو اچانک آ گئے تھے۔ بہت سے لوگ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں متعدد اوزار تھے۔ اور وہ اپنے ساتھ مٹی، گارا، اینٹیں اور بیشتر اور نہ جانے کیا کیا لائے تھے اور تب وہ ڈر گیا۔ کیونکہ اچانک اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ ان لوگوں نے جو جاہ و حشم والے تھے اور ریشم و حریر والے تھے اور جنہوں نے الفاظ کے معنی متعین کرنے کا حق اپنے نام محفوظ کرا رکھا تھا۔ کون سا نیا ستم ایجاد کیا ہے پہلے انہوں نے اسے زنجیریں پہنائیں، پھر پانی کے لئے ترسایا، پھر بھوک کی اذیت سے دوچار کیا۔ اور اب وہ اس سے آسمان چھین لینا چاہتے تھے۔ اور ستارے چھین لینا چاہتے ہیں۔ تاکہ اندھیرا ہمیشہ کے لئے اس کا مقدر بن جائے۔

مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا ہے، ماسوا اس کے چپ رہے اور دیکھتا رہے۔

چنانچہ وہ دیکھتا رہا۔ اور وہ لوگ جو اینٹیں اور گارا لیکر آئے تھے، دیوار اٹھانے میں جٹ گئے۔ ایک کے اوپر دوسری اینٹ جمتی گئی۔ اور دیوار اونچی ہوتی گئی۔ اور آسمان اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔ کھلا ہوا شفاف آسمان جو ستاروں سے بھرا ہوا تھا دھیرے دھیرے دیوار کے پیچھے گم ہوتا گیا۔ اور اندھیرا بڑھتا گیا۔ مگر وہ کچھ نہ کر سکا، بس دیکھتا رہا اور چپ رہا۔

دیواریں اٹھ گئیں تو انہوں نے چھت پاٹنی شروع کر دی۔ اب ہر طرف تاریکی تھی۔ گہری، دم گھونٹ دینے والی ہلاکت خیز تاریکی، اور چاروں طرف دیواریں تھیں۔ جن میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ کوئی روزن نہیں تھا۔ نہ روشنی کی کوئی کرن اندر آ سکتی تھی۔ اور نہ ہوا کی کوئی لہر صرف ایک دروازہ تھا مگر اس میں بھاری قفل پڑا تھا اور اس قفل کی چابی ان لوگوں کے پاس تھی جنہوں نے آسمان چھینا تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ کئی دن گزر گئے۔ تب ان لوگوں نے جو خدمت اور رہنمائی اور وفا اور علم و حکمت اور دیانت کے علمبردار تھے۔ سوچا کہ دیکھنا چاہئے کہ اب اس کا کیا حال ہے اگر بھوک اور پیاس اور تنہائی نے نہ سہی تو اندھیرے نے ضرور اس کا بھرم توڑ دیا ہوگا۔ اس کی گردن جھک گئی ہوگی اور اس کی زبان [illegible]

[illegible]



خلش اکبرآبادی

ادھوری یہ دنیا نظر میں رہے
مگر ارتقا کے سفر میں رہے

ہوا نے کہیں گھر بنایا نہیں
ہمیں قید کیوں بام و در میں رہے

کسے ڈھونڈنے گھر سے نکلے تھے ہم
ہمیشہ قدم رہ گذر میں رہے

ہوا سنگ باری پہ معمور تھی
ہمیں تھے جو شیشے کے گھر میں رہے

یہ گردش زمیں کی یہ میرا وجود
بھنور جیسے کوئی بھنور میں رہے

بسیرا ہوا اُس پہ میں نے کیا
نشیمن مرے بال و پر میں رہے

خلش سہہ گئے جو کہ آندھی کے وار
وہی چند پتے شجر میں رہے

چھیم چھیم گلی، آگرہ ۔ ۳ ۔ ۲۸۲۰۰۳ (یوپی)



عبدالاحد ساز

یوں تو سو طرح کی مشکل سخنی آئے ہیں
پر وہ اک بات جو کہنی نہ ابھی آئے ہیں

کیسے توڑیں اُسے، جو ٹوٹ کے ملتی ہو گلے
لاکھ چاہا کہ روایت شکنی آئے ہیں

ہر قدم، اس متبادل سے بھری دُنیا میں
راس آئے تو بس اک تیری کمی آئے ہیں

پیاس بجھ جائے، زمیں سبز ہو منظر ڈھل جائے
کام کیا کیا نہ ان آنکھوں کی تری آئے ہیں

دیوِ الفاظ کے چنگل سے چھڑانے کے لئے
آخرِ شب، کوئی معنی کی پری آئے ہیں

پھر یہیں قتل کرے شوق ہے، بن پائے اگر
اک غزل بھر تو کسی شب کوئی جی آئے ہیں

ساز یہ شہر نوردی ہیں بکھرتا ہوا دن
سمٹے اک موڑ، تو یاد اُس کی گلی آئے ہیں

حاجی آدم اینڈ کمپنی، چکلہ محمد علی روڈ، بمبئی ۳

ذکاء صدیقی

دل ہے اک تنہا مسافر، آرزو اک شہر ہے
کس گلی کو ڈھونڈھیے، یاں کو بکو اک شہر ہے

وہ گلی جو کھو گئی ہے جستجو کے شہر میں
کیا پتا بتلائیں اس کا، ہو بہو اک شہر ہے

حسرت و امید ہی کیا، زندگی کے ساتھ ساتھ
ہر طرف سو راستے ہیں، چار سو اک شہر ہے

یاس کہتی ہے کہ آگے بند ہے ہر راستہ
آس کہتی ہے: وہ تیرے روبرو اک شہر ہے

جانے کب سے پھر رہا ہوں آپ اپنے اردگرد
زندگی اک قافلہ ہے، جستجو اک شہر ہے

کتنی آوازوں کا دم گھونٹے ہوئے ہے خامشی
کیسے ویرانے تھے وہ، جن کا لہو اک شہر ہے

BOX 435, ALZAHRAH
(S.A.)

انجم عثمانی

۵۵۷، لکشمی بائی نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۳

زنجیر بدل جاتی ہے

اس کا کاندھا بوجھ سے دکھا جا رہا تھا۔ جسم بائیں طرف کو مستقل جھک چکا تھا۔ بائیں شانے پر جھولتے تھیلے کی ڈوری کا نشان گہرا ہوتا جا رہا تھا مگر وہ نہ رک سکتا تھا اور نہ اس بوجھ کو اتار پھینک سکتا تھا۔

"تم اس بوجھ کو اتار کیوں نہیں پھینکتے یا پھر کہیں رکھ کر تھوڑا آرام کیوں نہیں کر لیتے سفر طویل ہے، دھوپ تیز اور راستہ ناہموار ......"

"کتنا غلیظ ہو چکا ہے یہ بوجھ۔ اس غلاظت کی پوٹلی کی موجودگی میں ہم تمہارے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے ......"

سفر کے کئی ساتھیوں کی آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں مگر وہ سب کا جواب ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے دیتا اور چلتا رہتا تھا۔

"تمہارے سفر کا مقصد کیا ہے"

لوگ اس سے پوچھتے۔ جواب میں بس وہی ایک ہلکی سی مسکراہٹ۔

"اپنے بائیں طرف بوجھ کیوں لٹکا رکھا ہے؟"

جواب میں اسی خاموش مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ذہن کے دریچے سفر کے آغاز کی کرنیں بچھنے لگتیں۔

"تو جواب میں فرمایا شیخ نے کہ اگر تم ڈالو گے بوجھ اپنا کاندھوں پر دوسروں کے اور نہ اس بار امانت کو بے جا صرف ہونے دو گے اصل حقداروں کو تو ہو گے تم باعث فلاح اپنا اور اپنی قوم کی ...." درسگاہوں میں درس جاری رہتا اور استاد کے سامنے تپائی پر دھری کتاب کو گھورتا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح خاموش رہ کر پوچھتا:

"... یا شیخ! بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز راستے سے ہم گزر سکیں گے جبکہ ہمارے کاندھوں پر بوجھ ہوگا اور ہمارے دل مستقبل کے خطروں سے پُر ہوں گے ......"

جواب میں شیخ مسکرا دیتے اور باقی ساتھی اس پر رشک کرتے کہ وہ سوال کا موقع پاتا ہے بلکہ اس کے سوال پر شیخ برہم کیوں نہیں ہوتے

شیخ کی جوابی مسکراہٹ اس کے دل میں گھر کر جاتی، شیخ کے سامنے وہ دوزانو ہو جاتا اور عرض کرتا:

"یا شیخ! وساوس میرے دل میں زیر و زبر ہوتے ہیں"

"خواب مجھے ستاتے ہیں اور ٹوٹ چکا ہوں میری آنکھیں بند نہیں رہنے دیتی..."

شیخ نے سنا، نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، بائیں کاندھے سے چادر نما رومال اتارا اٹھ کھڑے ہوئے اور راستہ کے پرانے درخت کی طرف جا کر اس کے نیچے رینگتے کیڑوں کو رومال کی جھاڑ سے صاف کیا، کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بٹھایا اور اپنا رومال اس کے کاندھے پر ڈال کر یوں گویا ہوئے:

"سن اے جان شیخ! تو سوال بہت کرتا ہے،

وساوس تیرے دل میں ہوئیں مار رہے ہیں کہ قرب خاص تجھے نصیب ہونے والا ہے اس لیے نفس امارہ تجھے گھیرتا ہے اور تیرے مقامات کی بلندی سے خائف ہو کر تجھ پر حملہ کرتا ہے ....."

اگلی صبح شیخ نے درس میں شاگردوں سے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

"... اے سالکان راہ سلوک شیخ میرے، خدا ان کی لحد پر نور افشانی کرے۔ فرمایا کرتے تھے کہ تا عمر ان کی عبادت قضا نہ ہوئی الا ایک دن کہ نفس امارہ نے باد صبا کو ان کو سلانے رکھا ان کو، حتیٰ کہ سورج کی کرن نے شفق کے سرخی کو گھلا دیا، سہارا دے دئیے بطور مکافات اتنا، کہ مقامات بلند ہوئے مریدان کے، چنانچہ نفس امارہ ہمیشہ اس دن کے بعد خود ہی ان کو جگا دیتا تھا کہ ڈرتا تھا ان کے مقامات کی مزید بلندی سے — تمہارے شاگردوں، شیطان اگر خفا ہو جائے کبھی تم سے اور غالب آ جائے کبھی نفس، تو تعالیٰ کے حضور پیش ہم مزید انہماک برتو! ...."

شیخ نے درس ختم کیا، مسکرائے اور آنکھیں موند لیں۔

وہ مسکرا رہا تھا آج کا درس خاص طور پر اسی کے لیے تھا نفس امارہ اسی کی طرح ہے، خواب اسی کو ستاتے ہیں اور جاگ [illegible]

انار کے درخت کے نیچے اس کی نشست کے اوقات میں اضافہ ہوگیا حتیٰ کہ انار کے سارے پتے جھڑ کر سنتے پتے آگئے۔ پھل انار بن کر پھر پیدا کی خوراک بن گئیں اور شیخ کا چار خانہ رومال اس کے بائیں کاندھے پر آگیا۔

اب دار التدریس میں شیخ کی آواز اس کے منہ سے گونجتی۔ اب اس نے سوال کرنا بند کر دیے تھے اور شیخ کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اپنا مسکن بنا چکی تھی۔

ریاضت بھرے ایک طویل عرصے تک اس کی آنکھیں دار التدریس میں ایسے شخص کو ڈھونڈتی رہیں جس کے کاندھے پر چار خانہ رومال رکھ کر وہ بھی آنکھیں موند سکے حتیٰ کہ انار کے درخت کی جڑ کو دیمک لگ گئی شیخ کے مزار کی مٹی پرانی ہوگئی ــــ اور درس گاہ سے اٹھ اٹھ کر لوگ نئی آبادیوں میں جا بسے۔

اس نے بھی ارادہ کیا کہ وہ بھی نئی آبادی کا رخ کرے کہ بہرحال قوت لایموت کے بغیر نہ عبادت ہے نہ ریاضت ــــ چنانچہ اس نے سہولت کی خاطر چار خانہ رومال کا تھیلا بنا کر کاندھے پر لٹکایا کہ تیز ہوائیں رومال کو اڑا سکتی تھیں یا اس کے پیچ گردن میں کس سکتی تھیں اور اس شخص کی تلاش میں نکل پڑا جس کے بارے میں اسے بھی پورے طور پر علم نہ تھا؛

" اے سالکان راہ سنو کہ تم امانت سنبھالے چل پڑو کہ راستہ تمہارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا اور کوئی پڑاؤ تمہارے لئے منزل نہیں بن سکتا کہ ہم سب لوٹ جانے کے لئے آئے ہیں اور ہر شئے کی اصل اسے خود کھینچ لیتی ہے۔

اس سے پہلے کہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں اور وہ کہ قدموں کو اپنا ایک کان بچھاتی، ایک کان اوڑھ کر سوتی اور رات بھر اپنی لمبی لوکیلی زبانوں سے دیوار چاٹتی رہتی ہے۔ دیوار چاٹ چکے تم بالساماتت کو بے جا سونپو اس کے اصل حقداروں کو ــــ " مگر "

" اے عارف عالی مقام، اشیاء کی اصل کیا ہے اور روح اپنی اصل کی جانب کیوں مراجعت کرتی ہے؟ "

ہمیشہ کی طرح سوال اس کے ذہن میں کلبلایا، لیکن اسے یاد آیا کہ شیخ نے متنبہ فرمایا تھا کہ "

" اے لخت جگر تو سیدھا اپنی راہ چل، سوالات مزید سوالات کو جنم دیتے ہیں اور وہ لوگ جو گھر جاتے ہیں پیچ سوالوں کے، سوال اور جواب کے درمیان خلا ان کے لئے اور زیادہ ہو جاتا ہے، بس اسے جاننا کافی ہے کہ سمت ہو کہ راستہ ترے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا اور کوئی پڑاؤ تیرے لئے منزل نہیں بن سکتا ــــ "

چنانچہ اس نے سوالات کی جبہ سائی ترک کر دی، گرچہ اب بھی کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر سرسراہٹ ہوتی مگر شیخ کی مسکراہٹ اس کے لبوں پر اپنا مسکن بنا چکی تھی اور وہ اپنے بائیں کاندھے پر جھولا لٹکائے چل کھڑا ہوا تھا۔

وہ سرولا کے بے شمار جنگلوں، آنسوؤں کے بے شمار سمندروں اور قہقہوں کی بے شمار دلدلوں کو پار کرتا ہوا چلا جاتا تھا کہ وہ دن قریب ہے کہ جب دروازے بند ہو چکیں گے اور نفوس کے بھیجے جو لیے پر دھری ہنڈیا کی طرح کھول رہے ہوں گے۔

" کب تک چلو گے؟ "

" کہاں جاؤ گے؟ "

" اپنے کاندھے کو بوجھ سے کیوں لاد رکھا ہے؟ "

لوگ اس سے سوال کرتے اور سوال کرتے وقت بھول جاتے کہ جب پیچھے سے آئی آندھیوں نے آبادی کو گھیر لیا تھا، پتھروں کی بارش سے اجسام پاش پاش ہو رہے تھے۔ ماں نے اولاد کو اور اولاد نے ماں باپ کو پہچاننے سے انکار کرنا شروع کر دیا تھا تو بستی کے اتر طرف سے آتے رومال کے سایہ نے سب کو پناہ دی تھی۔ وہ یہ سب کچھ جانتا تھا کہ سوال کرنے والے اس عزت کو بھول چکے ہیں اور آنے والے عذاب سے بے خبر ہیں مگر لفظوں کو تو وہ کبھی کا اپنے اندر دفن کر چکا تھا اسے یاد تھا کہ

" لفظوں سے پناہ مانگو کہ یہ صرف سایا ہیں اور ایک دن انہیں پاش پاش ہو جانا ہے۔ بس یاد رکھو لفظ نفس کی صورت دیوار ہیں اور سالک کو ان سے دامن بچانا چاہیئے؛ "

چنانچہ اب وہ صرف مسکراتا اور چلتا چلا جاتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے تلوے کھال چھوڑنے لگے تو اسے یاد آتا کہ؛

اے سالکان راہ گوش بر آواز ہو کہ شیخ میرے خدا ان کی لحد پر نور افشانی کرے فرماتا، ایک دن انھوں نے شیخ اپنے سے کہ ٹوٹ چکے ہیں پاپوش میرے، راستہ ناہموار ہے، منزل دور ہے ــــ سنا شیخ نے اور خاموشی اختیار کی حتیٰ کہ آپا نظر درمیان راستے کے ان کو ایک شخص کہ بیٹھا تھا وہ میں اور نہ کھڑا ہو سکتا تھا خدا کی بنائی ہوئی زمین پر ــــ تب توجہ دلائی شیخ نے کہ شکر ادا کر کہ ترے پاس پاؤں تو ہیں کہ چل سکے۔ ۔ ۔ ۔

وہ چلتا رہا، چلتا رہا، راستہ کی دھوپ، بارش، آندھیاں اسے روک سکیں اور نہ لوگوں کے سوالات اس کی راہ میں حائل ہو سکے۔

اور اب بھی چل رہا تھا جبکہ اس کو پایاں کہ دعا دکھ سے کٹتا جا رہا تھا اور سمت ہنوز نامعلوم تھی ــــ

[باقی صفحہ ۱۳۰ پر دیکھیے]



علی عبّاس امید

کہیں عزیز نہیں، کوئی خاندان نہیں
خود اپنی ذات پہ بھی اب ہمیں گمان نہیں

جو آسماں کو اٹھائے ہوئے ہیں صدیوں سے
نصیب میں انھیں ہاتھوں کے سائبان نہیں

خموش یوں ہے کہ لفظوں کا حوصلہ معلوم
پڑھو نگاہ سے، وہ چہرہ بے زبان نہیں

جو زندگی کہیں مل جائے اس سے کہہ دینا
بچھڑنے والے بھی اب مجھ سے بدگمان نہیں

فروغ جشن بہاراں کے ہیں امیں وہ لوگ
کہ جن کی شاخ پہ موسم بھی مہربان نہیں

ازل سے محو سفر ہیں مگر حقیقت ہے
کسی بھی چہرے پہ اب تک کوئی تکان نہیں

ہمارے عہد کا المیہ ہے مقدر سے
زمیں پہ پاؤں نہیں ہے، سر پہ آسمان نہیں

● ۴۶/۱۲-۹۶ تلسی نگر۔ بھوپال۔ ۳۶۲۰۰۳ (ایم۔پی)



یعقوب تصوّر

پر نہ کھولیں تو اڑانوں کے ہنر جاتے ہیں
قصدِ پرواز سے اِس شہر میں پر جاتے ہیں

سرفرازیٔ انا سے وہ بھلا کیا واقف
منصفوں کے بھی کبھی دار پہ سر جاتے ہیں

عین ساحل پہ ڈبونے کی تمنّا لے کر
آگے آگے مری کشتی سے بھنور جاتے ہیں

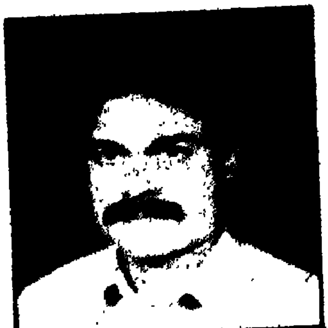
تند طوفاں میں سفینوں کی حقیقت کیا ہے
یہ الگ بات سمندر بھی اُتر جاتے ہیں

جانے کیا دیکھتے ہیں خواب میں بچے منظر
ماں کی آغوش میں سوئے ہوئے ڈر جاتے ہیں

کوئی تدبیر مری نیند کو گہرا کر دے
آنکھ کھل جائے تو خوابوں کے اثر جاتے ہیں

چاند سورج کو فقط اس لیے گنتا ہے گہن
حلقۂ بختِ تصوّر سے گذر جاتے ہیں

● پوسٹ بکس نمبر: ۴۶۲۸ - ابوظبی (یو۔اے۔ای)



عابد جعفری

قیمتِ عہدِ خطا سے اب وجر چاہتے ہو
ہم سے کیا دورِ غلامی کی سند چاہتے ہو

حرف دانائی کا یکھے نہیں ہو کوئی تم
سارے عالم سے بہت دادِ خرد چاہتے ہو

قبضۂ فکر میں دریا کی طنابیں رکھ کر
تم گھٹاؤں سے بھی امید رسد چاہتے ہو

خون اپنوں کا بہانا ہے بہا لو خود ہی
کیوں کسی غیر کے لشکر سے مدد چاہتے ہو

روز گن گن کے جو کرتے ہو تم تیغ ہیں
کم کسی طرح سے ہو جائے عدد چاہتے ہو

پست قد لوگوں کی کرتے ہو اطاعت جس پر
سب سے دنیا میں فزوں قامت وقد چاہتے ہو

● 10-1215 RADOM STREET
PICKERING, ONTARIO
CANADA, L1W-1J6

آصف فرخی
بی ۵۰۵۔ بلاک ۵۔ گلشن اقبال، کراچی (پاکستان)

ناف

جہاں پہلے تعلق تھا اب اس جگہ گھاؤ پڑ چکا تھا ورنہ اس رشتے کی بنیاد خون کے اشتراک پر تھی، پھر دو مشاق ہاتھ آئے اور عین اسی جگہ گرہ ڈال دی۔ گرہ پڑ جانے کے بعد بھی مُردہ خون ذرا ذرا رستا رہا جہاں سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا تھا خون سے نم رہی۔ پھر اس میں پیپ پڑ گئی۔

سہمی چڑیا کی طرح پھڑ پھڑاتا ہوا وہ ننھا سا دل، بند مٹھی کے برابر کا دھڑکتا تو سارا خون یہیں سے ہو کر گزرتا اور رگوں سے شریانوں سے نسوں تک سیراب و تازہ کرتا چلا جاتا ریشے ریشے میں تازہ ہوا پھیل جاتی پھر سانسوں میں برت لیا جانے والا خون باسی ہو کر وریدوں کی سمت پلٹنے لگتا، پھر یہیں سے ہو کر واپس جہاں سے آیا تھا اور اس کی جگہ لینے کو تازہ دم نئے خون کی کمک بھی یہیں سے ہو کر آتی ــــ ایک وقت تھا کہ زندگی کی دھڑکن وہاں تھی، رابطہ قائم تھا، مضبوط تھا دونوں طرف خون کی آزادانہ آمد و رفت جاری تھی غذا اور آکسیجن اور ماوری بدن کی کیمیا، جن کی اسے ضرورت تھی کہ نشو و نما پا سکے یہ سب اسی جگہ سے ہو کر گزرتا جہاں سے وہ پیوستہ تھا۔

اور وہیں سے وہ ٹوٹا۔

ایک چیخ اس کے پھیپھڑوں میں بھر گئی اور وہ باہر کر دیا گیا۔

پھر وہ مشاق ہاتھ آئے۔ اپنے کام میں ماہر، اور عین اسی جگہ گرہ ڈال دی۔ وہاں خون ہی خون ہو گیا، زندہ خون آخری سانسیں لیتا ہوا خون جو اس کے ساتھ ساتھ کھنچا آتا تھا تار جال کی طرح، پھل سے پلٹے ہوئے سانپ کی طرح اس کے اندر خون کا بہاؤ موم توڑ رہا تھا، جو تعلق رہا ہو گا اس کا دوسرا کنارہ اس تھیلی کی طرح جھول رہا تھا جو خالی اور بے مصرف ہو۔ اب یہ دم



گھونٹنے والا جال نہ بن جائے!

جس آنول نال نے ماں بن کر پرورش کی تھی اب وہ لاش کی طرح ایک طرف ڈال دی گئی کہ کوئی اٹھا لے جا کر دفن کر دے۔

دفن ضرور کرنا۔ یہ ضروری ہے کہ جسم کا کوئی حصہ بھی الگ ہو جائے تو اسے پورے جسم کے قاعدے سے دفن کیا جائے۔ پہلی آواز کی سماعت وہ ایک مرتے ہوئے تعلق کی جاں کنی میں پیدا ہو رہا تھا۔

اس کی جان نکل چکی تھی اور اس میں زندگی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے اس کے پیٹ پر جھینٹے سے غبارے کی طرح ناف پھول رہی تھی جس جگہ سے اسے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا تھا۔ واضح نشان نظر آ رہا تھا اس پر جمے ہوئے خون کی ہلکی سی تحریر تھی ورنہ اس کا باقی ماندہ حصہ ربڑ کی نلکی جیسا لگتا تھا کٹا پھٹا اور ڈنٹھا ہوا ربڑ، جو کسی حوض کے بجائے پیٹ میں اترا ہوا تھا، ناف کے پیالے کے وسط میں ایک گول گول تھوڑا سا ابھرا ہوا تھا زور لگا کر رونے سے یہیں پھول جاتا اور اس کے کناروں سے خون جھلکنے لگتا، تیز دھار والا چاقو یہیں چلا تھا، زخم ابھی بھرا نہیں تھا مگر مرجھانے لگا تھا۔ اس پر کھونس آ گئی تھی مُردنی کا پھیکا رنگ جو ایک ذرا سے ذرا میں سیاہ ہو گیا رکے ہوئے خون میں پیپ پڑنے لگی زخم ہرا رہا۔

جب اس پر پیپڑی جم کر کھرنڈ بن گئی اور سوکھنے لگی تب بھی کئی دن تک پیپ کسی نا آسودہ خلش کی طرح اندر ہی اندر کلستی رہی اپکتی رہی زخم کا منہ بند نہیں ہوا۔

جب بھی وہ ہاتھ پاؤں مارتا، روتا یا پیٹ بھرائے جانے کا مطالبہ کرتا تو یہ زندہ بدست مُردہ کچا کچا ہو کر ڈاتا جاتا اور اس کے کناروں سے پیپ ٹپکنے لگتی جس میں خون کی خفیف سی آمیزش ہوتی، سبزی مائل زرد مادے پر سرخ دھبے۔

ایک ہاتھ نے پیپ کو پونچھ دیا۔ ایک ہاتھ نے پیپ کو زخم سے دبا دبا کر نکالا اور جمع کر لیا۔ پیپ کا کلچر

کیا ضرورت ہے ؟"

"تمہیں خبر نہیں ہے کہ ہوا کیا ہے۔ عضو ضعیف دیکھ کر بیکٹیریا نے یورش کی ہے (SOLDIERS) اور نزا ہوئی ہے، جب تمہارے جسم کی مدافعت کو ذرا غافل پاتے ہیں، عود کر آتے ہیں اور (INFECTION) ہو جاتا ہے۔"

اس کے کانوں میں آوازیں پڑ رہی تھیں، مگر آوازیں کیا کہتی ہیں، ان الفاظ کا مفہوم کیا ہوتا ہے ـــــ پیپ، کلچر، کرنا اور ہوگا ـــ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ سننا اور سمجھنا اور دیکھنا ابھی اسے سیکھنے تھے۔ ابھی تو صرف نئے نئے سانس تھے، کاٹ کر الگ کیے جانے والی جگہ کی سوزش اور یہ بے قرار پیپ۔

اور آوازیں جو مسلسل تھیں (GRANULOMA)

اگر سرخی بڑھ جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بن رہا ہے، پھر (CAUTERY) کروانا پڑے گی۔"

اس جسم کو اب بھی جراحت کی ضرورت ہے ؟"، ایک آواز پہچانی گئی کہ متکلم تھی۔ بہت پاس سے آئی تھی، جلد ہی میں نے یہ مربوط کرنا سیکھ لیا کہ یہ بوڑھی بجا ہیں۔ اس سے پہلے آواز دن کو نام دیئے جا سکتے تھے نہ بدن۔ لفظ محض آواز تھے اور آواز، کان کے پردے پر ایک ارتعاش، متواتر مگر بے معنی ـــــ نہیں، معنی کی منتظر۔

زندگی کی ابتدا سے بھی پہلے سے یہ جان کے ساتھ تھیں اور خلا کو پُر کرنے کے لیے یورش کر رہی تھیں یہ آوازیں۔

ننھی سی جان پر اتنا بڑا کلپ لگا پہلی بار دیکھا۔ اتنا اونچا اسپتال اتنے بڑے ڈاکٹر اور بچے کی ناف ابھی تک نہیں سوکھی۔ بس بی، رہنے بھی دو، نام بڑا اور درشن تھوڑے۔ دیکھ لیا تمہارے نئے زمانے کو۔ ہمارے وقتوں میں تو دائی ہوتی تھی، ایک سے ایک سیانی، اپنے کام میں طاق۔ ادھر آنول نال باہر آئی، اس نے سونت سونت کر سارا خون نکال دیا اور ساری گندگی پونچھ ڈالی صاف کا صاف اور خون ضائع بھی نہیں ہوا۔ جب کچھ رہے گا ہی نہیں تو پک پک کر زخم کیا خاک بنے گا ؟ اور پھر ایک ہاتھ سے ناف پر لیپ کر دیا۔ مگر تم بھلا ہماری کہا سنتی ہو۔ دیسی طریقے تمہیں ویسے ہی گنوارے اور جرائم جیسے لگتے ہیں۔ اب جو یہ ولایتی طریقے سے بھی ہر کام کر کے سیپٹک ہو گیا تو یہ کس کی خطا ہے ؟ بولو

جواب دو، مگر تم کیا جواب دو گی ؟ کوئی جواب ہو تو جواب دو، اور وہ دھند جہاں سے نکل کر آوازیں آتی تھیں پھر جس میں لوٹ جاتی تھیں۔ یہ آواز مسلسل تھی اور بلند۔ "اسپتال والے بھی زچہ کو بھرتی کر لیتے ہیں پھر فارغ کرنے کے بعد یوں ہی لوٹال دیتے ہیں آنول نال ساتھ نہیں دیتے کہ ماں باپوں کے ہاتھ سے زمین میں گاڑ دی جائے۔ میں تو جانوں کسی کی نال ہی نہیں گڑی۔ جبھی تو آج کل کے لوگوں کے لئے مٹی میں ممتا نہیں ہوتی ناف سے کٹے ابلے بگلے پھرتے رہتے ہیں۔ میں پوچھوں کہ وہ موت پیٹے اسپتال والے اتنی بہت سی ناروں کا کیا کرتے ہوں گے۔ اچار تو ڈالنے سے رہے۔ اے بہنے اللہ معاف کرے، جی میں برے برے خیال آتے ہیں۔ الٰہی توبہ، اللہ تو ہی پناہ میں رکھ، بڑا جھنجھٹ ہے

اور اس آواز کے پاس حل بھی تھے، "بس بی بی بس، تم نے اپنی سگھڑ بہت دکھا لی، سارے جتن کر لیئے اور بچے کی ناف ہے کہ سوکھتی ہی نہیں۔ پھوڑے میں کھاج، الٹا پک گئی۔ نہ چین سے دودھ پیا ہے نہ پیشاب پاخانے کا ٹھکانہ ہے۔ اس وجہ سے منت بھی نہیں ہو پائی۔ ناف کے مارے نگوڑے لونڈے کو مسلمان تک نہ کر پائے اب میری مان جاؤ۔ پرانا آزمودہ نسخہ ہے۔ کارگر نہ ہو تو جو چور کی سزا سو میری۔ ماموں کے ہاتھ سے بینگن چھوا کر دروازے کی چوکھٹ میں لٹکا دو۔ جوں جوں بینگن سوکھے گا، ناف بھی سوکھتی جائے گی سوکھ کر جھڑ جائے گی ......"

اس آواز کے ساتھ رہی مانوس جوابی خاموشی۔

ماموں چھوایا ہوا بینگن ہر مرتبہ کارگر نہیں ہوتا، بعضوں کو پھولی ہوئی ناف کے ساتھ زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔

بچپن میں یہ سب کے لئے کھیل تھا۔ وہ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور کہتے۔ "بچو لوگ قمیص کھولو اور ڈھونڈھا دکھاؤ۔" قمیص ہٹائی اور پیٹ آگے کر دیا۔ ناف پھولتی اور سانس کے ساتھ غبارے کی طرح تن جاتی ـــ دوسروں سے ممتاز ہونے اور اپنے گرد مجمع لگانے کے لئے پھولی ہوئی ایک ناف بھی کافی ہوتی ہے۔ پھر احساس ہوا کہ دوسری کے ڈھونڈھوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ایک میرا ایک ٹیڑی کا۔ باقی تو سب کا پیٹ ہوتا ہے۔ بارش سے پہلے گرم حبس، بیکل دوپہریا میں تیتری پکارتی ہوئی اڑتی ـــ محض ایک آواز، دھوپ اور گرمی میں کھویا ہوا اس کا پیٹ جھلا

کس نے دیکھا تھا تو بھابو کو اعتراض ہوتا۔

"لو، پھر آگئیں۔ ارے ان کا ڈھونڈھا ہی نہیں بھرتا۔ بارش کے لیے بلبلاتی رہتی ہیں"

کوئی نہ کوئی ٹیڑی کی ہمدردی میں بھابو کو ضرور ٹوک دیتا "ارے بچے یوں تو نہ کہو۔ اس کا ڈھونڈھا بھر ہی کہاں سکتا ہے۔ پیر فقیر کی یہ بددعا نے لڑکی سے ٹیڑی بنا دیا اور اس کی تو چونچ میں چھید ہے۔ دماغ پر بارش کی بوند پڑے تو اس کی پیاس بجھے۔"

ٹیڑی کا تو ڈھونڈھا بددعا کی وجہ سے تھا۔ میرا پیٹ نہیں ڈھونڈھا ہے تو کیا صرف ناف کی وجہ سے؟

تب سے میں بھی ٹیڑی کی طرح پانی کھوجتا رہتا ہوں۔ تال تلیا، ندی، نالے، دریا، سمندروں کی طرف بار بار رجوع کرتا ہوں۔ بس اب اپنی پھولی ہوئی ناف کی وجہ سے دوسروں کے سامنے قمیص نہیں اتارتا ۔۔۔ ان عورتوں کے سامنے نہیں جن کی طرف میں راغب ہوتا ہوں۔ مبادا قربت کے لمحوں میں وہ میری ناف دیکھ کر ہنس پڑیں، جیسے میرے زیرِ ناف ٹیڑی کی چھید والی چونچ ہو ۔۔۔ اور پھر میں ٹیڑی کی طرح جگت پیاسا رہ جاؤں گا

بھابو مجھے گود میں لٹا کر گھنٹا ہلاتی تھیں اور ٹھوڑی میں ہاتھ دے کر سوال کرتی تھیں جواب بھی مجھ سے جواب دہی کا تقاضہ کرتا ہے۔"

"اے بی، تم کیوں آگئیں؟ خیر اب آگئی ہو تو سیدھی چل جانا"

میں ساری زندگی ان کے ڈراوے کو جیسے جیسے گیا ڈر کے مارے، دم سادھے، زندگی کے کنارے کنارے جیسے رتن کی لکڑ پر رینگتی ہوئی چھپکلی۔ اس ڈر سے حرکت نہیں کی کہ کسی نے دیکھا اور جنا بھینچ کر مارا۔

گھٹنے کی حرکت کے ساتھ ساتھ میرا پورا بدن ہلتا رہتا ہوگا، یہاں تک کی نیند آجاتی ہوگی اور ٹھوڑی پر ان کی انگلی کا نشان دیر تک بنا رہتا ہوگا ۔" اے بی، تم کیوں آئی ہو؟" کے جان گسل سوال میں اے بی کہہ کر کیوں مخاطب کیا جاتا تھا۔ ذلت اور تحقیر کی آخری انتہائی شکل کے طور پر؟ یہ سوال بھی میری ٹیڑھی پیاس میں شامل ہے۔ جہاں پانی دیکھتا ہوں، پر مار کر اتر جاتا رہوں، ایک لہر بند پڑ جائے کہ دماغ تر ہو سکے ورنہ جگہ ایسا شاید یہ ہے کہ ہوا کی رمق تک نہیں آتی سمندر کی سطح پر سایہ چلتا ہوا نظر آتا ہے جس کے آگے پانی اجلا، دھوپیلا ہے اور پیچھے سانولا، چھاؤں بھرا دریا کی گود میں موجیں پیاسی ہیں کہ زبان نکال نکال کر ساحل تک آتی ہیں مٹی کو چھو کر اسے تر بتر کر لینا چاہتی ہیں ریت کو چھو لینے کے بعد بے تاب ہو کر پلٹتی ہیں ٹھٹھک ٹھٹھک کر قدم پیچھے پلٹتی ہیں اور مایوس ہو کر بہہ جاتی ہیں اس بچھڑی ہوئی موج کو کوئی سمندر میں لے جا کر جوڑ دے پانی میں پانی کی گرہ ڈھیل کیسے پڑی؟ جس جگہ آج بھنور ناچ رہے ہیں وہیں وہ ناف تھی جواب تک اتنی پھولی ہوئی ہے کہ لگتا ہے کٹی ہی نہیں تھی موج کے تھپیڑوں سے میرے پھیپھڑوں میں ہوا کا شدید دباؤ ہے۔ کہیں یہ غبارہ تن کر پھٹ نہ جائے اور اندر سیلاب آجائے اور اب زیادہ دیر سانس روک نہیں سکتا۔ سر چکرا رہا ہے ہوش و حواس اب گم ہوئے کہ اب گم ہوئے بہتا امڈتا پانی بدن پر دستک دے رہا ہے، سانس تھمی بدن اڑا فضاؤں نے بلایا، ہوا نے تحلیل کر دیا پانی کا بلبلہ تھا، ہوا میں جذب ہو گیا میں بادل بن کر سارے میں چھایا جا رہا ہوں بدن کی ساری دھول صاف ہو گئی، مٹی دھل گئی اور میں ایسا سبک ہوا ہمک کر دھرتی کی گود میں نکلا اور آسمانوں پر پھیلنے لگا اب میرا دل اسی کی سنگت میں دھڑکتا ہے وہاں سے خون ملتا ہے اور اس کا آہنگ جسم کی حد پھیلی، پھیل کر بے کنار ہوئی وہ آنول نال سلامت ہے اور ناف سے جڑی ہوئی ہے میں دھرتی ہوں اور سمندر اس سے بھی آگے بہت دور تک دور دور دور تک پھیلتا ہوا منظر ہوں میں اور سر سے اونچا ہوتا ہوا، آنکھوں آگے کھلتا ہوا، گول گول گھومتا ہوا آسمان اور آسمانوں کے آسمان، افق سے افق کراں تا کراں اور یہ بے کرانی، سارا ابد تمام ازل جس کا کوئی انت نہیں، یہ میں ہوں میری ناف سلامت ہے اور اس کے ذریعہ میں اپنی ماں ۔ دنیا سے جڑا ہوا ہوں اس کے ہونے سے دھڑکتا ہے میرا دل میں باطن سے مربوط ہوں میں بدن میں بدن ہوں میں ہر روح ہوں اس کی ہستی میری رگوں میں بہتی ہے، میں کل کائنات ہوں!

خالد بشیر



ں نے دستک دی، دروازہ بند رہا
پر بھی عشق میرا شیرازہ بند رہا

ی سارے لوگ توکل کر گذرے
ں ہی ایک جگہ اندازہ بند رہا

ری آنکھوں پہ بھی گردِ ہوس رہی
ور تمہارا نقص بھی غازہ بند رہا

ہوں میرا ایک طرفہ اظہارِ شوق
ئی گنبد میں آوازہ بند رہا

کیسے کیسے بات ادھوری چھوڑی
پھلتے کھلتے غنچۂ تازہ بند رہا

● سونا وار، سری نگر (کشمیر)

افضال نوید

کیا جانے کس طرف ہے مرا سر لگا ہوا
کٹتا نہیں اثر کوئی پتھر لگا ہوا

ہر بار کی بکھرتی ہوئی شکل یاد ہے
بھولا نہیں ہوں ایک بھی چکر لگا ہوا

تھوڑا نکل کے رہتا ہے حدِ مقام سے
کاریجیاں میں میرا سمندر لگا ہوا

آتی ہے جانے کون سی دیوار راہ میں
دیکھو کہاں ٹھہرتا ہوں ٹھوکر لگا ہوا

چلتا ہوں اد گرم جب بھی دکھائی دے
اپنے مقام پہ کوئی جسم کر لگا ہوا

میں بھی ندی کو دیکھ کے واپس پلٹ گیا
اپنے خیال میں تھا مصور لگا ہوا

آواز تھی یہاں کوئی شرمائی سی نوید
دروازہ تھا یہاں کوئی چادر لگا ہوا

● 105-40, ORORRENLIGHT PLACE
SCARBORO ONT. M1K 4M8
CANADA.

عطاء الرحمٰن طارق

ایک ہی لاگ ہے میرے من میں
پریت کے رنگ نہاؤں۔
پریت کے رنگ نہاؤں۔
میں تو ساجن کی ہو جاؤں۔

دیر لگی سو دیر لگی اب
اور نہ دیر لگاؤں
پریت کے رنگ نہاؤں۔
میں تو ساجن کی ہو جاؤں۔

سانجھ، سویرے، جگ کے پہرے۔
کیسے ریت نبھاؤں ؟
پریت کے رنگ نہاؤں۔
میں تو ساجن کی ہو جاؤں۔
لوگ مجھے سمجھانے آئیں۔
میں ان کو سمجھاؤں۔
پریت کے رنگ نہاؤں۔
میں تو ساجن کی ہو جاؤں۔
ہاتھ پڑے ہیں کانچ کے
سورج کے دیپ جلاؤں۔
پریت کے رنگ نہاؤں۔
میں تو ساجن کی ہو جاؤں۔

[نیلودی کی گیتانجلی سے ماخوذ ایک گیت جو طبع زاد ہے]

● ۹۴ فاطمہ جناح، بیک مرکل، بیبی

نسیم محمد جان
مہارکی لین، محمود چوک، چھپرہ (بہار)

زندگی

پلیٹ فارم پر ایک ادھیڑ عمر فقیر، اس کی بیوی، دو بچے نظر آرہے ہیں۔ میلے کپڑوں کی چند گٹھریاں بکھری پڑی ہیں۔ گاڑی ابھی ابھی آکر رکی ہے۔ میری بیوی نے ناک پر رومال رکھ لیا۔ فقیر کے بچوں کے سامنے کچھ کاغذات کچھ پتے پھیلے پڑے ہیں جو جگہ جگہ سے داغدار نظر آرہے ہیں۔ ارد گرد مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ فقیر کے کنبے کا ہر فرد کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ ان کی گندی جلد پر جا بجا کالے میل کے دھبے جسم پر کچھ اس طرح چپکے ہوئے ہیں جیسے ان ہی کا حصہ ہوں۔ فقیر سیاہ پلیٹ فارم پر لیٹا آرام کر رہا ہے پاس بیٹھی بیوی اس کے سر پر جھکی بالوں کو الٹ پلٹ کر نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی ہے۔ ممکن ہے یوں ہی دل بہلا رہی ہو۔ میری بیوی مجھ سے مخاطب ہے۔

"مسکرا رہے ہیں آپ! توبہ توبہ گھن نہیں آتی آپ کو۔ کتنی دیر گاڑی ٹھہرے گی یہاں؟"

"پورے پندرہ منٹ۔ بڑا اسٹیشن ہے نا"

"آپ تو ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے ہنس کا جوڑا ہو۔"

فقیرنی پوری توجہ کے ساتھ اپنے شوہر کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی ہے۔ اسے گاڑی آنے کی غالباً خبر بھی نہ ہو پائی ورنہ سر اٹھا کر ایک بار تو دیکھ ہی لیتی۔ دونوں میاں بیوی کے سر کے بال تقریباً ایک ہی سائز کے ہیں۔ خشک ہونے کی وجہ سے اس طرح کھڑے ہیں جیسے معمولی جوتا صاف کرنے کے برش کے بال ہوں یا گھسے جھاڑو کے تنکے۔ ان کا چھوٹا بچہ آہستہ آہستہ بیٹھے بیٹھے کھسک رہا ہے۔ کاغذ چاٹ رہا ہے۔ منہ پر مکھیاں اڑ اڑ کر بیٹھ رہی ہیں۔ اس کے جسم پر کپڑے کے نام پر کچھ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب کہ اس کی بڑی بہن تقریباً برہنہ ہے۔ بچی نے المونیم کا پیالہ اٹھالیا۔ وہ اب میری جانب بڑھنے لگی۔ سیدھے میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی اور مجھے تعجب ہوا یہ عمر اور اتنی مہارت۔ آخر کیسے گئی میں ان میں دلچسپی لے رہا ہوں۔

ارے توبہ توبہ۔ یہاں بھی آگئی۔ بھاگتی ہے یا نہیں کو بھیک دینا، عادت خراب کرنا ہے۔" میری بیوی کی ناک کا پورا چہرہ سکڑ گیا۔

"بابو! کچھ کھانے کو دے دو مائی باپ!"

میری بیوی نے کہا "آخر یہ کام کیوں نہیں کرتی" اور میری جانب اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے سارا قصور میرا ہو۔ جی میں کہہ دوں یہ عمر کھیلنے کی ہے۔ بھاگنے دوڑنے کی۔ محنت مشقت کرنے کی نہیں۔ مگر خاموش رہا۔ ویسے بھی مدمکھی کے چھتے چھیڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

پھر آواز آئی

"مائی باپ! کچھ دے دو نا"

میں نے کچھ پیسے پیالے میں پھینک دیئے وہ آگے بڑھ گئی سر اٹھا کر دیکھا۔ بھکارن، اپنے شوہر کا سر دبا رہی ہے۔ دو کچھ گفتگو کر رہے ہیں۔ فقیر کروٹ بدل چکا ہے اب اس کا بیوی کی سوکھی جانگھ پر ہے۔ اس کی سکڑی گندی جلد ایسی رہی ہے جیسے کوئی جھلسی ہوئی لکڑی کیچڑ میں ڈبو کر رکھ دی دائیں جانب کچھ بے فکرے قسم کے کالج کے لڑکے کھا رہے ہیں۔ چھلکوں کو ایک خاص انداز سے اچھال کر پلیٹ فارم پر ہی پھینک رہے ہیں۔ ان کا ایک ساتھی جیب سے کنگھا نکال کر بال سنوار رہا ہے۔ دوسرا سیٹی بجانے میں مشغول۔ ہاتھ میں ایک فلمی پرچہ ہے۔ اس میں کسی ہیروئن کی بڑی سی

تصویر صاف نظر آ رہی ہے۔ اس عمر کی دنیا کتنی حسین ہوتی ہے

"بھلا تیسری شادی کر رہی ہے" میری بیوی کہہ رہی ہے۔

میں نے جواب دیا۔ "ہمت کی داد ملنی چاہیئے۔"

"آپ مرد لوگ اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔"

"عام خیال ہے کہ پہلی شادی ضرورت ہے۔ دوسری حماقت اور تیسری پاگل پن۔"

فقیرنی کی آواز تیز ہو گئی۔ پتہ نہیں کیا بات ہوئی۔ بھکارن بھی اس کے سر کو انگ جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ بڑبڑا رہی ہے بھلا تیسری شادی کر رہی ہے۔ اس نے خود ہی یہ بات بتائی تھی پہلے شوہر کو صرف اس کے فکس ڈیپوزٹ اور اس کی تنخواہ سے دلچسپی تھی۔ دوسرا بہت قریب آنے پر اچھا نہیں لگا۔ پھر آپ نے خود کہا وہ سچ بولنا چاہتی ہے۔ اب تیسری شادی کر رہی ہے۔ میری بیوی نہ جانے کیوں چڑ گئی جیسے بھلا نے کوئی گالی دے دی ہو۔ تنک کر بولی۔ چند سال اور نکل جانے دو جب تمہارا جسم بھی سچ بولنے لگے گا تو تمہیں جھوٹ بولنا آ جائے گا۔ اور میں سوچ رہا ہوں اگر میری بیوی کا نکاح کسی اور سے ہوا ہوتا تو؟ میں غور سے اپنی بیوی کی جانب دیکھنے لگا۔

زندگی کتنی مختصر ہے۔ کس قدر عجیب، کیسی دلچسپ ہوتی ہے سامنے والا جوڑا یورپین ہے۔ دونوں کے پینٹ پر پیوند لگے ہیں، پیٹھ پر بھاری بوجھ، شاید مغرب کا ہر فرد اور عورت اپنا بوجھ خود اٹھانے کے حق میں ہے۔ غالباً ان کے معاشرے میں سفید پوشی کا کوئی تصور نہیں۔ شاید سچ بولنے کا ان کا اپنا طریقہ ہے۔

فقیر اور فقیرن دونوں ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ بھدی بھدی گالیاں دے رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان کو گھیر رکھا ہے۔ فقیر کلکتہ جانے کے لئے بضد ہے۔ بیوی جانا نہیں چاہتی۔ فقیر بیوی کے بال پکڑ کر بری طرح دانت پیس رہا ہے وہ دونوں بچوں کے ساتھ لوٹنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ فقیر بچوں کو ہر قیمت پر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ بچوں کو فقیر کبھی اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور کبھی فقیرنی اپنی جانب۔ وہ بری طرح پٹ رہی ہے۔ لوگ ڈانٹ رہے ہیں۔ اسے پیٹنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ اپنی بیوی سے مخاطب ہے کہہ رہا ہے "دیکھو تمہاری وجہ سے اب لوگوں کے جوتے بھی کھانے پڑیں گے۔

تم بھی چاہتی تھیں نا۔"

فقیرن کی آنکھیں یکایک چمکنے لگیں۔ چیخ چیخ کر کہہ رہی "کون تم پر ہاتھ اٹھائے گا میرے رہتے۔ اس کا خون پی جاؤں"

پھر المونیم کا پیالہ اٹھا کر پاس کھڑے لوگوں سے بھیک مانگنے لگی۔ لوگ آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔

گاڑی کھلنے کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ فقیرنی نے پھر اپنی میں شوہر کا سر رکھ لیا۔ شاید کلکتہ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ بڑی بچی ٹین کا ایک پرانا ڈبا لئے ہوئے ہے۔ میری بیوی کچھ چڑ

ارے آپ ان کو کیا دیکھ رہے ہیں۔ جی چاہا ایک ساتھ جب جی میں آئے گا الگ ہو جائیں گے۔ نہ نکاح نہ طلاق۔

میں سوچ رہا ہوں کیا جواب دوں۔ بڑی بچی ٹین میں رسّی باندھ کر کھینچ رہی ہے۔ چھوٹی بچی آواز سن کر تالیاں بجا رہی ہے۔ سامنے سے ایک عورت اور مرد آ رہے ہیں۔ پیچھے تو سر پر مختصر سا سامان ہے۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان ایک تین سال کی بچی انگلی پکڑے چل رہی ہے۔ گوری چٹی، صاف ستھری بچی نے گلابی رنگ کا بے حد نفیس فراک پہن رکھا ہے اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت سی گڑیا ہے۔ فقیرنی کی چھوٹی بچی نے تالیاں بجانا بند کر دیا۔ بڑی بچی کے ہاتھ سے ٹین کھینچنے والی رسّی چھوٹ گئی۔ دونوں اس گڑیا والی بچی کو دیکھنے لگیں گاڑی چل پڑی۔ پلیٹ فارم پیچھے چھوٹ رہا ہے۔ دونوں بچیاں اب بھی گڑیا والی بچی کو دیکھ رہی ہیں۔

بقیہ صفحہ: زنجیر ہلا جاتا ہے

چلتے چلتے اچانک ایک جگہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں ۔۔۔ اور اسے طرف کھینچ چل گئی۔

آبادی کے ان گنت نفوس اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ وہ سب چاہتے تھے کہ اس کے بائیں طرف مستقل [illegible] کیا ۔۔۔ [illegible] سے ڈھیر نے بھر رہا تھا۔ مگر اس وقت سب آنکھیں سوال کی [illegible] جب انھوں نے دیکھا کہ اس کا پیالہ ہونٹوں خالی ہے جیسے وہاں کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔

ایک ہجوم تھا اس کے ارد گرد جمع تھا، ہر چہرہ سوال تھا مگر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ۔۔۔ اور [illegible] ہاتھ پر [illegible] آبادی سے باہر جا رہا تھا۔

مکتوبات

نومبر دسمبر ۹۳ء

★ جمیل الدین عالی — فیٹ ۲۴ بلاک ۲۳، گلشن، کراچی
شاعر مجھے باقاعدہ ملتا ہے۔ بعض مرتبہ بڑے بحث طلب نکات پیدا کرنے والے مباحث اور بہت سی خوبصورت تخلیقات کی روشنیاں ذہن کو اجاگر کرتی ہیں۔ میں آپ کے جریدے کا ایک ایک لفظ پڑھتا ہوں۔ "شب خون" کم اور بہت دیر یاب۔ جامعہ کے پرچے کبھی ملتے ہیں، کبھی نہیں ملتے۔ ہندوستان میں اردو ادب پر باقاعدہ اور سب سے زیادہ اطلاعات "شاعر" ہی سے ملتی ہیں۔ ششماہی جریدوں کی اہمیت اپنی جگہ۔ "سوغات" خوب جا رہا ہے مگر "شاعر" ماہنامہ ہے اور آپ کا انتخاب وسیع۔ اس مرتبہ (شمارہ نمبر ۱۱) پر عالم خوندمیری کا افتتاحیہ مضمون ہی تشنہ ہو کر بھی (شاید محدودات طوالت کے سبب) بڑا فکر انگیز ہے۔

★ حامدی کاشمیری — مسعود منزل، شالیمار، سرینگر (کشمیر)
پروین شاکر کی بے وقت موت سے بہت دکھ ہوا۔ ان کی موت سے اردو شاعری کا بہت نقصان ہوا ہے۔ کراچی میں ایک ادبی تقریب میں ان سے پہلی ملاقات کا تاثر دل میں محفوظ ہے۔ ان کی متانت اور شائستگی جو ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں جلوہ فگن تھی۔ آپ نے مرحومہ کی یاد میں ایک خوبصورت گوشہ نکال کر ایک محمود کام کیا ہے۔ مبارکباد۔

★ ظہیر غازی پوری — ہاشمہ محلہ نکل (ہزاری باغ) بہار
"گوشۂ پروین" میں آپ نے بجا فرمایا کہ شاعر کا اپنا انفرادی اور امتیازی حسن ہے اور اسے اور آگے، بہت آگے جانا ہے۔ آپ کا یہ مشورہ بھی دل کو چھو گیا کہ اپنے دوستوں کو شاعر بطور تحفہ دیجئے اور ہندوستان سے باہر اپنے اردو دوستوں تک "شاعر" کی ترسیل کو ممکن بنائیے۔ میری جانب سے "شاعر" میرے قریبی دوست صبا اکرام کراچی کو جاری کر دیجئے اور مجھے مطلع فرمائیے کہ میں زر سالانہ کے طور پر کتنے روپے بھیجوں۔ پروین شاکر کی شاعری پر آپ نے مکمل اظہار خیال کیا ہے۔ واقعہ ہے کہ پروین شاکر کی شاعری ذہن و دل میں خوشبو کی طرح بس جانے والی، شعور و لاشعور کے گوشے گوشے کو منور کرنے والی اور ہر طبقہ، ہر سطح کے انسانوں کو متاثر کرنے والی شاعری ہے۔ انہوں نے برصغیر کے تمام ارباب فن و ادب پر گہرا اور دیرپا تاثر چھوڑا ہے۔ وہ زمانے شاعری میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور یاد کی جائیں گی۔ ان کی بے وقت موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید مدتوں پر نہ

ہو سکے۔ خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔
انتہائی عجلت میں آپ نے ان کا گوشہ ترتیب دیا ہے پھر بھی وہ بیحد متاثر کن اور لائق مطالعہ ہے اور پروین شاکر کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے اور استفادہ کرنے پر قارئین شاعر کو یقینی طور پر آمادہ کرے گا۔

★ شمو ئل احمد — ۱۰۳، گراؤنڈ فلیٹ، تی پالی پتر کالونی، پٹنہ
پروین شاکر کا گوشہ ان کی شاعری کے مختلف جہات کو روشن کرتا ہے۔ پھر بھی ایک بھرپور مضمون کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اردو افسانے سے متعلق پروفیسر عالم خوندمیری کا اظہار خیال جرأت کا حامل ہے۔ شاعرات کی نظمیں بھی اچھی لگیں۔ خاص کر عذرا پروین کی نظم "خاتم العہد" یہ نظم رموز اور اسرار زندگی سے جڑتی ہے اور اردو شاعری میں ایک نئے ڈائمنشن کو اجاگر کرتی ہے۔ اتنی خوب صورت نظم کی اشاعت کے لئے مبارکباد۔ کچھ میں نہیں آتا اتنی ساری شاعرات کی نظمیں آپ کہاں سے اکٹھی کر لیتے ہیں۔ یہ یقیناً آپ پر زہرہ کا اثر ہے جو آپ کے زائچہ میں قمر سے اتصال کر رہا ہے۔ احمد ہمیش کا ایک ذاتی خط مجھے بھی موصول ہوا ہے۔ انہوں نے صحیح شکایت کی ہے کہ آپ نے ان کی تشکیل پر تبصرہ شائع نہیں کیا۔ تشکیل توجہ کا مستحق ہے۔

★ سہیل اختر — الفلاح سنٹر، نگر محو بنیشور، ۷، ۱۰۰۰۵
مشترکہ شمارہ کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ پہلے حصے میں پروفیسر عالم خوندمیری کا مضمون "موجودہ ادبی صورت حال" کافی اہم ہے۔ اس مضمون میں بھی دو حصے ہیں، پہلا اردو کی موجودہ ادبی صورت حال پر اظہار خیال ہے اور دوسرے حصے میں شرحیات HERMENEUTIC کی نئی ادبی تھیوری کو مختصر پیش کیا گیا ہے۔ موصوف کا کہنا درست ہے کہ صرف ادب پر بحث کر کے ادبی مسائل کا حل تلاش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ میں تو اس میں اتنا اور اضافہ کرنا چاہوں گا کہ صرف ادب پڑھ کر ادبی مسائل کو پوری طرح سمجھا بھی نہیں جا سکتا۔ مسائل کا حل تلاش کرنا تو دور کی بات ہے۔ ادب پر ہر وہ چیز اثر انداز ہوتی ہے جو زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ اس کی ادنیٰ سی مثال میں کہا جا سکتا ہے کہ مہاراشٹر کی سیاسی تبدیلیوں کا اثر "شاعر" پر پڑ سکتا ہے (خدا کرے ایسا نہ ہو)۔ ہمارے دانشوروں نقادوں کی کم فہمی، تنگ نظری اور مصلحت بھی تھی کہ انہوں نے اردو ادب کو اپنے گھر میں ایزی چیئر پر آرام فرماتے ہوئے اپنی چھوٹی سی کھڑکی سے دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ اسی محدود طریقے سے ادب کو سمجھا اور اس کی پرزور تبلیغ کی۔ اسی تنگ نظری اور کم فہمی کا نتیجہ ہے کہ ادب کو "ادب برائے زندگی" اور "ادب برائے ادب" جیسے لیبل دئے گئے۔

ہماری نسل کو ایسے ہی گمراہ کن راستے دکھائے گئے۔ اب صرف شکسپیئر اور اقبال کی عظمت کا تعلیم ہماری تنقید اب VALUE-LESS ہو چکی ہے۔ یہاں استثنا EXCEPTIONS ضرور ہیں۔ مثال کو پی چند نارنگ کی ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات پر کتاب آئی ہے۔ عصر حاضر کا جائزہ لیتے ہوئے نقش صاحب جدیدیت کے خاتمہ کا اعلان کرتے ہیں۔ اس کی کوئی دلیل انہوں نے نہیں دی۔ اگر ایسا ہے بھی تو اس کا قبل از وقت کہنے جیسی ہے۔ ادب میں کوئی رجحان اچانک ختم نہیں ہوتا۔ یوں بھی موجودہ ادب کو سماجی مسائل سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ سارے خطرے نمودار ہونے شروع ہو گئے ہیں جو ہمیں تباہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ جب زبان کا ہی قتل ہو جائے تو ادب کیسے تخلیق ہو سکتا ہے۔ اس زبان کو OVERHAULING کی ضرورت ہے۔ ہم قاری پیدا کرنے کے بعد کی چیز ہے۔ شرحیات پر ادھر مباحث کسی نے بھی اس کے DEVELOPMENT اور اس پر بحث نہیں بتایا۔ نقش صاحب کی کوشش میرے ناقص خیال میں اسے صرف آغاز ہی کی سادی باتوں پر مکمل کر مباحثہ ہونا چاہئے۔
پرچے کا دوسرا حصہ آپ نے پروین شاکر کے لئے وقف کر کے ایک اچھا قدم اٹھایا۔ نہیں کہ وہ صرف غزل کی شاعرہ تھیں، غزل کو نسوانی لہجہ دیا ہے۔ اور باقی ہماری تنقید کا کام ایک ذرۂ خاک کو اوج ثریا عطا کرنے میں ہے۔ پروین کی غزلوں میں تازگی کا احساس ضرور ہے۔ شاید انہوں نے ذائقہ بدلنے کے لئے ہی گوشہ میں شامل شاعرات کا کلام ہماری تخلیقی تسلسل کا جعفری سے سارہ شگفتہ اور آشا پربھات تک کن منزل سے گزری اس کا منظر نامہ صاف ہے کہ سارہ شگفتہ آشا تک آتے آتے شاعری زبیدہ زیدی وغیرہ سے کہیں آگے نکل گئی۔ ان میں شامل احمد ہمیش کا خط، خط کم اور اشتہار زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسی چیزوں کو چھپنے کا MARKETING کا موثر طریقہ ہے لیکن یہاں ہے۔ آپ اپنا PRODUCT جتنا شور و غل کرتے ہیں اتنا ہی یقین ہو جاتا ہے کہ آپ کا مال ناقص ہے۔ میں اشتہارات چھاپئے ضرور، مگر ان کی اپنی

فکرِ امروز



اردو شاعری محض ذریعہ تفریح اور شاعر حرف نقال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر آپ کسی شاعر کا تعارف کسی فلاسفر یا کسی فاضلِ سیاست سے کرائیں تو وہ ایک واضح اور ریاکا تبسم کے ساتھ گردن ہلا کر شاعر سے مصافحہ کرے گا۔ اور اس تبسم کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ اس کی نگاہوں میں شاعر کی کوئی خاص وقعت و عظمت نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک فلاسفر سے ایک مورخ یا ہیئت داں متعارف ہوگا۔ تو دونوں کے تیور سے ایک خاص سنجیدگی جھلکتی ہوگی جس کے معنی یہ ہوں گے کہ جانبین کو ایک دوسرے کی کافی عظمت و اہمیت کا اعتراف ہے۔

تو کیا واقعی شاعری اس قدر ذلیل و حقیر چیز ہے؟

[خطبات شاعری - ۱۲ دسمبر ۱۹۳۲ء]

سیماب اکبرآبادی

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰

بیادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۶واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد ــــ ۶۶
شمارہ ــــ ۵

فون: ۳۸۷۹۹۰۴

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۵ روپے

زرِ سالانہ ۷۵ روپے ◆ لائبریریوں سے ۹۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے ۲۵ ڈالر - ۱۵ پونڈ

Telephone 6883

AJKAL
The National Urdu Illustrated Fortnightly

آج کل

Telegrams

Post Box
Old Sect
DEL

۹م

محترمی، مجھے نہایت ہی افسوس اور شرمندگی ہے کہ آپ کا مقالہ، کاغذوں کے انبار میں اس طرح گم ہوگیا تھا کہ مجھے پرسوں سے قبل مل ہی نہیں سکا ورنہ ہرگز اس درجہ ناگوار تاخیر نہ ہوتی۔ امید کہ آپ اس اتفاقیہ تاخیر کو، جس میں میرے علم کو بھی دخل نہیں، معاف فرماکر شکریے کا موقع دیں گے —

اب رہی مقالے کی اشاعت، سو اس کے باب میں یہ مخلصانہ گزارش ہے کہ اس کا تعلق چونکہ میری ذات سے ہے، اس لیے جو رسالہ میری ادارت میں شائع ہوتا ہے، اس میں، خودنمائی و خودستائی کے الزام سے بچنے کی خاطر، اس مقالے کا شائع ہونا مناسب نہیں ہے — آپ میری اس مجبوری پر نگاہ کرکے، مجھے امید ہے کہ اس عدم اشاعت کا برا نہیں مانیں گے۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا —

نیازمند

جوش

جوش ملیح آبادی [بنام] مسعود حسین خان

* حضرت جوش [پ ۱۸۹۸ء — م: ۱۹۸۲ء] کے اس خط میں میرے جس مضمون کا ذکر ہے وہ میرے مجموعۂ مضامین "اردو زبان اور ادب" (ترمیم شدہ) مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ ۱۹۸۳ء میں شامل ہے۔ میرا مضمون آج کل میں نہ شائع کرنے کی وجہ جوش کا انکسار نہیں بلکہ غالباً یہ تھی کہ میں نے [بے تحاشا طرف داری کے باوجود] ۴۳ء میں ان کی گھن گرج والی شاعری پر نکتہ چینی کی تھی۔

[مسعود حسین خان]

سرورق

تلاشِ آشیاں

عمل

سلطان سبحانی

اب آپ کا شاعر وقت پر شائع ہو رہا ہے۔

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ شاعر مئی ۹۵ء سے اس تاریخ سے۔ ۔ ۔ اتنے برسوں سے چلا آ رہا ہے بے ترتیب تاخیر کا سلسلہ تمام ہوا ہے۔ ۔ ۔ یاد ہے کہ ماہ رسالہ کی اس بے ترتیبی کا آغاز کب ہوا تھا۔ ۔ ۔ گذشتہ کئی برسوں سے یہ ضرور رہا کہ شاعر ہر ماہ اپنے قارئین تک ۔ ۔ ۔ پہنچتا رہا ہے۔ اپریل کا شمارہ اور اس سے قبل ۔ ۔ ۔ شمارے اس طرح نہ چاہتے ہوئے بھی بحالت مجبوری ۲۱، ۲۱ صفحات کے چار شمارے شائع کرنا پڑے۔ ہم اگر ایسا نہیں کرتے تو کسی صورت تاخیر کا خلا پُر نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمیں اپنے بے شمار قارئین کی خواہشوں کا احترام بھی کرنا تھا۔ کاغذ کی زبردست گرانی، محدود وسائل اور کم صفحات کے باوجود ہماری پوری کوشش رہی کہ شاعر کا ہر شمارہ اپنے معیار و ۔ ۔ ۔ کسی طرح کم نہ ہو۔ تمام تر دلچسپیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مواد کی فراہمی شاعر کا خاصہ ہے۔

اپریل اور مئی کے شماروں پر مہینہ درج ہے۔ جون ۹۵ء کا شمارہ جون کے آخر تک قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا انشاء اللہ۔ مذکورہ شمارہ اپنے معمول کے مطابق ہوگا۔ مختصر وقت میں چار شماروں کی اشاعت میں ہمیں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس کا ذکر یہاں ممکن نہیں بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایک کثیر رقم جو ہم عصر اردو ادب نمبر کے لئے ہم نے کسی طرح بچائی تھی، اس میں سے خاصی بڑی رقم عام شماروں کی نذر ہو گئی۔ یہ سب کچھ ناگزیر تھا۔ نتیجے کے طور پر اب خاص نمبر کے کاموں کو اختتام تک پہنچانے کے لئے ہمیں پھر سرمائے کی فراہمی کی فکر ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کو وقت پر شائع کرنے اور مزید کسی تاخیر سے بچانے کے لئے ہمیں آپ سے تعاون کی ایک بار پھر شدید ضرورت ہے۔

اگر آپ :

- اپنا زرِ سالانہ وقت پر ارسال کریں
- شاعر کے تقاضاجات جو شاعر کی امانت ہیں بھجوا دیں۔
- شاعر کے لئے عطیات و خریدار فراہم کریں۔
- اردو کی نئی بستیوں کے فیصلے قارئین اپنا تعاون اور عطیات وغیرہ جلد ارسال فرمائیں۔
- اردو شعر و ادب کے بے شمار قارئین اور ادارے اور ۔ ۔ ۔ تک شاعر کو پہنچانا آپ کا ادبی فریضہ ہے۔

کمال

فشارِ درد میں ہنسنا، کبھی دل کو رواں رکھنا
مجھے بھی آ گیا اے عشق، غم کو کہکشاں رکھنا

بہت دشوار ہے یارو، حسابِ جسم و جاں رکھنا
مری خانہ براندازی پسِ سود و زیاں رکھنا

درِ دل پر غرض کچھ اس طرح چوکنا بیٹھی ہے
کہ اب آساں نہیں دل میں حسابِ دوستاں رکھنا

پسِ اظہارِ حرفِ حق بھی دیوانہ میں اپنا
وہی کانٹوں پہ چلنا، اور شعلوں پر زباں رکھنا

عجب اُس کا ہنر تھا، بے قفس رکھنا پرندے کو
اور اُس کے سامنے شاخِ تخیل پر آشیاں رکھنا

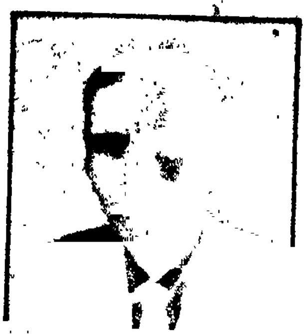
وہ اُس کا خواب اندر خواب رکھنا میری آنکھوں میں
مگر تعبیر، اکثر آسماں در آسماں رکھنا

بس، اک خانہ بدوشی ہے، کہ اب تک ساتھ ہے اپنے
تعیش ہے، تصور میں بھی اب کوئی مکاں رکھنا

مجھے یہ زعم، میں بھی حسن کاری میں شریک اُس کا
اُسے اک کھیل، میرے سامنے سارا جہاں رکھنا

کمال، آشوبِ جاں ہے آخری پہر کی حفاظت بھی
یہ میرا ظرف ہے، اپنے لیے حسنِ زیاں رکھنا

۵ مکہ، ۲۳، ۱۹۷۳ء - اردو ڈائجسٹ مئی — ۵۸



احمد صغیر صدیقی

پسند آتا نہیں لوگوں کو وہ دستور ہے میرا
بغاوت میری فطرت ہے جنوں منشور ہے میرا

کسی صورت یہ نکتہ چینیاں کچھ رنگ تو لائیں
چلو یوں ہی سہی اب نام تو مشہور ہے میرا

اُتارا جائے کوئی ابنِ مریم آسماں سے اب
غضب ہے میری بیماری عجب ناسور ہے میرا

نگہبانی محبت کی ملی ہے روح کو لیکن
ہوس کی پاسبانی پر بدن مامور ہے میرا

روش میری بھی مجھ پر جبر کی صورت مسلط ہے
مجھے لگتا ہے دشمن بھی بہت مجبور ہے میرا

بہت لمبا ہے یہ رستہ کہ جس پر چل رہا ہوں میں
کہ گو منزل قریب ہے سب کے ٹھکانا دور ہے میرا

مری یکجائی پنہاں ہے مرے بکھراؤ کے اندر
کھلے لفظوں میں سارا مدعا مستور ہے میرا

کہ اک انبوہِ نااہلاں میں ہوں نااہل میں سب سے
بس اتنی بات پر کیا کیا یہ دل مغرور ہے میرا

۸۔ بی۔ کرشن بنگلوز، ماڈل کالونی، کراچی — ۱۵۔۷ (پاکستان)



گوپی چند نارنگ

۲۵۲ ڈی، سرودیا انکلیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

موضوعِ انسانی متھ کے سائے میں

'...IN TRUTH THE LOSS OF WHAT HAS NEVER TAKEN PLACE, OF A SELF-PRESENCE WHICH HAS NEVER BEEN GIVEN, BUT ONLY DREAMED OF...'

DERRIDA

پچھلے دنوں پروفیسر آل احمد سرور نے ساہتیہ اکادمی کے سالانہ سمّوت سر لیکچر میں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تنقید سیمینار میں ہیومنزم کا مسئلہ اٹھایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت فلسفہ کی دنیا میں اور علوم انسانیہ میں کرائسس ہے اور وہ تمام اقدار جو وجودی کی مابعد الطبیعیات پر مبنی ہیں، ان پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان بنیادوں کو منہدم کرنے میں وجودیت اور جدیدیت کا بھی ہاتھ ہے۔ نئی تھیوری جو ادب اور آرٹ کو زبان کے تفاعل اور تہذیب و کلچر کے تناظر میں دیکھتی ہے (جو انسانی سرگرمی کے اہم ترین مظاہر ہیں) خود اس کرائسس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش میں ہے۔ گویا کرائسس نئی تھیوری نے پیدا نہیں کیا بلکہ نئی تھیوری خود کرائسس کی زائیدہ ہے اس کرائسس کی نوعیت کیا ہے اور نئی تھیوری اس چیلنج سے کس طرح عہدہ برآ ہے ذیل میں اس اہم مسئلے سے بحث کی گئی ہے:

نذر بہ پروفیسر آل احمد سرور والاحترام

(گوپی چند نارنگ)

موجودہ تھیوری کا مرکزی مبحث وہی ہے جو فلسفہ کا موضوعِ اول ہے، یعنی انسان کیا ہے یا شعورِ انسانی کیا ہے؟ لیکن نئے فلسفی اس کے لئے انسان یا شعور کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کے لئے SUBJECT یا HUMAN SUBJECT یا SUBJECTIVITY کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں ان کیلئے موضوع، موضوعِ انسانی، یا موضوعیت اس کے متبادل موجود ہیں۔ پس ساختیاتی اور دوسرے نئے فلسفیوں کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے انسان کے تصور کے لئے جو اصطلاحیں استعمال کی جاتی رہی ہیں جیسے انسان، شعور، شعورِ نفسی، شعورِ انفرادی، ذات، تشخص، وجود، زندگی، خود، خودی، عقل، روح، اسپرٹ، جوہر، جوہرِ مطلق یا ان سے ملتی جلتی دوسری اصطلاحیں، ان سب میں کچھ نہ کچھ مادرائیت ضرور رہی ہے۔ یعنی کچھ نہ کچھ ایسا مفہوم ضرور چھپا ہوا ہے جو پہلے سے فرض کر لیا گیا ہے۔ نئے فلسفی تصورِ انسان کو سبجکٹ اسی لئے کہتے ہیں کہ دیگر اصطلاحوں میں پہلے سے فرض کئے گئے معنی کی ملاوٹ ہے، جبکہ موضوع، نسبتاً خالص اور غیر جانبدار اصطلاح ہے۔ اس میں پہلے سے چلے آرہے کسی ایسے روحانی، سماجی، نسلی، جنسی، عقلی یا جذباتی معنی کی لاگ نہیں جو تصور کو خالص نہیں رہنے دیتے۔ موضوع، ایک مجرّد لفظ ہے جو ان تمام مفروضہ تعبیرات سے مغایرت کرتا ہے۔ جنہیں انسان یا زندگی کے بارے میں غور کرتے ہوئے ہم بنیادی اصولوں کے تسلیم کر لیتے ہیں۔ گویا موضوع کے مسئلے پر غور کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ پہلے کے ان تصورات سے ہاتھ اٹھا لیا جائے جو ہمارے ذہن کو ایک خاص

میں یا انسان، شعور اور ادب دنیا میں۔ تک حقیقت ہیں۔ اس کے بعد ہی ہم اس راہ میں آگے سوچ سکتے ہیں کہ انسان کیا ہے یا انسان، شعور اور حقیقت میں

میں کیا رشتہ ہے، کیونکہ یہ سب ایک ہی مرکزی مسئلے کے مختلف رخ ہیں۔

آیئے پہلے دیکھیں کہ صدیوں سے ہیومنزم (انسان دوستی) کی جو روایت چلی آ رہی تھی اس کی بنیاد کیا تھی۔ اتنی بات معلوم ہے کہ شعورِ انسانی

کا تصور مغرب میں یونانی فلسفے کی دین ہے۔ جس چیز کو آج موضوع کہا جا رہا ہے، اس کا پہلا سراغ ارسطو کے یہاں ملتا ہے، HYPOKE –

IMENON – سے مراد ہے، اصل خود سے مطابقت رکھنے والا، شناخت کا مرکز۔ لیکن اسے فلسفیانہ طور پر قائم کیا گیا نشاۃ ثانیہ کے

زمانے میں جب نوعِ انسانی کے وحدانی تصور کی ضرورت پیش آئی۔ ڈیکارٹ کے یہاں EGO COGITO سے مراد شعورِ انسانی ہی ہے

جو انسان کی شناخت کا مرکز ہے۔ کانٹ اور ہیگل نے اسے مزید مستحکم کیا۔

ہیگل کے یہاں ترکیبِ اضداد کے فلسفے کی اعلیٰ ترین فارم، اسپرٹ ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ، میں سوچتا ہوں، کالاحقہ انسانی تجربے کی

جان ہے اور شعورِ انفرادی کا مرکز ہے۔ ڈیکارٹ جس کا زمانہ سولہویں سترھویں صدی کا ہے ان سے پہلے کہہ چکا تھا۔

'I THINK THEREFORE I AM'

لیکن موجودہ فلسفے نے اس، اصول کی کایا پلٹ دی۔ لاکاں بدلیل کہتا ہے:

"I THINK WHERE I AM NOT
THEREFORE I AM WHERE I DO NOT THINK."

اس تبدیلی کی پشت پہ نئے فلسفے کی بدلی ہوئی ترجیحات ہیں جن کی رو سے قدیم زمانے سے چلے آ رہے اُن مفروضات پر از سرِ نو غور

کیا گیا ہے۔ جو نطق مرکزیت، پر قائم ہیں یا جو فی نفسہٖ قائم نہیں ہوتے۔ ان سب پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

کارٹیسیائی روایت جس کا ذکر اوپر کیا گیا اس میں انسان کی پہچان شعور پر مبنی تھی یعنی شعور مرکز تھا تصورِ انسانی کا، لیکن بیسویں صدی تک آتے

آتے یہ واضح ہونے لگا کہ شعور فی نفسہٖ وجود نہیں رکھتا، بلکہ محض تشکیل ہے ڈسکورس کی، اور جو چیز خود تشکیل ہے یعنی بے مرکز ہے

وہ تصورِ انسان کا مرکز کیسے ہو سکتی ہے۔

شعورِ انسانی کی پہچان ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس میں تبدیلی آناً فاناً نہیں آئی بلکہ اس کی پشت پر پچھلی ایک صدی سے زیادہ کا تجربہ

و تفکر ہے اس میں شک نہیں بظاہر اس تبدیلی میں زیادہ ہاتھ ساختیاتی فکر کا ہے لیکن اس کا آغاز پچھلی صدی میں ہو گیا تھا۔ نیز یہ

بھی صحیح نہیں کہ اس تبدیلی میں فقط فرانسیسی فلسفے کا ہاتھ ہے۔ یہ بات بالعموم معلوم نہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ نئی فکر اتنی فرانسیسی

نہیں جتنی جرمن ہے اور اس کا سراغ بڑی فلسفیانہ روایتوں سے مل جاتا ہے۔ تاریخ کی فلسفیانہ روایت جس کا آغاز کار

مارکس (۱۸۱۸ - ۱۸۸۳ء) سے ہوا۔ نفسِ انسانی کی فلسفیانہ روایت جس کا آغاز سگمنڈ فرائیڈ (۱۸۵۶ - ۱۹۳۹ء) سے ہوا

اور شعورِ حقیقت کی فلسفیانہ روایت جس کا آغاز ایڈمنڈ ہوسرل (۱۸۵۹ - ۱۹۳۸ء) سے ہوا۔

مارکس کی تھیوری کی سامنے کی یا میکانکی توجیہہ تاریخی ارتقا کے نظریے کی یہ ہے کہ جس طرح جاگیرداری کو بے دخل کر کے

سرمایہ داری غالب آگئی، اسی طرح جدلیاتی مادیت کی رو سے سرمایہ داری کو بے دخل کر کے سوشلزم کا غالب آنا ناگزیر ہے

لیکن مارکس فقط اتنا ہی نہیں، اس کی دوسری تعبیریں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک مارکس کو ایک ایسے نظریہ ساز کے طور پر بھی دیکھتی

ہے جس نے یہ معلوم کرنے کی سعی کی کہ دیے ہوئے تاریخی حالات جنہیں پوری طرح سمجھنے پر بھی انسان قادر نہیں ہوتا ان کی بنا پر

کس طرح وہ اپنی سماجی دنیا خلق کر لیتا ہے، یعنی نظام کچھ بھی ہو۔ انسان فریب خوردگی کا شکار ہوتا ہے اور اسی فریب خوردگی

کی بنا پر جو حقیقت سے فقط جزوی علاقہ رکھتی ہے، انسان تاریخ بناتا ہے۔ گویا انسان لاکھ عقلِ عام ...MON SENSE

کا سہارا لے، فریب خوردگی سے نہیں نکل سکتا، اور غور سے دیکھا جائے تو عقلِ عام ہی وہ نام ہے جو انسان نے اپنی فریب خوردگی

کو دے رکھا ہے۔

اس نظریے سے دیکھا جائے تو مارکس کے خیالات فرائیڈ کے خیالات کے پیش رو معلوم ہوتے ہیں۔ نئے فلسفی مارکس

[redacted]00007

طرح فرائیڈ کو بھی میکانکی تعبیروں سے ہٹ کر دیکھتے ہیں۔ (ژاک لاکاں (۱۹۸۱ - ۱۹۰۱ء)
فرائیڈ کے بازمطالعے میں اس بات پر زور دیتا ہے کہ فرائیڈ کے فلسفے کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ خواہ انسان کے اعمال کے مہیجات اور محرکات اس کو معلوم ہو جائیں تب بھی وہ ان کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسی لیے انسان کے اعمال بالعموم ان اعتقادات سے متصادم ہوتے ہیں جو عقلِ عام کی رو سے وہ اپنے بارے میں رکھتا ہے۔ گویا انسان اپنی فریب خوردگیوں کی رو سے اور ان کے بل پر جیتا ہے۔ لاکاں کہتا ہے:

'THE OBVIOUS HAS MADE US BLIND'

یعنی جو کچھ ہمیں معلوم ہے اس نے ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے یا جس کو ہم مانوس معنی یا معمولہ معنی کہتے ہیں، اس نے ہم سے حقیقت کو پرکھنے کی صلاحیت چھین لی ہے یا ہماری سوچنے کی قوت سلب کر لی ہے۔

ظاہر ہے تصورِ انسانی کی کارتیسیائی روایت سے جو عینیت پسندی پر مبنی ہے۔ پہلا واضح گریز مارکس اور فرائیڈ کے یہاں ملتا ہے یعنی یہ کہ انسان آزاد عامل نہیں بلکہ خود فریبی کے بل پر جیتا ہے، اور جس چیز کو عقلِ عام کہتے ہیں وہ دراصل ہماری خود فریبیوں کا پردہ ہے۔

مارکس اور فرائیڈ کی یہ غیر مقلدانہ یا غیر میکانکی تعبیریں ممکن ہو سکیں۔ دراصل ہوسرل کے فلسفے کی وجہ سے جسے مظہریت کہا جاتا ہے اور جس کے اثرات بیسویں صدی میں عام ہوئے۔ ہوسرل کا اجتہادی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فلسفے کی بنیادوں کی بنیادیں معلوم کرنا چاہیں۔ لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ بنیادیں خاصی گریزپا ہیں اور فطری دنیا میں ان کا کوئی معروضی وجود نہیں ہے ہوسرل کے بقول فلسفہ فقط ان مبینہ تصورات پر تکیہ نہیں کر سکتا جو روایتی طور پر مفروضات پر قائم چلے آ رہے ہیں، مثلاً انسانیت (موضوعیت)، معروضیت، تاریخ، فطرت، سائنس وغیرہ۔ اس کا مشہور قول ہے:

'THESE FAMILIAR CONCEPTS ARE THE PROBLEM,
NOT THE SOLUTION'

یعنی مانوس تصورات خود مسائل ہیں، مسائل کا حل نہیں، انہیں حل کرنے کے لئے ہوسرل نے تجربے کا رخ کیا جسے وہ PHENOMENA مظاہر کہتا ہے۔ اس مظہری علاقے PHENOMENAL FIELD کو اس نے فطرت یا معروضیت کے کسی بھی مفروضے کو بیچ میں لائے بغیر بیان کرنے کی کوشش کی۔ مظہریت کی رو سے ہوسرل نے بحث کی کہ ہمارے بہت سے بدیہی اور مسلّمہ مفروضات درحقیقت مصنوعی دریافتیں ہیں، مثلاً انسان اور کائنات کا رشتہ اور دونوں کا فرق جسے موضوع اور معروض سے نسبت دی جاتی ہے، یہ دراصل ہمارے تجربے کی بنیاد نہیں بلکہ محض ایک پیرایہ ہے جو بجائے خود تجربے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ مظہریاتی فکر کو ہوسرل کے شاگرد مارٹن ہائیڈیگر (۱۹۷۶ - ۱۸۸۹ء) نے مزید استوار کیا اور وجودیاتی مظہریت EXISTENTIAL PHENOMENOLOGY کی تشکیل کی جسے بالعموم وجودیت کہا جاتا ہے، نیز وجودیت کے اثرات آگے چل کر ژاں پال سارتر (۱۹۸۰ - ۱۹۰۵ء) سیموں دی بووا (۱۹۸۶ - ۱۹۰۸ء) البرٹ کامیو (۱۹۶۰ - ۱۹۱۳ء) اور ان کے معاصرین کے ذریعے ادب میں عام ہوئے اور ادبی روایت کا حصہ بن گئے۔

وجودیت کا مرکزی مبحث یہی تھا کہ انسان جس حالت میں بھی ہو اس کو بنیادی سوال کے بارے میں کچھ نہ کچھ فیصلہ کرنا ہی پڑتا ہے کہ وہ کیا ہے یا وہ کون ہے یعنی موضوعِ انسانی کیا ہے؟ اگر ہمیں اس کا احساس نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسروں کی سوچ نے جو فیصلہ کیا ہے، ہم نے اسے بالا رادہ یا بے ارادہ قبول کر لیا ہے، یعنی ہمیں فیصلہ کرنے کا جو اختیار تھا ہم نے خود ہی اس اختیار سے ہاتھ اٹھا لیا ہے اور گویا انتخاب نہ کرنے کا انتخاب کیا ہے۔ وجودیوں کے بقول فیصلے کی ذمہ داری کا احساس نہ رکھنا ایک طرح کی بدعقیدگی یا جعلی پن ہے۔ ذات یا وجود کا کھرا پن AUTHENTICITY اسی میں ہے کہ انسان جرأت مندانہ فیصلے کی ذمہ داری کا سامنا کرے، کیونکہ ذات کا سوال QUESTION OF SUBJECT

یک سوال ہے اور اس کے جواب پر ہی انسان کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا انحصار ہے۔

یہاں موضوعِ انسانی کی بحث کے حوالے سے یہ نکتہ لائقِ غور ہے کہ مظہریت ہو یا وجودیت ان میں اور مارکسزم اور فرائیڈیت میں یہ بات تہہ نشیں طور پر کسی نہ کسی پیرائے میں ایک دوسرے سے متفق چلتی ہے کہ انسان (موضوع) خواہ کچھ بھی ہو، وہ اصلیت سے ہمیشہ فاصلے پر زندگی کرتا ہے، اور اپنے بارے میں جن باتوں کو انسان مسلمات سمجھتا ہے، دراصل ان کی حیثیت مفروضات سے زیادہ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں شعور یا ذات کی بنیادیں مارکس اور فرائیڈ کے بعد مظہریت اور وجودیت کی رو سے بھی تحلیل ہوتی رہی ہیں۔

ساختیات و پس ساختیات نے اس سلسلے کو مزید جاری رکھا۔ وجودیت کے بارے میں آگے چل کر معلوم ہوا کہ خود وجودیت کی بنیاد ایک ایسے مفروضے پر تھی جو داخلی تضاد کا شکار تھا۔ یعنی یہ کہ فیصلے کی ذمہ داری خود موضوعِ انسانی کی ہے، لیکن جب موضوعیت فی نفسہٖ قائم ہی نہیں ہو سکتی تو ذمہ داری کیسی اور کس کے تئیں؟ یہ مرکزی تضاد بالآخر وجودیت کو لے ڈوبا اور ۱۹۶۰ء کے بعد وجودیت منہدم ہو گئی۔

یہی زمانہ فلسفے کے منظر نامے پر 'ساختیات اور پس ساختیات' کے ابھرنے کا ہے۔ ساختیاتی فکر کی رو سے چوں کہ زبان سے ماہر یا زبان سے پہلے کوئی جوہر نہیں ہے، اس لئے خیال یا وجود جو بھی ہے زبان کے نظام کے اندر، اس کی رو سے اور اس کے حوالے سے ہے۔ گویا موضوعِ انسانی بھی ایک تشکیل ہے جو زبان کے نظام کی رو سے قائم ہوتی ہے دراصل یہ نکتہ ہائیڈیگر کی مظہریت میں بھی تھا کہ وجود فقط اسی قدر ہے جس قدر ہم زبان کی مدد سے اس کا ادراک کر پاتے ہیں۔ بہر حال ساختیاتی مفکرین کے یہاں یہ نکتہ اس نوع کے اقوال میں ڈھل گیا کہ زبان بولتی ہے انسان نہیں، یا فکر سوچتی ہے مفکرین نہیں، یا ادب لکھتا ہے ادیب نہیں۔ (ر.ک۔ رولاں بارتھ: مصنف کی موت) واضح رہے کہ ایسے اقوال میں زبان، فکر، یا ادب سے زبانِ محض یا فکرِ محض، یا ادبِ محض مراد نہیں بلکہ وہ نظام جس کی بدولت زبان، فکر یا ادب کا تصور وجود پکڑتا ہے۔ یوں پس ساختیات تک آتے آتے موضوعیت پوری طرح بے دخل ہو گئی اور انسان جو یوں بھی مارکس، فرائیڈ اور ہوسرل کے بعد آزاد عامل نہیں رہا تھا اور اپنی کارٹیسیائی روایت سے بے دخل کیا جا چکا تھا، اب ڈسکورس کی تشکیلِ محض بن کر رہ گیا۔ لاکاں ہوں یا آلتھیوسے، فوکو ہوں یا بارتھ یا جولیا کرسٹوا، موضوعِ انسانی کی فلسفیانہ حیثیت ان سب کا مرکزی مبحث ہے۔ موضوع کی وحدت تو دریدا سے بہت پہلے چیلنج ہو چکی تھی۔ دریدا نے مزید یہ کیا کہ دلیل کی پوری طاقت سے معنی کی وحدت کو بھی چیلنج کر دیا، یعنی یہ کہ معنی مرکز گریز ہے، یا معنی جتنا موجود ہے اتنا مؤخر بھی ہے یا معمولہ معنی ہی کل معنی نہیں، غائب یا او جھل معنی بھی جواز رکھتا ہے یا معنی خیزی ایک مسلسل عمل ہے یوں موضوعِ انسانی کے ساتھ ساتھ معنی بھی لامرکزیت کی زد میں آ گیا۔ دیکھا جائے تو ڈی کنسٹرکشن کا بیج بھی ہائیڈیگر کی مظہریت میں موجود تھا اور دریدا کو اس کا اعتراف بھی ہے کہ اس نے ڈی کنسٹرکشن کا تصور ہائیڈیگر سے اخذ کیا۔ ہائیڈیگر کا قول ہے کہ فلسفیانہ نظریات پر غور فقط اس لئے نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کیا کہتے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ وہ کیا نہیں کہنا چاہتے ہیں۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ پس ساختیات ہو یا ردِ تشکیل، مارکسیت ہو یا نسوانیت، موضوعِ انسانی کی بے دخلی تمام نئے فلسفوں کا بنیادی مسئلہ ہے پال ریکیو (۱۹۱۳ -) کہتا ہے کہ ہماری آئیڈنٹیٹی کی بنیادیں ہل چکی ہیں شناخت کا مسئلہ ہمارے عہد کا مسئلہ ہے۔ بیسویں صدی کے فکشن بالخصوص جوائس اور کافکا کے یہاں سب سے بڑا کرائسس آئیڈنٹیٹی کا کرائسس ہے۔ کرداروں کے لئے سب سوالوں کا جو سوال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ میں کون ہوں جیفری ایکلنگ (۱۹۲۳ -) کہتا ہے کہ اب شاید ہی کوئی ہو جو لبرل ہیومنزم کی خوش فہمیوں کو شک و شبہ کی نظر سے نہ دیکھتا ہو، زمانہ اس فریبِ خوردگی سے آگے نکل آیا ہے۔

[redacted]•••••9

بہرحال خود انسانی تصورِ انسان کے کارتیسیائی تصور کے بارے میں تو معلوم ہو چکا کہ اس کی حیثیت ایک مفروضے کی تھی، اور کوئی دوسرا تصور جسے معروضی طور پر ثابت کیا جاسکے اب تک اس کی جگہ نہیں لے سکا۔ گویا موضوعِ انسانی آج بھی ایک کھلا ہوا سوال ہے اور اس کے جواب سے یہ بات بھی جڑی ہوئی ہے کہ انسان کی آئندہ ترقی کیا رخ اختیار کرے گی یا ادب، آرٹ اور فنونِ جن کی حیثیت انسانی روایتِ علیہ HUMANITIES کے نچلے اوں کی ہے، ان کا مستقبل کیا ہے۔ ایکلٹن تو بہرحال کہتا ہے کہ ہیومینیٹیز کا کرائسس تکرارِ بالمعنی کی مثال ہے۔ کیونکہ جہاں ہیومینیٹیز ہے وہاں کرائسس ہے، اس لئے کہ ہیومینیٹیز اور کرائسس لازم و ملزوم ہیں۔

'THE CRISIS OF THE HUMANITIES IS A GOOD INSTANCE OF TAUTOLOGY. FOR CRISIS AND THE HUMANITIES WERE BORN AT A STROKE'

اب ایک نظر مشرقی روایت پر بھی۔ مشرقی روایت میں انسان اور آدمی کے تصورات سے بہت پہلے بحث کی گئی ہے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے اور اگرچہ اس کی تفصیل کا موقع نہیں لیکن اتنی بات معلوم ہے کہ ہماری روایتوں کی نوعیت مادّی نہیں، اخلاقی اور مذہبی ہے یہ تصورِ ماورائیت پر بھی مبنی ہیں اور اسی تسلسل کا حصہ ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جس آفاقی انسانی تصور کو مغرب میں ریفارمیشن کے بعد اپنایا جاسکا ہمارے یہاں وہ تصوف اور بھگتی تحریک کے بعد اخلاقی روحانی بنیادوں پر ایک نہایت نکھری ہوئی شکل میں ملتا ہے۔ باطنیت اور وسیع المشربی پر مبنی انسانیت کا یہ کشادہ تصور اپنی سماجی جہت کے اعتبار سے کسی طرح مغربی ہیومنزم کی، انسان دوستی، سے کم نہیں تھا، لیکن مغربی تصور اور اس میں ایک اور بنیادی فرق بھی ہے۔ ڈیکارٹ اور کانٹ کے برخلاف مشرقی تصور کی بنیاد شعورِ نفسی کے اثبات پر نہیں، بلکہ شعورِ نفسی یا شعورِ انفرادی کی نفی پر ہے، یعنی مشرقی روایت کا منتہا، سپردگی اور تسلیم خودی ہے، یعنی عرفانِ ذات و یگیان، کی وہ منزل جہاں شعورِ انفرادی ایک جاری و ساری شعورِ کل میں ضم ہو کر اس کا حصہ ہو جاتا ہے، عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا، یا جہاں محدود شعورِ انفرادی لامحدود دیا اننت، کی نوید بن کر عالمِ موجودات یا کائنات کے سنگیت کا حصہ بن جاتا ہے۔ معاشرتی اعتبار سے اس کا ایک زبردست کارنامہ وہ ترفع ہے۔ جس کی بدولت فرد، نسل یا ذات یا برادری کی رسوم و قیود سے اوپر اٹھ سکتا تھا، اس منزل تک جہاں سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر ظاہرداری، منافقت اور ریاکاری سے ٹکرا جائے یا حق گوئی اور حق طلبی کی راہ میں ہر طرح کے خوف و خطر کو دل سے نکال دے۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کی تاریخ میں ایسی روایتیں بہت کم ہیں جو اس عظیم الشان انسانی روایت کے مقابلے پر پیش کی جاسکیں اس روایت نے صدیوں ہماری ثقافتی اور سماجی شیرازہ بندی بھی کی اور ہمیں انسانیت اور ایک دوسرے کے تئیں رواداری کے رشتے میں بھی پرودے رکھا۔

لیکن خود ہم نے اپنی روایت کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ ہم چاہیں تو اپنی اجتماعی شخصیت کی تمام کوتاہیوں کی ذمہ داری نوآبادیاتی اثرات پر ڈال سکتے ہیں۔ لیکن خود ہماری سائیکی میں جو کشاکش صدیوں سے چلی آرہی ہے اس کو نظرانداز کرکے ہم مطمئن تو ہوسکتے ہیں۔ حقیقت کو ہمیشہ کے لئے جھٹلا نہیں سکتے۔ ہم جن تضادات کا شکار ہیں ان کی تفصیل کا یہ موقع بھی نہیں اور نہ یہاں گنجائش ہے تاہم قطع نظر ہماری افتاد کے داخلی تضادات سے تضادات کا ایک دوسرا سلسلہ مشرق و مغرب کی کشمکش بھی ہے جو کچھ بیش و کم دو سو برسوں سے جاری ہے اور جس سے ہم نے ایک اور جگہ بحث کی ہے یعنی کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے۔ ہماری زندگی کا کوئی بھی رخ ایسا نہیں جس پر اس ڈائیلیما کی پرچھائیں نہ پڑی ہو۔ اور تو اور ہماری کوئی بڑی شخصیت ایسی نہیں جو قوتوں کی اس کشمکش کے امتزاج، انکار یا اقرار کے کسی نہ کسی مقام سے نہ ہو۔ غرض جب پورا ثقافتی اور تخلیقی عمل ہی قدروں کی آویزش و پیکار کی فضا میں انجام پا رہا ہو تو ایسے شعورِ انفرادی کے بے دخل ہونے یا نہ ہونے کی کیا حیثیت ہے۔

اردو میں مسئلے کا ایک پہلو اصطلاح کا تعلق بھی ہے۔ ہیومنزم کا متبادل اردو میں، انسان دوستی رائج ہے جو اچھا خاصا [illegible] یعنی حسنِ تعبیر ہے۔ اب ہیومنزم کے بے دخل ہونے کا ذکر آئے گا تو، انسان دوستی کے الٹ، انسان دشمنی، کی طرف ذہن جائے گا۔ اور یہ دشمنی ہی کا ایسا ہے کہ اس کے آتے ہی خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی ہے، حالانکہ اینٹی ہیومنزم کا مطلب ہے ہیومنزم کا مخالف، اختلاف ہے دشمنی کی ...

ایک فلسفیانہ موقف ہے کہ کوئی بھی مفروضہ کسی معروضی بنیاد پر قائم نہیں، وہ رد ہو گیا، اب دوسری تعریف کھوجنا ہوگی نہ یہ کہ فلسفہ انسان سے دشمنی پر اتر آیا ہے۔ اس تناظر میں اگر کوئی یہ کہہ کر پس ساختیات یا نئی تھیوری کو برا بھلا کہے کہ یہ انسان دشمنی ہے تو سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک طرح کی سادہ لوحی ہے یا مسئلے سے نظریں چرانا ہے۔ نئی تھیوری اس طرح انسان دشمن نہیں جس طرح ہم فوری طور پر تاثر قائم کر لیتے ہیں بلکہ یہ ایک فلسفیانہ موقف ہے۔ آنکھیں بند کر لینے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ مارکس ہوں یا فرائیڈ، مظہریت یا وجودیت، نیز ساختیات و پس ساختیات ہوں یا ردِ تشکیل، موضوعِ انسانی کی بے دخلیت اور انسان کے نئے تصور کی تلاش سب کا مسئلہ ہے، اور سب اس میں شریک ہیں۔ دریدا تو بہرحال بار بار کہتا ہے کہ بے دخل کرنے یا ردِ تشکیل کرنے کا مطلب کسی تصور کو تباہ کرنا یا فنا کرنا یا تہس نہس کرنا نہیں بلکہ اس کی تمام جہات کو سامنے لانا اور اس کی طرفیں کھولنا ہے۔

دریدا نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے حالیہ ایمنسٹی لیکچر میں (متن بہ عنایت عبید صدیقی بی بی سی اردو سروس لندن) واضح طور پر کہا ہے کہ ڈی کنسٹرکشن ایک برا لفظ ضرور ہے لیکن اس سے مراد موضوعِ انسانی کے تصور کو فنا کرنا یا اس کو نیست و نابود کرنا نہیں ہے۔ جب بھی کوئی تصور ردِ تشکیل کیا جاتا ہے، اس کا مطلب اس کی اصلیت کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی تمام طرفوں کو کھولنا ہے تاکہ اس کے ممکنہ تفہیمی پہلو سامنے آ سکیں۔ یہ تصور کو منسوخ کرنا یا فنا کرنا نہیں ہے بلکہ بقول دریدا فکری طور پر اس کو نکھارنا ہے۔ یعنی ردِ تشکیل دیگر معنیاتی امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتی ہے، یہ کسی بھی امکان کو منسوخ نہیں کرتی۔ موضوعِ انسانی فلسفے کا مرکزی مسئلہ ہے اور دوسرے بہت سے مسائل مثلاً ذات یا وجود یا نفسِ انسانی یا حقوقِ انسانی CIVIL RIGHTS کا مسئلہ یا خود ارادیت یا ملکی اور قومی آزادی، نیز وطنیت اور قومیت کے مسائل سب موضوعِ انسانی کے مرکزی مبحث سے جڑے ہوئے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ جن مفروضات جو بے اصل ہیں اور بغیر کسی بنیاد کے قبول کر لیے گئے ہیں، ردِ تشکیل سے وہ زائل ہو جاتے ہیں۔ فلسفیانہ جستجو کا ایک مقصود یہ بھی ہے کہ پہلے سے چلے آ رہے تصورات کو جانچا پرکھا جائے اور ان کی نئی تشکیل کی جائے۔ ردِ تشکیل اگر احتساب کرتی ہے یا سخت تنقیدی رویہ اپناتی ہے تو اس سے خائف ہونے کی نہیں بلکہ اس کو اس روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

بیسویں صدی کے نصفِ دوم کی فکرِ انسانی کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ باوجود تحفظ کی تمام تر کوششوں کے ہیومنزم کا بنیادی تصور متزلزل ہو گیا ہے، یہ کہ انسان خلاصۂ وجود ہے یا مرکزِ کائنات ہے یا اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہے، یہ وقار اور اعتبار جاتا رہا ہے۔ پچھلی نصف صدی میں فکرِ انسانی کے ارتقا کی کہانی اس دکھ بھرے اعتراف کی کہانی ہے۔ ہائیڈیگر کے فلسفے کی بنیاد ہی اس احساس کی شکست و ریخت پر ہے کہ وجودِ انسانی کوئی خاص مقام رکھتا ہے۔ ہائیڈیگر کا مشہور قول ہے کہ وجود کی خصوصیت فقط اس کے دیے ہوئے ہونے میں ہے جس پر خود اسے کوئی قدرت نہیں۔ سارتر کے NAUSEA کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ انسان کے اس باطنی سفر کا احوال ہے جہاں کوئی جائے اماں باقی نہیں ہے۔ کامیو کے یہاں بے معنویت سے نبرد آزمائی بھی اسی انسانی مرکزیت کے عدم احساس سے عبارت ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ WAITING FOR GODOT میں بیکٹ کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ ذات کے منصب خاص سے بے دخل ہونے کے بعد زندگی کی کیفیت کیا ہے۔ اس کی بے رنگی اور معنی کا خلا بھی اسی عدمِ مرکزیت کا لازمہ ہے۔ یعنی ہیومنزم کی بے دخلیت تو جدیدیت سے چلی آ رہی ہے، البتہ سوال یہ ہے کہ ایلیٹ جسے WASTELAND کہتا ہے اور میکس ویبر جسے نئی ICE AGE سے تعبیر کرتا ہے اس کے بعد کی راہ کیا ہے، یعنی ہیومنسٹ روایت کے ملبے پر کھڑا ہوا انسان کیا کر سکتا ہے۔ اس مرکزی سوال کا جواب مختلف مفکرین نے مختلف طور پر دیا ہے۔ مثلاً پہلی راہ بیشک مذہب کی ہے، کرکیگارڈ کا یہ قول اگرچہ مغرب کے لیے بے معنی ہو چکا ہے لیکن مشرق کے لیے بے معنی نہیں ہے کہ انسان کے لیے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ وہ عقیدے کی آغوش میں چلا جائے۔ دوسرا حل ٹائن بی کا ہے کہ مغرب سے منہ موڑ کر مشرق کا رخ کیا جائے۔ ٹائن بی کا کہنا ہے کہ روم نے سیاسی اعتبار سے دنیا بھر کو فتح کیا اور بالآخر کلچر کے ہاتھوں روحانی اعتبار سے اپنی شکست سے دوچار ہو گیا۔ ممکن ہے مغرب اور مشرق کا رشتہ اسی نوع کا ہو، لیکن مغرب نے مشرق کا جو استحصال کیا ہے اور جن کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، نیز جس اقتصادی پسماندگی اور

بدحالی سے مشرق دوچار ہے۔ اندیشہ یہ بھی ہے کہ جتنی تیزی سے آبادی بڑھے گی اتنی تیزی سے فاصلہ بھی بڑھے گا کم نہیں ہوگا۔ اس کے پیش نظر یہ مشورہ کہ مغرب مشرق کا رخ کرے گا بطور فیشن کے قبول کیے جانے کی اپیل تو رکھتا ہے جس کی محدود مثالیں زن بدھ ازم، ہرے کرشنا یا ستار، سرود اور طبلہ وادن کی بعض شکلوں میں مل جاتی ہیں، لیکن اس سے زیادہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تیسری راہ بھی کبھی حریت کوش تحریکوں EMANCIPATORY THEORIES یا ہابرماس یا آسٹیفنس نندی جیسے مفکرین کی کوششوں سے عبارت ہے، جو فلسفے کے نئے طور کو آزمانے کے لئے کوشاں ہیں۔ کبھی کبھی حریت کوش تھیوری میں مارکسیت یا نئی تاریخیت کے کچھ روپ ہیں یا جیسے دریدا کشادہ مارکسیت OPEN MARXISM کہتا ہے یا تحریک نسوانیت FEMINISM جس میں روشنی کی کچھ کرن باقی ہے۔ ❁

نجیب رامش

سنہری سیبوں کو پانے کا اطمینان لئے
جھکے رہو یونہی کاندھوں پہ آسمان لئے

وہ اپنے ہاتھوں میں پھولوں کا ہار اٹھائے اداس
میں دل گرفتہ سا ٹوٹی ہوئی کمان لئے

وہ سنگِ در ہی ایسا جہاں سے لوٹے ہو
نظر فسردہ، جبیں کو لہولہان لئے

پُرامن شہر میں سب اس کو خیر تھی کہ
یہاں وہ آیا تھا سینے پہ اک چٹان لئے

زمیں جو زیرِ قدم ہے، مری نہیں وہ بھی
جو لوٹ کے آئے انھوں نے یہاں مکاں لئے

نہ آئینہ جیسوں کے قرآن نہ سبز پوش سواد
کھڑا ہوں غیر مسلح ترا نشان لئے

زباں سمجھتے ہیں یہ سنگ صرف شیشے کی
میں آ گیا ہوں کہاں پھول سا بیان لئے

● ۳/۱۸، گوری شنکر نگر، بھوپال۔

جاوید ناصر

ایک غائب کردار

[والدِ محترم افتخار الزماں ناصر کے لئے]

وہ اپنے آپ کی تطہیر کرتا رہتا ہے
گناہ گار ہے، تشہیر کرتا رہتا ہے

لبوں پہ جیسے کوئی جھجک کے بات کرتا ہو
وہ گہری نیند میں تقریر کرتا رہتا ہے

کبھی وہ ڈھونڈتا رہتا ہے نیکیاں خود میں
پرانے دور کو تحریر کرتا رہتا ہے

اسے تلاش ہے شاید کسی ٹھکانے کی
وہ گھر میں بیٹھ کے تصویر کرتا رہتا ہے

بس ایک پل ہے مگر پل میں الجھنیں کتنی
اسی لیے تو وہ تاخیر کرتا رہتا ہے

کبھی ہے کل، کبھی حاضر، کبھی گذشتہ دن
ادھورے خواب کی تعبیر کرتا رہتا ہے

کبھی وہ تیر چلاتا ہے اندھی سمتوں میں
کبھی کمان کو بے تیر کرتا رہتا ہے

بہت غبار اڑاتی ہے اس کی تنہائی
ہوائے تیز کو زنجیر کرتا رہتا ہے

ہے ایسا خوف جو بے تاج حکمراں بن کر
کسی عذاب کی تکبیر کرتا رہتا ہے

اُسے یقین ہے کئی زلزلوں کی آمد کا
نئی دعاؤں کو شمشیر کرتا رہتا ہے

کئی سوال جو دشمن ہیں، اس کے ساتھی ہیں
"خدا مزاج" ہے تقدیر کرتا رہتا ہے

اذاں کو روز ابھرتا ہے مسجدِ جاں سے
شہید ہوتے ہی تعمیر کرتا رہتا ہے

وہ ایک شخص ہے، جاوید بھی ہے ناصرؔ بھی
دعا سلام "مرے پیر" کرتا رہتا ہے

● آل انڈیا ریڈیو، اورنگ آباد - (مہاراشٹر)

انیس رفیع
۴۰، توسرکار لین، کلکتہ ۷۰۰۰۱۳

درآید

عجیب کشمکش تھی جس میں وہ مبتلا تھا۔

اس کی آزردگی میں اور بھی اضافہ ہوتا جب وہ اپنے اندر جاری کشمکش کے اظہار سے خود کو معذور پاتا۔ معذور اس لئے کہ اسے یقین کی حد تک یہ خدشہ تھا کہ کشمکش کے سیاق کا حال زبان پر آتے ہی لوگ ہنسیں گے۔ خدشات نہ جانے کیوں اس کی زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔ قیاس یہ بھی تھا کہ خدشات ہی اس کے اندر ہونے والی کشمکش کے جنم داتا ہیں۔

سگریٹ پیتے پیتے باتیں کرتے کرتے وہ ٹھٹھک جاتا۔

گھورتا جاتا کسی خاص نقطے پر نظروں کو مرکوز کر کے۔ یہ سلسلہ لمبا تو نہیں مگر دراز ضرور تھا۔ وہ آپ کو خود ہی واپس لاتا تب تک کوئی اسے ٹوکتا۔

اس کے دوستوں نے کئی بار سمجھایا تھا کہ وہ اپنے موضوع سے انحراف نہ کرے۔ باہری باتوں پر غور و فکر ترک کر دے۔ ہم لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ ایک بے مثال کیچرر ہے۔ اسے چاہیئے کہ یہ پوزیشن برقرار رکھنے کے لئے اپنے گیان دھیان کو SUBJECT تک محدود رکھے۔ ان کا یہ ماننا تھا کہ بیک وقت کئی موضوعات ایک ساتھ ذہن کے مختلف خانوں میں بٹور کر رکھنے سے پیٹ کی طرح دماغ بھی چلنے لگتا ہے۔ مگر اوروں کے ماننے اور خود اس کے ماننے میں کبھی مصالحت نہیں ہو پائی۔

کل ہی کی بات ہے۔

دوستوں کی کہی ان کہی سب ایک طرف۔ یہ سوچ کر کہ جاتی ہوئی سردی اور آتی ہوئی گرمی کے درمیان کا وقفہ ہوتا ہے، بان گلے کے لئے تر و تازگی کے درمیان کا مرحلہ ہوتا ہے اس لئے فریج کے اندر کے متعلقات ایک خاص کشش کے حامل

بن جاتے ہیں۔

اس نے فریج کھولا۔

کھولتے ہی اسے جھٹکا لگا۔ برقی جھٹکا۔ جیسے فریج کی ساری باڈی میں کرنٹ دوڑ رہا ہو۔ ایک زوردار جھٹکے سے اس نے فریج کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ ہونٹوں پر کپکپی تھی۔ چہرے پر ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تھے۔ اضطرابی کیفیت میں مبتلا وہ بیوی بچوں کو ایسی ویسی سناتا رہا۔ ان کے لاکھ کہنے پر بھی نہ مانا کہ فریج میں ساری چیزیں وہی ہیں۔ حسب معمول وہی جو وہ گڑھ بازار سے لاتا ہے۔

ایسا کیا ہوا کہ فریج کھولتے ہی لرزنے لگا۔؟

وہ اندر بیٹھا ہے۔ کیسا گھسا وہ ہماری فریج میں؟ چہرے پر ابھرے ننھے قطرے بڑے ہو کر فرش پر گر رہے تھے۔

"تم تو ایسے بڑبڑانے جیسے یک بارگی سانپ دیکھ لیا ہو۔ گاؤں میں تم کیچوے دیکھ کر ڈر جاتی تھیں۔ فرق ہے کیچوے اور سانپ سے ڈرنے میں۔ وہ فریج کا ہینڈل پوری قوت سے دبائے ہوئے تھا۔

اس ڈر سے کہ جو اندر بند ہو گیا ہے کہیں باہر نکل نہ آئے

اس کی بے چینی بیوی کی چنگاری تھی۔ کیا ہوا فریج کھولتے ہی کہیں واقعی کوئی سانپ۔ مگر جیسے بائیس برس ہو گئے گاؤں چھوٹے آخری بار کرنٹ سانپ انہوں نے گاؤں میں ہی دیکھا تھا۔ کبھی گھر میں نکلا تھا۔ سائیں سائیں کی پھنکار پر آنکھ کھل گئی تو دیکھا چھت کی شہتیر سے لٹک رہا ہے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں سیاہی مائل چت کبرا کرنٹ یوں چمک رہا تھا۔ جیسے کسی نے سیدھا خنجر لٹکا دیا ہو۔ ان کی بھی آنکھ کھل تو دیکھ کر

نٹ اوپر اچھلے [illegible] سے بستر پر واپس آ رہے ہے۔ دھپ کی آواز پر سانپ نے رسی کی طرح بیتر ھا اور پھن کا رقص کرتن گیا۔ ان کے سر کے اوپر۔ ان کی ذرا سی جنبش پر پھو نچھیا یا یوں کہ اب بستر پر کو دپڑنے کا ان پر لرزہ طاری تھا حالاں کہ گاؤں کے گھروں میں سانپ نکلا ہی کرتے ہیں۔ اس لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کہتے ہیں کچی مائی میں سانپوں کا بسیرا ہوتا ہے ان دنوں گاؤں میں کچی مائی ہی ہوا کرتی تھی۔ پکی مائی کی بس اینٹ ہوا کرتی تھی۔ ماں کی بولی یہ بتاتی ہے کہ سانپ مار بے فرز ہیں۔

اس کے چہرے پر تناؤ بدستور تھا۔ فریج کے ہینڈل کو اپنی پوری طاقت سے دبائے بیوی کی طرف ایسے تاک رہا تھا جیسے ہلاکت خیز چھلانگ سے پہلے کوئی دنیا کو آخری بار دیکھ رہا ہو۔ بیوی نے تناؤ کم کرنے کی خاطر کہا

"فریج میں کوئی زندہ شے نہیں رکھی جاتی ڈارلنگ۔ یہ بھی تمہیں بتانا پڑے گا۔"

"بکواس مت کرو۔ فریج میں ہی ہے۔ میں کوئی اندھا نہیں ہوں فریج کی چابی لاؤ۔"

"مگر کس لئے۔"

"اسے لاک کردوں گا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے۔ اس کا مدفن بناؤں گا اس فریج کو۔"

اس کی ہٹ پر بیوی نے اسے چابی تھما دی۔ فریج کو لاک کرکے چابی اس نے جیب میں ڈال لی۔

اپنی دانست میں اس نے اس شے کو فریج میں دفن کر دیا تھا مگر کہیں نہ کہیں کسی راہ، کسی موڑ پر وہ اس کا تعاقب کرتی نظر آتی۔ تب اس پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی پھر سوچ کے کسی گوشے سے سوال ابھرتا۔

"فریج میں کہیں کوئی LOOPHOLE تو نہیں۔؟!"

اسے فریج کی INTEGRITY پر شبہ ہونے لگا۔ چور سوراخ کا وجود سسٹم کے حوالے سے اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی چوٹ بن گیا جب اس کی نگاہ بند فریج پر پڑتی۔ چوٹ کا احساس شدید تر ہو جاتا دھوؤں نے جیسے اسے انت جال میں گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ جال کہیں مہاجال نہ بن جائے۔ خدشات ہی خدشات۔

آج لیزر پیریڈ میں وہ سانیال کے ساتھ پاس والے کالفے میں چلا گیا تھا۔ سراسیمہ نظر بلکہ سے اس نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ وہ اچھل کر وہاں سے بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے کئی میز اور کئی کرسیاں الٹ گئیں۔ منیجر سے معذرت چاہ کر جب سانیال واپس سٹر روم میں آیا۔

تو دیکھا وہ چہرے کو دونوں ہاتھوں میں دبائے زور زور سے سانسیں لے رہا ہے۔ سانسیں نہیں تھیں جیسے ہلکی چیخیں تھیں جسے وہ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سانیال تشویشناک نگاہ سے بہت دیر تک کھڑا کھڑا ہی تاکتا رہا۔ اس نے دھیرے دھیرے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے جیب ٹٹولی۔ چابی نکالی اور غور سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہی چابی تھی۔ اس کو قدرے سکون ملا۔ سانیال اور دیگر رفقائے کار نے اسے بہت کریدا، جاننے کی کوشش کی مگر وہ مہر بہ لب تھا۔ بات ہی مضحکہ خیز تھی جواب کیا دیتا اگر بتاتا تو لوگ ٹھٹھا کر لگاتے اور بس۔ پتہ نہیں کیوں اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ کوئی اس کی اس بات کو SHARE نہیں کر سکتا یہاں تک کہ سانیال بھی جو برسوں سے اس کا ہم جلیس وہی خواہ تھا۔ اور یہ بھی کہ اسی کے شعبے میں پلاننگ اور پبلک فائنانس پڑھا رہا تھا۔ علم معاشیات کے بے حد اہم اور جدید موضوع ہیں یہ۔ سانیال کو بھی اس سے بڑی عقیدت تھی کہ وہ معاشیات کے پیچیدہ اور خشک چیپٹرز کو بھی سہل بنا دیتا۔ وہ حوالوں سے کم حقائق سے زیادہ استفادہ کرتا اور یہی وجہ تھی کہ طلبہ میں معروف و مقبول تھا۔ اس کے پڑھائے ہوئے اسباق LIQUIT کی طرح دماغ کے سانچے میں اتر جاتے۔

مس کھالکو بھی اس کی اس کیفیت پر حیران تھی۔ کھالکو اس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس کے ہاتھوں کھالکو کی GROOMING ہوئی تھی۔ DELHI SCHOOL OF ECONOMICS میں وہ اسی کی بدولت داخل ہوئی تھی۔

وہاں سے فارغ ہوئی تو اس نے اپنے شعبے میں ہی اسے ٹیچر رکھ لیا۔

آدی باسی ساخت کی مس کھالکو نے دلی اسکول آف اکنامکس کے اثرات قبول تو کئے تھے۔ مگر قبائلی سیرت اس کے اندر اب بھی زندہ تھی۔ اس کی پریشانی اسے بھی ایک انجانے کرب میں مبتلا کئے ہوئے تھی۔ ایک دن پوچھ ہی لیا۔

"سر آپ اتنے WORRIED کیوں ہیں۔ اچانک کیا ہوا آپ کو۔"

"یہی سوال پلٹ کر تم سے کروں گا کہ تم WORRIED کیوں نہیں ہو تو؟"

"ہوں مگر آپ کی الجھن دیکھ کر ۔"

"تمہاری اپنی کوئی الجھن نہیں ۔ میری الجھن تمہاری پریشانی کا باعث ہے گویا میں تمہارا موضوع ہوں ۔"

"اگر آپ مان لیں تو یہی سچ ہے ۔"

"تمہارا موضوع، تمہارا سچ اتنا چھوٹا ۔ تم کسی کے جنگل سے باہر آگئی ہو ۔"

"نہیں سر ۔ جنگل سے باہر نہیں ہوں ۔ اور اب جہاں جنگل نہیں ہے وہاں جنگل بنانے جا رہی ہوں سر ۔"

"ہاں میرے اندر بھی ایک جنگل بن رہا ہے ۔ ایک ایسا جنگل جس کے پیڑ گرتے نہیں ۔ شاخیں ہلتی نہیں، پتے ہوا نہیں دیتے ۔"

"یہ جنگل نہیں ہے سر یہ بیماری ہے ۔ آپ کا واہمہ ہے ۔"

"واہمہ! کمالکو ہم لوگ معاشیات پڑھاتے ہیں یہ نہ بھولو ۔"

"سر میں، آپ کی اس پریشانی کی وجہ جاننا چاہتی ہوں ۔"

"میں نہیں بتا سکتا ۔ ہنسو گی سن کر ۔ میرے لئے وہ عذاب ہے، میں، میں ...... بولتے بولتے سیریس ہو گیا ۔ چپکے سے جیب ٹٹولی چابی جیب میں تھی ۔"

پھر وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا ۔ کمالکو اس کی اس ہیجانی کیفیت کو نئے پہلو سے INTERPRET کر رہی تھی ۔ کبھی دونوں اکیلے ہوتے تو کامیاب اور ناکامیاب ازدواجی زندگی کی بحث چھڑتی ۔ اس بحث میں کچھ دور چل کر اٹک جاتی ۔ اور وہ بحث کے آخری سرے پر پہونچ کر تھم جاتا اور انتظار کرتا ۔ وہ نہیں آتی ۔ اس کے سارے دلائل اور بحث کسی گہری کھائی پر تنکوں سے پل بنانے کے مترادف تھے ۔ کہیں کوئی گہری چوٹ ضرور چھپی تھی ۔ وہ اپنے محسن کے اس بجانے دکھ کا مداوا نہیں ۔

"تھرڈ پیریڈ کے بعد میرا آف ہے ۔ آج میرے ساتھ گھر چلئے ۔"

"کیوں لے جانا چاہتی ہو گھر ۔ ؟"

"کوئی بات یا کوئی شے ستا رہی ہے ۔ آپ کو اسی سے فرار چاہیئے اس طرح آپ کو WORRIED دیکھ کر میں بہت پریشان ہوں ۔ اور کالج میں COLLEGUES کے دلوں میں آپ کی اس کیفیت کے بارے میں سوال ہی سوال ہیں ۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ۔"

"تو کیا تمہارے پاس کوئی جواب ہے ؟"

"جو سوال آپ کے بھیتر برسوں سے پک رہا ہے اس کا جواب تھا اور ہے میرے پاس ۔" وہ اس کے قریب کھسک آئی ۔

"مگر سوال تو تمہیں کرنا ہے ۔"

"جس سوال کا جواب ہو تو وہ سوال کرنا نہیں چاہیئے ۔ کلاس دے کر آتی ہوں ۔ جائیے گا نہیں ۔"

وہ دونوں بہت دیر تک گم سم بیٹھے ایک دوسری کی سخافتوں کو محسوس کرتے رہے ۔ مگر اس کی بے چینی بدستور تھی ۔ اس نے کپڑے بدل لئے تھے ۔ نائٹ گاؤن پہن کر وہ دوسری ہی لگ رہی تھی ۔

"کوئی ڈرنک بناؤں آپ کے لئے ۔ ؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا ۔

"گھبرائے ہوئے رہنے کی یہ عادت، یہ بے چینی آپ میرے حوالے نہیں کر سکتے سر ۔"

"میری بے چینی وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو ۔"

"بے چینی سمجھتی نہیں، محسوس کرتی ہوں ۔ ناسمجھی کا الزام نہ لگائیں سر ۔ بہت چھوٹی لگنے لگتی ہوں ۔"

"تم جذباتی ہو رہی ہو ۔"

★ "جذباتی ہونا کوئی بری بات نہیں ۔ جذبہ آدمی کا سب سے بڑا CAPITAL ہے ۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم ۔ میں بھی یہی مانتا آیا ہوں مگر CAPITAL کا قائم رہنا، اس کا بڑھنا تب ہی ممکن ہے ۔ جب وہ صحیح جگہ INVEST ہو ۔"

"میرے نزدیک آپ سے بہتر کوئی PROJECT نہیں ۔ میرے جذبات کی صداقت اسی PROJECT سے وابستہ ہے ۔"

"میرا یہ اضطراب کسی جذبے کی صداقت کی جانچ نہیں چاہتا مجھے خوف لگتا ہے ۔ یوں سمجھو کر سورج اپنی حدت کی انتہاؤں پر پگھل رہا ہے ۔ سارا عالم پگھل رہا ہے ۔ وہ پگھلتا ہوا سورج تمہارے کان میں انڈیل دوں تو، کیا تم زندہ رہ پاؤگی ۔ ؟"

"انڈیل کر تو دیکھئے ۔" کمالکو نے گرفت مزید تنگ کر دی ۔ وہ اس کے آغوش میں یوں لگ رہا تھا جیسے کنگارو کا بچہ ۔ ماں کے پیٹ سے چپٹا ہر بلا سے محفوظ ۔ بلائیں گھیرتیں تو اسے اتنا ڈر نہیں لگتا جتنا کہ ......

کمالکو نے گاؤن کے بند کھولے انداز سے کہ چہرے سے

چھاتیوں کے بیچ دبا کر بولی۔
"جذبے کی صداقت آواز بن کر اٹھ رہی ہے کلیجے سے ہیں
سہمے ہیں سر۔"
کیا اب بھی آپ اپنی بے چینی کی وجہ مجھ سے چھپائیں گے۔؟
اس نے آنکھیں وا کیں۔ کھا لکو کا عریاں جسم۔ دراز زلف پیشانی آنکھیں، پستان، ناف، ساری ازلی صداقتیں بے پردہ سامنے تھیں اس کا اضطراب آنکھوں سے ہونٹوں پر اتر آیا، وہ گویا ہوا۔
"میری بے چینی تمہیں راکھ کر دے گی۔ ضد کرتی ہو تو سنو وہ میرے فریج میں آکر بیٹھ گیا ہے۔ ہمارے پاس جتنی ٹھنڈک ہے وہ اسے پی لینا چاہتا ہے۔ وہ ٹھنڈک پی لے گا تو ہمارے پاس کیا بچے گا۔ انگاروں کے سوا چاروں گرمی، صرف گرمی، پگھلانے والی گرمی۔ میں ان انگاروں کو اپنے اندر سرخ رنگ ہوتا محسوس کر رہا ہوں۔ میں جل رہا ہوں۔ جوالا مکھی میں داخل ہونا کا جل کر بھسم ہو جاؤ گی میں اس تپش سے تم کو، سب کو محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں، اتنا کہتے کہتے وہ تڑپ کر بیڈ سے نیچے کود گیا۔ وہ بے حد مضطرب، پریشان اور خوف زدہ دکھائی پڑ رہا تھا۔ کھا لکو بے چین، ہراساں اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ پھر وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ بڑے چاؤ سے اس کی طرف بڑھی اور اپنی انگلیاں اس کے بالوں پر پھیرنے لگی یوں کہ HEALING TOUCH دے رہی ہو۔
کھا لکو اور اس کے تمام COLLEAGUES ششدر رہ گئے جب اس نے کالج کے پرنسپل کے ذریعہ ضلع مجسٹریٹ کو یہ درخواست گزاری کہ وہ خود کو خطرے میں گھرا محسوس کر رہا ہے۔ کسی لمحے کسی جارحیت کا شکار ہو سکتا ہے لہٰذا اسے پستول کے لئے لائیسنس دیا جائے۔ ادھر طلبہ نے پرنسپل کو بتایا کہ کلاس میں لکچر دیتے وقت انہوں نے ہدایت دی کہ ہم سب اپنی اپنی بنچ کے نیچے دیکھیں، کہیں وہ آکر چھپ نہ گیا ہو۔ جب ہم لوگوں نے دھیان نہیں دیا تو خود ہی جھک جھک کر دیکھا۔ پھر بولے دراصل جو کچھ میں تمہیں کلاس میں پڑھاتا ہوں۔ ہم سب کی آنکھوں سے اوجھل ایک شے اس کی نفی کرتی ہے۔ اسے یہ پسند نہیں کہ تمہارے ذہنوں میں جو شبہات ہیں، آپ سے جو سارے سوالات ہیں۔ وہ مٹ جائیں۔ THANK GOD کہ اسے میں نے فریج میں لاک کر دیا ہے۔ مگر پڑھا ہوا، سالا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ کب نکل بھاگیں۔ لہٰذا میں نے پستول کے لئے درخواست بھی دے دی ہے۔
ایک دن فرسٹ ایر کلاس میں جب وہ پالیٹکل اکانومی اینڈ کیا ذس پر تھارنی لکچر دے رہا تھا۔ اسے کلاس کے آخری بنچ سے پرے ایک ہیولیٰ نظر آیا۔ وہ چیخا خبردار۔ لکچر ڈسٹرب نہ کرنا نکل جاؤ کلاس سے۔ نکلو، دفع ہو جاؤ۔ مگر وہ ہیولیٰ جوں کا توں رہا۔ تو وہ RISER سے کود کر اس کی طرف لپکا۔ ہیولیٰ دروازے کی طرف بھاگا۔ اس نے پستول نکال لی۔ کلاس کے لڑکے سب CONFUSED تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔
وہ بھی دروازے سے باہر بھاگے۔ چند لڑکے اس کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ ہیولیٰ ٹائیلٹ میں داخل ہو گیا۔ کھولو دروازہ، کھولو دروازہ آج تم بچ نہیں سکتے۔ زور زور سے دروازے پر لات ماری اور دروازہ کھل گیا۔ گرجدار آواز ابھری "YOU BLOODY RASCAL" پھر پے در پے پستول کے کئی شاٹ کی آواز گونجی۔ جب لڑکے دوڑ کر TOILET کے پاس پہونچے تو دیکھا کہ واش بیسن کے اوپر لگا آئینہ چور چور تھا۔ وہ زمین پر گرا بے ہوش تھا۔ ایک بازو اور کنپٹی سے خون رس رہا تھا۔ آئینے پر پڑی دو ایک گولیاں چھٹک کر اسے لگی تھیں۔ پھر اسے ایمبولنس بلا کر ایمرجنسی وارڈ کے لئے روانہ کر دیا گیا۔
چند روز بعد وہ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر گیا۔ تو کھا لکو پرنسپل اور کئی ایک ساتھی مزاج پرسی کے لئے اس کے گھر گئے وہ اب بھی گھبرایا گھبرایا سا تھا۔ پرنسپل صاحب کو اس نے بتایا کہ اسی دن اس سے چوک ہو گئی۔ آئینے میں وہ نہیں میں خود تھا اور میں نے اپنے آپ پر ہی گولی چلا دی۔ وہ کمبخت تو میرے فریج میں بند ہے۔ اس نے ان تمام صاحبان کو تاکید کی کہ وہ پھر بھی چوکنا رہیں گو کہ فریج لاک ہے مگر اس کے پاس قوت غیبی ہے۔
بیوی نے بتایا کہ ان کی ساری بے چینی کی جڑ فریج میں رکھی ہوئی چیزیں ہیں۔ ان لوگوں نے جاننا چاہا کہ کون سی ایسی چیز ہے جس نے ان کے دل و دماغ کو اس طرح متاثر کیا ہے۔ بیوی نے بتایا کہ فریج میں ایسی کوئی چیز میری نظر میں نہیں ہے۔ عام طور پر جو چیزیں ہوتی ہیں وہی ہیں۔
پھر ان لوگوں نے اصرار کیا کہ وہ فریج کھول کے دیکھا جائے اس شے کو جس نے اس درجہ ہراساں کر رکھا ہے۔ وہ پہلے تو ٹال مٹول

[باقی صفحہ [illegible] پر دیکھئے]

[redacted]0000K

قاضی فراز احمد

غزل کا رنگ الگ ہے، اثر کا رنگ الگ
تصورات کی ڈوری الگ، پتنگ الگ

نہ ایک جیسا ہے زخمہ، نہ ایک سا نغمہ
صدا لئے درد الگ ہے، رباب و چنگ الگ

پرائی آگ میں اکثر وہ کود جاتا ہے
[illegible] آدمی کا ہے ہر آدمی سے ڈھنگ الگ

ہیں ایک ذات میں کتنی صفات پوشیدہ
ہے شاخ ایک مگر برگ برگ رنگ الگ

خیال و خواب سے لڑتے تو آتے ہیں لیکن
ہم اپنے آپ سے لڑتے ہیں اپنی جنگ الگ

کوئی خطا تھی، تکلف تھا، خوف تھا، کیا تھا
نہ بیٹھ پائے کبھی وہ ہمارے سنگ الگ

نہ خانقاہ، نہ کمبل، نہ کاسہ و بستر
ہمارے دور میں پیدا ہوئے ملنگ الگ

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۲۲۱ ۔ دوحہ (اسٹیٹ آف قطر)

انعام شرر

مرے مزاج پہ ہر روز اتنے سنگ لگے
کہ سبزہ زار بھی دیکھوں تو خون رنگ لگے

ہیں سرحدوں کے کرشمے کہ بھائی کو بھائی
نوید امن بھی دے تو پیام جنگ لگے

کسی کو اتنا قد آور کرے خدا نہ کبھی
زمیں سے فاصلہ جس کو فلک کا تنگ لگے

ہمارے سر کی تو چھوڑو یہ جھک بھی جائے کبھی
مگر وہ شخص جو صورت سے اک ملنگ لگے

خرام ناز ہے اس کا مثال رقص شرر
چلے تو آگ میں ڈوبا سا انگ انگ لگے

۱۰۲۳، چار دروازہ، گنگا پول روڈ۔ جے پور ۳۰۲۰۰۳

احسن عزیز

ہزاروں ذات رہی ایک ذات کے اندر
میں کائنات تھا خود کائنات کے اندر

نہ ربط تھا، نہ تسلسل نہ کوئی معنی تھے
کہ روز و شب تھے عجب واقعات کے اندر

ہر ایک شخص ملا اپنی داستاں لے کر
کہانیاں تھیں بہت بات بات کے اندر

نزاکتیں تھیں، بڑے پیچ تھے، بہت اسرار
دل و نگاہ کے ان معاملات کے اندر

غضب تھی چاندنی، بیتاب کر گئی کچھ اور
خلش اترتی تھی جیسے رات کے اندر

اٹھائے اپنی صلیبوں کو ہر کوئی عیساں
پناہ کس کو ملے کس نجات کے اندر

تمام زیست کا بے پایاں دکھ لئے احسن
وہ ایک غم جو رہا ہر نشاط کے اندر

[illegible] MIN—AER CLOSE,
TEMPLESTOWE. VICTORIA
[illegible]06 AUSTRALIA

فیروز عابد

۱۔ اے۔ ۳۔ ۱۲۔ ۲ اربن گان ۔ کلکتہ ۔ ۹

لکّا چوری



پستی اور بلندی کا فرق واضح کرنے کے لئے اس نے بلیک بورڈ پر پہاڑ اور زمین آکاش اور پاتال کے نقشے بنائے ۔ اپنی آواز کے زیروبم اور خطابت کے زور سے یہ بات منوانے کی کوشش کی کہ بلند بلند ہوتا ہے اور پست پست ! پست خون دھوکا دے گا، ڈنک مارے گا، اپنی سرشت سے باز نہیں آئے گا اور اپنی خو نہیں بدلے گا ۔ اور جو بلند ہے وہ پستی کی طرف کبھی نہ جائے گا اور اگر کہیں اس کے قدم ڈگمگائے تو بھی خاندانی وجاہت خاندانی شرافت تہذیب، رواداری اور خون کی اصلیت اسے بلندی کی طرف لے جائے گی۔

اس کی بات سن کر میں ہنسا ۔ میری ہنسی سے وہ بھی ہنسا اور پھر سب ہنسنے لگے ۔

اچانک میرے پوتے نے پوچھا ۔ آپ کیوں ہنس رہے ہیں ۔ یہ لوگ کیوں ہنس رہے ہیں ۔

تب ہی اس نے مجھے ، میں نے اسے اور سبھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ۔ پوتے کے اس سوال کا کیا جواب ہوگا ۔؟

پوتے نے میری شرٹ کو جھٹکا دے کر اشارے میں پھر پوچھا کیوں ، کیا ہوا ؟

اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے سبھوں کی طرف دیکھتے ہوئے میرے پوتے سے کہا ۔ " جاؤ میاں اونچ نیچ ، لکّا چوری کھیلو اور دل کھول کر ہنسو ! "

" اس کی بات پر مجھے بہت زوروں کا غصہ آیا اور میں نے اس سے کہا ۔ کیا غلط سلط بات بچے کو سکھا رہے ہو ۔ اونچ نیچ اور لکّا چوری یہ کھیل ہی تو دراصل عملی زندگی کے لئے ایک بددعا ہے ۔ اخلاقی گراوٹ اور تہذیبی شکست و ریخت کی پہلی اینٹ ۔ "

وہ بہت زور سے ہنسا ۔ تم بچوں کے کھیلوں کی بھی درجہ بندی کر رہے ہو ۔ "

بچپن میں تو بچے اسی قسم کا کھیل کھیلتے ہیں ۔ !

صحیح کہا تم نے ۔ ہم نے بھی اپنے بچپن میں اونچ نیچ اور لکّا چوری کا کھیل کھیلا تھا اور اسی تجربے کی روشنی میں کہہ رہا ہوں کہ بچوں کو ان کھیلوں سے روکنے کی ضرورت ہے ۔

تمہارا بچپن کیا تھا اور تم نے کس انداز سے لکّا چوری کا کھیل کھیلا تھا یہ میں نہیں جانتا لیکن یہ سچ ہے کہ لکّا چوری اور اونچ نیچ کے بچپن کے اس کھیل کی روشنی میں جب آج کے ماحول پر نظر ڈالتا ہوں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خیر چھوڑو یار کوئی اور بات کرو ۔ سیمینار میں جا رہے ہو؟

" کون سا سیمینار ؟ " میں نے کہا ۔

دنگ چار مہینوں سے دعوت آئی ہے کیا ؟ اس طرح کون کا سوالیہ نشان لگا رہے ہو ۔ ارے وہی اسکولوں میں تعلیم کے مسائل پر ۔ " اس نے ہنستے ہوئے کہا

" ہاں جاؤں گا تو ضرور ، مجھے بھی کچھ سوالات کرنے ہیں نگراں حضرات کی لاپرواہی ، معاشرے کا بے ڈھنگا پن اور وسائل کی کمی " میں نے کہا ۔

ابھی میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ پھر ہنسنے لگا " جاؤ بھائی ضرور جاؤ ، بولو ، سنو ، چائے پیو اور دعوت اڑاؤ ۔ "

وسائل کی کمی کا رونا رو گے ۔ تعلیمی پس ماندگی کو معاشرتی نظام کے بے ڈھنگے پن اور نگراں حضرات کے ان پڑھ ہونے سے ہم رشتہ کرو گے واہ رے لیکچر ۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا درد کا ایک سایہ اس کے چہرے پر آ کر ٹھہر گیا تھا ۔ بہت دیر تک خاموش رہا ۔

"کیوں کیا ہوا کچھ اور بولو۔"

"کیا کہوں۔"

اور تم کہو گے بھی کیا۔ صرف نصیحت۔ یا پھر جھول۔ تم سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ گزشتہ سال۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے دیکھا میری بیٹی زار وقطار رو رہی تھی۔ وہ کامیاب ہوئی تھی مگر میں اسے اس کی ناکامیابی سمجھ رہا تھا۔ اس کے اہم اور بلند پوزیشن کے لئے میں کچھ نہ کر سکا

وہ مسکرایا۔ مسکراتا ہی رہا۔

"مذاق اڑا رہے ہو؟!"

"نہیں۔! مذاق بن رہا ہوں۔ ماحول کا رونا رو کر کیا ہوگا۔ میں ایسے لوگوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتا۔ میں گھٹا کر بڑھانے اور احسان جتانے کا قائل نہیں۔ کوئی بات نہیں پھر کوشش کرو گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں۔ میں نے اپنے بیٹے سے کہا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا۔۔۔" اس نے بہت سکون سے جواب دیا۔

صحیح کہا تم نے۔ تم اپنے بیٹے کے لئے کچھ نہ کر سکے۔ میری بیٹی کے لئے کیا کرتے۔ ایک بڑی برادری تم سے خفا ہے۔ تم کسی کے لئے کوئی کام نہیں کرتے۔"

"کوئی کام نہیں کرتا ایسا نہ کہو۔ ناپسندیدہ کھیل نہیں کھیلتا بچپن میں لکا چوری، اور پچ بچ کا کھیل بہت کھیلا ہے میں نے۔ ڈریل کرتے ہوئے، حساب حل کرتے ہوئے۔"

اس کی باتیں مجھے عجیب لگیں۔

"یار تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تم کھیل کود کو ڈریل سے ملاتے ہو ٹھیک ہے، حساب سے اس کا کیا تعلق۔ خیر چھوڑو۔ سیمینار کے موضوع پر کچھ پوائنٹس بتا دو۔ کچھ تو سوال کرنے ہیں نا یار۔ چبھتے ہوئے سوال۔ اور ایسے سوال تم ہی تیار کر سکتے ہو۔ ہم تقریر کے قابل نہیں۔ ہاں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لئے ہم نے سوال بہت کئے ہیں۔ دیکھو آج بھی مختلف امتحانات کے لئے جس قسم کے سوال میں تیار کرتا ہوں اور کوئی نہیں۔ اچھے اچھے استاد بھی کچھ دیر کے لئے اپنے سر کے بالوں کو جھٹکا دیتے ہیں۔ آج اسی کی ضرورت ہے چلو ذرا جلدی سے شروع ہو جاؤ۔"

اس نے میری طرف دیکھا اور کہا "صوبائی، قومی اور عالمی سطح پر سوال لکھ دوں یا صرف صوبائی سطح پر یا پھر صرف اردو۔۔۔"

"یار تم ذرا [illegible] سوال کرو۔ سب VER [illegible] کرتے ہوئے

اور اردو کی بات یہاں کہاں سے آگئی۔"

"تم تو اردو کے آدمی ہو نا۔ بات تو اردو کی ہی ہونی چاہئے اس لئے کہ اردو کے سلسلے میں لکا چوری کا کھیل آج کل بہت ہو رہا ہے وہ لکا چوری نہیں جو ہم نے اپنے بچپن میں اپنے استادوں سے سیکھی تھی۔ بلکہ وہ لکا چوری جو آج کے ان گنت استادوں نے شاید اپنی برادری کے کچھ لوگوں سے سیکھا ہے۔ آج جو جدید قسم کی لکا چوری چل رہی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے میرے پاس دماغ نہیں" اس کی آواز میں اس صدی کا نہیں بلکہ آج کا تازہ تازہ کرب تھا۔

"خیر چھوڑو ان سب باتوں کو، تم سوالات تیار کرو گے نا۔" میں نے اس سے التجا کی۔

"ضرور کروں گا۔ بس زندگی بھر سوالات ہی تو تیار کئے ہیں ہم جیسوں نے۔ ہمارے جواب بہتوں کو پسند نہیں آتے۔ اس لئے کہ لفظوں نے نئے معنی تلاش کر لئے ہیں اور بالکل صحیح مفاہیم کے بیان کرنے سے ان گنت لوگوں کے چہروں پر تناؤ آجاتا ہے۔ آج زندگی کا مفہوم بس جینا ہے، تلاش نہیں ہے۔"

عجیب حال ہے یار تمہارا۔ تلاش کے لئے ہی تو یہ سب سیمینار ہوتے ہیں۔ بحثیں ہوتی ہیں۔ ایک قدم اور کس طرح بڑھایا جائے اس کے لئے سب سر جوڑ کر سوچتے ہیں۔ اور تم اسے بے معنی بتا رہے ہو۔ اور لفظوں کی بازی گری کے ذریعہ۔۔۔۔۔ "ابھی میں پوری بات مکمل بھی نہ کر سکا تھا کہ وہ ابل پڑا۔

"میں تم سے الجھنا نہیں چاہتا اور الجھ کر ہوگا بھی کیا کہ آج ہمارے قدم اتنی دور چاند ستاروں پر پہنچ گئے ہیں کہ ہر چیز لوگوں کو آسان نظر آ رہی ہے۔ بحث و مباحثہ اور سیمینار بھی آسانیوں کی طرف بڑھتے ہوئے قدم ہیں۔ مگر تم ذرا اپنے اندر، اپنی طرح کے دو چار دوستوں کے اندر جھانک کر دیکھو کہ آسانیوں کی اس بھیڑ میں شک و شبہات کی ایک عجیب و غریب دنیا آباد ہو گئی ہے کہ ہر کوئی ایک دوسرے کو دنیا نگاہوں سے تاک رہا ہے۔" اس نے یہ ساری باتیں گلوب کو گھماتے ہوئے کہیں۔

"ارے یار۔"

"نہیں اور کچھ بھی نہیں۔ میں اب خاموش ہو جاؤ۔ سیمینار کے پوائنٹس لکھ دوں گا۔ تم مطمئن رہو۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اپنے بچپنے آنکھ مچولی اور لکا چوری کھیلنے دو۔ اب میری آنکھوں سے آنسو نہیں

نکلے کہ بات اب نصابوں کی بے روحی کی نہیں بلکہ . . . . . .

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں بہت آنسو تھے ۔ سچ ہے میں بھی نہیں بھول سکا اپنے پرائمری کے اساتذہ کو جو بحث کرنے کو برا سمجھتے تھے الفاظ کو کسی طرح بھی ضائع نہیں کرتے تھے ۔ بلکہ طلبہ کی نفسیات کا مطالعہ ان کی کاپیوں، تختیوں اور بستوں سے کرتے تھے اور پھر نہ نصابوں کی بے روحی کی بات آتی تھی اور نہ معاشرتی نظام کے بے ڈھنگے پن کی۔ پڑھانے والا پڑھاتا تھا اور پڑھنے والا ٹھیک پڑھ لیتا تھا ۔ آج پھر میں شکست کھا گیا تھا ۔ پانچ سال کی عمر سے بائیس سال کی عمر تک کا وہ رشتہ جو میرے اساتذہ سے میرا تھا ۔ نیم کی چھاؤں سے بھی زیادہ ٹھنڈا اور صحت آگیں ۔ آج وہی سب کچھ ۔ برف کی طرح جس کی کوئی پہچان نہیں ۔ ٹھوس ، گیس یا رقیق ، ! „

وہ پوتنش تک رہا تھا ۔ اس کے چہرے پر درد کا دبیز سایہ تھا

„اب اس کی ضرورت نہیں ۔ بہت لکا چوری کھیل لیا میں نے ۔ چلو ماضی کو یاد کریں ۔ آج تم سے دل کھول کر باتیں کریں ۔ „ میں نے کہا ۔

وہ مسکرایا اور اس کے چہرے سے درد کے سائے اترنے لگے اتنے میں میرا پوتا آگیا ۔

„ دادا وِدّیا ساگر کے معنی „ علم کا سمندر ، ہے نا ۔ وِدّیا ساگر کے بارے میں کچھ بتائیے ۔ ان پر ایک مضمون لکھنا ہے ۔ „

وہ مسکرایا اور مجھ سے مخاطب ہوا ۔ تمہارا پوتا درجہ دوم کا طالب علم ہے ۔ وہ وِدّیا ساگر کے معنی جانتا ہے ۔ میں حال سے مایوس نہیں لیکن اس سے مطمئن بھی نہیں ۔ اس لئے کہ ماضی کی شرارت میں تلاش تھی اور حال کی سنجیدگی میں اپنی عمر سے زیادہ کا بوجھ ۔ سوچ ، کتاب اور سنجیدگی کا بوجھ ۔ قابلیت ۔ معصوم دل اور دماغ ۔ ماں باپ کی بہت بلند اڑان ۔ ذرا ایک چکر لگاؤ اپنے علاقے کا اور پھر بتاؤ ۔ ایسے بچوں نے بڑے ہو کر کیا کارنامہ انجام دیا ۔ مت تباہ کرو ان کے ذہنوں کو ۔

اس کی آنکھوں میں بے انتہا آنسو تھے ۔

„ تم رو رہے ہو ۔ „

„ نہیں ۔ بلکہ اپنی کمزوری اور اپنے جیسوں کی بے حسی کے ساتھ لکا چوری کھیل رہا ہوں ۔ „ وہ مسکرایا اور پھر گم سم ہو گیا ۔

بقیہ صفحہ ۱۹ دہ آید

کی ۔ کیا آپ سب اس کی موجودگی کو سمجھ نہیں پائیں گے ۔ شاید یہ دیکھ کر ہنس سکے مگر اس بار سارے لوگ مصر تھے ۔ بیوی نے بہت زور ڈلوایا پرنسپل صاحب سے ۔ کسی طرح وہ راضی ہوا ۔ پھر اس نے بیوی کو چابی دی اور خود سرہانے سے پستول نکالی ۔ فریج کی طرف بڑھنے لگا ۔ بیوی کو ہدایت دی کہ وہ فریج کی دوسرے سائڈ سے کھولے ۔ بیوی نے ایسا ہی کیا ۔ فریج کی سیدھ میں وہ پستول تانے کھڑا تھا ۔ بقیہ لوگ اس کے پیچھے کھڑے دلچسپی سے فریج کے کھلنے کا انتظار کر رہے تھے ۔ جیسے ہی بیوی نے فریج کا دروازہ کھولا وہ چیخا „ خبردار باہر مت آنا ، ورنہ گولی مار دوں گا ۔ „ پھر وہ کھڑے لوگوں سے مخاطب ہوا ۔

„ دیکھا آپ نے پھر لوٹ کر آگئی ہے وہ بوتل ۔ کیسے بیٹھی کنڈلی مار کر ہمارے آب و دانہ پر ۔ „ بیوی نے بھی حیرت سے دیکھا ۔

ارے یہ تو وہی پرانی بوتل ہے ۔ جانے کب چپکے سے در آئی فریج میں ۔ ہم نے تو کب کا بھلا دیا تھا اس سرد ذائقے کو ۔

پھر یہ ؟

اس نے ایک چوکس سراغ رساں کی طرح جست لگائی اور کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف پلٹا ۔ ان کی طرف نشانہ باندھ کر چیخا ۔ „ کہو تم میں سے کس کی شرارت ہے ۔ ؟

سارے کے سارے اس اچانک ٹرن پر گھبرا گئے

ایک زبان ہو کر بولے

„ یہ ہماری نہیں کسی بچے کی شرارت ہے ۔ !

حامد اقبال صدیقی

ضروری تو نہیں تو تیر لکھ دے
یرے خوابوں کی بس تعبیر لکھ دے

یہ مانا لفظ گونگے ہو گئے ہیں
نگاہوں سے مری تفسیر لکھ دے

بلوں تو کھول دے راہیں فلک تک
ریں جب پاؤں تو زنجیر لکھ دے

بس اپنے حق میں کیا مانگوں خدایا
نصیروں کے لئے تنویر لکھ دے

یاں اپنے ہنر کی بات کیجے
زل حامد تجھے یا میر لکھ دے

تو ظاہر ہے مری سب عادتوں سے
ابھر احساس کی زیریں تہوں سے

ہوا گھر خواب چکنا چور شاید
یہاں ملبہ پڑا ہے مدتوں سے

موذن کی صدا کا رابطہ ہے
ترے سورج سے میرے جگنوؤں سے

سفر مشکل مگر ماں کی دعائیں
خدا محفوظ رکھے حادثوں سے

اداسی گونجتی رہتی ہے مجھ میں
مری اچھی نبھے گی وحشتوں سے

کبھی ہم بے تحاشہ دوڑتے تھے
مگر اب انسیت ہے راستوں سے

عالم خورشید

تمام کوششیں ہم کو تباہ کرنے کی
تو کیا سبیل ہو اب وہ ہم دراہ کرنے کی

شکم کی آگ بجھانے میں ہم پریشاں ہیں
یہیں یہاں ہے سعادت گناہ کرنے کی

سجا رہا ہے مرے گھر کو وہ چراغوں سے
کہ سازشیں ہیں مجھے بے پناہ کرنے کی

تمام شہر میں بے داغ اک مرا دامن
سبھوں کو ضد ہے اسے بھی سیاہ کرنے کی

میں ایک راہگزر اپنے گاؤں تک سمجھو
مہم چلی ہے مجھے شاہراہ کرنے کی

خدا بچائے دنیا کے چراغ کو عالم
ہوا چلی ہے یہاں اشتباہ کرنے کی

● معرفت : ڈی۔ ایم۔ بلیاوی، ایگزیکیٹیو ...

● ۲۲۸ - ۲۳۰، دینا ناتھ بلڈنگ، ـــــ، تیسرا منزلہ، روم ۱۲، پی۔ بی مارگ، ممبئی ـ ۲

اسرار گاندھی

۵ بی گاپہ باری کالونی الہ آباد - ۳

وہ جو راستے میں کھو گئی



جلوس شاید قدرے قریب آگیا تھا کہ جھنجے کی دھم دھم آواز کانوں تک پہونچنے لگی تھی۔

جلوس جس کی خبر تھوڑی دیر پہلے کسی نے گھر میں دی تھی ،، او لوگ کلبیا کا ایک دم ننگا کیے ، کے گاؤں میں گھما رہے ہیں۔

کلبیا ــــ میری آنکھوں میں ایک تصویر ابھر آئی۔

گٹھیلے جسم کی جنسی کشش والی ایک عورت، آنکھوں میں آگ اور ہونٹوں پر دعوت دینے والی مسکراہٹ، ابھرا ابھرا جسم اور اوبھیجان پیدا کر دینے والی چھاتیاں لیے ایسے قوم کی فرد کی طرح جس کی پیدائشی مجبوری اور اس مجبوری میں نافرمانی چھوڑ کر سب کچھ شامل تھا

اس نے برسوں پہلے کلبیا کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنی نئی بیاہتا بہن کو دیکھنے پہلی بار گاؤں آیا تھا۔ وہ گھر کے آنگن میں چھسکر مار کر کچھ اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کی گہری سانولی سڈول ٹانگیں دور تک کھلی رہ گئی تھیں۔

پھر اس نے کلبیا کو بار بار دیکھا تھا۔ جب بھی وہ بہن سے ملنے گاؤں آتا کسی نہ کسی جگہ اس کی ملاقات اس سے ہو ہی جاتی اور کبھی کبھی کسی تنہا موڑ پر کلبیا کے ہونٹوں پر دعوت دینے والی مسکراہٹ ایک قدم اور آگے بڑھ جاتی اور وہ اس دعوت کو ٹھکرا کر نازاں بھی ہوتا اور اپنی بزدلی پر شرمسار بھی۔

جلوس اب شاید کچھ اور قریب آگیا تھا کہ جھنجے کی آواز پہلے کے مقابلے میں تیز ہو چلی تھی۔

اسے اپنے اندر ایک عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی۔

ایک طرف گھر سے باہر جا کر پورے طور پر برہنہ کلبیا کو سورج کی تیز روشنی میں بھرپور طریقے سے دیکھنے کی خواہش۔ دوسری جانب

ضمنی ہوئی ان قدروں کا پاس جو اسے خاندانی وراثت میں ملی تھی۔

وہ کمرے سے آنگن میں نکل آیا۔ جہاں اس کی بہن نیم کے درخت کے نیچے نوکرانی سے کوئی کام لے رہی تھی۔

اس کی نظریں بہن سے ملیں۔ تو اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا ــــ

،، کیا بات ہے یہ باہر شور کیسا ہو رہا ہے ؟ ،،

اس نے دیکھا کہ اس کا سوال سن کر وہ ایک لمحے کے لئے سمٹ سی گئی۔ پھر بے تعلقی کے لہجے میں بولی ۔

ارے وہی کلبیا ہے ۔ ٹھاکر صاحب کسی بات پر اس سے ناراض تھے اب اسے سزا کے طور پر گاؤں میں گھما رہے ہیں۔

،، کس بات پر ناراض تھے ،،

،، مجھے کیا معلوم ؟ اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ پھر وہ آنگن سے کمرے کی طرف بڑھ گئی ۔

اسے کل کی دوپہر یاد آگئی

اس وقت وہ امرود کے باغ کی طرف ٹہلتا ہوا تنہا چلا جا رہا تھا کہ ایک کھیت کی میڑھ پر بیٹھی ہوئی کلبیا اسے مل گئی تھی

،، کب آئیں میاں ؟ اس نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا

،، کل ۔ ،، اس نے ایک مختصر سا جواب دیا

،، آپ تو ٹھیک رہیں نا ؟ ،،

،، ہاں ۔ ،،

ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی ۔

اچانک اسے خیال آیا کہ کلبیا کا اسٹر یا سی اکلوتا بیٹا بجون کل سے اب تک اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ جب اپنی بہن کے

[illegible]

اس کے پاس گھنٹوں بیٹھا مختلف نوکریوں کے بارے میں جانکاری حاصل کرتا رہتا۔

"بھیون کہاں ہے؟ کل سے اب تک دکھائی نہیں دیا" اس بار اس نے سوال کیا۔

"ارے میاں او، اوکا تو نوکری مل گئے، کنو لو دیہتر میں بابو ہو گو ہے۔ اب شہر میں رہت ہے۔"

اس نے دیکھا کہ اس خبر کو دیتے وقت کلیسا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایک ایسی چمک جو بے پناہ خوشی کے نتیجہ میں ابھرتی ہے۔

"ارے واہ! تم نے یہ خبر تو بہت اچھی سنائی۔" اسے سچ مچ خوشی ہوئی تھی۔

"میاں او جو ٹھاکر بچن سنگھ ہیں نا، ان کے بیٹوا ابھی نوکری کیلئے گوا رہین۔ مگر ایکو نا ہیں بھوا، ہمرے بھیون کے ہوئے گوا۔ ٹھاکر مار کرڈکڑان رہین۔ ہم کا تو گاری گپتا کرے بھتین۔ سرکار و کا بھی گریاین۔" کلیسا کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

اسے لگا کہ جیسے یہ مسکراہٹ صرف ایک شرارت آمیز مسکراہٹ نہ ہو بلکہ ایک ایسی مسکراہٹ ہو جو کاندھوں پر ہزاروں برس سے لدے بوجھ یا پھر ہزاروں برس سے چڑھے ہوئے قرض کو اتارنے کے بعد ہونٹوں پر پھیلی ہو

اچانک کلیسا ایک دم اداس دکھائی دینے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"اگر آج اوکر باپ جندہ ہوتے کتنا کھس ہوتے۔"

وہ بھی قدرے مغموم ہو گیا۔

اس نے پہلی بار کلیسا کے اندر چھپی ہوئی ایک دوسری کلیسا دیکھی۔ اس کلیسا کے ہونٹوں پر نہ تو مسکراہٹ تھی اور نہ آنکھوں میں لپلپاتے ہوئے شعلے۔ بلکہ ہونٹوں پر مردنی تھی اور آنکھوں میں اداسیوں کا غبار۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولی۔ "میاں جب بھیون کے باپ مرگوا تو ہمری زندگی کیسے بیتی کا بتائی۔ بھیون کا پڑھاوے کو ہم کا نہیں کیا۔ دہبو جون کرے کا چاہی اور دہبو جون نہ چاہی ٹھاکر بھیون کا لگ چپکا دیں بھیں۔ "ابے چمرہ لکھ کے کا کر بے؟ تو کا کون نوکری ملے کا ہے۔ چل ہمرے بیٹا کا م کا ج دیکھ اور مجا مار۔" بلا ہم بھیون کا پڑھائی نے چھوڑا۔

کلیسا کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بھاری بھاری قدموں سے امرود کے باغ کی طرف چل پڑا۔

بھجن کی آواز اب خاصی تیز ہو چلی تھی۔ جلوس شاید کافی قریب آ گیا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا لیکن پھر ٹھٹھک کر رک گیا۔

اس نے اپنے آپ کو باہر جانے سے روکنے کی کوشش کی لیکن کلیسا کو ننگا دیکھنے کی خواہش کچھ زیادہ ہی شدید ثابت ہوئی

وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور دور تک کسی کا پتہ نہ تھا صرف ٹھاکر بچن سنگھ کے کچھ پٹی دار اپنے اپنے دروازوں پر کھڑے آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔

اسے گھر سے باہر نکلا دیکھ کر بچن سنگھ کا بھتیجہ اتم سنگھ اس کے پاس آ گیا کہ گاؤں کے اکثر لوگوں سے اس کے تعلقات خاصے پرانے ہو چلے تھے۔

"تم کب آئے"؟ اتم نے آتے ہی سوال کیا۔

"میں تو کل آیا۔ تم کب آئے؟" اس نے بھی سوال کیا

"مجھے تو آئے کئی دن ہو گئے۔ دراصل میں نے تو دفتر سے چھٹی لے رکھی ہے۔ بچوں کی چھٹیاں تھیں۔ سوچا انہیں گاؤں گھما دوں۔ امرود وغیرہ کی فصل بھی ہے۔"

ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔

پھر اس نے اتم سے اچانک سوال کیا۔

"ٹھاکر یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے؟" اس کا اشارہ آتے ہوئے جلوس کی طرف تھا۔

"ارے کچھ نہیں۔ وہ جو عوام کی بھی کلیسا ہے نا، ٹھاکر چاچا کے لڑکے کو خراب کر رہی تھی۔ انہوں نے اسے کئی بار سمجھایا لیکن وہ نہ مانی۔ ٹھاکر چاچا کا غصہ تو بہت برا ہے ہی وہ غصہ میں کسی کی نہیں سنتے۔ جو من میں آتا ہے کر ڈالتے ہیں۔ اب تم دیکھو تو سہی کیا ہو۔"

اتم نے اپنی بات کچھ اس ڈھنگ سے کہی کہ جیسے جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ اس کی نظر میں اس کی کچھ اہمیت

ہی نہ ہو۔

چند منٹوں کے لئے پھر سناٹا چھا گیا۔

اس نے اتم کو پھر چھیڑا — "یار ایک بات سچ سچ بتاؤ وہ تمہارے بھائی کو خراب کر رہی تھی یا تمہارا بھائی اُسے خراب کر رہا تھا۔"

"نہیں وہ میرے بھائی کو خراب کر رہی تھی ورنہ اجے تو بہت سیدھا ہے۔"

"اچھا! بالکل اپنے باپ ٹھاکر بچن سنگھ کی طرح؟"

اس کی بات سن کر اتم کھسیانہ سا ہو گیا کہ اس کے چاچا کی عیاشیوں کے قصّے دور دور تک مشہور تھے۔

جھنجھے کی آواز اب اس کی سماعت پر ضرب لگانے لگی تھی

جلوس اب اس کے بالکل سامنے آ گیا تھا۔

سر سے پیر تک ننگی کلیا سب سے آگے چل رہی تھی۔ اس کے پیچھے ٹھاکر کا داہنا ہاتھ راگھو پنڈت اپنی بندوق تانے چل رہا تھا۔ اس کے کرخت اور مکروہ چہرے پر پھڑکتی ہوئی مونچھیں اس کی خوف ناکی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اس کے برابر ایک ڈراؤنا سا آدمی چل رہا تھا۔ جس کے ہاتھ میں کسی پیڑ سے تازی توڑی ہوئی ایک سنٹی تھی۔ کلیا کے قدم جب رکنے لگے۔ تو سنٹی اس کے ننگے کولہوں پر زور سے پڑتی پھر ایک چیخ کے ساتھ اس کی سست پڑتی رفتار قدرے تیز ہو جاتی سنٹی والے آدمی کے پیچھے موجود لوگوں میں ایک آدمی کے دونوں ہاتھوں میں جھنجھنے تھے جنہیں وہ ایک ہی رفتار سے بجائے چلا جا رہا تھا۔ باقی لوگ کلیا پر آوازیں کس رہے تھے کلیا جس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ایک ٹک آسمان کی جانب تکے جا رہی تھی۔ جب گردن اٹھائے اٹھائے دکھنے لگتی تو وہ گردن کو نیچے کر لیتی اور اس کی نظریں آسمان سے زمین پر اتر آتیں۔ اس کی آنکھوں میں شرم، خوف، دہشت، مجبوری، اذیت اور بے بسی کی پرچھائیاں ناچ رہی تھیں۔

اسے کلیا کو سورج کی روشنی میں برہنہ دیکھنے والی خواہش پر اپنے آپ سے بڑی ندامت کا احساس ہوا۔ اسے لگا کہ جیسے اس کے کہیں کوئی کانٹا سا چبھ گیا ہو۔ ایک عجیب سی بے چینی جیسے آہستہ آہستہ اس کا خون منجمد ہو رہا ہو۔

جلوس اب قدرے آگے بڑھ گیا تھا۔

اس نے سوچا کہ سچ کہا ہے، وہ جو اتم سنگھ نے بتایا یا پھر کچھ اور۔؟ شاید کوئی کانٹا جو بچن سنگھ کے دل میں کہیں چبھ گیا تھا اور جس کی چبھن اسے بے چین کئے ہوئے تھی۔

گھر پہنچ کر وہ سب کی نظروں سے بچتا بچاتا ہوا کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ اس کے دل و دماغ سائیں سائیں کر رہے تھے ایک جھنجھلاہٹ پورے وجود پر طاری تھی لگتا تھا جیسے اندر کہیں کچھ ٹوٹ سا گیا ہو۔

جھنجھنے کی ہلکی ہلکی سی آواز اب بھی آ رہی تھی۔

نہ معلوم کیوں اسے لگا کہ جیسے یہ جلوس تھوڑی دیر پہلے نہ نکلا ہو۔ بلکہ ہزاروں برس سے رواں دواں ہو۔



قمر قدیر ارم

مری آنکھوں میں آ کے چھپ گیا ہے
مجھے چھپ چھپ کے کیسے دیکھتا ہے

مری سانسوں میں آ کے بس گیا ہے
مری رگ رگ میں جیسے دوڑتا ہے

وہ میرا خواب سا اک دیکھا بھالا
مجھے بے خواب راتیں دے گیا ہے

یوں لگتا ہے کہ جیسے سو رہی ہوں
مگر وہ میرے اندر جاگتا ہے

میں جتنا دور اس سے ہونا چاہوں
وہ اتنی ہی کمندیں ڈالتا ہے

تکلم آشنا میں کب نہیں تھی
رگِ جاں میں تو تو ہی بولتا ہے

سرابوں کا سفر کب مختصر تھا
مگر رستے میں دریا مل گیا ہے

● بارہ دری (وانگ) مراد آباد ۲۴۴۰۰۱ (یوپی)



تسنیم عابدی

بجھا بجھا سا زمانہ وہ بھی اداس میں بھی تھی
چراغِ آخرِ شب کا لباس میں بھی تھی

یہ اور بات کہ دنیا کو تج دیا لیکن
وہ جانتا ہے زمانہ شناس میں بھی تھی

جو داستان سنائی گئی زمانے کو
اسی کا ایک حسیں اقتباس میں بھی تھی

یقین ہو گیا کیسے ملتی ہے بازی
کہ ڈوبتے ہوئے ساحل کے پاس میں بھی تھی

ستمبر نے پیرہنِ چمن کو اتار دیا
بدلتی رُت کا پرانا لباس میں بھی تھی

ہلال بن کے وہ اُبھرا تو اس کی محفل میں
مثالِ ہالہ کبھی آس پاس میں بھی تھی

ہمیں تو وہ در و دیوار یاد آتے ہیں
جس اک مکان کی خستہ اساس میں بھی تھی

● پوسٹ بکس نمبر ۳۸۰۱۰۳، ابوظہبی، یو اے ای



صدف جعفری

مکمل مت سبھی رکھیے
کہیں تو کچھ کمی رکھیے

ہنر مندی سے کہہ کر بھی
کہانی ان کہی رکھیے

نشاں گھر کا تو رکھنا ہے
جلی چوکھٹ سہی، رکھیے

ہوائیں سب بکھیریں گی
نہ یوں لب پہ ہنسی رکھیے

پرانے گھر میں بھی اکثر
سجاوٹ کچھ نئی رکھیے

تصور کی اڑانوں میں
لہو کا رنگ بھی رکھیے

صدف جی! نام پائیں گی
قلم میں تازگی رکھیے

● ۲۹ ذکریا اسٹریٹ، کلکتہ

قاسم خورشید

ایس آئی ای ٹی، ایس سی ای آر ٹی کیمپس، مہندرو، پٹنہ-۶

تجارت

شہر کے سب سے بڑے تاجر مسٹر ماتھر سے کوئی بھی چھوٹا کاروباری بہت قریب رہنا چاہتا تھا لیکن مسٹر ماتھر کی شخصیت کچھ ایسی تھی کہ کوئی بھی ان کے قریب جاکر شاید خود کو زیادہ دیر تک انہیں چھپا سکتا تھا انہیں اپنے لئے بکھرے ہوئے خلوص اور عزت کا پس منظر اچھی طرح معلوم تھا شاید اسی لئے انھوں نے اپنی زندگی کے اس پہلو کو جہاں کسی کی ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے، بہت سنبھال کر رکھا تھا۔

انہیں زندگی نے یوں تو بہت کچھ دیا تھا لیکن ایک گہری خاموشی نہ جانے کس دلدل میں انہیں لئے جا رہی تھی۔

ایک بہت ہی خوبصورت حویلی۔ آرام و آسائش کا بھرپور نظم — ان کی ایک آواز پر کئی جھکے ہوئے چہرے۔ لیکن یہ سب ان کے کسی روحانی جذبے کی نمائندگی نہیں کیا کرتے تھے۔ سب کچھ کاروبار کا ایک حصہ تھا۔

مسٹر ماتھر پینتالیس کے ہوئے لیکن اب تک شادی کیوں نہیں کی؟ وہ اس شاندار حویلی میں تنہا کیوں رہتے ہیں جبکہ شہر میں ان کے رشتہ دار بھرے پڑے ہیں ان کے ذاتی مسئلے سے ابھرنے والے سوال کرنے کے لئے کوئی بھی ہمت نہیں جٹا پاتا تھا، ہاں! خوش گپیوں کے لئے یہ سب موضوع بحث ضرور ہوا کرتا کہ شاید انہیں گہری چوٹ لگی ہے۔ انہیں ضرور کوئی بھنور میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

میں کئی دنوں سے چاہ رہا تھا کہ مسٹر ماتھر سے ملوں، لیکن ان کی شخصیت کے بارعب پہلو سے متعلق جو باتیں سن رکھی تھیں، ان سے میرے بونے قد کا احساس اور بھی بڑھ گیا۔ پھر یہ بھی سوچا کہ مسٹر ماتھر اگر نہ بھی مل پائے یا پھر انھوں نے میرے ساتھ بہتر سلوک نہیں بھی کیا تو کیا فرق پڑتا ہے؟ میری حیثیت میں تو کہیں کوئی تبدیلی نہیں آنے والی۔ شاید یہی سوچ کر میں آج اپنے گھر سے نکلنا چاہ رہا تھا کہ حسب معمول ٹھیک دروازے سے باہر نکلتے ہی بیوی نے ٹوک دیا بلکہ حکم بھی صادر کیا۔

"ابھی سنتے ہو، یہ تمہاری کیا عادت ہو گئی ہے کہ روز جاتے وقت کہتے بھی نہیں کہ جا رہا ہوں"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے اب جا رہا ہوں تو جا رہا ہوں بس...!"

"آج سیما کے کالج میں فنکشن ہے، اسے لوٹنے میں شام کے چھ بج جائیں گے، تم ساتھ لئے آنا.......!"

"لیکن دوکان ہی سے آج شام مجھے مسٹر ماتھر سے بھی ملنا ہے وہاں گھنٹہ بھر لگ سکتا ہے"

"تو کیا ہوا، تم پہلے سیما کو کالج سے لے کر مسٹر ماتھر کے یہاں ہوتے ہوئے گھر چلے آنا......"

میں اپنی ایک چھوٹی سی فرنیچر کی دوکان کو ایک بڑا روپ دینے کی کوشش گذشتہ کئی برسوں سے کر رہا تھا آج بھی یہ کوشش جاری تھی۔ دن بھر کی کڑی محنت کے بعد شام میں سیما کے کالج گیا اور اسے لے کر مسٹر ماتھر کے دفتر پہنچا تو وہ اپنی کار میں بیٹھ کر شاید اپنی حویلی کی طرف جانے کے لئے تیار تھے، انہیں رخصت کرنے کے لئے کئی لوگ ہاتھ جوڑے کھڑے تھے کہ میں ہمت کے ساتھ ایک دم ان کے پاس چلا گیا۔

"سر......! مجھے آپ سے ملنا تھا...... ایک دم ذاتی کام تھا سر...... تھوڑا وقت اگر دے سکیں تو......"

"آپ کل دفتر آجائیں" مسٹر ماتھر نے مسکراتے ہوئے کہا

"سر دفتر...! دفتر کا...... کام...... نہ...... نہیں ہے سر......"

پھر انھوں نے مجھے اپنی کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرے لئے یہ بہت بڑا آفر تھا۔ میں نے ماتھر صاحب کے دفتر ہی میں اپنا اسکوٹر پارک کیا اور پھر سیما کو بھی کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"یہ...... یہ...... سر...... یہ ہماری بیٹی ہے سیما"

کار وہاں سے رینگنے لگی۔ مسٹر ماتھر [illegible] ہوئے میری طرف دیکھ

رہے تھے اس کے بعد باہر کے گزرتے ہوئے مناظر کا جائزہ لینے لگے۔ میں کہاں سے بات شروع کروں۔ یہ مجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں اسی ادھیڑ بن ہی میں تھا کہ مسٹر ماتھر نے خود ہی سوال کیا۔

"آپ نے اپنا پریچے تو دیا ہی نہیں ...."

"اوہ .... ہاں سر .... میں ہوں جتندر پرساد۔ اسی شہر میں کئی برسوں سے اسٹرگل کر رہا ہوں۔ فرنیچر کا ایک چھوٹا سا کاروبار ہے۔"

مسٹر ماتھر کچھ دیر خاموش رہے تو مجھے کچھ نروس سا ہونے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ڈرائیور کو گاڑی روک دینے کے لئے کہہ دیں۔ انھوں نے تھوڑی خاموشی کے بعد سکوت توڑا۔

"کمال ہے .... فرنیچر کے تمام چھوٹے بڑے کاروباری ہمارے پاس آتے رہتے ہیں اور آپ اتنے برس گزر گئے، لیکن ......"

"انکل ...... ! پاپا آپ کو اپنا آئیڈیل مانتے ہیں بلکہ ہمارے گھر میں آپ کی ایک بڑی سی تصویر بھی لگا رکھی ہے" سیما بولنے لگی تو مجھے راحت کا احساس ہوا۔

"ہوں .... ! یو آر ویری انٹیلیجینٹ! کہاں پڑھتی ہو ...."

"جی! سینٹرل کالج میں بی۔ اے فائنل کی اسٹوڈنٹ ہوں ...."

"پڑھنے میں بہت تیز ہے سر۔ گاتی بھی بہت اچھا ہے .... ! اسے سیما سر کو غزل سناؤ، یہ غزل کے بہت شوقین ہیں ....."

مسٹر ماتھر کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ بکھری، انھوں نے گانے کے لئے کہا۔ سیما غزل گنگناتی رہی اور مسٹر ماتھر دھیان سے سنتے رہے۔ پھر بیچ ہی میں انھوں نے کہا۔ "بہت پیاری آواز ہے۔ تلفظ بھی بہت اچھا ہے، تمہیں تو آرٹسٹ کے گھر میں جنم لینا چاہیئے تھا۔ یہ ہم جیسے کاروباری لوگوں کے یہاں ....."

پھر مسٹر ماتھر ہمیں اپنی حویلی میں لے گئے۔ دیر تک شراب نوشی کی اور میں اپنی پسندیدہ غزلیں سناتے رہے۔

وہ شام اتنی خوبصورت گزری کہ مجھ میں اور اعتماد بھر گیا۔ مسٹر ماتھر کی شخصیت کے اس پہلو کو، جہاں آرٹ سے ان کا بے پناہ لگاؤ تھا، مجھے معلوم ہو سکا تھا۔ میں سیما کی مدد سے مسٹر ماتھر کو جب کوئی ایسا تحفہ پیش کرتا جس میں کہیں نہ کہیں قدرت کی جھلک ہوتی تو انہیں بے حد خوشی ہوتی۔ ان کی زندگی کے ایک پہلو سے ہمیں بہت ہمدردی سی ہونے لگی تھی۔ کبھی کبھی ماتھر صاحب موڈ میں ہوا کرتے تو کہہ دیا کرتے کہ شہر کے آدمی [illegible] جہاں

لیا ہے۔ اب کبھی کبھی میرے ساتھ میری بیگم بھی ہو لیا کرتی۔ ہم دیر تک گھریلو باتیں کرتے رہتے تو کبھی کبھی مسٹر ماتھر معصوم بچوں کی طرح ہم سے پیش آتے۔ اکثر انہیں بہت جذباتی دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو جاتیں۔

ایک روز شام کے وقت میں مسٹر ماتھر کی حویلی میں گیا تو پتہ چلا کہ ابھی ابھی ڈاکٹر چیک اپ کے لئے آیا تھا۔ اچانک طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ شاید کام کا بوجھ ان پر زیادہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ انہیں کسی اسٹیشن پہ جا کر دس پندرہ دنوں تک مکمل آرام کرنا چاہیئے۔ میں دوڑتا ہوا مسٹر ماتھر کے کمرے میں گیا، وہ ایک کتاب کے مطالعے میں محو تھے اور غزل کی آواز بھی ان کے کمرے میں گونج رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر شاید اس وقت انہیں اچھا نہیں لگا۔ پھر بھی میں نے پوچھ لیا۔

"سر! ابھی ابھی پتہ چلا کہ ڈاکٹر آپ کا چیک اپ کرنے آیا تھا۔" شاید طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ آپ کو کسی ہل اسٹیشن جا کر آرام کی ہدایت دی ہے"

انھوں نے کتاب کا صفحہ الٹا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ "اوہ! جتندر جی .... ڈاکٹر تو ہمیشہ ہی سے ایسا ...."

"لیکن سر ...."

"میں جانتا ہوں مجھے کچھ نہیں ہوگا ...."

"نہیں سر .... ! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ پلیز آپ ڈاکٹر کی بات مان لیں ......"

اور پھر مزید اپنائیت کے اظہار کے لئے میں نے فوراً اپنے موبائل سے گھر فون لگا کر سیما اور اپنی بیٹی کو مسٹر ماتھر کے بیمار ہونے کی خبر دی۔ دونوں آدھے گھنٹے بعد ہی آگئیں۔ پھر ہم تینوں مسٹر ماتھر کے منع کرنے کے باوجود ان کی خدمت کرتے رہے۔ اس رات ماتھر صاحب تو سو گئے لیکن ہم تینوں تمام رات ان کے کمرے کے باہر ہی رہے۔

صبح ماتھر صاحب بیدار ہوئے تو ہم تینوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے شکریے کا اظہار کیا۔ سیما بول اٹھی۔

"انکل! .... آپ کو ڈاکٹر نے آرام کرنے کے لئے کہا ہے تو آپ کو آرام کرنا ہے۔ میں آج ہی آپ کیلئے کسی ہل اسٹیشن جانے کا انتظام کرتی ہوں ....."

"نہیں سیما یہاں تو تم لوگوں نے بہت اپنائیت کے ساتھ میری خدمت کی ہے، وہاں جاؤں گا تو بالکل اکیلا ہو جاؤں گا ...."

میں نے کہا " ماتھر صاحب! آپ بہت خوب صورت الگ لگ رہے ہیں۔ بیٹی سیما آپ کے ساتھ جائے گی۔ یہ آپ کی سیوا کرے گی۔ اسے آپ بھی اپنی بیٹی سمجھیں۔۔۔۔"

"ہاں انکل۔۔۔۔۔ میں آپ کی سیوا کروں گی۔"

"نہیں نہیں تم لوگ یہ سب نہ کرو۔" گویا یہ مسٹر ماتھر کا فیصلہ تھا۔ پھر بھی سیما نے بہت ضد کی اور وہ بالآخر مان ہی گئے۔ میں بہت خوش ہوا کہ مسٹر ماتھر نے مجھ جیسے معمولی آدمی کو بھی اپنا فیملی ممبر سمجھا۔

سیما نے ان کے جانے کی پوری تیاری کر دی۔ ہم ان دونوں کو جب ایئر پورٹ پر سی۔ آف کرنے گئے تو میں نے مسٹر ماتھر سے بہت مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"سر مجھے ایک بات۔۔۔۔۔"

"ہاں ہاں! کہیے۔۔۔۔۔ ارے بولئے بھی۔"

"سر! پچھلے دنوں آپ کی کمپنی نے جو ٹینڈر مانگا تھا تو مجھ جیسے معمولی آدمی کا بگاڑ وہ ٹینڈر ہو رہا ہے۔ اگر یہ ٹینڈر مجھے مل جائے تو میں اپنے کاروبار کو خوب پھیلا سکتا ہوں۔"

مسٹر ماتھر کے چہرے پر اچانک تبدیلی آگئی اور پھر انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہوں! تو آپ راتوں رات امیر آدمی بننا چاہتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ میں نے آج تک اپنے کاروبار میں کسی بھی سطح پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا اس لئے وہ ٹنڈر کسی بھی طرح آپ کو نہیں مل سکتا۔"

اسی دوران سیما دوڑتی ہوئی ہماری طرف آئی اور ماتھر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے بولی انکل! جلدی چلئے! سامان اندر جا چکا ہے۔"

اچانک ہی ہم نے دونوں کو سی۔ آف کیا اور دل میں ایک پھانس سی لئے ہوئے گھر لوٹ آئے۔

ایک ہفتے بعد ہی مسٹر ماتھر شہر لوٹ آئے لیکن سیما بہت بیمار رہنے لگی۔

مسٹر ماتھر اپنے کاروبار میں لگ گئے اور سیما کی خاموشی گہری ہوتی گئی۔ اس کے دل میں کوئی بات ضرور تھی۔ جو وہ ہم سے کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہیں پا رہی تھی۔ پھر ایک رات اچانک ہی اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس کی ماں کو اس کے کمرے میں بھیجا اور کچھ دیر بعد خود بھی کمرے میں گیا تو وہ روتے ہوئے اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔

"اس ماتھر کے بچے کو مت چھوڑنا ممی۔۔۔۔۔ اس ماتھر کا۔۔۔۔ ممی اس نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔۔۔۔۔ ممی اس نے مجھ سے سب کچھ۔۔"

یہ سن کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا اور میں نے اسی وقت مسٹر ماتھر کے یہاں جانے کا فیصلہ کیا تو پتنی نے روک دیا۔ پھر مجھے نیند نہیں آئی۔ صبح ہوتے ہی پوری تیاری کے ساتھ میں مسٹر ماتھر کی حویلی پہنچا۔ میرے اندر جو کچھ ابل رہا تھا اسے مسٹر ماتھر کا خون ہی شانت کر سکتا تھا۔

میں بغیر اجازت کے اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ حسب معمول وہ غزل اور شراب سے دل بہلا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور شاید میری آنکھوں کے ابلتے ہوئے شعلوں کو بھی محسوس کیا۔ پھر اس نے بہت خلوص کے ساتھ مجھ سے کہا۔

"آئیے۔۔۔ جتندر پرساد جی۔۔۔۔۔ بہت بہت مبارکباد۔۔۔۔ راتوں رات آپ کے لکھ پتی بننے کا خواب پورا ہوا۔ ٹنڈر میں نے آپ ہی کا پاس کیا ہے۔۔۔ مبارک باد۔۔۔۔۔"

میری آنکھوں سے ابلتے ہوئے شعلے نہ جانے کیوں اچانک شانت ہونے لگے۔ میری بند مٹھیاں ہتھیلیوں میں تبدیل ہونے لگیں، میری نم آنکھوں میں کہیں سے خوشی کی کوئی لہر دوڑنے کو بے چین سی ہونے لگی۔

اس روز پہلی بار میں نے مسٹر ماتھر کے بنائے ہوئے جام کو اٹھا کر کہا ——— "چیئرز۔۔۔۔۔!!"

اردو کی نئی بستیوں کے رفیقان شاعر سے گذارش

- اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے یا ختم ہو گئی ہے تو اپنا زرِ تعاون جلد ارسال کرنے کی کوشش کیجئے۔
- شاعر کو اردو کا عالمی معیاری ادبی جریدہ بنانے کی ہماری کاوشوں کو کامیاب کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ خریدار فراہم کیجئے۔
- اردو کے بڑے اداروں، انجمنوں اور لائبریریوں کے لئے شاعر کی ترسیل کا اہتمام کیجئے۔
- شاعر کے لئے اپنے عطیات بھجوائیے۔

MANDEL SHTAM

۱۵ جنوری ۱۸۹۱ء ● ۲۷ دسمبر ۱۹۳۸ء
رشین پولینڈ (موجودہ پولینڈ) شاعر OSIP EMIL EVICH
متوسط طبقے کے ایک یہودی خوش حال خاندان میں
پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش سینٹ پیٹرزبرگ میں ہوئی۔ جوان
شاعری میں تمام عمر دھڑکتا رہا۔ شاعری کی ابتداء ۱۹۱۰ء میں کی
اور نظموں کا پہلا مجموعہ "KAMEN" [THE STONE]
۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ دوسرا شعری مجموعہ TRISTIA
۱۹۲۲ء میں چھپا۔ اس مجموعے کی شاعری HOMER
DANTE, VIRGIL, OVID جیسے دانشور شعراء کی
شاعری کی گونج سنائی دی

اسٹالن کے خلاف ایک طنزیہ نظم کے سبب ۱۹۳۴ء
میں انہیں جیل میں ڈال دیا گیا کہ انہوں نے روس میں چلنے والی سیاسی
پالیسیوں کی مخالفت میں لکھی تھی۔ مینڈل شٹام کی شہرت میں
ان کی بیوی NADEZHDA YAKOVLEVNA (۱۸۹۹-۱۹۸۰ء)
اہم کردار ادا کیا ہے۔ دو جلدوں میں تحریر کی گئی یادداشتوں کا نام
"ONE OF THE GREATEST BOOKS OF OUR ERA" ہے۔ اس کے ترجمہ MAX HAYWARD نے ۱۹۷۱ء
پہلی جلد اور ۱۹۷۳ء میں دوسری جلد لندن سے شائع کی۔

۱

کاش کہ اڑ پاتا میں
جہاں کوئی نہ دیکھ پاتا مجھے
روشنی کی کرن کے اس پار
کوئی نقش چھوڑے بغیر!
پر تم۔ بنانے دو روشنی کو دائرہ
تمہارے ارد گرد۔
بس وہی تنہا خوشی ہے۔
ستاروں سے سیکھو
روشنی کا مفہوم۔

[illegible] کرن ہے، اگر وہ روشنی ہے
صرف اس سبب کہ
عاشقوں کی سرگوشیاں
مضبوط اور پختہ بناتی ہیں۔

[illegible] سے یہ کہنا ہے
میں کر رہا ہوں سرگوشی۔
سپرد کر رہا ہوں، تمہیں کرن کو
سرگوشیوں میں۔

۲

تم اٹھا لے گئے سارے سمندر اور ساری کشادگی
اور مجھے ملا ایک نقش پا سی زمین
سلاخوں سے گھری ہوئی۔
کہاں لے گیا یہ سب تمہیں؟ کہیں نہیں۔
کہ تم نے میرے ہونٹ چھوڑ دیئے میرے پاس
اور وہ تراشتے ہیں الفاظ
گھنی خاموشیوں میں بھی!

۳

انسانی کھوپڑیوں کا ہجوم
بھٹک رہا ہے تا اُفق۔
میں ان میں رینگتا ہوا
کوئی مجھے دیکھتا نہیں۔

لیکن ان جان سے بھی عزیز کتابوں میں،
اور بچوں کے کھیل میں،
ابھر آؤں گا میں عدم سے،
یہ اعلان کرنے
کہ سورج ابھی درخشاں ہے!

۴

ابھی زندہ ہو تم!
ابھی تنہا نہیں ہو تم۔
اور بے کراں میدانوں،
دھند اور بھوک
اور اڑتی ہوئی برف کے درمیان سے
ایک مسرت پہنچ رہی ہے تم تک!
زر و افلاس، شاہی بے نیازی!
رہو اس میں پرسکون۔ رہو مطمئن۔
مبارک ہیں یہ شب و روز
اور خالص ہے خلقت کی میٹھی نغمگی۔

بدبخت ہے وہ انسان،
جو بھاگتا ہے اپنے سائے میں پوشیدہ جانور سے،
جس کے زانوں کو ہوائیں کریدتی رہتی ہیں۔

اور بے حال ہے وہ
جو پھیلاتا ہے اپنی حیات کے چیتھڑوں کو

۵

دھات کی کن ہولہان رگوں سے
واپس لوٹ آئے گا مجھ تک
کائنات کا عزیز مادّہ؟
لہجے، اشک، مشقتیں،
مشکلات کی کھولتی ہوئی سرگوشی،
تمام کھوئی ہوئی صدائیں؟
میرے کاسۂ سر میں پہلی بار
تالے عیاں ہیں،
کائی زدہ پانی سے چھلکتے ہوئے۔
اور میں ان کے پیچھے چلا جا رہا ہوں
اپنے سے دور
ہر قوم سے نفرت کرتے ہوئے
مجھ سے بے خبر،
دونوں۔ نابینا انسان اور اس کا رہبر!

۶

دنیا کے محور سے رس پان کرتے ہوئے
بھنوروں کے قطار سے بیدار،
یاد کرتا ہوں ہر ایک چیز کو
جس سے مجھے ملنا پڑا
زبانی یاد ہے مجھے وہ سب۔ رائیگاں!

نہ میں تصویر بناتا ہوں، نہ گاتا ہوں
نہ ہی سیاہ آواز کی مضروب اٹھاتا ہوں۔
زندگی میں چھوٹا سا سوراخ بناتا ہوا میں!
اور کتنا رشک آتا ہے
اُن بھنوروں کی طاقت اور چالاکی پر!

کاش کہ صرف ایک بار
ہواؤں کا ڈنک، بھنوروں کی تمازت
مجھے سہنے کی قوت عطا کرتی
نیند اور موت کے اس پار،
دنیا کے محور کو!

نومبر ۹۴ء

★ شکیل تنویر — کھمبر، سعودی عرب سے
واقعی پروین شاکر تو بلو تمام کی طرح تھیں، وہ ادا جعفری، کشور ناہید، منیر و ملک، فہمیدہ ریاض اور پروین فنا سید کے بعد ابھرنے والی شاعرات میں سب سے نمایاں تھیں۔ لیکن اردو والوں کی بے حسی کو کیا کہا جائے۔ اردو بلٹز میں رضوان احمد کا مضمون پروین شاکر پر شائع ہوا تھا۔ آپ نے پروین شاکر پر ایک مختصر لیکن عمدہ گوشہ شائع کر کے بے حسی کو دور کیا ہے۔ آپ کا یہ کہنا ایک تلخ حقیقت کا اظہار ہے کہ "ہندوستانی مشاعروں اور عالمی سطح پر منعقد ہونے والے مشاعروں میں شریک ہونے والی بہت ساری نام نہاد شاعرات بھی پروین شاکر کا تذکرہ کرنے لگیں"۔ پروین شاکر کے اجداد میتھلا جس کے رہنے والے ضرور تھے لیکن پروین شاکر کیا میتھلا شاعر ودیاپتی سے متاثر تھیں۔ سردار جعفری صاحب کو اس بات کا سراغ کہاں سے ملا کہ وہ ودیاپتی سے متاثر تھیں۔ پروین شاکر نے اپنے کسی انٹرویو میں ودیاپتی کا ذکر نہیں کیا۔ ایک انٹرویو میں پروین شاکر نے کہا تھا کہ "جہاں تک کلاسیکی ہندی شاعری سے متاثر ہونے کا سوال ہے تو میرا مطالعہ براہ راست تو ہے ہی نہیں۔ میرا ہندی کے کچھ انگریزی تراجم میں نے دیکھے ہیں"۔ نادرہ حسین کا مضمون "سوچتی گڑیا" پروین شاکر کے فن اور شخصیت کو سمجھنے میں مددگار ہے۔ نادرہ حسین کا یہ کہنا قابل غور طلب ہے کہ "پروین شاکر خود ایک ستم رسیدہ اور شکستہ، سماجی تضادات کیوں نہ بن جائے بنیادی طور پر وہ ایک روایتی عورت ہے"۔

★ ساجد حمید — (کرناٹک)
اللہ تعالیٰ جس سے جتنا کام لینا چاہتا ہے اس سے اتنا لینے کے بعد جب اس کی ضرورت زمین پر نہیں رہتی تو اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ پروین شاکر جیسی کئی مثالیں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے اگر زندہ رہتیں تو بہت کچھ ادب کو دے سکتی تھیں بے شک۔ آپ نے فوری طور پر پروین شاکر پر جو گوشہ نکالا وہ قابل تحسین ہے اس سے آپ کے ذہنی طور پر فعال ہونے کا ثبوت ملنے کے ساتھ ساتھ آپ کی دردمندی اور انسان دوستی کی مثال بھی ملتی ہے۔

★ کنیز فاطمہ — HILL ROAD NSW-2153 AUSTRALIA
شاعر پابندی سے مل رہا ہے۔ ہر شمارے میں ایک آدھ چیز پڑھنے والی ضرور ہوتی ہے۔ کبھی افسانے اچھے ہوتے ہیں تو کبھی مضامین۔ شاعر کا نمبر پروین شاکر والا شمارہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کی ضرورت تھی کیونکہ ہم ایسے لوگ جو پندرہ بیس سال سے پاکستان سے باہر بیٹھے ہیں وہ پروین شاکر کی شاعری سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ ان کی شاعری پر وہ شعلے کی طرح بھڑکی اور خاموش ہو گئی۔ کیا خوبصورت شاعری کی ہے۔ ققنس کی طرح اس نے دیپک راگ الاپا، اور اسی میں جل کر بھسم ہو گئی۔ پروین کے کتنے ہی اشعار ہمارے دل کی آواز معلوم ہوتے ہیں۔ مرحومہ پر مرثیہ (سردار جعفری) اور مضامین پڑھتے پڑھتے جب دوسری شاعرات کی نظمیں غزلیں سامنے آئیں تو ایک خوشگوار تغیر کا احساس ہوا۔ مذکورہ شمارے میں بدر عالم خلش نے اپنے مضمون "موجودہ ادبی صورت حال" میں صفحہ ۸ پر لکھا ہے "مجھے اردو میں ایک بھی کتاب ایسی نہیں ملتی جو جدید ترین موضوعات مثلاً تبدیلی انتظامیات، صنعتی نفسیات، مصنوعی ذہانت، کمپیوٹر پروگرامنگ، GENETICS کے رائج الوقت اصول یا جدید فلکیات، نظریات اور تکنیک کا احاطہ کرتی ہے۔ ان کی شکایت بجا ہے۔ اس کمی کے پیش نظر حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر محمود علی نے جو عثمانیہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں جدید سائنسی موضوعات پر اردو میں چند کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اردو میں ذخیرۂ الفاظ اور وسعت اظہار موجود ہے کہ یہ زبان جدید ترین سائنسی موضوعات کا احاطہ کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر محمود علی کی پہلی کتاب کا نام "کائنات اور اس کے مظاہر" ہے جسے اردو سائنس بورڈ (لاہور) نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اردو کاسمالوجی سے متعلق ہے۔ دوسری کتاب فلسفۂ سائنس ہے جسے ترقی اردو بورڈ (دلی) نے شائع کیا ہے۔ تیسری کتاب "ذہن اور دماغ" ہے جسے مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد) نے شائع کیا ہے۔ جمیل جالبی صاحب کا کہنا ہے کہ ہم نے اردو میں ان موضوعات پر ایسی کتابیں لکھی نہیں دیکھیں اور یہاں میں نے آپ کے تحریری مضمون "خوشبو سی کہہ —" کے متعلق زیادہ لکھا نہیں۔ دو صفحات میں آپ نے معلومات کا ذخیرہ سمو دیا۔ اس کو لکھنے کے لئے کتنی مغز ریزی کی ہے آپ نے۔ اس کا عنوان دیکھ کر یہ تاثر ملتا تھا۔ مضامین اور اور نے لکھے ہیں، شاعر نکالتے رہیئے۔

★ نفیس بانو — شعبۂ اردو، خواتین
نذر پروین شاکر اور قلم کار خواتین پر مشتمل شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس خوبصورت پیش کش پر میں آپ کو مبارکباد دیتی ہوں۔ آج بھی ہمارا تنگ نظر سماج عورت کی تصویر کو ایک مخصوص چوکھٹے میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ برسوں عورت کی بے حس و حرکت تصویر کسی گوشے میں آویزاں رہی۔ آخر اس میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے زبان کھولی "میں وہ تصویر نہیں، رقص پر وہ نہیں"۔ اس کی ادبی مثالیں جیسی مثالیں کی نگاہوں سے دیکھی گئیں لیکن وقت کا منصف ہے جو فیصلہ کر دیتا ہے۔ بلا شبہ شاعر ایک معیاری ادبی رسالہ ہے اور آپ کا یہ قدم قابل ستائش۔ خدا "شاعر" کو نظر بد سے بچائے۔

شمارہ نمبر ۱-۹۵ء

★ محمد انجم رستوگی —
شاعر شمارہ ۱۲-۱۱ یعنی جنوری ۱۹۹۵ء شمارہ کئی دن پہلے ملا جس کو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ ملفوظات سیماب مرحوم، ۱۹۴۰ء عصری حالات کے آئینہ دار ہیں۔ ایک تحریر نئی نسل کے لئے بھی صاف و شفاف اوریجنل اور ادب کے ... سے عبارت ہے۔ اس کا یہ تمام انتخاب امت، سیماب سے لے کر افتخار امام تک کیا اور خود اس ترتیب و انتخاب کے ... صرف نظر کرتے ہوئے تحقیق و تنقید کی سمت و اقدار کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ برادرم انجم صاحب کا مضمون ... فرسودہ معتقدات KIZOMMAS کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ ... ابن فیضی کی رباعیاں اچھی ہیں مگر جس کا سہارا اردو میں مروج ہے نہیں۔ اردو سے متعلق آپ کے اداریوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ہندوستان میں اردو کی ترقی میں حائل ... اڑچنیں اور الجھنیں ہیں اور یہ تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی اکثریت کی نظر اردو پر نہ ہو کر ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں پر ہے کیونکہ مملکت اردو میں ان کو نظر انداز کیا گیا۔ مولوی عبدالحق پر کتابیں، خصوصی نمبر وغیرہ شائع ہوئے ہیں اور ... موہن کیفی دتاتریہ کی خدمات کا ذکر بھی نہیں کیا جا... شمارے کے بیشتر منظومات قابل مطالعہ ہیں مگر اس ... کے نہیں ایسا افسانے اچھے ہیں، جان شمارہ تو اور ہے۔

★ سعید انجم — BEJORDET ... 1266 ...012 NORWAY
تازہ شمارہ میں "ٹوٹا ہوا تیر" پڑھا۔ دل میں گھر کرنے والی اس تحریر کے شائع کرنے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ مصطفیٰ کریم صاحب نے کامیاب لوگوں کی تباہی کے ... خوب گرفت میں لیا ہے۔ سمجھنے والی بات ان لوگ کا ... ہیں ہے۔ کردار کی مستقل کیفیت قاری کے اندر بھی ایک خوف کی شکل میں پیدا ہوتی ہے۔ شاید یہ افسانہ زندگی ... رہ جانے، تنہا رہ جانے کے اسی المیے کو ظاہر کرتا ہے۔ ... کہانی قاری پر ایک جذباتی ارتعاش طاری کرتی ہے۔ آپ مصطفیٰ صاحب سے ایسے اور افسانے بھی لکھوائیں۔ ... دو چار ہی کے افسانہ نگار اردو زبان میں ہیں، ... صاحبان میں سے ایک ہیں۔ ان کو چاہئے کہ اب ... صرف افسانے لکھیں۔

فیقو فرحت — ۲۲۲ اور شمس ہار محمد پال

جلد ۲۱ کے شمارے ۔ اس کے اداریے نے بہت متاثر کیا
چند مجبور کیا۔ "لزوم" کے کنگرے سے نکل کر ادب
اپنی بات اپنے انداز میں کہنی پڑے گی اور بات میں
ہوگی۔ جعلی ہوگی تو ریا ہوگا احساس ہوگا تو اظہار کے لئے
د عالم وجود میں آجائیں گے۔ تصویر کے لئے زخم
از خم کے لئے تصویر نہیں بنائی جائے گی۔ اس سے ابہام
بھی ختم ہوگی۔ ترسیل کے مسائل بھی خود بخود حل
ں گے اور قاری خود کو ادب سے جڑا ہوا محسوس
ے گا۔ بڑا اور عالمی ادب اسی طرح پیدا ہوتا ہے۔ مصنوعی
ں سے نہیں۔ استفسارات اور فکر انگیز اداریے کے
مبارکباد مگر مدیر محمودی اختیار سے نسبتاً کمزور ہے۔ محمد
نقی کا مضمون بہت معلوماتی ہے اور محنت سے لکھا گیا

شاہ حسین نہری — شبنم [illegible]

۱۹۹۵ کے پہلے شمارے کے مطالعے کا موقع ملا۔
کے اداریے "ایک ترید اور — نئی نسل کے لئے"
بہت متاثر و مسرور کیا۔ آپ کے لئے دل سے دعا نکلی۔
اداریے میں آپ کی "صدیقی" روح بول رہی ہے۔
کے طرز اظہار اور آپ کے اسلوب میں اجمال ادبیت کی
ہے واقعیں۔ آپ کی دردمندی کی ترجمان بھی ہے۔ انسان
آپ کو اور اپنے خالق کو پہچانے، اپنے اور اپنے خالق
اور میان تعلق کو صحیح بنیادوں پر متعین اور استوار کرے،
ان کی تخلیق کی ماہیت و حقیقت پر غور کرتے ہوئے اپنے
رف و مکرم مقام کا ادراک کرے اور اس کا شعور بیدار
ہے تو اس کا اظہار (ادبی ہو یا عام معاشرتی سطح پر) اس کے
مرتبے کے شایان شان ہوگا۔ یہ تو درست ہے کہ ادب کو
خاص نظریے کا "مکر" بنانا مناسب نہیں لیکن ادب
ز تو بہرحال کسی نہ کسی نظریے اور نظام حیات کا پابند
تا ہے یا یہ کہ اسے پابند ہونا ہی چاہئے۔ اباحیت اور بے
روی کا نام آزادی نہیں۔ فلسفے اور فلسفیوں کے بارے
زیادہ نہیں جانتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ بے قید فکر سے
سار انتشار کا دروازہ کھل جاتا ہے جب کہ خود اس کے
اس کے بند کرنے کی کوئی قوت اور صورت موجود
تی۔

نسان کے اپنے خالق اور مالک و معبود سے ایمانی رشتہ
بنیادوں پر استوار کرنے کی اب بس ایک ہی صورت
اللہ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ
سلم کے لائے ہوئے دین کے مطابق خالق کی غلامی سے

آزاد ہو کر اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک حقیقی کی غلامی میں
دے دے اور اس کی بندگی اپنے شعور اور ارادے کے ساتھ
قبول کرلے۔ یہ غلامی اور بندگی ہر قسم کی غلامی سے نجات
دے سکتی ہے خواہ وہ افکار و نظریات کی غلامی ہو یا افراد و
اقوام وغیرہ کی۔ اس طرح وہ صحیح معنوں میں "آزادی" کی
نعمت سے بہرہ مند اور فیض یاب ہو سکتا ہے۔ دین اسلام
مالی آخرت اور اقتدار کا بانی ہے اور انسان کی مادی (دنیوی) اور
اخروی فلاح کا یقینی ضامن ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے
بارے میں برادران وطن اور برادران عالم کے ذہنوں میں
جو غلط فہمیاں ہیں اور بدگمانیاں بھی پیدا کی ہیں، انہیں دور کرنا
توحید و رسالت محمدی اور آخرت کے ماننے کا دعویٰ کرنے
والوں کی ذمہ داری ہے، اپنے عمل سے بھی اور اپنے قول
سے بھی۔ محض غلط فہمیاں ہی نہیں ہیں، متعدد غلطیاں بھی
دعوے داران اسلام سے ہو رہی ہیں اور ہو رہی ہیں، ان کا ازالہ اور
اصلاح بھی ضروری ہے۔ اسلام ہی دنیا میں امن و ترقی اور
آخرت میں نجات کا واحد چارہ ہے۔ اسلام انسانیت کے
مستقبل کی واحد امید ہے۔ اللہ کرے غلط فہمیوں کی گرد چھٹے،
تعصب کے بادل چھٹیں اور انسان اپنے اصلی مقام کو پہچان
لے۔

الحق فیل اللہ الیٰ رب العالمین ہے، محض رب
المسلمین نہیں۔ تمام انسان بنی آدم اور آپس میں بھائی بھائی
ہیں۔ رنگ و نسل، علاقہ، زبان، ذات برادری، جاہ و ثروت اور
مادی قوت و شوکت کی مصنوعی تفریقیں اور ان کی بنیاد پر کسی
کو برتر اور کسی کو کمتر سمجھنا انسانی شرف کی ہتک توہین ہے۔
سید المرسلین، خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین، سرور عالم، ہادی اکرم،
صادق و مصدوق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے
ایک ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ جو اپنے لئے پسند کرو وہی اپنے
بھائی کے لئے بھی پسند کرو۔ ایمان و اسلام اور حضورؐ سے
محبت کے دعوے داروں کو چاہئے کہ جب انہوں نے دین
اسلام کو اپنے لئے نظام حیات کے طور پر پسند کیا تو دنیا کے
اپنے بھائیوں کے سامنے اسے بے کم و کاست واضح طور پر
پیش کریں۔ حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ اور اپنی عملی
زندگیوں سے اسلام کی برکتوں اور فیض رسانیوں کی شہادت
دیں۔ انسان کو اللہ نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اسلام
انسانی فطرت کی پکار ہے۔ توقع ہے کہ ان غلط فہمیوں کی
گرد میں چھٹیں گی، جہاں جہاں تعصب کے بادل ہیں وہاں وہاں
سے یہ بادل چھٹیں گے اور دنیا اسلام کے سایۂ رحمت میں امن
و سکون پاسکے گی۔ [illegible] بات [illegible] والے
کا نام احسن طریقے سے بات [illegible] ہے۔ دلوں کا

پہ سلنے والا وہ ہی ہے جس نے انسانوں کے سینوں میں دل کو
جگہ دی اور انہیں عقل و شعور اور تخلیق و عمل کی صلاحیتوں اور
قوتوں سے نوازا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ عزوجل آپ کو
جزائے خیر دے اور اجر جزیل سے سرفراز فرمائے۔

برادرم محمد صلاح الدین پرویز کی اس بات سے مجھے
اتفاق ہے کہ ادبی دنیا کا یہ عہد "عہد فاروقی" ہے۔ محترم شمس
الرحمن فاروقی کا مضمون "شاعر" میں دیکھ کر مجھے بھی بڑی ہی
بہت خوشی ہوئی تھی لیکن مجھے بھی وہ کچھ "تشنہ تکمیل" سا
محسوس ہوا تھا۔ فاروقی صاحب کی علمی ژرف نگاہی اور سخن فہمی و نقد
دی سے یقین ہے کہ وہ "اس عہد" کے ادیبوں اور
شاعروں پر بھی لکھیں گے اور خوب لکھیں گے، ان شاء اللہ۔
لیکن بھائی محمد صلاح الدین پرویز میرے خیال میں غالب
میر کی فاروقی صاحب کی بازیافت خود بجائے عہد کی ترجمانی اور
شناخت کا ایک موثر اور بلند معیار بھی تو ہے۔ اللہ جل شانہٗ
صحت و تندرستی کے ساتھ فاروقی صاحب کو عمر دراز عطا
کرے۔ "ہائیکو" کے بارے میں بشر بھائی (اشرف
صاحب) کے فکر انگیز شذرے پر بحث سود مند ثابت ہو سکتی
ہے لیکن میری رائے میں یہ صنف اردو کے شعری مزاج
سے کچھ ایسی مناسبت نہیں رکھتی، البتہ "ترائیلے" کی شکل
اور اس میں مصرعوں کی تکرار سے پیدا ہونے والی صوتی
اردو کے مزاج سے نسبتاً زیادہ قریب محسوس ہوتی ہے۔
راحت حسن صاحب کی غزل میں ردیف پر جگہ نہیں مل سکی
ہے۔ دیکھئے دوسرا، تیسرا، چوتھا شعر اور مقطع۔ میں کہاں ہوں
کہاں اشعار میں "ہو سکتے ہونے" کا عمل ہے۔ راحت حسن
صاحب سے گزارش ہے کہ وہ میری اس تجویز پر غور
کریں۔ آپ نے اعلان کیا اردو کے چند [illegible] مسائل پر
جرائد کے خاص نمبر شائع کئے۔ ایسے دیگر مسائل کے خاص نمبر بھی
شائع کریں تو احسن ہے [illegible] کے مزاج کا اندازہ ہو سکے گا
مشمولات [illegible] حاصل ہو۔

★ حیدر ربانی — [illegible]

"شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ سرورق بہت جاذب نظر [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] جس میں انہوں نے لکھا ہے
"[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]"

ہو گیا ہے — ا — سوتا ہو گیا ہے —!!

اس ایک سطر میں شاعر نے آنکھ کی پوری شخصیت دی ہے۔ یعنی آپ سو جاتیں، تیار ہوا سوتا۔ آنکھوں کو خیرہ کرنے والا سوتا اور دوسری دھاتوں پر ملمع کر اس دھات کو خوبصورت بنانے والا سوتا۔ شروان کمار ورما کا افسانہ "خواہش" پسند آیا جو بڑی حقیقت پسندی سے لکھا گیا ہے۔ شاہد اختر کا افسانہ "برف پر ننگے پاؤں" پوسنیا کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں میں شاید سب سے خوبصورت افسانہ ہے۔ ایک کم عمر افسانہ نگار بزرگوں جیسا لکھ رہا ہے اور یہ معمولی بات نہیں۔

نذیر آزاد — آزاد منزل، کرگل، لداخ (کشمیر)

محمد علی صدیقی کا مضمون "اردو کے بین الاقوامی مسائل کا کردار" معلوماتی ہونے کے باوصف سرسری اور سطحی نوعیت کا ہے۔ صدیقی صاحب نے اس مضمون کی ابتدائی تمہید میں مستشرقین کی بعض اردو لغات کا تذکرہ کیا ہے اور روایتی انداز میں مسٹر کورج کیٹو کی لغت (۱۷۴۳ء) کو اس نوعیت کی پہلی لغت قرار دیا ہے جو کہ جدید تحقیق کی رو سے غلط ہے۔ اس لغت کا تذکرہ گریرسن نے "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" کی نویں جلد میں مسٹر کورج کے جنرل کیٹلاگ ——— کے حوالے سے کیا ہے جو کہ بالاتفاق دستیاب نہیں ہے۔ اس لئے مسٹر کورج کو اس لغت کا مولف قرار دینا غلط ہے۔ اس لغت کے ساتھ کورج کا تعلق صرف حوالے کا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مولف نامعلوم ہے البتہ گریرسن کے مطابق یہ لغت ۱۷۴۳ء میں سورت کے انگریزی کارخانے میں تالیف کی گئی۔ زمانہ حال کی تحقیقات کی روشنی میں اسے مستشرقین کی قدیم ترین لغت قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اردو لغت (تاریخی اصول پر) کراچی مطبوعہ ترقی اردو بورڈ کراچی (۱۹۷۷ء) میں اس سے بھی قدیم لغت کے بارے میں لکھا ہے جو کہ ان کے ایک مستشرق شاگرد ڈاکٹر جان بورف نے دریافت کی ہے۔ ڈاکٹر صدیقی کے مطابق اس کے مولف کا نام چیرونیمو خادر ——— ——— ہے جس کے ہندوستان میں قیام کا زمانہ ۱۷۰۴ء اور ۱۷۱۵ء کے درمیان کا ہے اور یہ لغت ۱۷۰۴ء سے پیشتر لکھی گئی تھی۔ یہ ہندوستانی، فارسی اور پرتگالی میں ہے اور جس کا عنوان ہے HINDUSTANI PERSISCH-VOCABULASUIM — PORTUGIESISCH PORTUGUEZ HINDUSTANI PERSIANISCH ڈاکٹر بورف نے اس لغت کی ماٹکرو فلم گوا کی SOCIAL BRICE لائبریری کے کتب خانے سے حاصل کی ہے اور وہی اسے مرتب اور شائع کر رہے ہیں۔ محمد علی صدیقی نے دوسری لغت کے بارے میں جو معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ بھی صحیح نہیں ہیں۔ اس لغت کے بارے میں بھی گریرسن نے مذکورہ کتاب میں لکھا ہے کہ یہ کیپوچن راہب فرانسیس کس تعدادی کی تالیف ہے۔ اس کی دو جلدیں ہیں (نہ کہ ایک) اور دونوں کی ضخامت ایک ہزار صفحات ہے (نہ کہ پانچ سو صفحات) اور یہ لغت اب روما کی پروپیگنڈا لائبریری میں موجود ہے۔ اسی طرح اگرچہ ہردوشیا کے باشندہ (جو کہ شاہ عالم اور جہاندار شاہ کے دربار میں ڈچ سفیر کی حیثیت میں تھا) جان جوشوا کیٹلر نے ۱۷۱۵ء میں GRAMMATICA HINDOSTANICA ترتیب دی لیکن اسے جارج ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ یہ صرف و نحو کی کتاب ہے اور اس میں ہندوستانی الفاظ و محاورات رومن حروف میں ہیں۔

اصغر علی انجینئر کے مضمون "اردو تنقید نئی سمت، نئی قدریں" میں پڑھ کر مسرت ہوئی کہ وہ ادب اور تنقید کو کسی بھی نظریے کی چیری بنانے کے حق میں نہیں ہیں۔ لیکن انہوں نے بھی عام جدیدیت مخالف حضرات کی طرح جدیدیت کے رد میں یہی لکھا کہ یورپ میں دو عالمی جنگوں کے رد عمل میں وجود میں آئی اس لئے برصغیر میں اس کا چلن مردود ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ کیا ہمارے یہاں کی مختلف قسموں کی شدت پسندی، رشوت ستانی، آمریت، دفتری طوالت، فسادات اور سب سے بڑھکر دو بار ہند پاک جنگیں اور ایک بار ہند چینی تصادم انسان کے احساس تنہائی کے لئے کافی نہیں۔ نیز زندگی کی طرف رجحان چاہے وہ مثبت ہو یا منفی، بہر حال زمین کے ساتھ وابستگی اور مٹی کی دلیل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صاحب مضمون کا نظریے سے وابستگی کی تردید کے باوجود یہ کہنا کہ ادب سے سماج کی حقیقت بدل دی جا سکتی ہے گھوم پھر کر ترقی پسندی کی طرف مراجعت کے مترادف ہے۔ سماج کی حقیقت نہ کلاسیکی ادب (بقول ترقی پسند حضرات بورژوا ادب) سے بدل سکی اور نہ ہی ترقی پسند ادب اور تنقید سے۔ پھر آپ ایسی توقع کیوں کر جدیدیت یا مابعد جدیدیت سے رکھ سکتے ہیں؟۔ اس مضمون کے حوالے سے ایک اور بات عرض ہے کہ نظریاتی وابستگی کے باوجود بھی عظیم ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے اور وہ ٹیس، درتہ، اقبال اور فیض اس کی زندہ مثالیں ہیں شرط یہ ہے کہ ادب نظریے کا پروپیگنڈہ نہ بنے۔

فضا ابن فیضی کی رباعیات کو ہلکا کے گورکھ دھندے کے علاوہ اور کس نام سے پکار سکتے ہیں حالانکہ ان کی غزلیں بڑی جاندار اور پرکشش ہوتی ہیں۔ ان رباعیوں کے بجائے اگر ادب اور حقیقی تنقید کے عنوان سے مضمون لکھتے تو زیادہ بہتر رہتا کیونکہ ان کے اس فتوے پر عمل کر سکتے کہ وہ خود اپنے ادب کا نقاد ہوتا ہے۔ برادر عزیز عبدالاحد ساجنی کا مکتوب پڑھنے کے بعد یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ ساجنی صاحب شعر و شاعری کی تنقید کر رہے ہیں یا اپنی تنقیص۔ شمارے کی دیگر منظومات ٹھیک ہیں، البتہ علامہ سیماب کی غزل، آپ کا اداریہ، اکبر حیدرآبادی کی غزل اور محمد صلاح الدین پرویز کی نظمیں اور مکتوب خصوصی مطالعے کی چیزیں ہیں۔

★ شکیل جمالی — جامع مسجد مارکیٹ چاند پور

"شاعر" کا تازہ شمارہ نظر سے گزرا۔ "اردو کے بین الاقوامی رسائل کا کردار" اور "اردو تنقید نئی سمت نئی قدریں" دونوں مقالے عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ غزلیات کے حصے میں اکبر حیدرآبادی اور بشیر بدر کی غزلیں عمدہ ہیں۔ بشیر بدر تخلیقی سطح پر جب جب سنجیدہ ہوتے ہیں، اچھی شاعری تخلیق ہوتی ہے۔ نظام ہاتف، پرویز اختر اور لعمان شوق کی غزلوں کے کچھ اشعار تازگی لئے ہوئے ہیں۔ صلاح الدین پرویز کا خط اور نظمیں دونوں توجہ طلب ہیں مگر شمس الرحمن فاروقی اتنے ظالم آدمی ہیں کہ وہ اتنے پر بھی توجہ نہیں کریں گے۔ موصوف خط کی ابتدا یوں کرتے ہیں "تمہارا سارا دن، بدن روشن ہوتا جا رہا ہے۔ ایک دن ایسا آئیگا کہ یہ سارا ہمارے عہد کی پہچان بن جائیگا (آمین)۔ تم بہت اچھے مرد ہو، بہت اچھے شاعر ہو، بہت اچھے مومن ہو اور بہت اچھے انسان بھی ہو۔ اتنے بہت زیادہ اچھے تم میں کیوں شامل ہو گئے"۔ موصوف آگے شمس الرحمن فاروقی کو یوں خوش کرتے ہیں "یہ عہد فاروقی صاحب کا عہد ہے، میری ان سے گزارش ہے کہ وہ اس عہد کے ادیبوں، شاعروں اور منظر ناموں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لکھیں۔ میرا نام کو چھوڑ کر ہم ایسے فقیروں کی طرف بھی توجہ دیں"۔ اوگی اپنے ذرا سے فائدے کے لئے کیسے کیسے طریقے اختیار کرتا ہے اسکی زندہ مثال انکی نظمیں ہیں جن میں سے ایک زبردستی آپ کے ساتھ نتھی کر دی گئی ہے۔ نظم کم پڑ گئی تو دو شخصیتوں (قرۃ العین اور شمس الرحمن فاروقی) کو ایک میں ملا دیا گیا۔ آپ اس قسم کی شاعری کو شاعر میں شائع کر کے کون سا ادبی کارنامہ انجام دینا چاہتے ہیں یا اردو شاعری کو چڑیوں کی کوکھوں، پھولوں کے کرلیوں اور سوتیا بند کی ماری ہوئی آنکھوں سے کیا تعفن باہر نکالنا چاہتے ہیں۔

فکرِ امروز

✻

بے شک، عربی اور فارسی مسلمانوں کی قدیم قومی زبانیں ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں آئی ہیں اس لئے عقیدت کی طرف سے یہ تمنیہ کی جا سکتی ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انھیں زبانوں کی تقلید ہمارے لئے منتہائے سعادت مندی ہے۔ لیکن یہاں عقیدت کا سوال نہیں، علم و فن کا سوال ہے۔ ہم عقیدتاً اور مذہباً عربی و حجازی فطرت کی تقلید کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں لیکن جب وطنیت کے اعتبار سے لسانی سوال پیدا ہوتا ہے تو ہمیں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم فنی نقطۂ نگاہ سے اردو شاعری کے قواعد بھی اپنے ہی بنائیں تاکہ ہماری زبان اور ہماری شاعری کسی دوسری زبان کے قواعد و ضوابط کی محتاج اور پابند نہ رہے۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح تقلید سے اجتہاد کی طرف بڑھنا چاہیئے۔

[۱۲ دسمبر ۱۹۳۰ء]

سیماب اکبرآبادی

شاعر

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰

یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۶ واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد — ۶۶
شمارہ — ۷

فون: ۳۸۲۹۹۰۴

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۷ روپے

✻

زرِ سالانہ ۷۵ روپے ◆ لائبریریوں سے ۹۰ روپے

شاعر خریداری ۱۳۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۵۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

شاعر

ہم عصر اردو ادب نمبر

[دو جلدوں میں]

اردو شعر و ادب کا ایک خوب سیرت عالمی گاؤں
۲۱ ویں صدی کے نام

*

تعمیر و تشکیل کے ناتمام منظر نامے

باب ۵ مقالات

● ۱۴۰ سے زائد ناقدینِ ادب نے ہم عصر شاعری، افسانہ، ڈرامہ، ناول، تنقید، طنز و مزاح، سوانح، تحقیق، فنونِ لطیفہ اور اردو زبان و ادب کے مختلف مسائل پر فکر انگیز مضامین لکھے ہیں۔

ابن فرید ابوالکلام قاسمی احمد سہیل
اخلاق اثر اسلم حنیف اطہر فاروقی
ایش کمار ایوب جوہر بشر نواز
تارا چرن رستوگی جمیل جالبی حامدی کاشمیری
حنیف نقوی خورشید احمد خورشید سمیع
دیویندر اسر رضا نقوی واہی سحر انصاری
سعید انجم سلیم اختر سلیمان اطہر جاوید
سلیم شہزاد سید حامد حسین سید مبارک علی
شمس الرحمٰن فاروقی شمس بدایونی شمیم صبا متھراوی
شوکت حیات شین کاف نظام شہاب سرمدی
ظفر کمالی ظہیر احمد صدیقی ظہیر غازی پوری
عبدالقوی ضیاء عبداللطیف اعظمی عتیق اللہ
عصمت جاوید علی جواد زیدی علی حماد عباسی
علی سردار جعفری عنوان چشتی قاضی تیمور سلام
قمر رئیس کالی داس گپتا رضا کاوش بدری
کرامت علی کرامت کمال احمد صدیقی گوپی چند نارنگ
گیان چند جین لطف الرحمٰن محمد حسن
منصور عالم محمود ہاشمی نامی انصاری
نثار احمد فاروقی نظام صدیقی وارث علوی
وزیر آغا وہاب اشرفی یوسف سرمست

باب ۱ افسانہ

● ۱۶۰ سے زائد مشاہیر اور تازہ کار افسانہ نگاروں کے غیر مطبوعہ افسانے۔
● عظیم افسانہ نگاروں سے منسوب ذیلی ابواب
● ہر باب کی ابتدا ایک زندہ شاہکار کہانی سے
● معاصر اردو کہانی پر لکھی گئی اہم تنقیدی کتابوں کے حوالے، تجزیے اور اقتباسات۔
● خاص نمبر میں شامل ہر افسانہ نگار کے فن پر نقادوں کی رائے۔
● اردو افسانہ: داستان سے کہانی تک

افسانہ نگار

آصف فرخی آصف نقوی آصفہ نشاط
آغا بابر آغا سہیل آمنہ ابوالحسن
ابرار ترمذی ابراہیم اختر ابن کنول
ابن اسماعیل احمد ہمیش احمد یوسف
احمد صغیر اختر یوسف اسرار گاندھی
اشفاق احمد اسلم خان افتخار نسیم
اقبال متین اکرام باگ امجد جاوید
امراؤ طارق انجم عثمانی انل ٹھکر
انور خان انور زاہدی انور قمر
انیس رفیع اوپندر ناتھ اشک ام کرشن راحت
ایچ عصیم ایم۔ منوجہ ایوب جوہر
بشیشر پردیپ بانو قدسیہ بلراج ورما
بنت مسعود بیگ احساس تسکین زیدی
جمشید مسرور جوگندر پال جیلانی بانو
حبیب کیفی حسن جمال حیدر قریشی

حسین الحق حمید سہروردی خالد جاوید
خالد سہیل خورشید اکرم خورشید عالم
دیویندر ستیارتھی ذکیہ مشہدی رام لعل
رتن سنگھ رشید امجد رضا احمد ادیب
رضاء الجبار رضوان احمد رفیع حیدر انجم
رفیعہ منظور الامین ریاض قاصدار زاہدہ حنا
زیتون بانو زیب اختر ساجد رشید
ساگر سرحدی سریندر پرکاش سعید انجم
سلام بن رزاق سلطان جمیل نسیم سلطان سبحانی
سلیم اختر سیدہ حنا شام بارکپوری
شاہد اختر شاہین نظر شرون کمار ورما
شفق شفیع مشہدی شکیب رضوی
شکیلہ رفیق شمس نعمانی شموئل احمد
شمیم حیدر شوکت حیات شہناز کنول
شیخ سلیم احمد ش۔ اختر ش۔ منیر ادیب
ش۔ مظفر پوری صدیق عالم صغرا مہدی
صغیر رحمانی صفیہ صدیقی طارق چھتاری
طاہر نقوی ظفر اوگانوی عابد جعفری
عارف انوبی عارف خورشید عباس خان
عبدالصمد عبدالعزیز خان عذرا اصغر
عذرا پروین عذرا نقوی عشرت بیتاب
عطا عابدی علی امام نقوی علی تنہا
علی حیدر ملک عوض سعید غضنفر
غلام محمد فاروق راہب فرحت جہاں
فیروز عابد فیصل ایم فاروقی قاسم خورشید
قاضی عبدالستار قمر جہاں قمر قدیر ارم
قمر حسین کوثر قیصر تمکین قیوم راہی
کرتار سنگھ دگل کشمیری لال ذاکر کلام حیدری

کنور سین بچن سنگھ [illegible]
گلزار جاوید محافظ حیدر محسن عثمانی
محمد افسر خان مظفر الدین فاروقی مختار سعید
مرزا حامد بیگ مشتاق مومن مشرف عالم ذوقی
مصطفیٰ کریم مظہر الزماں خان مقدر حمید
م۔ق۔ خان منظور الٰہی شیخ منظور کاظمی
منیر الدین احمد مہدی ٹونکی ناصر بغدادی
نثار راہی نریندر سنگھ بھاٹیہ نسیم محمد جان
نعیم کوثر نعیم ضیاء الدین نور الحسنین
نور پرکاش نیر مسعود وریندر پٹواری
ولی محمد چودھری ہرچرن چاولہ یوسف عارفی

طویل کہانیاں، ناولٹ، ناول

کئی طویل کہانیاں، ناولٹ۔ نئے قلم کاروں کے زیر قلم ناولوں کے ابواب معاصر اردو ناول پر تنقیدی شذرات۔

احمد یوسف الیاس احمد گدی جیتندر بلو
خالد اگاسکر خالد سہیل سید محمد اشرف
عبد الصمد عذرا پروین مشرف عالم ذوقی
ولی محمد چودھری

باب ڈراما

نامور ڈرامہ نگاروں کے ساتھ نئے ڈرامہ نگاروں کے جدید ڈرامے، معاصر اردو ڈرامہ، اردو تھیٹر، ہندوستان میں جدید تھیٹر۔

انند لہر اقبال نیازی انل ٹھکر
جاوید دانش زاہدہ زیدی شمیم حنفی
ظہیر انور [illegible] حیدر کمال احمد
مبین صدیقی محمد حسن

باب طنز و مزاح، انشائیہ

طنز و مزاح اور انشائیہ کے نامور قلم کاروں کی تازہ تحریریں۔ تازہ کار قلم کاروں کے تخلیقی شگوفے۔ معاصر طنز و مزاح انشائیہ کی صورتِ حال۔

[illegible] اشرف پرویز ید اللہ مہدی حسنین عظیم آبادی
لبیب سنگھ شفیقہ فرحت شکیل اعجاز
نسیم احمد فضل حنیف [illegible]
مجتبیٰ حسین محمد اسد اللہ یوسف ناظم

نقد و نظر

شاعر کو موصولہ ۱۹۹۰ء کے بعد کی مطبوعات پر تبصرے۔ کئی اہم کتابوں کے طویل تجزیے کتابوں کی باتیں۔

انور خان بشر نواز مہاراج کومل
جاوید اقبال حامد اقبال صدیقی حامد اللہ ندوی
حمید الماس ساجد رشید شین کاف نظام
صفدر امام قادری عبد الاحد ساز عتیق اللہ
محافظ حیدر ندا فاضلی یعقوب راہی

باب شاعری

- معاصر عالمی اردو شاعری کا ضخیم ترین غیر مطبوعہ انتخاب
- ۱۵۰۰ سے زائد شعراء کی شمولیت
- مشاہیر شعرا کا کلام [بخطِ شعرا]
- کلاسیکی روایت کے امین بزرگ شعرا
- نئی نسل کے شعرا
- نووارداں شاعری
- مابعد جدید شاعری پر شذرات

آدم نصرت آذر بارہ بنکوی آر۔پی۔ شوخ آزاد گورداسپوری
آزاد گلاٹی آس نیری آشا پربھات آشفتہ چنگیزی
آفاق صدیقی آفاق عالم صدیقی آفاق فاخری آفتاب [illegible]
آفتاب اقبال شمیم آفتاب عالم آل احمد سرور آمر صدیقی
ابرار احمد ابراہیم اشک ابو محمد سحر ابوالخیر نشتر
اثر طوری ابہام رشید احتشام اختر احترام اسلام
احسان شام احسن شفیقی احسن عزیز احمد سعید
احمد سہیل احمد ظفر احمد صغیر صدیقی احمد عارف
احمد کمال احمد کمال پروازی احمد فراز احمد محفوظ
احمد منظور احمد نثار احمد ندیم قاسمی احمد رضی
احمد وصی احمد ہمیش اختر آذری اختر الایمان
اختر بستوی اختر جمال اختر سعید خاں اختر شاہجہانپوری
اختر ضیائی اختر لکھنوی اختر نظمی اختر ہوشیارپوری
اخلاق بسوانی ادا جعفری ادیب سہیل ارتضیٰ نشاط
ارشاد باری ارشد جمال ارشد طارق ارشد ارشد محمود ناشاد
ارشد عبد الحمید ارشد کمال [illegible] ارمان نجمی
اسد رضا اسد رضوی اسرار احمد [illegible] اسرار اکبر آبادی
اسعد بدایونی اسلم بدر اسلم ثاقب اسلم حنیف
[illegible] اشرف انصاری اشرف سلیم اشرف عادل
اشعر علیگ اشفاق انجم اشفاق حسین اشفاق عادل
اشفاق قلق اشہد ہاشمی اظہر راز اظہر عباس عابد

اطہر فاروقی اطہر سلیم اطہر نسرت اظہر سبحان
اظہر عنایتی اظہر نیر اعتماد صدیقی اعجاز احمد اعجاز
اعجاز تابش اعجاز منصور اعزاز افضل [illegible]
افتخار امام صدیقی افتخار انجم افتخار عارف افتخار [illegible]
افتخار نسیم افضال ملک افضال نوید اقبال انجم
اقبال خلش اقبال کرشن اقبال مسعود اقبال ملک
اکبر حمیدی اکبر حیدرآبادی اکبر علی خاں عرشی زادہ اکرام تبسم
اکرام خاور اکرم کمال اکرم نقاش اکمل امام
امام اعظم امان اختر امان اللہ ساغر امتیاز نسیم
امجد اسلام امجد امیر قزلباش امیر خوشاب امین [illegible]
انجم سلیمی انجم رہبر انجم عرفانی انجم [illegible]
اندر کرشن تنہا اندر موہن کیف [illegible] [illegible]
انوار انجم انوار فیروز انور ادیب انور انصاری
انور ایرج انور تاباں انور حسین انور انور شیخ
انور مینائی انور ندیم انیس احمد خاں انیس اشفاق
انیس انصاری انیس سلطانہ انیس [illegible] [illegible]
اویس احمد دوراں اے۔بی۔ بہار ایم۔ آئی۔ ساجد ایم۔ [illegible]
ایم۔ بی۔ مشتاق ایم۔ نصر اللہ نصر ایم۔ کے۔ اثر ایم۔ ایم۔ [illegible]
ایوب صابر باقر مہدی باقر نقوی باسط [illegible]
بخش لائلپوری بدر عالم خلش بدر ظہیری بسمل [illegible]
بسمل نقشبندی بشر نواز بشیر بدر بشیر [illegible]
بشیر فاروقی بلراج کومل بلراج کومل [illegible]
بلقیس ظفیر الحسن بلند اقبال [illegible] [illegible]
پردیپ ساحل پرکاش تیواری پرکاش فکری [illegible]
پرویز اختر پرویز رحمانی پروین راجہ پروین [illegible]
پروین کمار اشک پروین شاکر پریم کمار نظر [illegible]
[illegible] پی۔ پی۔ ایل۔ رتن پیرزادہ قاسم [illegible]
تابش مہدی تاج پیامی تاج سعید [illegible]
تحسین منور تسلیم نیازی تسنیم عابدی تسنیم [illegible]
تنویر سامانی تنویر [illegible] [illegible] [illegible]
توقیر [illegible] ثروت حسین ثمر [illegible] [illegible]
ثمینہ راجہ شاکر [illegible] جابر حسین جاوید [illegible]
جاوید اختر آزاد جاوید اشرف [illegible] جاوید اکرم جاوید [illegible]
جاوید ندیم جبار جمیل [illegible] جعفر [illegible]
جعفر عسکری جگن ناتھ آزاد جلیس نجیب آبادی [illegible]
جمال اویسی جمال قریشی جمشید مسرور [illegible]
جمیل الدین عالی جمیل الرحمن جمیل [illegible] جمیل [illegible]
جنید حزیں لاری جوہر [illegible] جون ایلیا [illegible]
جینت پرمار چندر بھان خیال [illegible] [illegible]
حامد اکمل حامد مجاز حباب ہاشمی [illegible]
حسن رضا [illegible] حسین عابد [illegible]
حسن عزیز حسن فرخ حسیب سوز [illegible]

حفیظ آتش	حفیظ انجم	حفیظ بنارسی	حفیظ نواز
حکیم [illegible]	حکیم منظور	حکیم یوسف حسین	حمایت علی شاعر
[illegible]	حمید الماس	حمیرہ رحمان	حنا انجم
حنیف اخگر	حنیف ترین	حنیف کیفی	حنیف نجمی
حیات لکھنوی	حیدر قریشی	خ ز [illegible]	خالد اختر
خالد اقبال یاسر	خالد بشیر	خالد سجاد	خالد جمال
خالد حسین [illegible]	خالد رحیم	خالد سعید	خالد عبادی
خالد عبداللہ	خالد کفایت	خالق جعفری	خان جمیل
خداداد مونس	خسرو متین	خلش [illegible]	خلیل الرحمن راز
خلیل تنویر	خلیل مامون	خمار قریشی	خواب اکبر آبادی
خورشید اکبر	خورشید افسر بسوانی	خورشید اکبر	خورشید رضوی
خورشید سحر	خورشید طلب	خورشید وحید	خوشتر مکرانوی
خوشنود بخاری	دلدار ہاشمی	دلکش غازیپوری	دلنواز صدیقی
دلیپ بادل	دیپک شمیم	دیپک قمر	ذاکر وارثی
ذکاء الدین شایاں	ذکاء صدیقی	ذکی بلگرامی	ذکی طارق
ذیشان ساحل	راج نرائن راز	راج کمیتی	راجیندر ناتھ رہبر
راحیل [illegible]	راحت [illegible]	راحت حسن	راز اشادی
راز [illegible]	راشد آذر	راشد حسن راشد	راشد احمد راشد
راشد [illegible]	راشد جمال فاروقی	راغب شکیب	راغب مراد آبادی
[illegible]	راہی فدائی	راہی قریشی	رحمان [illegible]
رحمت [illegible]	رزاق [illegible]	رشید اعجاز	رشید افروز
رشید [illegible]	رشید منظر	رشید جمال	رضا اشک
رضا [illegible]	رضا حیدری	رفعت سروش	رفیق [illegible] عابدی
رفیق انجم	رفیق جعفر	رفیق راز	رفیق سندیلوی
[illegible]	رمز آفاقی	رونق شہری	رونق نعیم
رؤف جاوید	رؤف خلش	رؤف خیر	رؤف رحیم
رؤف رضا	رئیس الدین رئیس	ریاض [illegible]	ریاض لطیف
ریحانہ [illegible]	زاہد [illegible]	زاہد امر	زاہد کمال
زاہدہ زیدی	زبیر رضوی	زبیر شفائی	زینت [illegible] ساجد
زین راموش	ساجد حمید	ساجدہ زیدی	ساحر افغانی
ساحر شیوی	ساحل احمد	ساز [illegible]	ساغر جیدی
ساغر [illegible]	ساقی فاروقی	ساقی [illegible]	ست [illegible]
ستیہ پال آنند	سجاد مرزا	سجاد سید	سحر سعیدی
سخاوت شمیم	سراج اجملی	سردار ابسام	سردار شفیق
سرشار بلند شہری	سرفراز شاکر	سرور صہبائی	سرور ساجد
سرور عالم راز	سعید [illegible]	سید مظفر [illegible]	سعید روشن
سعید عارفی	سعید قیس	سلطان احمد [illegible]	سلطان اختر
سلمیٰ [illegible]	سلیم انصاری	سلیم سرفراز	سلیم شہزاد
سلیمان خمار	سوہن راہی	سہیل احمد زیدی	سہیل اختر
سہیل شفیق	سہیل فاروقی	سہیل کاکوروی	سید احمد سحر
سید احمد شمیم	سید شکیل دسنوی	سید محمد اشرف	سیفی پریمی

سیفی سرونجی	سیما فریدی	شاداب [illegible]	شاد عباسی
شاذ تمکنت	شارق جمال	شارق عدیل	شارق کیفی
شافع ادیب	شان [illegible]	شان بھارتی	شاہ حسین نہری
شاہد اختر	شاہد [illegible]	شاہد جمیل	شاہد رضا
شاہد عزیز	شاہد کبیر	شاہد کلیم	شاہد لطیف
شاہد ماہلی	شاہد نصیب آبادی	شاہد میر	شاہدہ حسن
شاہدہ نسیم	شاہین اقبال	شاہین بدر	شاہین مفتی
شائق مظفرپوری	شائستہ یوسف	شبیر آصف	شبنم رومانی
شبنم شکیل	شبنم عشائی	شبنم مناوری	شجاع خاور
شجاع فرحی	شرد غازیپوری	شرف کمالی	شریف احمد
شعیب نظام	شفق سوپوری	شفیق سلیمی	شفیق [illegible]
شکیب ایاز	شکیل اعظمی	شکیل جمالی	شکیل قمر
شکیل مظہری	شگفتہ طلعت سیما	شمس بدایونی	شمس تبریزی
شمس رمزی	شمس فرخ آبادی	شمیم انور	شمیم [illegible]
شمیم طارق	شمیم فاروقی	شمیم قاسمی	شمیم یوسفی
شناور [illegible]	شوکت عظیم	شوکت ماہری	شہاب اختر شہاب
شہاب اشرف	شہپر رسول	شہریار	شہزاد احمد
شہناز نبی	شہید [illegible]	شین کاف نظام	شین [illegible]
صابر آفاقی	صابر ابوہری	صابر زاہد	صابر [illegible]
صابر فخرالدین	صابر [illegible]	صادق	صبا اکرام
صدف جعفری	صدیق مجیبی	صغرا عالم	صفدر رضا
صمد انصاری	صہبا وحید	صلاح الدین نیر	ضمیر درویش
ضمیر کاظمی	ضیا [illegible]	ضیا جالندھری	طارق [illegible]
طارق متین	طارق نعیم	طفیل [illegible]	طلعت عرفانی
طیب آزاد	ظفر اقبال	ظفر اقبال ظفر	ظفر امام
ظفر صہبائی	ظفر غوری	ظفر گورکھپوری	ظفر مراد آبادی
ظفر ہاشمی	ظہیر آتش	ظہیر [illegible]	ظہیر غازی پوری
ظہیر ناشاد	عابد اللہ غازی	عابد جعفری	عابد مناوری
عاصم [illegible]	عارف سیمابی	عارف شفیق	عاشور کاظمی
عاصم [illegible]	عاصی کاشمیری	عالم خورشید	عامر ریاض
عباس دانا	عبدالاحد ساز	عبداللہ کمال	عبدالحمید
عبدالوہاب [illegible]	عبدالسلام کوثر	عبدالصمد تپش	عبدالرحیم نشتر
عبدالقادر [illegible]	عبدالمتین جامی	عبرت [illegible]	عتیق احمد عتیق
عتیق اللہ	عتیق انظر	عذرا پروین	عذرا نقوی
عرش صدیقی	عرش صہبائی	عرفان [illegible]	عرفان صدیقی
عرفانہ عزیز	عزیز بانو [illegible]	عزیز [illegible]	عزیز تمنائی
عزیز قیسی	عشرت [illegible]	عشرت ظفر	عشرت قادری
عصمت [illegible]	عطاء الحق قاسمی	عطاء الرحمن [illegible]	عطا عارف
عفت [illegible]	عقیل شاداب	عقیل [illegible]	علقمہ شبلی
علی احمد جلیلی	علی جواد زیدی	علی سردار جعفری	علی ظہیر
علی [illegible]	علیم اللہ حالی	علیم صبا نویدی	عمران انصاری

عمران [illegible]	عمران عظیم	عنبر بہرائچی	عنبر شمیم
عین تابش	عین رشید	غالب عرفان	غضنفر
غضنفر غزنی	غلام حسین ساجد	غلام [illegible] تابش	غلام مرتضیٰ راہی
غنی اعجاز	غوث [illegible]	غیاث متین	فاخر جلالپوری
فاروق [illegible]	فاروق شفق	فاروق شکیل	فاطمہ حسن
فخر [illegible]	فراز [illegible] پوری	فراغ روہوی	فرحت احساس
فرحت [illegible]	فرحت قادری	فرخ جعفری	فردوس گیاوی
فرہاد آذر	فریدہ [illegible]	ف س اعجاز	فصیح اکمل
فصیح اللہ نقیب	فضا ابن فیضی	فضل افضل	فضل تابش
فضل المتین	فضیل جعفری	فکری بدایونی	فوق کریمی
فہیم [illegible] پوری	فہیم نادر	فیاض [illegible]	فیاض رفعت
فیروز اختر	فیروز مرزا	قاصر [illegible]	قاضی انصار
قاضی حسن رضا	قاضی رئیس	قاضی سلیم	قاضی [illegible]
قائم علی غوری	قتیل شفائی	قمر ادیب	قمر جمیل
قمر [illegible]	قمر قدیم ارم	قمر نقوی	قمر علی قمر
قیصر علی [illegible]	قیصر الجعفری	قیصر شمیم	قیوم خضر
کاشف قمر	کالی داس گپتا رضا	کامران نجمی	کاوش بدری
کاوش پرتاپگڑھی	کاوش عباسی	کبیر اجمل	کرامت بخاری
کرشن ادیب	کرشن کمار طور	کرشن مرلی	کرشن موہن
کریم خان ساز	کریم مورجوی	کفیل آزر	کفیل اکمل
کلیم حاذق	کلیم ضیا	کمال [illegible]	کمال جعفری
کوثر مظہری	کیف بلگرامی	کیفی سنبھلی	کیلاش ماہر
گلزار [illegible]	گلشن کھنہ	گوہر شیخ پوری	لطیف [illegible]
لطیف شاہد	م ر خاور	ماجد الباقری	ماہ طلعت زیدی
مبارک انصاری	مبارک شمیم	متین [illegible]	مجاز نوری
مجید اختر	محبوب راہی	محبوب عالم غازی	محسن احسان
محسن بھوپالی	محسن [illegible]	محسن [illegible]	محسن زیدی
محمد اجمل نیازی	محمد احمد رمز	محمد اختر [illegible]	محمد اظہار الحق
محمد ایوب راز	محمد رفیع	محمد [illegible]	محمد صلاح الدین پرویز
محمد علوی	محمد علی اثر	محمد فیروز	محمد قاسم دہلوی
محمد کلام آزاد	محمد مختار علی	محمود [illegible]	محمود [illegible]
محمود ایاز	محی الدین [illegible] عادل	مختار احمد انصاری	مختار احمد عباسی
مختار شمیم	مخدوم اشرف	مخمور سعیدی	مدحت الاختر
مدہوش بلگرامی	مرتضیٰ علی شاد	مرغوب [illegible]	مسرور جالندھری
مسرور عابدی	مسلم شہزاد	مشتاق جاوید	مشتاق سنگھ
مشتاق شاد	مشتاق شبنم	مشتاق [illegible]	مصباح الصبیح
مصطفیٰ [illegible]	مصطفیٰ [illegible]	منصور سبزواری	مضطر مجاز
مظفر ایرج	مظفر حنفی	مظفر [illegible]	مظفر وارثی
مظہر امام	مظہر سعید	مظہر علی شاد [illegible]	مظہر محی الدین
معصوم انصاری	معصوم نظر	معظم عزم	معین احسن جذبی
مغنی تبسم	منیب الرحمن	مقیم [illegible]	ملک زادہ جاوید

ملک نسیم ممتاز لطیف منشاء الرحمٰن منشا منصور اعجاز
منصور احمد منظر اعجاز منظر سلطان منظر زمسل
منور رانا منظور چندرپوری منظور ہاشمی منیر حسینی
مہتاب حیدر نقوی مہدی پرتاب گڑھی میکش اجمیری نازش قادری
ناشاد اورنگ آبادی ناشر نقوی ناصر زیدی ناصر شہزاد
ناظم جعفری ناظم سلطانپوری ناقد نظمی ناوک حمزہ پوری
نثار احمد نثار نثار ترابی نجم عثمانی نجیب رامش
نداف فضلی ندا الفواز نذیر آزاد نذیر قیصر
نذیر فتحپوری نریش نزہت صدیقی نسیم سحر
نسیم سید نشتر اکبرآبادی نشتر خانقاہی نصرت گوالیاری
نصر غزالی نصر قریشی نصر ملک نصیر احمد ناصر
نصیر پرواز نظام اختر نظام الدین نظام نظام ہاتف
نظر بریلوی نظیر صدیقی نعمان شوق نعیم صبا
نعیم صدیقی نعیمہ ضیاء الدین نکہت بریلوی نور الحسن ہاشمی
نور تقی نور نور جمالی نور جہاں ثروت نور جہاں نوری
نور محمد یاس نوشاد احمد کریمی نوشی گیلانی نوید ہاشمی
نیاز جیراجپوری نیر جہاں نیر گنگوہی واجد قریشی
واحد جمال والی آسی واثق جونپوری وحید اختر
وزیر آغا وسیم بریلوی وسیم قریشی وسیم مینائی
وفا صدیقی وقار خلیل وفا راشدی وقار واثقی
ولی عالم شاہین وویک وشال ہارون شیدا ہارون فراز
ہمایوں ظفر زیدی ہما صدیقی ہیرانند سوز یاسمین حمید
یاسمین گل یٰسین افضال یٰسین بیگ یعقوب تصور
یعقوب راہی یعقوب یاور یوسف اعظمی یوسف بیگ جمالی
یوسف تقی یوسف جمال یوسف عثمانی یوگیندر پال ثائر

قمر رئیس مجروح سلطانپوری محمد حسن
محمد فیروز شاہ محمود سعیدی مصطفیٰ کریم
مظفر حنفی معین احسن جذبی ناصر عباس نیر
نظیر صدیقی وزیر آغا

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مسائل

ابرار احمد ابرار مجیب احمد سہیل
ارشد مسعود ہاشمی بدر عالم خلش پروانہ ردولوی
تابش نقوی توقیر احمد خان سرفراز نتیجے
رئیس عالم رفعت اختر سرمد صہبائی
سرور ساجد سلیم اختر سید مجیب الرحمٰن
سید یحییٰ نشیط سیفی پریمی شمیم انور
صفدر امام قادری طاہر تونسوی عین تابش
غلام حسین ساجد محمد ایوب واقف محمد نعمان خان
مرزا خلیل احمد بیگ مناظر عاشق ہرگانوی منظر اعجاز

شاعری سے نثر کی طرف، نثر سے شاعری کی طرف

احمد سہیل اظہار اثر اقبال متین
اکبر حمیدی تنویر احمد علوی جاوید شاہین
حامدی کاشمیری حنیف نقوی خالد سہیل
رتن سنگھ زاہدہ زیدی ساجدہ زیدی
سدرہ سندیلوی سلطان سبحانی سید ضمیر جعفری
شارب ردولوی شکیب ایاز شمس الرحمٰن فاروقی
طاہر رضوی برقی ظہیر احمد صدیقی عصمت جاوید
علیم اللہ حالی عنوان چشتی کرامت علی کرامت
کشمیری لال ذاکر گلزار گیان چند جین
لطف الرحمٰن محمد حسن مسعود حسین خاں
مناظر عاشق ہرگانوی نامی انصاری وجاہت علی سندیلوی
یوسف ناظم

ہماری اساس شعر و ادب پر قارئین کی رائے

آدم نصرت آغا افضل رضا آفاق عالم صدیقی
احسان آرا احمد عبدالعلیم قادری احمد علی خلد قاسمی
ارم مالک نجمی اسریٰ ارشد اشرف قادری
اشعر نجمی اطہر سلطانہ فہیم امام اعظم
ایم۔ اے۔ عامر بشیر احمد بلقیس فاطمی
پریم پال اشک تسنیم اختر تنویر عالم
جیالال ساز حسن نظامی حق نواز
حیدر جعفری سید خالد حسین خان دانش اقبال
سلیم جعفری سید فائق رضا سید فضل اللہ مکرم
شاداب رضی شفیق شفایت شفیع شیخ

عبدالواسع خان عبدالوحید عزیز اکبرآبادی
غیاث قریشی قاضی فیروز احمد کوثر نہال مبارکپوری
قمبر علی خان قیام انیس قیوم بیدم
کاشف تجربے کاوش عباسی گربچن چندن
متین انصاری مثیل آصفی محمد اسداللہ
محمد اسلم محمد اظہر خان محمد حامد
محمد حنیف مستری محمد فاروق اعظم محمد حمید اللہ
مختار الحق مصور قیصر مسرور عابدی
معین شاداب م۔ ق۔ سلیم نثار پاشا
نسیم فاطمہ نسیمہ ضیاء الدین ہارون شیدائی
یوسف تقی

افسانہ: ۱۹۶۰ء کے بعد

ایک بہت مختلف و منفرد ادبی مذاکرہ جس میں ۱۰۰ سے زائد، جدید و قدیم افسانہ نگاروں، افسانے کے نئے نقادوں اور کہانی کے قارئین نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے۔

ابراہیم اشک ابن اسماعیل ابواللیث جاوید
احمد رشید احمد صغیر اختر یوسف
ارتضیٰ کریم ارشد سراج ارشد نیاز
اسرار گاندھی اشرف النہار بیگم اظہار صہبائی
اظہار عالم اقبال حسن آزاد انجم امداد انجم
انور امام اے۔ خیام بانو سرتاج
بشیر پردیپ جاوید اقبال جلیل عشری
جی کے مانک ٹالہ خالد جاوید خورشید ملک
ذاکر فیضی رضا الجبار رفعت صدیقی
رفعت نواز سعید انجم سہیل وحید
سید احمد قادری شان الحق حقی شاہد اختر
شاہد انور شاہد جمیل شاہنواز قریشی
شکیلہ رفیق شمسہ فاطمی شمع خالد
شموئل احمد شمیم عالم مصطفیٰ شہاب ظفر
شہزاد منظر شہناز کنول صبا اکرام
صغیر رحمانی ضیاء الرحمٰن سید طاہرہ قریشی
عابد سہیل عباس خان عتیق احمد
عذرا اصغر عذرا پروین [illegible]
عشرت بیتاب علیم اشرف عظیم اقبال
علی امام علیمہ تشنہا علی حیدر ملک
علی عمرانی عینی دت غلام محمد
غلام حسین ساجد فرحت جہاں فضیل جعفری

ادبی مذاکرے

ترقی پسندی سے جدیدیت تک دانشوری

آفاق صدیقی ابن فرید احمد سہیل
ادا جعفری اظہار اثر اصغر علی انجینئر
اکبر حمیدی امیر عارفی ایم جمال علوی
دلنواز صدیقی حمید الماس اویس احمد دوراں
حامدی کاشمیری تاراچرن رستوگی بلراج کومل
خورشید سمیع سید انیس شاہ جیلانی حیدر قریشی
سلیم اختر رفعت سروش سید حسن
سید مظفر چغتائی سید احمد شمیم سید خورشید عالم
سید احمد حنیف سید محمد عقیل شان الحق حقی
شانتی رنجن بھٹاچاریہ طاہر رضوی برقی شکیب ایاز
عابد جعفری عبدالقوی دسنوی عبدالقوی ضیا
عبدالمغنی عنوان چشتی غلام ربانی تاباں

نیاز احمد رہنما — قاسم سندیر — قرۃ العین طاہرہ
شکور قدیر امام — قدیر زمان — قیصر اقبال
کیفی عمانی — معین صدیقی — محمود احمد نانی
مشتاق اعظمی — عبد الباری ڈاکٹر — مختار ٹونکی
مہراج احمد بیگ — مشتاق احمد نوری — مشتاق انجم
مصطفیٰ کریم — مظہر حسین — مظہر سلیم
معین الدین شاہین — م۔ م۔ راجندر — منظور وقار
مقتدیٰ حسن قیصر — نذیر احمد یوسفی — نوید رشید عباسی
نصرت احسن تقی — نسیم محمد جان — نسیمہ آس
نعیم کوثر — نکہت ریحانہ خان — نند کشور وکرم
ہارون ایوب — یوسف عارف

اردو کی نئی بستیاں

اردو کی نئی بستیوں کے شعر و ادب پر تازہ ترین مضامین، جائزے، معلوماتی شذرات۔ اور بہت کچھ

سوانحی لغت

● خاص نمبر میں شامل سیکڑوں قلم کاروں کے مستند سوانحی اشاریے
● سیکڑوں قلم کاروں کے تازہ ترین پتے
● قلم کاروں کی تصاویر [البم]
● اردو کے تمام موجودہ ادبی رسائل کی فہرست اور دیگر تفصیلات

وفیات

مرحوم قلم کاروں کے سوانحی اشاریے، غیر مطبوعہ تحقیقات۔ مضامین اور دیگر معلومات۔

— آثار لفظ لفظ —

● مکاتیب مشاہیر کے عکس [مع حواشی]

— چہرہ چہرہ یاد ہے —

● پرانی یادگار تصاویر

— بازیافت —

● قدیم و نایاب کتابوں کے عکس مع تعلیقات

★

● ناول۔ ڈراما۔ طنز و مزاح اور ادب کے دیگر مسائل پر بحث اور ادبی مذاکرے۔

ایک مکمل حوالہ جاتی کتاب

مصورانِ خاص نمبر

جینتی پرمار۔ سلطان سبحانی
علام الھندی

محدود صفحات اور نامکمل INDEX کی وجہ سے قلم کاروں کی یہ فہرستیں ابھی ادھوری ہیں۔ پاکستان، بنگلہ دیش اور اردو کی نئی بستیوں کے علمی اہم اور نئے نام ان فہرستوں میں شامل ہونا باقی ہیں۔

جلد اول کی اشاعت میں بہار اسٹیٹ اردو اکاڈمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

جلد اول

ضخامت: ۸۰۰ سے زائد صفحات — قیمت: ۱۶۰ — روپے

شاعر کے مستقل خریداروں کے لئے جلد اول کی رعایتی قیمت

۱۱۰ روپے ✻ مع رجسٹری خرچ

اشاعت نومبر ۹۵ میں

اعزازی کاپی کیلئے اصرار نہ کیجئے گا

ایجنٹوں کو معقول کمیشن

● ہم عصر اردو ادب نمبر میں کتب و رسائل اور نیک خواہشات کے اشتہار ●

خاص نمبر میں کتب و رسائل اور نیک خواہشات کے اشتہارات کیلئے صفحات مختص کئے گئے ہیں۔ اگر آپ اپنی کتاب، رسالہ یا نیک خواہشات کے طور پر اپنا کوئی خوب صورت شعر، کوئی نثری جملہ، فقرہ یا کوئی ادبی بات بے شمار لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہوں تو رعایتی شرح اور دیگر تفصیلات طلب کیجئے۔

★ اردو کی نئی بستیوں کے رفیقانِ شاعر کے لئے خاص نمبر کی رعایتی قیمت، رجسٹری خرچ، کتب و رسائل اور نیک خواہشات کی رعایتی شرح اور دیگر معلومات علاحدہ ارسال کی جا رہی ہیں

غزل پر تنقیدی مکالمہ

غزل پر شاعر کے ایک ہنگامہ خیز تاریخی و ادبی معرکے کا اختتامیہ۔ ایک نئے تنقیدی آغاز کے ساتھ ۷۰ سے زائد نئے پرانے قلم کار اس بحث میں شامل ہیں۔

آر پی کپور — ابراہیم اشک — احتشام اختر
احمد سہیل — اشعر نجمی — اظہر نیر
اعجاز حسینی — انور سدید — انور مینائی
بدر عالم خلش — بلقیس ظفیر الحسن — پروین کمار اشک
پریم پال اشک — تارا چرن رستوگی — جلیس نجیب آبادی
جینتی پرمار — حسین الحق — خمار قریشی
خوشبو اکبرآبادی — دیویندر اسر — ذکاء الدین شایاں
رفیق عالم — سلیمان اطہر جاوید — شاہد عزیز
صادقہ نواب — صغیر رحمانی — ظفر ہاشمی
عابد صفی — عالم خورشید — عبرت مچھلی شہری
عتیق انظر — علیم اللہ حالی — فصیح صدیقی
مرتضیٰ علی شاد — مشتاق انجم — مظہر امام
منظر اعجاز — موسیٰ مجروح — وسیم احمد نیّر

گوشے

ترقیت میر اور میریات
ترقیت سیماب اور سیمابیات
اعجاز صدیقی — ممتاز صدیقی
ڈاک دریدا — اور کئی نام

مکالمے۔ مصاحبے

احمد علی — انور سجاد — الف رسل
شمس الرحمٰن فاروقی — غلام عباس — فراق گورکھپوری
قرۃ العین حیدر — محمد علی صدیقی اور کئی نام

سرورق

"نشانی" [ماخوذ از غالب]

عمل

علام الہندی

[بنارس]

[illegible]

احمد صغیر صدیقی - عرفان صدیقی - قمر نقوی
ناصر بغدادی - یوسف جمال - اخلاق ہسوانی
تنویر علی - سمیع الدین اطہر - تفضل حسین
نجیب دانش - عرفان احمد - تاراچرن رستوگی
صلاح الدین پرویز - دل تاج محلی - مرزا حامد بیگ
طارق صدیقی ۴۶ نظیر صدیقی

شمارہ - ۷ [جولائی ۹۵] جلد - ۴۶

پہاڑی بھوجلہ
۱۷۰۵ - دلی
۲۷ جولائی ۶۱ء

ڈیر اعجاز صاحب۔

ہم دور میں ایک دوسرے کو ڈیر دیر لوگ لکھ سکتے ہیں جو ڈیئرنس
الاؤلس کے بل بوتے پر زندہ ہیں اور سیٹھے ستی کے بل بوتے پر چل رہے
ہیں آپ کی حالت دیکھ آیا ہوں اور اپنی حالت زیادہ "حدادب" عالی منزل
ہے۔ دو ماہ سے حسب دستور قدیم لکھنؤ انتقال کر گیا تھا صاحب فراش پڑی
ہی دوبارہ جنم لیا ہے۔ ابھی ابھی آپکا خط ملا۔ بارش ہو رہی تھی۔ "گدھا
مہاغزلیں" جو لکھنے بیٹھا تو جس ورق کو تھم کر رکھتا تھا وہ اُڑ اُڑ کر صحن
میں پانی میں "کڑی" لگانے چلا گیا تھا نتیجہ یہ کہ اُن سارے کاغذوں
کو جوڑ جوڑ کر اور اُن کا اچھا بچھا ہچھ کر زمانے میں رکھ رہا ہوں یہاں کیا کام
تھا خوابے۔ اس واقعہ کا علم ہو۔ لہٰذا تو تحریر سے وہ شکل اختیار کر لی ہے کہ "کھی
ہوسکی اور پڑھی خدا" ہی [illegible] اعجاز لگانی کا تالی ہو جاؤ لگا اگر [illegible] مسودہ
کہ صحیح پڑھکر چھاپ دیجئے۔ خدا کیجے وہ سودا والا مضمون نقل کراکے بھجوا دو۔
میں اسکی خاطر کب سے سوداؤں ہو رہا ہوں۔ یہ آپ ہی کا اعجاز تھا جو آپنے مجھے بلا یاد نہ
کون ستاتے تھا نہیں دل میں

مکا ابر دیسے بھی نہیں ملا۔ جو ملا پڑھ لیا۔ اس ہی سے صرف آپ ایڈیشنل
ابتک پڑھ پایا ہوں [illegible] ۔ ساغر کی کتاب پر ریویو خوب ہے۔ پوری کتاب پڑھکر ریویو کرنا
اسداللہ خاں قیامت ہے
ساغر سے میں نے ذکر کیا تو بولا "آپکو بہت پسند آیا ہوگا" ۔ میں نے کہا بالکل
اُسکا آخری حصہ۔ یار! ساغر بھی خوب آدمی ہے۔ ہم چار یاری ہونے
کے باوجود بھی لکھنوا سے صحابہ کا قائل [illegible] نہیں ہے۔ اور وہ خالص مدح صحابہ کا شاعر
مگر ایسے لوگ بھی آدمی ہیں اور خوب ہیں۔ خط میں کیا لکھوں بھائی کہ میں
بڑی [illegible] پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ خدا مجھے تمہاری صحت کی طرف سے بڑا تشخوہ
لگا رہتا ہے اور ایسی لاؤ لرتم گوں کرگئے ۔ ملک میں پہلے شہر یا مالی پریشانیوں
کا سامنا تو آپ سے ہم تم نہ اٹھائیں گے تو کیا ڈالمیہ اور مدراس
اٹھائیں گے ۔ تمہارے اوپر تو یہ شعر صادق آتا ہے ۔

اللہ رے زور مجبوری کہ سمجھ وہ حیرت ہی ہے
جو بوجھ اٹھانا پڑتا ہے کیونکر وہ اٹھایا جاتا ہے

بچوں کو پیار۔ بھابھی کو سلام

مخلص
ملاع لکھنؤ فرقت کاکوروی

فرقت کاکوروی بنام اعجاز صدیقی

فرقت کاکوروی [غلام احمد : ولادت : جون ۱۹۱۰ء لکھنؤ ۔ وفات : ۳۰ جنوری ۱۹۷۳ء بنارس]
اُردو کے مشہور طنز و مزاح نگار اور شاعر جنھیں لوگ بھول چکے ہیں۔ (ادارہ)

بشیر بدر

ہم لوگ سوچتے ہیں، ہمیں کچھ ملا نہیں
شہروں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں

شدت کی دھوپ، تیز ہواؤں کے باوجود
میں شاخ سے گرا ہوں، نظر سے گرا نہیں

تاریکیوں میں اور چمکتی ہے دل کی دھوپ
سورج تمام رات یہاں ڈوبتا نہیں

آخر غزل کا تاج محل بھی ہے مقبرہ
ہم زندگی تھے ہم کو کسی نے جیا نہیں

جس کی مخالفت ہوئی، مشہور ہو گیا
ان پتھروں سے کوئی پرندہ گرا نہیں

کس نے جلائی بستیاں بازار کیوں لٹے
میں چاند پر گیا تھا، مجھے کچھ پتہ نہیں

● بسلسلہ بادشاہ اپارٹمنٹ، کوہِ فضا، بھوپال

عبدالقوی ضیاء

وہ حجابوں میں چھپ کے بیٹھا ہے
انجمن انجمن تماشا ہے

زلف اُس کی بکھر گئی شاید
رات کا رنگ کتنا گہرا ہے

کچھ محبت کو جانتا ہے وہی
ضبطِ غم کا جسے سلیقہ ہے

آدمی کی ہو کس طرح پہچان
سیکڑوں رُخ ہیں ایک چہرا ہے

زحمت انتظار کا موسم
اس نے میرے ہی نام لکھا ہے

ایک پل جو رہا تھا نظروں میں
مدتوں اُس کا خواب دیکھا ہے

فصلِ گل آگئی چمن میں ضیا
ہر کلی سے لہو ٹپکتا ہے

●
94 AUMER AVE
SUDBURY ONTARIO
CANADA P3A 4A7

مظفرؔ حنفی

یہ کون کہہ رہا ہے دھرتی نہیں مہکتی
جتنا لہو پیا ہے، اتنی نہیں مہکتی

سر پیٹتے ہیں وحشی، کیسی بہار ہے یہ
اڑتے نہیں شگوفے، تتلی نہیں مہکتی

جس باغ میں پرندے پر تک سنوارتے ہیں
اُس کی چنبیلیوں سے کیاری نہیں مہکتی

ویسے تمام پودے پھولوں سے لد رہے ہیں
لیکن کسی کے نیچے مٹی نہیں مہکتی

بوچھار جیسا کوئی گزرا ہے اس طرف سے
ورنہ زمین اتنی سوندھی نہیں مہکتی

مخصوص ہاتھ میں وہ کھلتی ہے جو کلی اگر
سب کے لئے ہماری چٹکی نہیں مہکتی

کتنا ہی عطر ملیے اس پر مبالغے کا
جھوٹی غزل مظفر پھر بھی نہیں مہکتی

● شعبہ اردو، کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ

کہاں کہاں سے الگ کر سکو گے تم مجھ کو

★

شاعر کے اداریوں پر اختلافی بحث یا مشورات کے حوالے سے مدیر شاعر کی گرفت، مکتوبات میں شامل اختلافی خطوط پر، کسی حاشیہ آرائی کو میں پسند نہیں کرتا۔ دراصل شاعر، کسی گروہ یا مخصوص حلقوں اور احباب کی شرکت سے شائع ہونے والے مجلوں کی طرح کا ادبی رسالہ نہیں کہ مدیر رسالے پر حاوی رہے اور رسالہ اپنے قارئین کو انگلی پکڑ کر چلاتے، قدم قدم پر ان کی لاٹھی بن جائے۔ شاعر کے بے شمار قارئین کو ایک جمہوری ذہن اور اظہار کی آزادی کو۔ میں نے مقدم جانا ہے۔ مدیر کی حیثیت سے میں شاعر کے سرورق سے آخری صفحے تک حرف حرف سے گزرتا ہوں۔ میری نگاہ اپنی خامیوں اور اپنے تسامحات پر بھی رہتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے جواب دینا نہیں آتا۔ مجھے یہ بھی اندازہ رہتا ہے کہ کون کتنی غلط فہمیوں اور مغالطوں میں ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک کثیر الاشاعت ادبی رسالے کے بے شمار قلم کار و قارئین کے ساتھ انصاف کرنا آسان نہیں۔ غیر جانب دار ادب کی تخلیق اور اس کی اشاعت کے لئے بہ یک وقت سب کو خوش نہیں کیا جا سکتا، ہر ایک کو مطمئن بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے بہت سارے معاملات کو مجموعی ابہام و تفہیم کے لئے قارئین کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

آج کی محفل میں قارئین شاعر سے گفتگو کا مقصد نہ تو "با خط باتیں ہزار" کے مشمولات کا جواب دینا ہے اور نہ ہی ایسے کسی اختلافی خط یا مضمون کو موضوع بحث بنانا ہے۔ شاعر کی ڈاک بے حد پیچیدہ، مسائل، متنوع اور اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ان سب کو پڑھنا اور جواب دینا آسان نہیں۔ تعریفی و توصیفی خطوط کا تو ایک ذخیرہ بنا رہتا ہے۔ شاعر کو زیادہ سے زیادہ معیاری اور خوب صورت بنانے کے لئے قلم کاروں سے مراسلت اور جواب در جواب کا سلسلہ الگ۔ ہزار اختلاف کے باوجود بحث طلب طویل خطوط کی اشاعت جیسا شاعر کو ۱۹۷۶ء سے ادبی رسالہ بنانے کی صحت مند قدم ہے۔ لیکن شائع ہونے والے طویل خطوں کے مندرجات سے مدیر شاعر متفق ہو یہ ضروری نہیں اور ہر خط کا جواب دیا جائے یہ بھی ضروری نہیں۔ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ کئی ایک طویل خطوط شائع ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ تعریفی و تائیدی خطوں کی معتد بہ تعداد تو مکتوبات میں سما ہی نہیں بلکہ قصداً ان خطوں کی شمولیت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ لیکن ایسے بے شمار شاعر نواز قارئین شکریے کے بہرحال مستحق ضرور رہتے ہیں۔

بدیع عالم فلش اور مناظر عاشق ہرگانوی کے درمیان جو علمی و لسانی مکالمہ جاری ہوا ہے۔ اسے تخلیقیت سیریز کے ناقد نظام صدیقی کی شمولیت نے کچھ اور روشن کر دیا ہے۔ ان کے مضمون نما خط میں بعض باتیں ایسی بھی آگئی ہیں جو ستیہ پال آنند کے ایک طویل خط [با خط باتیں ہزار میں] بھی مذکور تھیں۔ سردار جعفری صاحب کے مضمون اور نظام صدیقی کے خط نے تحریک دی کہ مجھے بھی چند معروضات اس بیان میں لکھ دینی ضروری ہیں۔ حسب معمول اصرار اور دباؤ بھی رہا کہ مدیر کی حیثیت سے کم از کم ستیہ پال آنند کے مکتوب کا جواب ضرور دینا چاہیئے۔ احمد ہمیش ہوں کہ سلیم شہزاد یا ستیہ پال آنند ان سب سے الجھے بغیر قارئین سے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

شاعر کے اداریوں کا ایک مستقل عنوان "جرعات" گزشتہ ۱۲ برسوں سے قائم ہے۔ جرعات، جمع ہے جرعہ کی اور جرعہ کے لغوی معنیٰ سب کو معلوم ہیں۔ جرعات کے ایک صفحے میں کسی موضوع کے چھوٹے چھوٹے جرعے ہی پیش کئے جا سکتے ہیں جو کسی طویل مضمون یا مبسوط کتاب کا اشاریہ تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک صفحے میں کسی بڑے اور اہم موضوع کی سمائی ممکن نہیں۔ اداریہ نہیں سے بیاں کا ممکن۔ ایک کتاب کا موضوع ہے۔ خدا، مذہب، دانشوری اور روشن خیالی کے متعلق میرے نظریات کتابی نہیں ہیں۔ اس موضوع پر میں علیحدہ سے مضمون لکھ رہا ہوں۔ کیوں کہ اداریے سے متعلق اب بھی خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ میرا موضوع آج کا موضوع ہے۔ انسان کے مستقبل کا موضوع ہے

ستیہ پال آنند صاحب نے اپنے خط میں حب احمد ہمیش کی رو میں جو باتیں تحریر کی ہیں وہ اردو ادب کی تاریخ سے ان کی لاعلمی کا نتیجہ ہیں یا پھر محض شوشہ چھوڑنے اور خبروں میں بنے رہنے کی یہ کوئی شعوری کوشش ہے بالکل ویسے ہی جیسا کہ حالیہ برسوں میں ہندوستان کے بہت کچھ چھوٹے معمولی اور بونے سیاست داں یا نام نہاد سیاسی جماعتیں اپنی صدیوں کی تاریخ، اپنی مشترکہ ثقافت اور تہذیب و تمدن کی وحدت سے یا ناواقف ہیں یا پھر چشم پوشی کرتے ہوئے محض اپنے ووٹ بینک کو چمکانے کے لئے شوشے چھوڑتی رہتی ہیں اور مفروضوں کو ایشو بنانے میں مصروف رہتی ہیں۔ میں کوئی سماجی سائنس داں نہیں، تاریخ نگار، محقق اور ناقد بھی نہیں لیکن ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ ضرور کہوں گا کہ اردو شاعری میں ہندوستان کی کئی ہزار سال کی تہذیب رچی بسی ہوئی ہے۔ ایک ایسی رنگا رنگ تاریخ جس میں ہزار دس سال کا ہندوستان دیگر نیا ادوار سے کہیں زیادہ متحرک رہا ہے اور اردو ادب کا ہر طالب علم اس سچائی سے واقف ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے تا حال مشترکہ تہذیب و تمدن اور مشترکہ ثقافت کی ایک طویل زندہ تاریخ کو چند سطروں یا چند کتابوں میں نہیں سمویا جا سکتا۔ اس کے لئے ہزاروں جلدیں ناکافی ہوں گی۔ یہ عرصہ ہے کہ اس ثقافتی وحدت کو بگاڑنے کی کوششیں گزشتہ کچھ برسوں سے تیز تر ہیں۔ مذہبی اور سیاسی سطح پر ایک سیکولر وحدت کو زبردست خطرہ لاحق ہے۔ ساتھ ہی کے سوال نئے نہیں ہیں۔

ہمیں جان سے زیادہ ہم کو عزیز دونوں
ہندوستاں ہمارا، اُردو زباں ہماری
[اعجاز صدیقی]

تن پایا، تب من ملا اور من پایا تب پی
جیسے نجر ایک ہے اور دکھت کے دو تین
[مضطر خیرآبادی]

جو مانگنا ہو، ابھی مانگ لو وطن کے لئے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
[جوہر]

یہ نصف صدی کے وہ مردہ سوال ہیں جنہیں زندہ رکھنے کی کوشش بہر طور کی جاتی رہی ہے۔ ہندوستان کے مختلف مذاہب، ۲۲ سرکاری زبانوں اور ۲۲ مادری زبانوں کے ساتھ علاقائی اور مقامی بولیوں کے تال میل، سنسکرت کے ساتھ ہندی کی بولیوں میں اردو زبان، یہ سب کچھ ایک ایسے جاری فطری عمل سے ارتقاء پذیر ہیں کہ اردو کو اور مسلمانوں کو کہیں سے بھی الگ نہیں کیا جاسکتا۔

اردو زبان تو آریاؤں کے داخلہ ہند [۱۵۰۰ ق م] سے بھی قبل موجود تھی۔ البتہ نام اور اس کے روپ رنگ مختلف تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد اس زبان کا ارتقائی سفر تیز تر ہوا اور ہند آریائی زبانوں کے اختلاط سے ہندوستان کی مٹی سے جنمی اس زبان کی مختلف شکلیں جنتی سنورتی رہیں۔ اردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ اور یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک زندہ زبان اپنی مٹی کی بو باس سے ہٹ کر کسی اور کلچر کی بات کرے۔ کیا ہندوستان کی دیگر زبانوں پر عربی فارسی زبان کے اثرات نہیں؟ کیا ہندوستان کی دیگر زبانوں کے شعراء نے عربی فارسی کے اثرات قبول نہیں کئے؟ جس عہد میں فارسی، ہندوستان کی غالب زبان تھی تو کیا ہندؤں نے اس زبان سے اثر قبول نہیں کیا؟۔ قدیم ادبیات کے تنزل کے بعد جب عوامی زبانیں ابھر کر سامنے آئیں تو ان زبانوں پر عربی فارسی کے اثرات بھی مرتب ہوئے۔ ہندی کو قومی زبان بنائے جانے کے بعد سے اس زبان کے اثرات سے کوئی کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

اردو شاعری صرف غزل نہیں ہے اور اگر صرف غزلیہ شاعری ہی کا جائزہ لیا جائے تو اس کے موضوعات، تلمیحات، استعارے علامتیں، بیشتر ہندوستانی ہیں۔ نظم کی دیگر اصناف میں رثائی شاعری کا بنیادی موضوع واقعہ کربلا ہے۔ لیکن اس کے تانے بانے اور بیانِ واقعہ کی پوری فضا ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی سماج ہی سے خمیر کی گئی ہے۔ بے شمار مثنویوں کے بیشتر واقعات و کردار ہندوستانی ہیں۔ ہمارے محاوروں اور کہاوتوں کی وسیع فرہنگ مجموعی طور پر ہندوستانی ہے۔ ہر عہد میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب سے شاعروں نے رشتہ جوڑا ہے کسی بھی عہد کو لے لیجئے اور دیکھئے کہ عربی فارسی کے ساتھ تشکیل پذیر اردو نے ہندوستان کو کتنی شدت کے ساتھ اپنے اندر جذب کیا ہے۔ بے شمار کتابوں اور رسائل اور مضامین سے صرف نظر کرتے ہوئے زیادہ دور نہ جائیے۔ بہت سامنے کی ایک کتاب "ہندوستان ہمارا" (مرتبہ : جاں نثار اختر) کی دو جلدیں ملاحظہ کیجئے، اس میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے بہت سارے روپ اردو شعراء نے اپنی شاعری میں سجائے ہیں۔ صرف فراق یا احمد ہمیش ہی پر کیا موقوف۔ بے شمار شعراء نے ہندو دیومالا اور اساطیر سے استفادہ کیا ہے۔ بقول ستیہ پال آنند ۲۵۰ سال قبل تک یعنی ۱۹۷۰ تک، پوری اردو شاعری عرب و عجم ہی کی پیروی کرتی رہی ہے اور اردو شعراء، دجلہ و فرات اور آذر ہی کو بطور استعارہ استعمال کرتے رہے ہیں یا تمام تر تلمیحات و استعارے اور علامتیں ۱۹۷۰ تک عربی و عجمی ہی رہی ہیں۔ یہ کارنامہ فراق اور احمد ہمیش نے انجام دیا کہ اردو شاعری کو ہزاروں سال کی ہندوستانی تہذیب عطا کر دی۔ کتنی عجیب بات ہے۔ کتب و رسائل میں جو بے شمار مواد بکھرا پڑا ہے وہ سب کیا ہے۔؟

علی سردار جعفری صاحب نے اپنے طویل خط میں اپنی ہی شاعری کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے۔ ترقی پسند شعراء اور ان کے بعد جدیدیے اور اب مابعد جدیدیت کے شعراء میں سے کسی بھی معتبر شاعر کا شعری مجموعہ اٹھا لیجئے۔ وہ شاعری ہندوستانی شاعری ہی معلوم ہوگی، عربی یا عجمی نہیں، نصف صدی سے زائد فلموں کے لئے لکھی جانے والی شاعری کی زبان اردو ہی رہی ہے اور اردو والوں نے بھجن، گیت، دوہے، نظمیں، غزلیں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ سب ہندوستانی ہے اور ناقابلِ فراموش ہے۔ فلمی شاعری پر کام کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستانی موسیقی کی راگ راگنیوں کے ساتھ اردو شاعری کو ہم آہنگ کرکے ایسا زبردست جادو جگایا گیا ہے کہ فلمی شاعری بھی ہماری تہذیب کا حصہ بن گئی ہے۔ فلموں کی زبان، غزل گائیکی، موسیقی کے مختلف گھرانے۔ یہ سب کچھ مشترکہ تہذیب ہی کی دین ہے۔ غزل اور نظم کی دیگر اصناف کے ساتھ ہندو بانی روایت میں اردو والے بھی شامل ہیں بلکہ یہ صنف اردو میں آج بھی زندہ اور توانا ہے۔ جب کہ ہندی میں اب یہ روایت ختم ہوگئی ہے۔

میں اگر صرف دبستانِ اکبرآباد کا ذکر کروں تو تنہا سیماب اکبرآبادی اور ان کے تلامذہ کی ایک ایسی تاریخ بنتی ہے جس میں پوری ایک صدی دھڑکتی ہے۔ اس ایک صدی کے شعر و ادب میں پورا ہندوستان دھڑکتا ہے۔ ہزاروں سال کی روایت کے تسلسل کا ایک حصہ ہے یہ صدی۔ سیماب کے غلبات شاعری (کلیم عجم) میں ہر پہلو سے ہندوستان ہی جلوہ گر ہے۔ سیماب نے اپنے ہزاروں تلامذہ کی تربیت بھی اسی نہج پر کی تھی۔ سیماب کے ارشد تلامذہ میں سے کتنے ہی ایسے نام ہیں جنہوں نے اپنے تلامذہ کی تربیت بھی دبستان اکبرآباد کے نصب العین کے تحت کی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ سیماب کی نظم و نثر کی کتابوں میں سے ایک کرشن بانسری بھی ہے جس میں سری کرشن پر مختلف وقت و اہنگ کی نظمیں شامل ہیں ساتھ ہی منظوم مقدمہ بھی ہے کتابت، طباعت اور گیٹ اپ کے اعتبار سے یہ اپنے وقت کی خوبصورت ترین

کتابوں میں سے ایک ہے۔ سیماب کے دیگر شعری مجموعوں میں ساز و آہنگ، کارِ امروز اور شعرِ انقلاب کی نظموں میں ہندوستانی تہذیب اور اس کی قدیم ترین روایت کی پوری فضا بندی موجود ہے۔ مثالوں سے گریز کر رہا ہوں۔ حوالے بھی نہیں دے رہا ہوں، صرف اشاروں میں سرسری ہی گزر رہا ہوں کہ دبستانِ اکبرآباد چند سطروں کا موضوع نہیں ہے۔ اور سیماب کی زندہ شاعری کا تاریخ مسلسل دفاع کر رہی ہے۔

میں نے جو کچھ تحریر کیا ہے، وہ ستیہ پال آنند کے خط کا جواب نہیں ہے۔ ہندو دیومالا اور اساطیر سے براہِ راست بحث بھی نہیں کی ہے اردو کے شاندار نثری ادب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ پاکستان کی اردو شاعری میں ہندوستان کی ہزاروں سال کی تہذیب کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ اردو شاعری کے حوالے سے البتہ کچھ اشارے کر دیئے ہیں۔ اردو شعر و ادب کی تاریخ کو کتابوں سے کتابوں میں منتقل کرنا میرا کام نہیں ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اردو ادب کی کوئی مکمل و مستند تاریخ لکھی ہی نہیں گئی ورنہ اس نوع کے سوال بار بار کیوں ابھرتے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کوئی نیا موضوع نہیں —— شاعر کا ضخیم قومی یک جہتی نمبر ملاحظہ کیجئے۔ ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

نظام صدیقی نے اپنے طویل خط میں اردو عروض کا ذکر کیا ہے اور ستیہ پال آنند کے خط سے استدراک کرتے ہوئے ناظم حکمت اور علی سردار جعفری کے حوالے سے اپنی بات کہی ہے کہ انہوں نے عروض شناسی کے ذیل میں اردو کا اپنا عروض کے لئے ایک اہم سوال اٹھایا ہے۔ ناظم حکمت اور فیض کے درمیان جو مکالمہ ہوا تھا (سردار جعفری کے ساتھ نہیں) اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ناظم حکمت ہوں، فیض ہوں، یا نظام صدیقی، شاید اردو شاعری میں ہیئتی تجربوں کی تاریخ سے یہ لوگ واقف نہیں۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ عروض کی چھوٹی بڑی کتابوں کے علاوہ بے شمار مضامین کتب و رسائل میں بکھرے پڑے ہیں، اس کا اندازہ عنوان چشتی کی کتاب "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" سے کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کسی بحث میں الجھے بغیر سرسری گزرتے ہوئے عرض کروں کہ عربی فارسی شاعری کے آہنگ سے ناظم حکمت کی کیا مراد تھی؟ آہنگ کا تصور شعری متن بھی اور شعر کا عروض بھی۔ دونوں صورتوں میں صداقت یہ ہے کہ موضوع اور مواد کے اعتبار سے اردو شاعری کا غالب حصہ ہندوستانی ہی ہے اور جہاں تک شعر کے عروض کی بات ہے تو اردو میں غزل سے نثری نظم تک، اصناف و ہیئتوں کا زبردست تنوع ہے۔ اس میں اگر عربی فارسی عروضی نظام سے استفادہ ہے تو عربی اصناف و ہیئتوں کے ساتھ مغربی عروض اور اصناف و ہیئتوں کے تصرفات بھی ہیں، ہندی لوک گیت مقامی بولیوں کے اثرات اور پنگل شاستر کے امتزاج سے وزن و آہنگ کی ایک وسیع کائنات موجود ہے۔ شاید کسی اور زبان کی شاعری میں وزن و آہنگ کا اتنا اور ایسا تنوع نہیں [دو قابلِ مطالعہ کتابیں عروض، آہنگ اور بیان (شمس الرحمٰن فاروقی) اردو اور ہندی کے جدید مشترک اوزان (حبیب اللہ اشرفی) شامل ہیں] جہاں تک اردو کے اپنے عروض کا سوال ہے تو انشاء دہلوی [۱۸۱۷ - ۱۷۵۲ء] سے گیان چند جین [اردو کا اپنا عروض] تک، اس انقلابی نظریے پر خاصا کچھ لکھا گیا ہے یہاں صرف چند عروضی باغیوں کا ذکر کروں گا۔ اردو کے نئے عروض پر عظمت اللہ خان [۱۹۲۷ - ۱۸۸۷ء] کا ایک مضمون رسالہ "اردو" میں ۱۹۲۴ء شائع ہوا تھا۔ اردو عروض کے لئے انہوں نے جو اصول وضع کئے تھے انہیں اپنی شاعری میں برتا بھی۔ ان کا شعری مجموعہ "سریلے بول" اس کی روشن مثال ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری [۱۹۱۸ - ۱۸۸۵ء] نے اس عروضی نظام پر تنقید کی اور نیا متبادل عروضی نظام پیش کیا۔ سیماب نے دوسرے شعراء کی بہ نسبت ہیئتی تجربے زیادہ کئے۔ بقول عبدالقادر سروری "اسالیب کے اختراع اور تنوع کی مثالیں جو جدید دور کا طرۂ امتیاز ہیں، جیسی سیماب کے پاس نظر آتی ہیں، دوسرے شعراء کے پاس کم نظر آئیں گی" جدید شاعری۔ سیماب نے شاعر (آگرہ) کے کئی شماروں میں "عربی و فارسی عروض کا ہندی روپ" کے عنوان سے قسطوں میں مضمون لکھا تھا۔ وزن و آہنگ کے تجربوں کا یہ سلسلہ ان کے کئی نامور تلامذہ تک پہنچا۔ ان میں مختار صدیقی، ساغر نظامی، راز چاند پوری، محمود جالندھری، ضیا فتح آبادی، منظور صدیقی، سید فیضی، حنیف جالندھری، الطاف مشہدی، اعجاز صدیقی، نازش پرتاب گڑھی وغیرہ اور پھر ان کے اپنے تلامذہ نے وزن و آہنگ کے تجربوں کی مزید توسیع کی۔ دبستانِ داغ و امیر مینائی تحقیق کا ایک الگ باب ہے۔

اگر اردو کا عروض کسی منضبط شکل میں نہیں ہے تب بھی اس میں ترمیم و تنسیخ کا عمل برابر جاری ہے۔ ہندی پنگل میں اگر اضافے ہوتے ہیں تو اردو شاعری نے انہیں بھی اخذ کیا ہے۔ معاصر ہندی شاعری میں اب وزن و آہنگ کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن اردو شاعری کی موجودہ اصناف سخن میں غزل سے ہائیکو تک، وزن و آہنگ کے نت نئے تجربوں کا سفر مسلسل ہے۔

محض مفروضوں اور مغالطوں کی تکرار، لاعلمی یا کم علمی، مگر مشہور لوگوں کے بیانات کو بچشم تسلیم کر لینے کے چلن نے اردو کے جدید عہد کے جنہوں نے شاعری میں عربی فارسی عروض کے ساتھ وزن و آہنگ کے بے پناہ تجربے کئے، انہیں نظرانداز کیا ہے۔

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
تہذیبِ ہند کا نہیں چشمہ اگر ازل!
فطرت میں گر تڑپ ہے تو اس ارضِ پاک سے

مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے
یہ موجِ رنگ رنگ پھر آئی کہاں سے ہے (ہندوستان)
سورج میں روشنی ہے تو اس آسماں سے [ظفر علی خان]

میں ہوں ایک مستقل عنوان ہستی کے فسانے میں
مجھے تاریخ دہراتی رہے گی ہر زمانے میں
[سیماب]

علی سردار جعفری

سیتا محل۔ دوسرا منزلہ، بومن جی پیٹیٹ روڈ بمبئی ۔ ۲۶۔

اردو شاعری اور ہندوستان کی تہذیب

اپریل [illegible] کا شاعر میرے سامنے ہے۔ اس میں ستیہ پال آنند کا ایک طویل خط شائع ہوا ہے۔ یہ خط اہم ہے اور اگر اس پر کھل کر بحث کی جائے تو شعور اور تخلیق کے بہت سے دروازے کھلیں گے۔ اور ہمارے شعر و ادب کو فائدہ پہونچے گا۔ فی الحال میں اپنی بے انتہا مصروفیات کی وجہ سے کوئی طویل مضمون لکھنے سے قاصر ہوں۔ سترہ اٹھارہ سال سے میری کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے اور اس وقت سات مسودے مجھ سے اپنا حق طلب کر رہے ہیں۔ اشاعت سے پہلے ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ان میں میرا نیا شعری مجموعہ بھی شامل ہے اور وہ رباعیاں بھی جو میں نے ودیا پتی کی شاعری سے متاثر ہو کر پچیس تیس سال پہلے کہی تھیں۔ ان میں سے دس بارہ رباعیاں یا شاید کچھ زیادہ [illegible] کے آس پاس ہندی کے مشہور ہفتہ وار "دھرم یگ" میں شائع ہو چکی ہیں۔ ہندوستان کی اس تہذیب سے میرا کیا رشتہ ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اپنے مسودوں سے فارغ ہو کر ان مسائل پر گفتگو کروں گا جو ستیہ پال آنند کے خط میں اٹھائے گئے ہیں۔ اس بحث میں دوسرے احباب کو بھی شرکت کی دعوت دوں گا۔ میرا مضمون طویل ہوگا جس کے لئے زیادہ فرصت درکار ہے۔ اس وقت اتنی وضاحت ضروری ہے کہ ستیہ پال آنند نے اردو شاعری کی بحروں کے سلسلے میں ناظم حکمت کی جس گفتگو کا حوالہ دیا ہے وہ مجھ سے نہیں بلکہ فیض احمد فیض سے ہوئی تھی اور اس کے زیر اثر انہوں نے اپنی مشہور نظم "انتساب" لکھی جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

آج کے نام اور آج کے غم کے نام
آج کا غم جو ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا
زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے
درد کی انجمن جو مرا دیس ہے
کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام
پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام وغیرہ

یہ نظم مجھے پسند ہے اور آزاد نظم ہونے کے باوجود پاکستان میں گائی بھی گئی۔ لیکن فیض کے دوسرے چاہنے والوں اور خاص طور سے غزل کے پرستاروں کو پسند نہیں ہے کیونکہ اس میں فیض کا دل موہ لینے والا عاشقانہ انداز نہیں ہے۔ اس سے پہلے فیض نے کلرکوں، پوسٹ مینوں، تانگے والوں، ریل بانوں، بیسواؤں اور طالب علموں کے الفاظ استعمال نہیں کیے تھے۔ یہ تو میرا اور میرے مزاج کے دوسرے ترقی پسند اور جدید شاعروں کی زبان ہے۔ اس نئی جمالیاتی فضا اور آہنگ کو ترقی کرنے میں پچاس ساٹھ سال لگے ہیں اور یہ ابھی تک اپنے عروج اور کمال کی منزل تک نہیں پہونچا ہے۔ اس کاوش میں حلقہ ارباب ذوق کا بھی حصہ ہے۔ ان کے حوالے میرے طویل مضمون میں آئیں گے۔ ناظم حکمت سے میری گفتگو اردو شاعری کی نئی اور جدید زبان کی سطح پر تھی اس میں

فیض کا ذکر بھی آیا اور جوش و فراق کا ذکر بھی۔

ستیہ پال آنند نے لکھا ہے کہ "آج سردار جعفری، پروین شاکر پر نظم لکھتے ہوئے ودیاپتی سے اشارہ اور تلمیح کے طور پر جو استعارہ لیتے ہیں۔ لیکن پچیس برس پہلے تک کی اردو شاعری میں (فراق کو چھوڑ کر) کتنے شاعروں نے ہندوستان کی اس تہذیب سے رشتہ جوڑا جو کئی ہزار برس پرانی ہے" اس پر مفصل بحث میرے طویل مضمون میں آئے گی۔ آج کے مراسلے میں نہایت انکسار اور معذرت کے ساتھ صرف اپنی شاعری کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ اس لئے کہ ستیہ پال آنند میرے دوست ہیں۔ شاعری میں میرے چھوٹے بھائی ہیں اور صاحب فہم و دانش ہیں۔ ان تک میری بات پہونچنی چاہیئے۔ "وائے بر جان سخن، گر بہ سخنداں نرسد"

جیسا میں نے شروع میں عرض کیا ہے میں نے ودیاپتی سے اثر تیس سال پہلے قبول کیا۔ اس کی شاعری سے خیال لے کر اپنی زبان میں رباعی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی اور یہ کوشش کامیاب ہے جس کی مثال وہ رباعی ہے جو میں نے پروین شاکر پر اپنی نظم میں نوٹ کے ساتھ نقل کی تھی۔

آئے ہیں سجن تو گھر میں من لگتا ہے
ہر چیز میں ایک اپنا پن لگتا ہے
وہ دیکھ رہے ہیں مسکرا کر مجھ کو
اب میرا بدن میرا بدن لگتا ہے

میری اور فراق کی رباعیوں میں فرق یہ ہے کہ انہوں نے سنسکرت اور ہندی کے شرنگار رس کو اردو رباعی میں پیش کیا ہے لیکن میری رباعیوں کا موضوع "رادھا اور کرشن" کا پریم ہے۔ اس میں وہ شرنگار رس خود بخود آ جاتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک رباعی جس کی زبان ذرا مشکل ہے یوں ہے ؎

کاجل کی سیاہی سے ہیں لب آلودہ
لالی سے لبوں کی آنکھیں سب آلودہ
آئے ہیں کرشن مل کے رادھا سے اب
کب پاک تھے اتنے، اتنے کب آلودہ

یہ دونوں رباعیاں پچیس سال پہلے دھرم یگ (ہندی) میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس سے چند سال پہلے ۱۹۶۶ء میں میری کتاب "پیراہن شرر" شائع ہوئی۔ اس میں کالی داس کی ایک طویل نظم کا ترجمہ شامل ہے جس کا عنوان ہے "موسموں کا گیت" دراصل پیراہن شرر کی نظموں کی تخلیق اس روحانی کرب کا نتیجہ ہے جو ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ نے پیدا کیا تھا۔ اس کتاب کی نظموں میں امن کا پیغام ہے۔ میری ایک نظم "کون دشمن ہے" اس بند پر ختم ہوتی ہے ؎

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

اس کتاب میں کالی داس کی نظم موسموں کا گیت (رت سنگھار) امن کے پیغام کو حسیں تر بنانے کے لئے شامل کی گئی تھی۔ اس میں میں نے اپنی طرف سے ایک بند کا اضافہ کر دیا جو اس نظم کی تمہید ہے۔

کتنے دلکش ہیں مرے ملک کے موسم ان میں
حسن کی بات کریں عشق پہ اصرار کریں

نورِ محبوب سے روشن کریں آنکھوں کے چراغ
پھول کی طرح سے ذکرِ لب و رخسار کریں
مصحفِ حق کی طرح کھولیں کتابِ دل کو
جس میں جنگ اور جدل کا کوئی افسانہ نہیں
فصلِ گل، فصلِ خزاں، فصلِ زمستاں ہے مگر
موسمِ جنگ نہیں، موسمِ ویرانہ نہیں

کالی داس سے میرا تعارف بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ مہاراجہ بلرام پور کے کتب خانے میں ایک کتاب تھی جس کا نام غالباً "چند نگارین" تھا۔ (اب ٹھیک سے یاد نہیں) میں نے اس میں پہلی بار "شکنتلا" کا اردو ترجمہ پڑھا تھا۔ کالی داس کی دوسری تخلیقات کے ترجمے بھی اس میں شامل تھے۔ اس نے مجھے کالی داس کا شیدائی بنا دیا۔ میں نے ۱۹۳۶ء میں بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کرنے کے لئے اسٹیشن ڈائریکٹر ذوالفقار بخاری کی فرمائش پر چھ تقریریں کالی داس پر ریکارڈ کیں۔ ان کا ذکر رفعت سروش نے اپنی ایک کتاب میں کیا ہے۔ آہستہ آہستہ کالی داس کی شکنتلا اور میگھ دوت میری شاعری میں استعارہ بن کے ظاہر ہونے لگے۔ میری ۱۹۴۹ء کی نظم "اودھ کی خاک حسین" میں یہ مصرعے ہیں۔ ؎

غریب سیتا کے گھر پہ کب تک رہے گی راون کی حکمرانی
دروپدی کا لباس اس کے بدن سے کب تک چھنا کرے گا
شکنتلا کب تک اندھی تقدیر کے بھنور میں پھنسی رہے گی
یہ لکھنؤ کی شگفتگی مقبروں میں کب تک دبی رہے گی (پتھر کی دیوار)

اسی سلسلے میں پتھر کی دیوار میں میری نظم یلغار کا آخری بند ہے ؎

فضاؤں میں میگھ دوت اترتے ہیں اہلِ دل کا پیام لے کر
ہماری ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں ہندیوں کا سلام لے کر
کتابیں محوِ سفر ہیں ٹیگور و بھارتی کا کلام لے کر
ہم آج اٹھے ہیں دل کے پیمانے اور محبت کے جام لے کر
چلے ہیں تہذیب و امن کی مے جہاں کو سرشار کر رہے ہیں - ہم آج یلغار کر رہے ہیں

میری نظم "اودھ کی خاک حسین" میں (تخلیق ۱۹۴۹ء ناسک جیل مہاراشٹر) "میگھ دوت" نے تخیل کو مہمیز کر کے میرے قلم سے شمالی ہندوستان میں بارش کے آخری منظر کی تصویر کشی کرائی ہے ؎

میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں میں ڈھکی ہوئی ہیں۔
فضاؤں میں میگھ دوت پرواز کر رہے ہیں
نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر
گھٹائیں کی اپسرائیں اپنی
گلابی آنکھوں میں آخری بار مسکرا کر
ہماری آنکھوں کو تر کیے ہوئے ہیں۔

ہرے پیڑوں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں
قدیم گنگا کا پاک پانی زمیں کے دامن کو دھو رہا ہے۔
وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں
جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنے بجا رہی ہیں
ہمالیہ کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہیں
ان آسمان بوس چوٹیوں کو
سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلغیوں سے سجا دیا ہے

اردو شاعری میں نئے مزاج کی ترجمان امیجری کا یہ منظر اتنا ہی قدیم ہے جتنا ہمالہ کا دامن اور شمالی ہندوستان کے میدان۔ یہ منظر گوتم بدھ کی آنکھوں نے بھی دیکھا ہوگا۔ اور کالی داس کی نگاہوں میں بھی آیا ہوگا۔ آج میں یہ منظر اردو شاعری کی حمایت کیلئے اپنے دوست ستیہ پال آنند کو دکھا رہا ہوں۔ اس نظم کی بحر فارسی کی بحر ہے لیکن زبان کا آہنگ اردو کے رس میں ڈوبا ہوا ہے میرا خیال ہے کہ اس سے ملتی جلتی بحر سنسکرت شاعری میں بھی ہوگی۔ یہ بحریں اردو شاعری میں اس لئے کامیابی کے ساتھ استعمال ہوتی ہیں کہ یہ ہندوستان کے شاستریہ سنگیت (پکی موسیقی) کے سُروں میں آسانی سے ڈھل جاتی ہیں۔ سنگیت زبان اور بحروں کی ہم آہنگی اتنی شاندار ہے کہ یہ بحریں ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی اپنا حسن بے نقاب کرتی ہیں۔ آج ہندوستان اور ہندوستان کے باہر غزل کی مقبولیت کا راز اسی ہم آہنگی میں ہے۔ فارسی غزلیں اور نظمیں بھی بہت آسانی سے ہمارے سنگیت کی گود میں آکر مسکرانے لگتی ہیں۔ اس ہلکے پھلکے سنگیت کی تربیت امیر خسرو نے کی ہے۔ جسے غزل کی گائیکی کہتے ہیں اور ان کے وقت سے سفر کرتے کرتے یہ سنگیت بیگم اختر فیض آبادی سے ہوتا ہوا مہدی حسن اور جگجیت سنگھ تک پہونچا ہے (اس پر مزید اور وسیع تر گفتگو دوسرے مضمون میں ہوگی۔)

ستیہ پال آنند اس کام سے باخبر ہوں گے جو میں نے کبیر اور میرا بائی پر کیا ہے۔ کبیر پر میری کتاب "کبیر بانی" اردو اور ہندی رسم خط کے ساتھ سنہ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں کبیر ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) مستند نظموں کے ترجمے (اصل کے ساتھ) ہیں انتیس صفحات کا دیباچہ اور تینتالیس (۴۳) صفحات کے حواشی ہیں۔ اس کتاب میں پہلی بار کبیر کی انقلابی معنویت سے بحث کی گئی ہے اور ہندو دیو مالا، بھگتی، تصوف اور فارسی، اردو اور بنگال کے باؤل کویوں کے حوالے ہیں۔ جن ایرانی شعراء کا اثر کبیر کے کلام میں نظر آتا ہے۔ ان میں رومی، عطار، اور جامی اہم ہیں۔ اس کے دس سال بعد میں نے کبیر پر ایک دستاویزی فلم بنائی جس کا نام ہے "پھر بولو اے سنت کبیر" اس عنوان کی بنیاد میری ایک غزل ہے جس کا شعر ہے۔

یہ دنیا گمراہ ہے اب تک پھر بولو اے سنت کبیر
ایک ہی سونے کے سب گہنے، ایک ہی ماٹی کے برتن

میرا بائی پر میری کتاب کا نام "پریم وانی" ہے۔ یہ بھی بیک وقت اردو اور ہندی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں سو سے زیادہ نظموں کے ترجمے (اصل کے ساتھ) شائع کئے گئے ہیں اور تقریباً ایک ہزار الفاظ کی شبد لی (فرہنگ) شامل ہے۔ جو ڈاکٹر آہ سیتاپوری نے تیار کی تھی۔

میری شاعری کی فکری بنیادوں میں میرا تصور وقت بہت اہم ہے جس پر اب تک کسی نقاد نے قلم نہیں اٹھایا کیوں کہ وہ زیادہ تر مزدور اور انقلاب کے الفاظ میں الجھے رہے۔ میرے تصور وقت میں مارکسزم اور اقبال کے علاوہ کبیر کے افکار کی آمیزش ہے اس کا بھرپور اظہار میری طویل ڈرامائی نظم "نئی دنیا کو سلام" میں اور مختصر نظم "میرا سفر" میں ہوا ہے (میرا سفر کو اب مشہور کتھک رقاصہ شوونا نرائن نے رقص میں تبدیل کر دیا ہے گزشتہ سال دہلی میں دو بار پیش کیا جا چکا ہے اس سال بمبئی میں پیش کیا جائے گا۔ میں نے اس تصور وقت کو اپنی ایک غزل کے ایک مصرعے میں اس طرح ڈھال دیا ہے "یہ عالم لذت تخلیق کا ہے رقص لافانی" یہ دراصل آفاقی رقص تخلیق ہے۔ COSMIC DANCE OF CREATION میری منظوم خود نوشت

(نومبر، میرا گہوارہ) ان مصرعوں سے شروع ہوتی ہے۔

جب کہیں پھول ہنسے
جب کوئی طفل سرِ راہ ملے
رات کے شاخِ سیہ رنگ پہ جب چاند کھلے
دل یہ کہتا ہے حسیں ہے دنیا
چھتڑوں ہی میں سہی ماہ جبیں ہے دنیا
دستِ صیاد بھی ہے بازوئے جلاد بھی ہے
رقصِ تخلیقِ جہانِ گزراں جاری ہے

میری شاعری کی رگوں میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا خون رواں دواں ہے۔ جس کلچر کی تشکیل کئی ہزار سال کی مسلسل تاریخی کاوشوں سے ہوئی ہے۔ اس لئے میرے اشعار میں وید انجیل اور قرآن کا ذکر اکثر ایک ساتھ آتا ہے۔ صرف دو مثالیں ایشیا جاگ اٹھا کی ابتدا۔

یہ ایشیا کی زمین تمدن کی کوکھ تہذیب کا وطن ہے
یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی
یہیں پہ انسانیت کی پہلی سحر نے رخ سے نقاب اٹھائی
اس بلندی سے ویدنے زمزمے سنائے
یہیں سے گوتم نے آدمی کو سانتا کا سبق پڑھایا
ہماری تہذیب کی ہوائیں مسیح کے بول سن چکی ہیں
ہمارا سورج محمد مصطفےٰ کے سر پر چمک چکا ہے
اور اب ہمارے قدیم آکاش کے ستارے
قدیم آنکھوں سے ایشیا کی نئی جوانی کو دیکھتے ہیں
فصاحتوں نے ہمارے بچپن کے ہونٹ چومے
بلاغتوں نے بڑی حسین لوریاں سنائیں
زبان کھولی تو وید انجیل اور قرآن بن کے بولے

اور میری نظم "یہ لہو" کے یہ مصرعے۔

یہ لہو مسلم نہیں، کافر نہیں، ملحد نہیں
وید و گیتا کا ترنم، مصحفِ یزداں کا لحن
یہ کتابِ زندگی کا پہلا حرفِ دلنواز
آرزو کی سب سے پہلی راگنی
روحِ انجیلِ مقدس، جانِ توریت و زبور
خنجروں کی پیاس اس شعلے سے بجھ سکتی نہیں

ہندوستان کے مشترکہ کلچر پر میرے کئی مضامین ہیں۔ چار مضامین کئی سال پہلے "کتاب نما" (نئی دہلی) میں شائع ہوئے تھے۔ دیکھئے تو کس منزلِ طوفاں سے آتی ہے حیات۔ اور میری ایک دستاویزی نظم ہے جس کا عنوان ہے "ہندوستان ہمارا"

[باقی صفحہ ۲۰ پر دیکھئے]



نظام صدیقی

۵۲۰ - دائرہ شاہ محب اللہ، بہادر گنج، الہ آباد - ۳

شرح + یات اور تفہیم + یت کا مسئلہ

لغوی معنیٰ ہو یا اصطلاحی معنیٰ، کسی زبان سے ترجمہ کا غلطی یکسر غلط (۱) تفہم (۲) تشریح (۳) تنقیح (۴) تفہیم (۵) تعبیر کو راہ دیتی ہے۔ تفہمی تشریحی، تنقیحی، تفسیری، تفہیمی اور تعبیری عمل میں صحیح ترجمہ کی کلیدی حیثیت ہوتی ہے۔ HERMENEUTICS کا صحیح ترجمہ علم تفسیر، علم تفہیم اور علم تعبیر ہے۔ SCIENCE OF INTERPRETATION ہے۔ جرمن میں مصدر HERMENEO کے معنی TO INTERPRETE ہیں۔ خود انگریزی میں INTERPRETATION کے درجنوں مرادفات ہیں۔ وہ سب معنوی اور کیفیتی سطح پر مماثل نہیں بلکہ متضاد ہیں۔ لیکن ان سب کو تفسیر، تفہیم اور تعبیر کے دائرہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں فی زمانہ یہ انتہائی عبرت ناک عالم ہے (جیسا کہ افتخار امام صدیقی صاحب نے اپنے ارسال کردہ گرامی نامہ میں نشان دہی کی ہے) کہ لوگ باگ مغربی تقلیدیت کے جذباتی شور و شر میں اردو، فارسی اور عربی کی کلاسیکی تہذیب کی رفعتوں اور گہرائیوں کو یکسر فراموش کر بیٹھے ہیں۔ ہمارے کلاسیکی ارباب فکر و نظر، تعبیرات شناسی، معنویات فہمی، اور کیفیات آگہی کے ضمن میں صاحب فہم و ذکا، شارح، مفسّر، مفہّم اور معبّر کی معنوی اور کیفیتی تفریقات اور ترجیحات کے عارف تھے۔ ایک نظر کبھی عربی اور فارسی کے نقد عالیہ پر مرکوز کیجئے تو یہ سورج آسا حقیقت روشن ہو جاتی ہے جو فی زمانہ دکھتی آنکھوں کیلئے ناقابلِ برداشت ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ مشرقی دانش و بینش کے قدیم و عظیم ترماضی کے عارف نہ سہی تاہم دقیقہ سنج اور نکتہ شناس ہیں اور جدید مغربی علم و آگہی کے مستند، معتبر اور موقر عالم ہیں۔ ویسے خامیوں سے کلیتاً مبرا کون معصوم ہے؟ البتہ کج بحثی اور کٹھ حجتی گناہ ہے۔ لیکن یہ سفاک حقیقت ہے کہ نارنگ صاحب کی مخترع اصطلاح تفہیمیت کو سمجھنے میں بدر عالم خلش صاحب کو صریحاً مغالطہ قاضی افضال حسین صاحب کی وجہ سے ہوا ہے۔ قاضی صاحب نے "تفہّم" اور "تفہیم" کے نازک اور لطیف فرق کو سمجھے بغیر تفہیم کو UNDER STANDING کیلئے بے تکلف استعمال کیا ہے اور شرح کو INTERPRETATION کیلئے ایجاد کیا ہے۔ اس ایجاد بندگی کے باوجود یہ بے رحم سچائی ہے کہ فہم + یات یا "تفہم + یات (علم کے معنوں میں نہیں، بحیثیت عامیانہ جمع کے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں) کے بعد شرح + یات EXPLANATION (۲) تنقیحات (۳) تفسیرات (۴) تفہیمات اور تعبیرات کی پہلی منزل ہے جس کا منبع نور تفہّم UNDERSTANDING ہے۔ اس کے لئے فہم اور ادراک کا بھی استعمال مروج ہے۔ تفہّم کے لغوی معنی (سمجھنا) اور تفہیم کے لغوی معنی (سمجھانا) ہوتا ہے۔ تفہیم میں تشریح، تنقیح، تفسیر اور تعبیر تدریجاً چاروں معنویاتی SEMANTIC اور کیفیاتی EMOTIVE مراحل شامل ہیں۔ تشریح، تنقیح، تفسیر، تفہیم اور تعبیر کا ایک ایک ابتدائی اور مکتبی جزو ہے جو جامد کردار کا حامل ہوتا ہے اور لغوی ترجمہ سے مشروط ہوتا ہے۔ یہ صرف معنی کو بیان کرتا ہے۔ معنویت SIGNIFICANCE کو نہیں۔ معنی اور معنویت میں فرق ہوتا ہے۔ تنقیح میں معنی کی جوہریت، اہمیت اور معنویت کو منکشف کیا جاتا ہے۔ تشریح تو صرف معنی کو آشکار کرتی ہے۔ معنویت کی ثروت، عمق اور پیکرانیت کو نہیں۔ معنی اور معنویت میں تقلیبی تفاوت ہے۔ ان کے درمیان کا عرصہ ENTIRE SPACE اور التوا DEFERMENT ہی تخلیقیت اور کیفیت افروز ہوتا ہے۔ متن کی ساخت میں اصوات، الفاظ اور جملوں کا تفریقی اور التزامی کردار ہی صرف تخلیقیت آفریں اور معنویت کشا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ان کے درمیان

کا وہ خلا " MATRIX WOMB بھی جہانِ معنی یا آفاقِ معنی کا آفریدگار اور پروردگار ہوتا ہے۔ اس کیفیت اور معنویت پر "چاک" سے اہلِ قاری کو لذتِ غلار "پری" نصیب ہوتی ہے۔ معنویت اور کیفیت (رس) بین صوت، بین الفاظ، بین کلام بین سطور، بین مصرعتین، بین بدلیتین اور بین معنین بھی کارفرما ہوتی ہے۔ اسی لئے مائیکل ریفاٹیر (ریفائیر غلط ہے) نے بھی خود معنویت اور کثیر المفہومیت کی حامل قرأت کی دو سطحوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلی انکشافی، تنویری، تحقیقی تفہیمی سطح HEURISTIC ہے اور دوسری تفسیری، تفہیمی اور تعبیراتی سطح HERMENEUTICS ہے۔

معنی کے اظہار کرنے اور معنویت کو منکشف اور منور کرنے اور دوسری اشیاء سے اس کے رشتے کی قدر RELATIONAL VALUE کو روشن تر کرنے میں بہت زیادہ فرق ہے۔ لہٰذا شرح اور تفہیم و تعبیر میں ہمالیائی تفاوت ہے۔ اگر کوئی صاحبِ فہم و ذکا (فہیم کا دھنی اور گنی) محض آہن پوش معنی کو رقم کرے تو وہ شارح ہے۔ اس کی برف پوش رقمیہ ECRITURE WRITING حرفِ شرح ہے۔ اگر وہ معنویت کی لامتناہیت کو منکشف کرے تو وہ مُفہِّم اور مُعَبِّر ہے اور اس کی تخلیق کردہ تحریر و تنقید تفہیماتی یا تعبیراتی مکاشفہ ہوگی۔

تفسیر میں نسبتاً کہیں زیادہ غیر مشروط معنویاتی اور کیفیاتی حرکیت DYNAMISM ہوتی ہے۔ اس میں دوسرے علوم و فنون، روایات، رسومیات اور دیگر معنوی اور کیفیتی مضمرات سے بھی مشروط تشریح و توضیح میں مدد لی جاتی ہے۔ مولانا مودودی اور مولانا آزاد کی قرآن حکیم کی تفاسیر و حواشی اس امر کے شاہد ہیں۔ لیکن تفہیم (فہمائش) اور تعبیر میں معنویت در معنویت کو بہ جہتی سے اجاگر کیا جاتا ہے۔ یہ قطرہ میں دجلہ دیکھنے اور دکھانے کے مترادف ہے۔ اس عارفانہ جمالیاتی اور اقداری وظیفہ میں معنویت در معنویت کی ساری طرفیں حسبِ توفیق کھول دی جاتی ہیں۔ تفہیم اور تعبیر کی سطح پر اہل قاری یا ناقد کا طبعزادانہ اور خلاقانہ کردار نمایاں ہوتا ہے۔ لہٰذا شرح + یات جزوئیت کی حامل ہوتی ہے اور تفہیمیت کلیت کی امین ہے۔ اس ضمن میں قاری افضال حسین صاحب سے بہت بڑی چوک ہوگئی ہے (اس فاش غلطی کی پیروی کے جذباتی شور و شر میں بدر عالم خلش صاحب "گوپی چند نارنگ صاحب کے الفاظ کو بے دخل" کرنے کے زعمِ باطل میں مبتلا ہو گئے۔ جو رتن ناتھ سرشار خوجی کی یاد دلایا جو بات بات پر "لانا تو میری قرولی" کا نعرہ بلند کرتا تھا)

تفہیم و تعبیر میں کثیر الابعاد معنویات جوئی ہوتی ہے۔ یہ متن کی معنویت در معنویت کی تلاش، مدام تلاش کا غیر مختتم سفر ہے۔ یہ معنی کشائی، معنی آفرینی اور معنی خیزی کا تخلیقیت افروز وظیفہ ہے۔ نئے عہد کی تخلیقیت کے زندہ اور متحرک سیاق میں مجھے تعبیراتی تنقید کی اصطلاح زیادہ اس لئے پسند ہے کہ اس میں محض وضاحت و صراحت ہی نہیں ہوتی اس میں اقداری محاکمہ بھی ہوتا ہے۔ (اس ضمن میں میرا مبسوط ترین مقالہ "تخلیقیت پسند ادب کا نیا جمالیاتی اور اقداری نظام" مطبوعہ خاص نمبر "توازن" مالیگاؤں مفید مطلب ہے۔ یہ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتابوں کے شائع ہونے سے سات آٹھ سال قبل شائع ہو چکا ہے) تعبیراتی تنقید میں کثیر لمعنی متن کی سیالیت اور اہل قاری یا ناقد کے تفہیم، تشریح، توضیح، تفسیر اور تعبیر کی تخلیقی کارکردگی کا سلسلہ کار PROCESS نئے تناظر میں بھی متواتر جاری رہتا ہے۔ نتیجتاً زندہ، تابندہ اور پائندہ متن کی تخلیقیت اور تفہیم و تعبیر کی تخلیقیت کا جشن جاریہ ابد تک جاری رہتا ہے۔ انہیں معنوں میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے بڑی تخلیقیت کش بات کہی تھی۔ "آج شکسپیر جو کہا ہے جو ہم اسے سمجھتے اور سمجھاتے ہیں۔ حدودِ امروز سے شکسپیر کی رشحاتِ فکر ہی نہیں کوئی بھی فکر و فن پارہ قدم باہر نہیں نکال سکتا۔" آنے والا نیا عہد جب بھی ظہور پذیر ہوگا تو امروز کے سنہرے افق پر نمودار ہوگا۔ آنے والی نسل ہماری تفہیمات اور تعبیرات کی تشکیل کر سکتی ہے۔

درحقیقت جدید علم تفہیم و تعبیر کے علمبردار پول رکیور غ (ریکیور غلط ہے) کے زاویۂ نگاہ سے یہ تفہیم و تعبیر اسرار شکنی DEMYSTICATI اور فریب شکنی DEILLUSION ہے۔ "بدر عالم خلش صاحب کا شدید منفی رویہ" سے نئے نظریات

کی چیل پیل ،، کے ضمن میں انتہائی مضحکہ خیز ہے ۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی جیسے ہی نہیں اہم ہیں ۔ علم نہیں اعلم ہیں ۔ وہ میری تخلیقیت سیریز کا نہایت دیدہ ریزی سے تنقیدی تعارف نامہ لکھتے رہے ہیں ۔ جو تمام مابعد جدید POST MODERN اور مابعد ساختیاتی POST STRUCTURAL نظریات کا اولین آئینہ خانہ ہے ۔ پندرہ سال سے تو میں متواتر تخلیقیت سیریز ہی لکھ رہا ہوں ۔ نئے عہد کی تخلیقیت تحسین و تقدیر کے ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر نارنگ، ڈاکٹر انور سدید، شمس الرحمٰن فاروقی جوگندر پال جیسے اکابرین ادب کے علاوہ خود بدر عالم خلش تک کے مکاتیب شائع ہو چکے ہیں ۔ ،، دیگر علوم ،، کی کتابوں کے ضمن میں اسٹریلیا سے کنیز فاطمہ صابرہ کا مکتوب ڈاکٹر محمود علی کے کاموں کے ضمن میں چشم کشا ثابت ہوگا ۔ اس کے علاوہ مشہور شاعر شہزاد احمد نے سائنسی موضوعات پر کئی اہم کتابیں تصنیف کی ہیں ۔ امریکہ سے ستیہ پال آنند جی کا مکتوب نشان دہی کرتا ہے کہ ہندو دیومالا، اساطیر پر چوتھائی صدی قبل سے ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ہمیش وغیرہ کام کر رہے ہیں ۔ اسطوری تنقید پر بھی میرے علاوہ ڈاکٹر انور سدید نے بھی کام کیا ہے ۔ علی الخصوص ،، نئی عروض شناسی ،، کے ضمن میں گزشتہ کئی سالوں سے میں نے ایک نہایت معنیٰ انگیز سوال انگیخت کیا تھا ۔ اس کی توثیق عالمی شہرت یافتہ شاعر و مفکر ناظم حکمت کے استفسار اور علی سردار جعفری صاحبان کے علیمانہ و عارفانہ اثبات سے ہو گئی ہے ۔ کیا برصغیر کے شاعروں (ان کا مطلب اردو شاعری سے تھا) کے پاس اپنا آہنگ نہیں ہے کہ وہ عربی اور فارسی شاعری کی کفالت پر ہی بھروسہ کرتے ہیں ۔ سردار جعفری صاحب نے اس معنی خیز استفسار کا اثبات نہایت علیمی اور تخلیقی بصیرت سے یوں کہا ہے ۔ ،، آج میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں کتنی صداقت تھی ۔ ،، ایک جملہ معترضہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اہم اور معنی خیز آرٹیکل ،، موضوع انسانی متھ کے سایہ میں ،، میں یہ ہے کہ ژاک لاکاں بھی فرائیڈ کے مانند ۔

(۱) فرسٹ سائیکلوجی یعنی سائیکلوجی آف پیتھیولوجی (امراض کی نفسیات) کا ہی نمائندہ ہے ۔ گو اس نے ساختیاتی تحلیل نفسی کے مکتبہ فکر کی بنیاد ڈالی ہے ۔ اور فلسفۂ لسان اور فلسفہ نقد کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے ۔ لیکن مابعد جدید نفسیات اور مابعد النفسیات کی دنیا ژاک لاکاں کے موضوع انسانی کے تحلیل ہونے کے وقوعہ) FADING OF THE SUBJECT سے بہت آگے ۔ (۲) سکنڈ سائیکلوجی یعنی سائیکلوجی اوف ہلدی مین کے (صحت مند آدمی کی نفسیات) GROWING OF THE SUBJECT (موضوع انسانی کی نشوونما) کا ارتفاع کر (۳) تھرڈ سائیکلوجی یعنی سائیکلوجی آف ان لائٹمنٹ ،، موضوع انسانی کی پوری کھلاوٹ ،، کی جانب گامزن ہے ۔ ،، نیو ایج موومنٹ ،، میں اس پر بہت جم کر کام ہو رہا ہے ۔ محولا بالا دونوں مابعد جدید نفسیات اور مابعد النفسیات کے ان رجحانات کی ابہام و تفہیم کے ضمن میں میری تخلیقیت سیریز کا بہت اہم اساسی رول رہا ہے ۔ جواب باقاعدہ ،، نئے عہد کی تخلیقیت ،، کا خورشید نشان بن گیا ہے ۔ اس کا پورا عالمی اور قومی منظرنامہ ،، شاعر ،، کے ہم عصر نمبر میں پہلی بار خصوصی سطور پر شائع ہو رہا ہے ۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف !

بقیہ صفحہ ۲۷ ۔ اردو شاعری اور ہندوستان کی تہذیب

وہ ہڑپا اور موہنجو داڑو کے عہد سے شروع ہو کر ہندوستان کی آزادی کے عہد تک کا احاطہ کرتی ہے

یہ چند باتیں صرف اس سوال کے جواب میں ہیں کہ ،، آج سردار جعفری پروین شاکر پر نظم لکھتے ہوئے وویاپتی سے اشارہ اور تلمیح کے طور پر حوالے مستعار لیتے ہیں ۔ لیکن پچیس برس پہلے تک کی اردو شاعری میں (فراق کو چھوڑ کر) کتنے شاعروں نے ہندوستان کی اس تہذیب سے رشتہ جوڑا ہے جو کئی ہزار برس پرانی ہے ۔ ،،

باقی باتیں آئندہ کے مضمون میں ۔



شبنم رومانی

اِن ایک نیا امتحان سر پہ ہے
ین پاؤں تلے، آسمان سر پہ ہے

ہائی دیتی ہیں کیسی ہری بھری فصلیں
ی غنیم کی صورت، لگان سر پہ ہے

ا خاندان کے سر پہ ہوں بادلوں کی مثال
د بجلیوں کی طرح خاندان سر پہ ہے

دم جاؤں تو دھنستے ہیں ریگِ سرخ میں پاؤں
ذ سر اٹھاؤں تو نیلی چٹان سر پہ ہے

لا کے خاک ہی کر دے یہ چیختا سورج
مگر دعاؤں کا اک سائبان سر پہ ہے

ل اور وصلِ سخن، اور اک وصالِ نگاہ
فارقت کی گھڑی میری جان! سر پہ ہے

۲۰۷۔ گھڑیالی بلڈنگ، صدر، کراچی (پاکستان)

شجاع خاور

میں نے صرف اپنے نشیمن کو سجایا سال بھر
فصلِ گل بھی اس لئے آئی ہے اب کے ڈال بھر

بدگمانی آئی تو لے جائیگی رشتے تمام
دیکھنا نکلے گی ان شیشوں کی ہستی بال بھر

معتبر چاکِ گریباں نے تجھے بھی کر دیا
چل دوانے تو بھی اب جیبِ جنوں میں مال بھر

وہ زمانہ ٹھیک تھا ایمان لانے کیلئے
حیدرِ کرار بھر خیبر اور شرِ دجال بھر

آج میری عرض پر زلفیں اگر کھولے گا وہ
کل حسد کی آگ میں جل جائے گا بنگال بھر

سجدہ بھر ایمان باقی رہ گیا ہے شیخ کا
اور عقیدت برہمن کی رہ گئی ہے تھال بھر

نیک و بد کی کشمکش میں ہیں کراماً کاتبین
بس شجاع اب خود ہی اپنا نامۂ اعمال بھر

۱۷۔ پارک لین۔ نئی دہلی ــــ ۱۱۰۰۰۱

باقر نقوی

کوئی بیکل خوشبو روح میں ہے کوئی سوچ آوارہ دل
اک چاند ادھورا چہرے پہ اک کچا تارا دل میں

کسی یاد کی گرمی سے اچھلے، کسی پیار کی خوشبو سے
اسے خون کہوں یا شعر کہوں، یہ جو اک فوارہ دل

مٹی تو مری ہے پریاگی، یہ دھوپ لگی ہے نہ
گنگا میا مری آنکھوں میں اور سندھ کا دھارا دل

مرا جسم ہے سونے چاندی کا مرا روپ نگر میں ہے ڈ
مگر ایک خلش ہے سینے میں ابھی اک انگارہ دل میں

یوں جلتی دھوپ کے صحرا میں خاموش کھڑا ہوں میں
دریاؤں میں ٹھنڈے پانی کا اور برف کا پارہ دل میں

یہ خانہ بسر تو موسم موسم آتے جاتے رہتے
کئی موسم دل پر ٹوٹ چلے مگر اک بنجارہ دل میں

تم سبزے کے متوالے تھے، تم چاند ستارے والے
پھر شام ہے کیسی چہرے پر کیسا اندھیارا دل میں

بستی سے نکل آئے ہو مگر مجنوں بننا آسان
کوئی سودا سر میں ہے کوئی بے چین شرارہ دل میں

وہ ہنستے بستے دل والا پاگل کر ہوا شاعر
منظر کے ہیں ناوک آنکھوں میں اور دکھ کا آ

۱ پریاگ، الٰہ آباد ۲ مہران وادی سندھ

THE CROSSWAYS, MESTON
MIDDX TW5 OSJ(UK)

گلزار

بوسکیانہ، پالی ہل۔ باندرہ۔ بمبئی ۔ ۵۰

دس پیسے اور دادی

بس ایک دس پیسے کے لئے جھگڑا ہوگیا دادی سے۔ اور گھر سے بھاگ گیا دس پیسے بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟ رام منوہر کی جیب میں کتنی ریزگاری رہتی ہے۔ جب چاہیں جاکے پتنگ خرید سکتے ہیں بلکہ گٹی اور دوسرے کی کٹی بندھ گئی۔ ماسٹے کی چرخی بس بھری ہی رہتی ہے اور سندی کے کتنے سارے پتے رکھے ہیں گھر میں یہ سب یاد آتے ہی پھر غصہ آگیا اسے۔ دادی ہے ہی ایسی گھنی۔ اسی لئے اتنی جھریاں ہیں اس کی شکل پر۔ رام کی دادی کی شکل پر تو ایک بھی نہیں۔ ایک کے بعد ایک اسے دادی کے سارے نقص یاد آنے لگے۔ کان کتنے ڈھیلے ڈھیلے ہیں۔ جب بھی گالوں پہ چومتی ہے تو آنکھوں پہ لٹک جاتے ہیں اور پلکیں تو ہیں ہی نہیں۔ رات کو سوتی ہے تو آدھی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ منہ بھی کھلا رہتا ہے — دادی کے کارٹون بنا تا۔ وہ ننگے پاؤں ہی ریلوے اسٹیشن تک گیا۔ بلا کسی ارادے کے وہ اسٹیشن میں گیا اور جیسے ہی گاڑی نے سیٹی دی وہ دوڑ کے گاڑی میں چڑھ گیا۔

گاڑی چلنے کے بعد ہی اس نے سوچا کہ چلو گھر سے بھاگ جائیں اور گاڑی میں ہی اس نے فیصلہ کیا کہ زندگی میں خود مختار ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ ایک ایک پتنگ کے لئے اتنے بوڑھے بوڑھے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے۔ اسی لئے تو اس کے بڑے بھائی بھی دادی کو چھوڑ کر بمبئی چلے گئے تھے اور پھر کبھی نہیں آئے۔ کتنے سال ہو گئے۔

گاڑی کے دروازے کے پاس ہی بیٹھے بیٹھے اسے نیند آگئی بہت دیر بعد جب آنکھ کھلی تو باہر اندھیرا ہو چکا تھا — اور تب اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ واقعی گھر سے بھاگ آیا ہے۔ دادی پر غصہ تو کچھ کم ہوا تھا لیکن شکایت اور گلہ ابھی تک گلے میں رندھا ہوا تھا۔

دس پیسے کون سی ایسی بڑی چیز ہیں۔ اب اگر پوجا کی کٹوری سے اٹھالئے تو چوری تھوڑا ہی ہوئی۔ بھگوان کی آنکھوں کے سامنے سے کر گیا تھا۔ خود ہی تو کہتی ہے دادی کہ اس کے دیوتا جاگرت، ہیں۔

" دن رات جاگتے رہتے ہیں؟ کبھی نہیں سوتے؟ "

" نہیں! وہ آنکھ بند کریں، تب بھی دیکھ سکتے ہیں!

ہونہہ تو دس پیسے کیسے نہیں دیکھے؟ اور دیکھے تو بتایا کیوں نہیں دادی کو؟ وہ تو سمجھتی ہے میں نے چوری کی ہے! دادی کے بھگوان بھی اسی جیسے ہیں۔ گونگے! کم سنتے ہیں۔ کم دیکھتے ہیں!

کسی نے دروازے سے ہٹ کے اندر بیٹھنے کے لئے کہا اسٹیشن آیا تھا شاید، گاڑی آہستہ ہو رہی تھی۔ گاڑی کے رکتے رکتے ایک بار تو خیال آیا کہ لوٹ جائے لیکن اسٹیشن پر ٹہلتے ہوئے پولیس والوں کو دیکھ کر اس کا دل دہل گیا وہ بنا ٹکٹ تھا یہ خیال بھی پہلی بار ہوا اسے! اس نے سنا تھا، بنا ٹکٹ والوں کو پکڑ کر پولیس جیل بھیج دیتی ہے، اور وہاں چکی پسواتی ہے!

دروازے کے پاس ٹھنڈ بڑھ گئی تھی وہ اندر کی طرف سیٹوں کے درمیان آکر بیٹھ گیا۔ گاڑی چلی اور لوگ اپنی اپنی جگہوں پر لوٹے تو بندھی بندھی بستر کے اوپر نیچے سے ہوتا ہوا وہ کھڑکی کے بالکل نیچے جا کر فٹ ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد اسے بھوک اور پیاس کا احساس ستانے لگا خود مختاری کے مسئلے ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے۔ اسے بھوک بھی ستا رہی تھی، پیاس بھی۔ اوپر والی برتھ پر سوئے ہوئے حضرت کی صراحی مسلسل ٹرین کے جھکولوں سے جھول رہی تھی۔ اور صراحی کے منہ پر اوندھا لگا ہوا گلاس بھی مسلسل کٹ کٹ کئے جا رہا تھا۔

اسی وقت نیلی وردی پہ پیتل کا چمکتا ہوا بلا لگائے ٹکٹ چیکر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی اس کا اسسٹنٹ ایک بنا ٹکٹ والے کو

گدڑی سے پکڑے ہوئے داخل ہوا۔ چکو کی تو جان ہی نکل گئی۔ جانکلا کہ
میں یہ آدمی کیسے اندر آ گیا۔ اسٹیشن سے چڑھتے ہوئے تو دیکھا نہیں تھا
ضرور کہیں چھپ کے بیٹھے رہتے ہوں گے یہ لوگ!
سیٹ کے نیچے ہی نیچے، گھسٹتا، کھسکتا وہ نیلی وردی کے پیچھے
کی طرف جا پہنچا   پھر وہاں سے کھسکتا ہوا ڈبے کے دوسری طرف
جا نکلا۔ جہاں سے ٹائیلیٹ نظر آ گیا۔ بس اسی میں گھس گیا اور نیکر کھول
کے کموڈ پر بیٹھ گیا۔ پاخانے میں تھوڑا ہی کوئی ٹکٹ پوچھنے آئے گا؟
یہ خیال بھی آیا کہ دوسرے لوگ یہ ترکیب کیوں نہیں استعمال کرتے اور وہ
چیچک کے داغوں والا تو کر ہی سکتا تھا جسے ٹی۔ سی کے اسسٹنٹ نے گدڑی
سے پکڑ رکھا تھا۔   بہت دیر بیٹھا رہا۔ ننگی ٹانگوں پر ٹھنڈ
لگ رہی تھی۔ ہوا بھی! تھوڑی دیر کموڈ پر بیٹھے بیٹھے نیند بھی آنے لگی تھی۔
پھر گاڑی نے پٹری بدلی۔ ایک دھچکا سا لگا۔ رفتار بھی کچھ کم ہونے
لگی۔ بڑی احتیاط سے اس نے ٹائیلیٹ کا دروازہ کھولا۔ باہر جھانکا کوئی
اسٹیشن آ رہا تھا۔ جھانک کر دیکھا تو نیلی وردی کہیں نظر نہ آئی۔ ضرور کہیں
چھپ کر بیٹھا ہوگا ورنہ چلتی گاڑی سے کہاں جاتا؟ گاڑی رکی، تو وہ فوراً
اتر گیا۔

سنسان اسٹیشن، آدھی رات کا وقت۔ کوئی اترا بھی نہیں   گاڑی
تھوڑی دیر کھڑی ہانپتی رہی۔ پھر بھک بھک کرتی ہوئی آگے چل دی۔
چکو ایک بنچ پر سکڑ کے۔ اپنی ہی ٹانگوں میں منہ دے کر بیٹھ گیا
اور فوراً ہی تکیے کی طرح ایک طرف لڑھک گیا۔ ٹھک ٹھک کرتا، لالٹین
ہاتھ میں لیے۔ ایک چوکیدار آیا اور اسے کان سے پکڑ کر اٹھا دیا۔
"اے   چل باہر نکل! گھر سے بھاگ کر آیا ہے کیا؟
چل نکل، نہیں تو چوکی والے دھر لے جائیں گے۔ چکی پسوائیں گے
جیل میں۔

ایک ہی دھمکی میں وہ لڑکھڑا کے کھڑا ہو گیا۔ چوکیدار ٹھک ٹھک
کرتا پھر غائب ہو گیا۔ چکو، پلیٹ فارم کے نیچے کی طرف نکل گیا جہاں مدھم
سی روشنی میں ایک بوریوں کا ڈھیر پڑا نظر آ رہا تھا   بوریوں کے
پیچھے ہی کوئی بڑھیا، دادی کی طرح منہ کھولے سو رہی تھی۔ پھٹا پرانا ایک
لحاف اوڑھے۔ کوئی بھکارن ہوگی۔ نیند اور برداشت نہیں ہو رہی تھی۔
وہ اسی بھکارن کے لحاف میں گھس گیا   اُسے لگا تھا جیسے دادی کے
لحاف میں گھس رہا ہے۔ گاؤں میں اکثر یہ ہوتا تھا۔ سردی اپنے پاس
سلاتی تھی اور وہ رات کو اٹھ کر دادی کے لحاف میں جا گھستا تھا۔ سردیوں
پر گئے ہی سو گیا۔
صبح جب اٹھا تو ویسے ہی بڑھیا سے لپٹ کے سویا ہوا تھا۔
بھکارن کے سرہانے پڑے کٹورے میں ریزگاری پڑی تھی۔
پھر وہی کٹوری یاد آ گئی۔ کل رات کی بھوک پھر لوٹ کر آ گئی۔ اتنی ساری
ریزگاری کیا کرے گی بڑھیا   ۔   دادی سے پوچھا تو کہتی تھی
"مر کے بھی تو ضرورت پڑتی ہے پیسوں کی! ورنہ اس کاٹھی کو
جلائے گا کون؟"
تھوڑی! کتنی لکڑیاں پڑی تھیں گھر میں! اس کی نظر پھر پیالے پر
گئی۔ ایک دس پیسے نکال بھی لے تو کیا ہے؟ یہاں تو بھگوان بھی نہیں
دادی بھی نہیں! مانگ لوں تو شاید خود ہی دے دے۔ اِدھر اُدھر
دیکھا اس نے! کینٹین کے پاس رکھی انگیٹھی کا دھواں اکڑ سے کے اوپر
چڑھتا جا رہا تھا اس نے اٹھا لئے دس پیسے۔ بڑھیا کا لحاف ٹھیک
کیا اور موتری کی طرف چلا گیا۔ واپس آکر مٹی سے ہاتھ دھوئے دادی
نے سکھایا تھا۔ صابن نہ ہو تو چولہے کی راکھ سے ہاتھ مانجھ لیا کرو۔
"اور راکھ بھی نہ ہو تو؟"
"تو گیلی سی تھوڑی سی مٹی لے لو۔ لیکن موتری سے آ کے ہاتھ
دھویا کرو۔"

ہاتھ دھوئے۔ تج ٹھنڈے پانی سے۔ کسی نے کوئلہ مسل کر رکھا
تھا ہودی پر۔ منجن کیا ہوگا۔ اس نے دانت بھی مانجھ لیے۔ منہ ہاتھ
بھی دھویا۔ ہاتھ جھٹک کے سکھائے اور نیکر کی جیب میں ہاتھ ڈال
کر پونچھے، تو ٹھنڈے ٹھنڈے دس پیسے کے سکے نے ہاتھ پہ کاٹ
کھایا۔

واپس لوٹا تو بڑھیا کے پاس تین چار آدمی کھڑے تھے۔ ایک اس
کے سر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کہہ رہا تھا۔
"بالکل اکڑ گئی ہے۔ مرے ہوئے بھی آٹھ دس گھنٹے تو ہو گئے
ہوں گے"

"رات نیند ہی میں چل بسی شاید!"
چکو گھبرا کے کھڑا ہو گیا وہیں۔ ویٹنگ روم سے بھی کچھ لوگ اس
طرف آ رہے تھے۔
"اب کیا ہوگا اس کا؟"
"اسٹیشن ماسٹر آئے گا تو کسی کو خبر کرے گا!"
"کس کو؟"
[باقی صفحہ [illegible] پر دیکھئے]

برسات کے دو گیت

[بمبئی کے سلسلۂ نظم کاروں کے نام ؎]

محمد صلاح الدین پرویز

۱

میرا عروج لے کے جا، میرا زوال لے کے جا
اے نامہ بر، قسم تجھے، اس کا رومال لے کے آ
اس کے رومال میں کہیں میرا بھی ایک پھول ہے
پھول ہے لال رنگ کا، اس کی ہیں سبز پتیاں
سبز حسین پتیاں کہتی ہیں ایک داستاں
داستاں،
جس میں اِک بدن دوجے بدن کے ساتھ ہو
ایک ہی اسم سے بندھے
ایک طلسم سے جڑے
سہمے ہوئے، چھپے چھپے
دونوں بدن اتر پڑیں جنگل میں ڈھونڈنے اِسے
جنگل میں تھوڑا چاند ہو، جنگل میں تھوڑی رات ہو
جنگل میں ایک موت ہو، جنگل میں اک برسات ہو
جنگل میں تھوڑا خوف ہو، جنگل میں تھوڑی چاہ ہو
جنگل میں کچھ پناہ ہو، جنگل میں کچھ گناہ ہو
جنگل میں اک پہاڑ ہو، جنگل میں ایک ہنر ہو
جنگل میں تھوڑا قہر ہو، جنگل میں تھوڑا مہر ہو
اتنے میں چل پڑے ہوا
دونوں بدن لرز اٹھیں
اتنے میں کوندیں بجلیاں
دونوں بدن چمک اٹھیں
اتنے میں برسیں بدلیاں
دونوں بدن سلگ اٹھیں

بھیگے ہوئے وہ دو بدن
بارش کا گیت گائیں پھر
جنگل بھی ان کے ساتھ میں، سلگا ہوا، جلا ہوا
اپنی ازل پریسیکا،
یعنی الاؤ اس رات کی
زلف ذرا سی چھیڑ کے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اتنا کہے:

پریسیکا!
تانوں میں مستیاں نہیں، لے میں خماریاں نہیں
آنکھوں میں لے کے آ ذرا، دونوں بدن کے وصل کو
بارش کا تو بھی گیت گا!

میرا عروج لے کے جا، میرا زوال لے کے جا
اے نامہ بر، قسم تجھے، اس کا رومال لے کے آ

۲

ابھی گیت گانے کا موسم نہیں ہے
ابھی زلف بھی میری بھیگی نہیں ہے
ابھی ہونٹ بھی میرے سوکھے ہوئے ہیں
ابھی آنکھ بھی میری پُرنم نہیں ہے
ابھی میرا آنچل ہے سینے پہ میرے
ابھی میں نے اس کو نچوڑا نہیں ہے
ابھی خالی خالی ہے میری کلائی
ابھی چوڑیاں ان میں کھنکی نہیں ہیں
ابھی پاؤں میں میرے خاموشیاں ہیں
ابھی ان میں پائل بھی باجی نہیں ہے
ابھی تو ہے اک دوپہر میرے دل میں
ابھی شام اس میں سمائی نہیں ہے
ذرا شام آئے
تو یہ زلف بکھرے
تو یہ ہونٹ بہکیں
تو یہ آنکھ بولے
ذرا شام آئے
تو آنچل بھی بھیگے
یہ چوڑی بھی کھنکے
یہ پائل بھی باجے
ذرا شام آئے تو برسات لائے
جو برسات آئی تو میں بھیگ لوں گی
جو میں بھیگ لوں گی تو سب سے کہوں گی
مرے شیام!
میں شام سے منتظر ہوں
قسم سے مرے شیام، میں بے خبر تھی
میں اپنے بدن سے بہت بے خبر تھی
مگر اب نہانے میں کب اور کیسے
بدن سے بہت با خبر ہو گئی ہوں!!!

؎ ان نظم کاروں میں خلیل جعفری، انتظار امام صدیقی، سلام بن رزاق، انور خان، انور قمر، مقدر حمید، ساجد رشید، انجم عثمان اور بہت سارے دوسرے بھی شامل ہیں۔

● پوسٹ بکس ۴۵۵۱، ریاض۔ ۱۱۴۱۲۔ (سعودی عربیہ)

طاہر نقوی

بلاک ۳، ۵۶۱-اے گلشن اقبال، کراچی (پاکستان)۔

دستک

اور لوگوں کی طرح میری زندگی بھی ایک مخصوص ڈھرے پر چل رہی تھی۔ صبح صبح اٹھ کر دفتر جاتا۔ وہاں ساتھیوں کی آپس کی ذہنی منافقت اور افسروں کی چاپلوسی، چنانچہ یہ تمیں ساتھ لیے روز ہراساں اور تھکا تھکا گھر لوٹ آتا۔ پھر بیوی سے بات بات پر الجھاؤ اس کے نتیجے میں بچوں پر خواہ مخواہ ڈانٹ ڈپٹ ہوتی رہتی۔ میرے لیے دکھن کی کیفیت ہر طرف پھیلی رہتی۔ میں سچ اور جھوٹ کے خانوں میں بٹ کر وقت کے خانے سے بھی باہر ہوتا جا رہا تھا۔ میرا اندر کا وجود چیخ اٹھتا تھا اور پھر یوں ہی رات کو پلنگ پر جا پڑتا اور خود کو اوڑھ کر سو جاتا۔

وقت کے ریلے کے ساتھ یہ خلا پھیلتا جا رہا تھا۔

اس یکسانیت سے گھبرا کر میں کوئی ایسا کام کرنا چاہتا تھا جس سے مجھے ذہنی آسودگی میسر آئے اور اپنی ذات کے خول سے نکل کر کسی کے کام آسکوں۔ مختلف آوازیں اندر سے مجھے دستک دیتی رہتیں۔ چنانچہ ایک روز گلیوں میں کھیلتے بچوں اور آوارہ گھومتے ہوئے نوجوانوں کو دیکھا تو اسی وقت طے کر لیا کہ اس محلّے میں ایک لائبریری قائم کی جائے تاکہ یہ بچے کچھ وقت مطالعے میں صرف کر سکیں۔ میرے ذہن میں اب پرندے خواہشوں کا استعارہ بن کر اڑنے لگے۔ اس سلسلے میں محلّے کے چند لوگوں سے مشورہ کیا۔ کسی نے ہنس کر ٹال دیا۔ کسی نے لاپروائی سے انکار کر دیا، کسی نے کہا کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو، کوئی اچھا کام کرو، ہر ایک میں بے نام سی بے رخی تھی۔ سب اپنے آپ کی پرچھائیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ ان میں ناآشنائی کا رشتہ تھا۔ کیوں کہ ان میں کوئی مشترک درد موجود نہ تھا۔ لیکن چند نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ بھی کیا۔ اس سے مجھے بجا طور پر حوصلہ ہوا۔

میں نے مقبوضہ پلاٹ پر مکان بنانے کے لیے جو رقم اکٹھی کی تھی اس سے پلاٹ کے ایک کونے میں چھوٹی سی لائبریری قائم کرنے کے لیے کام شروع کر دیا اور ضروری فرنیچر بھی بنوا لیا۔ اس دوران بیوی مجھ سے برابر لڑتی رہی کہ پیٹ کاٹ کاٹ کر مکان کی تعمیر کے لیے یہ رقم جمع کی تھی، تم اسے یوں ضائع کر رہے ہو۔ محلّے والے بھی مجھے بیوقوف اور احمق قسم کے القاب سے نوازتے رہے۔ تاہم کتابیں اکٹھی کرنے کا مرحلہ آیا تو مجھے یقین تھا کہ کتابیں کافی تعداد میں مہیا ہو جائیں گی چنانچہ ایک معمولی سے جلسے کے انتظام کے لیے خاصی بھاگ دوڑ کے بعد ایک سرکاری افسر کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے آنے پر میں نے آمادہ کر لیا۔ اسے میں اپنے لیے بڑی کامیابی سمجھ رہا تھا۔

جس روز جلسہ تھا۔ اس روز میرے ساتھ محلّے کے چند لوگ اور شامل ہو گئے۔ محلّے میں شاید پہلی بار ایسی چہل پہل اور رونق ہوئی تھی۔ حاضرین خاصی تعداد میں اکٹھا ہو گئے تھے۔ چنانچہ میں نے مہمانِ خصوصی کی تعریف میں رسماً بہت ساری باتوں سمیت یہ بھی کہا کہ یہ علم دوست ہیں اور علم کے لیے بہت کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ مہمان خصوصی نے حسبِ دستور محض کچھ وعدے کئے اور مجھے ایک سیٹھ صاحب کے پاس جانے کی ہدایت کی کہ وہ کتابیں فراہم کر دیں گے۔ لہٰذا اگلے ہی روز میں متعلقہ سیٹھ کے پاس جا پہنچا اس وقت ان کے پاس ایک صاحب بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سیٹھ صاحب ان سے بولے کہ ان کی لائبریری کے لیے کتابیں مہیا کر دو۔ کمشنر صاحب سے میں نے مجبوراً حامی بھر لی۔ کیونکہ ان سے میرا کام اٹکا ہوا ہے۔ وہ صاحب نہایت خوش دلی سے مجھ سے گویا ہوئے کہ کل میرے پاس تشریف لے آئیے۔ چنانچہ میں ان کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی فوراً کسی کا ٹیلی فون نمبر گھما کر بات کرنے لگے کہ یار میں ایک صاحب کو بھیج رہا ہوں انہیں بہت ساری کتابیں خرید کر دے دو۔ پھر مجھ سے

کہنے لگے کہ بھائی مجھے نہ لائبریری سے دلچسپی ہے اور نہ کتابوں سے
میں تو محض سیٹھ صاحب کی خوشنودی کی خاطر یہ کام کر رہا ہوں ۔
دراصل ان سے میرا بہت اہم کام اٹکا ہوا ہے ۔ وہ ہونٹوں کی محراب
سے مجھ پر مسلسل نوکے تیر برسے پھینک رہا تھا ۔ اس لئے اس کے
لفظوں کی تپش سے میں پگھل کر رہ گیا ۔ ماحول کا جوہڑ اس کے اندر
کے جوہڑ سے جا ملا تھا ۔ البتہ راکھ سے اٹے ہوئے اس کے سخت
چہرے پر تھوکنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی ۔ میں محض اپنے وجود کے
دلدل میں پھنسا ہاتھ پاؤں مارنے لگا ۔ اور کڑواہٹ بوند بوند میری
روح میں ٹپکنے لگی ۔ واپسی کے لئے میں وہاں سے اٹھا تو ایسا
محسوس کر رہا تھا جیسے میرے اندر کچھ ٹوٹ کر دھڑام سے گر گیا ہو
اور نتیجے کے طور پر تھکان کا شدید احساس میرے جسم میں جم کر
بیٹھ گیا ۔

ہمارے معاشرے کے ایسے لوگ ٹیلی فون کے تاروں کی طرح ہوتے ہیں جو محض پیغام ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں ۔ تاہم ہر طرف سے مایوسی کے بعد میں نے کتابوں کے عطیئے کے لئے اخبار میں اشتہار دے دیا ۔ اب مجھے اعتماد تھا کہ عوام اسے پڑھ کر آگے بڑھیں گے ۔ مگر کئی روز گزر گئے کسی نے کوئی خبر نہ لی ۔ میں لائبریری میں آنکھوں کے دروازے کھولے تنہا منتظر بیٹھا رہتا ۔ میرے ہمدرد مجھ سے طنزیہ کہتے کہ اگر تم ناچنے گانے یا کسی ایسے ہی فنکشن کے لئے چندے کی اپیل کرتے تو تمہیں مایوسی نہ ہوتی اب میں ہر طرف سے سخت مایوس اور کرچی کرچی ہو کر رہ گیا ۔ میرے لہو میں وحشتیں گھل گئیں ۔ میری نظروں کے سامنے گلیوں میں کھیلنے اور کتابوں کے دکھ اپنے سینوں میں جلاتے بچوں اور آوارہ نوجوانوں کے چہرے گھومنے لگے ۔ میری آنکھوں سے افسوس کی تیز بارش ہوتی رہی اور بوسیدہ لمحے سلگ سلگ کر میرے سامنے ناچنے لگے ۔ میں لائبریری کے خالی ریک اور الماریوں کو احساس بے بسی سے تکتا رہا اور بے ثمر لمحوں کی دہلیز پر خاموش بیٹھا رہا ۔ یہ دکھ میں تنہا جھیل رہا تھا ۔ البتہ میں اپنی خوش فہمیوں کے جال سے اب باہر آ گیا تھا ۔ لیکن ہر کرنے والا لمحہ مختلف لباسوں میں سامنے آتا ہے ۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا ایک بچے کو ساتھ لئے اندر داخل ہوا ۔ دونوں کے چہرے مہرے اور لباس سے معاشی بدحالی ٹپک رہی تھی ۔ میں نے بے توجہی اور انتہائی بے زاری سے ان کے آنے کا سبب دریافت کیا ۔ تو بوڑھا رسانیت سے بولا ۔

" میرا بیٹا آپ کی لائبریری کے لئے چند کتابیں لایا ہے "

" میرے گرد تحیر کا ہالا تن گیا ۔ اور آنکھوں میں ایک بار پھر چمک پیدا ہو گئی ۔ "

بقیہ صفحہ ۲۸ اکیلا پن

پہلے اولاد اپنے والدین کی ذرا سی تکلیف برداشت نہ کر سکتی تھی ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خون پسینہ ایک کر دیتی تھی اب بیٹا یہ کہتا ہے سب توجہ سمیٹنے کے بہانے ہیں ۔ ڈرامے بازی ہے ۔ کیا میں بوجھ ہوں ؟ کیا تمہاری کمائی کھاتا ہوں ۔ ؟ غسل خانے گیا ۔ کپڑے خود دھو لیئے ۔ بے وقت چائے خود بنا کر پیتا ہوں کہ تم سب کو بھی پلاتا ہوں ۔ باورچی خانے میں گیا کھڑے کھڑے برتن دھو ڈالے ۔ بہو ذرا ہنس کر بول دے تو ہانڈی روٹی بھی کر دوں ۔ وہ تو باورچی خانے اور کھانے کی میز پر مجھے دیکھنے کی روادار نہیں ۔ الٹا کہا جاتا ہے ہر بات میں دخل دیتا ہوں اچھا ہوا تمہاری ماں یہ سب دیکھنے سننے سے پہلے چلی گئی ۔ یہ دکھ اٹھانے سے بچ گئی ۔ گستاخیاں سہنے سے بچ گئی ۔ دیکھو تو کس قدر کٹھور نکلا ہے یہ اپنا ڈاکٹر بیٹا ۔ ایک روز جل کر کہہ دیا جیسی خدمت تم کرتے ہو ۔ خدا کرے تمہاری اولاد بھی یوں ہی پیش آئے ۔ جیسے تڑ تڑ سوال جواب تم کرتے ہو ۔ یہی معاملہ تمہارے ساتھ بھی ہو ۔ پھر تو ایسا روٹھا ایسا ڈانٹا کہ اب سامنے آنے سے ڈر لگنے لگا ہے ۔ کہتا ہے ۔ ہاں ۔ ہاں تم نے میرے بچے کو کوسا ہے ۔ پاگل کہیں کا ۔ جس کے لئے دعا کرتے کرتے دانت گھس گئے ۔ جس پوتے کو دیکھنے کو ترسا کیا جسے دیکھ کر نہال ہو جاتا ہوں ۔ اسے بددعا دوں گا ؟ کل کلاں دم نکل گیا تو پھوٹ پھوٹ کر روتا پچھتاتا اور ہاتھ ملتا کہ باپ اس دنیا سے ناراض گیا ۔ ناشاد گیا ۔ پھر کچھ بھی نہ چلے گا ۔

اس نے لاٹھی کا سہارا لیا اور بمشکل اٹھ کر کھڑا ہو پایا ۔ پنڈے پر ہاتھ پھیر کر لباس درست کرتے کرتے سوچا ،

کاش ! اولاد ہوتی ، بڑھاپے کا سہارا ہوتی !!

حمیرا رحمٰن

تمام فرصتیں کہانیوں کی نذر ہو گئیں
عجیب بستیاں حقیقتیں پانیوں کی نذر ہو گئیں
کوئی بھی خواب حقیقتوں سے مختلف نہیں
محبتیں بھی خوش گمانیوں کی نذر ہو گئیں
کھنڈر پکارتے ہیں اعتبار کی فصیل کے
یہ بستیاں یہاں کے بانیوں کی نذر ہو گئیں
کچھ عذاب کا جو ڈر تھا خطہ خطہ کم ہوا
علامتیں بھی کم بیانیوں کی نذر ہو گئیں
حمیرا گفتگو کے ایک طرفہ روشنی رہے
سماعتیں بھی بے زبانیوں کی نذر ہو گئیں

◆

سوغات منگا لیتے ہیں بچے امرملاب
سب کو دوست بنا لیتے ہیں بچے امرملاب
ان دیکھی کرنوں کے بے امکان اجالوں سے
جو بھی ڈھونڈیں پا لیتے ہیں بچے امرملاب
ان افواہوں کی تردید میں پریاں کوئی کیسے
ان کے رنگ چرا لیتے ہیں بچے امرملاب
گونگے بہرے گھر کے ہر کونے ہر پیڑ میں
کافی شور مچا لیتے ہیں بچے امرملاب
کڑوے نوحے اور زہریلا ورثہ آب و ہوا
سارے بوجھ اٹھا لیتے ہیں بچے امرملاب
ان چنار سحر کی مہک کی چھاؤں میں
کبھی کبھی بس گا لیتے ہیں بچے امرملاب

3- YOUMAN AV, YONKERS
N.Y 10719 (U.S.A)

شاہد ماہلی

◆

آنکھوں میں اس کی جھانک کے دیکھا تھا کیا رنگ
چاروں دشا میں پھیل گیا اک سنہرا رنگ
دل کی پردا پہ ڈال دیا کس نے گہرا رنگ
میرا تھا ہی ہے اب تو کوئی اور دوجا رنگ
آنکھوں میں بس گیا ہے وہی شوخ پیرہن
دل میں اتر گیا ہے وہی اودا اودا رنگ
سب اپنے اپنے رنگ میں مدہوش تھے مگر
سب کو اداس کر گیا آنکھوں کا پیلا رنگ
ہر گام پہ کھسکی ہے پیروں تلے زمیں
سر پہ یہ آسمان بدلتا ہے کیا رنگ
ہر شخص یارب اپنے تعصب کا ہے اسیر
بس اپنا اپنا راگ ہے اور اپنا اپنا رنگ
شاہد! تغیرات کے اسی دور میں جناب
ہر سو ہے ایک لرزہ وہی ایک جیسا رنگ

◆

آنکھوں دیکھی بات کہانی لگتی ہے
نئی نئی سی ریت پرانی لگتی ہے
دشت نوردی لگتی ہے سوغات مجھے
شب بیداری کوئی نشانی لگتی ہے
شاخوں کا تھا کھیل سہانا بچپن کا
چھومنتر سی بھری جوانی لگتی ہے
شام ہوئی تو کالے سائے امڈ پڑے
مجھ کو تو ہر چیز سہانی لگتی ہے
مریم جیسی ڈھلی ڈھلی اک مورت سی
میرا جیسی کوئی دیوانی لگتی ہے
چہرہ آنکھیں ہونٹ تمہارے جیسے ہیں
صورت پھر بھی کیوں انجانی لگتی ہے
لوٹ کے ... کبھی سونا تھی
پتھر جیسی سخت جوانی لگتی ہے

سکے ۔ ۲ بومی اسٹیٹ شیخ سرائے، فیس ۔ ۱۱، نئی دہلی ۔ ۱۷

مقصود الٰہی شیخ

'RAVI HOUSE'- UNIT E1, LEGRAMS LANE
BRADFORD BD7 1NS. (U.K.)

اکیلاپن

اس نے اپنے سفید سفید بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچتے سوچتے خوش ہونا چاہا۔ یہی تو میں چاہتا تھا۔ جو میں چاہتا تھا ویسا ہی تو ہوا ہے۔ وہ اپنے گھر میں شاد ہے۔ آباد ہے۔ اپنے بچوں کی دیوانی ہے جیسے کبھی وہ تھا اپنے شوہر پر جان چھڑکتی ہے۔ جیسے کبھی اس کی ماں اس پر مرتی تھی۔ !!!

مرنے والی مرگئی۔

اس کے گلے میں پھندہ لگ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ اداس ہوگیا موت کا تصوّر کیسے رگ رگ سے خون کھینچ لیتا ہے۔ جب اس کی بیوی کی گردن ڈھلک گئی۔ ہاتھ رکھ کر آنکھوں کے پپوٹے بند کردیئے گئے اور تلاوت رک گئی۔ سب کے رونے کی آوازیں بلند ہوئی تھیں

اس نے سوچا تھا

موت پر کس کا اختیار ہے؟ زندگی دینا اس کے بس میں نہ تھا ورنہ شانو کیوں مرتی؟ وہ تو زندگی سے پیار کرتی تھی۔ اس نے مرنے سے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا۔ میں اب سمجھی تم مجھے کتنا چاہتے ہو مجھے صحت مند ہونے پر تمہاری وہ خدمت کروں گی کہ دنیا میں اس کی مثال بن جائے گی۔ کسے خبر تھی، کون جانتا تھا کہ گھڑی جاتی ہے جب شانو کسی کے روکے نہ رکے گی۔ اپنی پیاری سی بچی سوہنی کو بنا کسی کے سپرد کئے اس دیس جا سدھارے گی۔ جہاں سے کوئی نہیں پلٹتا شانو کے بارے میں سب کو پتہ تھا کہ مرض جان لیوا ہے۔ بہلکے سے اب نہ بچے گی نہیں مگر وقت کا اندازہ ڈاکٹروں کو بھی نہ تھا۔ اس نے زور سے شوہر کا ہاتھ پکڑا۔ ہچکی لی اور ختم ہوگئی۔

اس وقت سوہنی چھ ماہ کی تھی۔

پھر سوہنی چھ سال کی ہوئی۔ وہ گڑیا سی تھی۔ پریوں کے پھول نگر کی شہزادی لگتی تھی۔ وہ کبھی سوہنی پکارتا۔ کبھی جوہی کہتا اور کبھی شرارت سے زبان دبا کر چوہی کہہ دیتا تو وہ بگڑ جاتی پھر قسمیں کھایا کرتا۔ اس نے جوہی کہا تھا۔ سوہنی کہا تھا۔

پھر وہ سولہ برس کی ایسی لڑکی نکلی جس کی سب تعریف کرتے تھکتے نہ تھے۔ ہر ماں اسے اپنی بہو بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ پھر اس کی چوہی، اس کی جوہی اس کی سوہنی کسی کی دلہن بن گئی۔ کتنے ارمانوں سے اس کا بیاہ رچایا تھا۔ کتنے بڑے دل سے اسے دوسروں کے حوالے کیا تھا۔ دولہے راجا کو کیسے گھٹ گھٹ کر جپھیاں ڈالتا تھا جب تک اسے اطمینان نہ ہوگیا کہ وہ اپنے گھر خوش ہے۔ آہیں بھرا کرتا۔ بات بات پر آنکھیں ڈبڈبا آتیں۔ آنسو نکل پڑتے تھے۔ وہ بہانے بہانے بیٹی کے گھر کا چکر لگاتا۔ دنیا جہاں کے میوے، پھل، ہوے کھلونے اور سامان لے جاتا۔ تحفے دیتا۔ اس کے بچوں کو لا دے لا دے پھرتا۔

ایک روز وہ وہ بچوں کو جوتے دلانے بازار جا رہی تھی اس کے منہ سے نکل گیا۔ میرا تو دل چاہتا ہے اپنی کھال اتار کر اس کے جوتے بنا کر پہنا دوں ان بچوں کو، تو وہ بھڑک گئی۔ یہ فلمی ڈائیلاگ نہ بولا کرو بابا۔ مجھے نہیں اچھے لگتے۔ بچوں پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ کہتی ہے بابا اپنے غلط پیار سے بچوں کو بگاڑ رہے ہیں۔ وہ سچ مچ خفا ہوجاتی اس سے بولتی بھی نہیں۔

ارے! میرے پیار سے تو بگڑ گئی تھی۔

اس نے اٹھتے سمے، اپنے جسم کو سنبھالتے سنبھالتے سوچا اب اٹھنا بیٹھنا دشوار ہوا۔ جوڑ جوڑ دکھتا ہے۔ اپنا ڈاکٹر بیٹا کبھی جو نبض دیکھے تو کہتا ہے۔ زیادہ نہ کھایا کرو۔ وزن کم کرو۔ پھر شکایت کی، پکار کی دہائی ڈھلنے کی عادت تمہاری پرانی ہے۔ لو، کوئی اب ہلانے بھی نہ کہے۔ درد ہو تو لب سی لے۔



صادق

دگر بے لطف، زمیں سے لپٹ کے دیکھ ذرا
اُتر کے تخت سے مٹی میں اَٹ کے دیکھ ذرا

کبھی تو نوکِ زباں سے شکست چکھ اپنی
کبھی تو فتح کو اپنی الٹ کے دیکھ ذرا

ترا وجود ہوا پر ہے منحصر ناداں
جو پھولا پھرتا ہے اک بار پھٹ کے دیکھ ذرا

یوں بیٹھے بیٹھے تو کھلتے نہیں ہیں جوہرِ ذات
یہ تیغ کھینچ لے، میداں میں ڈٹ کے دیکھ ذرا

بہت گذاری سیاق و سباق میں رہ کر
اب ایک لمحہ عبارت سے کٹ کے دیکھ ذرا

یوں بازہو کہ سبھی وسعتیں ہوں تنگ مگر
برائے تجربہ خود میں سمٹ کے دیکھ ذرا

● سی ۴/ ۱۰۳ آئی جی اے، ہوکاس پوری، بوڈیلا، نئی دہلی — ۱۸

پرتپال سنگھ بیتاب

جادو تھا یا زور بہت تھا پانی میں
آ پہنچے ہم کتنی دور روانی میں

منزل تھی مقصود خبر دی اور سفر
ہم سے کیا کیا قدم اُٹھے نادانی میں

اتنا ہے بس یاد کہ ہم ڈوبے جس وقت
کئی سفینے تیر رہے تھے پانی میں

قصہ ختم ہوا تو یوں محسوس ہوا
گویا ہم ابھی تھے موجود کہانی میں

دکھ میں جو دیوانے ہیں وہ جانتے ہیں
کتنا سُکھ ملتا ہے نوحہ خوانی میں

سہل ڈگر پر چل کر یہ معلوم ہوا
کتنی مشکل ہوتی ہے آسانی میں

ابھی نہ کر بیتاب جزیروں کی باتیں
آگے اور سفر ہے اس طغیانی میں

● "نشیمن" ۱۸۸ سیکٹر ۱، چھنی ہمت ہاؤسنگ کالونی، جموں — ۱۱

سہیل احمد زیدی

وہی جو چاہتے تھے ہو گیا ہے
خدا کا شکر فتنہ سو گیا ہے

کھلے ہیں پھول کیسے بے تحاشا
کوئی اس دشت میں کیا بو گیا ہے؟

عجب افسردگی دل میں بسی ہے
کہ جیسے کچھ ہمارا کھو گیا ہے

گذرنے والوں کا تانتا تو دیکھو
یہ رستہ جانے کس گھر کو گیا ہے

وہ ظالم دیکھئے کب لوٹتا ہے
کہ رہنا ہوش میں کہہ تو گیا ہے

شریف شہر سے نجسہ رہا
میاں زیدی تمہیں کیا ہو گیا ہے

● ۷۔ شوکت علی روڈ، شمالہ الہ آباد

مظہر الزماں خان

مکان نمبری، ایل پی ایس ۔ ۲۵۹ ۔ بی آئی سی، کاچی گوڑا، حیدرآباد ۔ ۲۷

پیر تسمہ پا

اچانک کہانی کار نے آخری ہچکی لی اور گردن کو زمین پر ڈال دیا تو دوسرے کہانی نگار نے اپنی کہانی شروع کر دی کہ سانپ ڈسا آدمی پھر ادھ نگلنے لگا تھا۔

"فضا میں بڑی عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سڑے ہوئے کتوں کی سی، مرے ہوئے چوہوں کی سی، بچہ جنی عورت کی سی۔ بڑی عجیب بو تھی کہ ناک کے نتھنوں میں داخل ہوتے ہی ناکیں زمین پر گرنے لگی تھیں اور کٹورے کی شکل کی بستی کے تمام گھروں کے دروازے بند تھے کہ بستی سے باہر نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہی نہ تھا اور جو راستے تھے۔ ان کی آہنی گیٹوں پر تالے پڑے ہوئے تھے اور وہ شعلہ پوش۔ ایک اک مکان کے دروازے پر جا کر اپنے آگ ہاتھوں سے دروازہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہا تھا کہ آگ میرا لباس بن گئی ہے۔ دروازہ کھول دو اور میرے آگ کے لباس کو میرے جسم پر سے اتار لو کہ میرا گوشت پوست جل رہا ہے اور آگ ہڈیوں کو چاٹنے لگی ہے۔ وہ ہر ایک دروازہ کو پیٹتا اور یہی کہتا کہ مجھے آگ سے بچا لو۔ تاہم کسی نے دروازہ نہیں کھولا کہ بستی کے گھروں کے سب کے سب دروازے بند تھے اور فضا میں بڑی عجیب بو پھیلی ہوئی تھی۔ مرے ہوئے کتوں کی بچہ جنی عورت کی اور وہ تھا کہ . . . .

کہانی نگار کے ہاتھوں سے کتاب چھوٹ کر اس کے زانوں پر گری اور وہ ٹھنڈا ہو گیا تو سگریٹ والے شخص نے ایک اور کہانی نگار کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے کہانی "پیر تسمہ پا" شروع کر دی۔

"یوں ہی سندباد جہازی ہیرے جواہرات کے خوبصورت خواب سے چونک کر اٹھا۔ اس پر کھانسی کا ایک زبردست حملہ ہوا جیسے رات کے وقت فسادیوں کا حملہ۔ اور وہ کھانستے کھانستے نڈھال سا ہو گیا لیکن کھانسی کا یہ سلسلہ بس کچھ ہی دیر کا تھا اور جیسے ہی وہ رکیں سندباد کو ایسا لگا کہ اس کی گردن اور پیٹھ پر کوئی وزنی چیز آ کر بیٹھ گئی ہے۔ چنانچہ وہ دونوں ہاتھ پھیر پھیر کر دیکھنے لگا لیکن کچھ بھی نہ تھا۔ تاہم وزن برقرار تھا اور وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے کی دیوار کے ایک کونے میں اکھڑی ہوئی پلاستر کے قریب ایک کیڑا جو اس کی پیدائش کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔ دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن دیوار کی بھربھری مٹی اس پر مسلسل گرتی چلی جا رہی تھی۔ پھر بھی وہ آگے بڑھنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ دفعتاً پھر سندباد کو اپنی پیٹھ اور گردن پر دباؤ کا شدید احساس ہوا تو وہ بستر چھوڑ کر اٹھا اور کپڑے اتار کر قد آدم آئینہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا جو وہ اپنے سفر کے زمانے میں فرعون کے میوزیم سے لایا تھا اور گھوم گھوم کر اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ لیکن پیٹھ اور گردن پر اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا تاہم وزن برقرار تھا اور اس کے اندر بڑی پراسرار دھمکیں سنائی دے رہی تھیں جیسے مصر کے اہرام میں ہواؤں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ حیرت سے آنکھیں گھما کر چاروں طرف دیکھنے لگا اور پھر جلدی جلدی کپڑے پہن کر اپنے پیچھے کھڑی ہوئی کار بدست قطار سے کچھ کہے۔ سنے بغیر چپ چاپ باہر نکل گیا تو ابھی سورج نکلا تھا اور ہر طرف ایک عجیب سی ویرانی پھیلی ہوئی تھی ایسی ویرانی جیسے بغداد پر ہلاکو کے حملے کے بعد پھیلی تھی۔ بالکل ویسی ہی بو یہاں آج پھر پھیلی ہوئی تھی اور ریت میں جلتے ہوئے پرندوں کی بو فضا میں دوڑ رہی تھی۔ اور بوڑھا سندباد آہستہ آہستہ چل رہا تھا کہ اب اس کے پاؤں میں سے راستے نکال لیے گئے تھے۔ تاہم چل رہا تھا۔ اس امید پر کہ اگر کوئی دوست یا شناسا کہیں مل جائے تو پیٹھ اور گردن پر رکھے ہوئے بوجھ کے متعلق سے گفتگو کرے۔ لیکن جو بھی دکھائی دے رہا تھا وہ کمر خمیدہ تھا۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک سب کے سب کمر خمیدہ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک اس کے جی میں آئی کہ وہ عقاب کے پیروں سے لپٹ کر اس زمین ہی سے

اڑ جائے، مگر سندباد کے پیروں کو پکڑ رکھا تھا اور وہ پہاڑ سا بوجھ اپنی پیٹھ پر اٹھائے مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے مرغابی کے انڈے کے برابر ہیرے کے بجائے پچھلے زمانے کے کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اس کی گردن اور پیٹھ پر بیٹھے ہوئے بوجھ کے بارے میں بتائے کہ دفعتاً اس کی نظر حاتم طائی پر جا کر ٹھہر گئی جو ایک درخت کے نیچے بیٹھا اپنی گردن سہلا رہا تھا۔ سندباد آہستہ آہستہ چلتا ہوا حاتم کے قریب پہنچا۔ اور سلام کے بعد کہا "حاتم میں نے بہت سفر کیا تاہم کبھی تھکا نہیں کہ تکان نے مجھے چھوا تک نہیں تھا مگر آج میں بہت تھک گیا ہوں۔ اس دور کے ان گنت افراد نے جو میری گردن پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے بہت تھکایا ہے۔ بہت بہت تھکایا ہے اور میری پیٹھ اور گردن پر منوں وزنی بوجھ پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے چلنے میں مجھے بڑی دشواری ہو رہی ہے۔ اور تم تو دوسروں کا بوجھ اتارنے کے لئے خاصے مشہور ہو۔ اے حاتم! میری پیٹھ پر سے بھی بوجھ اتار دو کہ میں جھک سا گیا ہوں" حاتم نے سندباد کی طرف دیکھا اور پھر اپنی سفید سفید پلکیں زمین کی طرف جھکا کر کہا "میں بھی تمہاری ہی طرح کمر خمیدہ ہو چکا ہوں کہ سارے کھیت آج کے بادشاہ کھا چکے ہیں اور ہماری گردنوں اور پیٹھوں پر بوجھ رکھ دیا گیا ہے۔ چنانچہ میں بھی اس بوجھ تلے دب کر رہ گیا ہوں کہ اپنی جگہ سے اٹھ بھی نہیں سکتا کہ ساری قوم ساری نسل بس بیٹھ گئی ہے۔ سو بیٹھ ہی گئی ہے اور پھر میرے دل میں قبض پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ قبض اداس موسموں کا آخری ریچھ ہے۔ پھر بھلا میں تمہارا بوجھ کیسے اتار سکتا ہوں۔ جاؤ اے سندباد۔ آگے نوشیرواں بیٹھا چڑیوں کو دانہ کھلا رہا ہے۔ اس سے کہو۔ شاید وہ تمہارا بوجھ اتار دے"

"میں نوشیرواں سے مل چکا ہوں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب زمین بہت سبز تھی اور خوب دانے اپنے اندر سے نکالتی تھی۔ شاید تمہاری یادداشت کمزور ہو چکی ہے کہ آج سبھوں کی یادداشتیں کمزور ہو گئی ہیں۔ ہم سب بھولے بہت ہو گئے ہیں۔ چنانچہ نوشیرواں دیمک کی غذا بن چکا ہے کہ اس کے دل میں بھی قبض پیدا ہو گیا تھا مگر یہ دیمک وہ دیمک نہیں ہے جو کاغذ اور لکڑیوں کو کھاتی ہے۔"

"یہ کب ہوا؟" حاتم نے کہا۔ سندباد بولا "یہ آدھی رات کی کہانی ہے جب ایک کبوتر کا جسم دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔"

اچانک سندباد پر پھر کھانسی کا حملہ ہوا۔ اور وہ کھانستے کھانستے نڈھال سا ہو گیا۔ تاہم کھانسی کا سلسلہ جاری تھا اور ہر کھانسی کے ساتھ اس کے جسم پر چہرے پر موٹے موٹے چھالے پیدا ہوتے چلے جا رہے تھے اور وہ کھانس رہا تھا۔ مسلسل کھانس رہا تھا کہ دفعتاً کہانی نگار کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

(آخری داستان گو سلسلہ)

بقیہ صفحہ ۲۳ دس پیسے اور دادی

"بھونپلی کو! دہی جلائے گی سو جا کے"
جو پاس بیٹھا تھا اس نے لحاف کھینچ کر منہ ڈھک دیا
چکو نے نیکر کی جیب سے دس پیسے نکالے اور بڑھیا کے کاسے میں پھینک دیئے!
سب دیکھا اس کی طرف! اور وہ بھاگ لیا۔ تیز۔ بہت تیز اپنی دادی کے پاس!!

بقیہ صفحہ — زنجیر

کھڑکی پر نیا شیشہ آویزاں کرنے کے بعد وہ رخصت ہونے لگا تو دروازے سے منسلک زنجیروں کو دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے قہقہہ ابل پڑا۔

"اتنی ساری زنجیریں....؟"

"ہاں! کیا تم اخبار نہیں پڑھتے؟ آج کل جرائم کس قدر بڑھ گئے ہیں" میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

ہوں! ۔ تو گویا دروازے میں زنجیروں کی تعداد بڑھانے سے جرائم کی تعداد میں کمی واقع ہو جائیگی"

"پتہ نہیں"..... میں نے لاعلمی سے کہا۔

"آپ کو پتا ہے جناب، اتنی ساری زنجیروں کے باوجود آپ کے گھر میں چوری ہو گئی اور آپ کہتے ہیں کہ پتہ نہیں۔" اس کے لہجے میں مسلسل طنز تھا۔

"ہاں تو کیا کریں، اپنی حفاظت تو کرنا ہی ہے نا۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"کیوں نہیں، حفاظت کا خیال بالکل درست ہے.... مگر دروازے کی ان زنجیروں کا محل وقوع درست نہیں.. اگر دنیا بھر کے امن پسند لوگ واقعی اپنی حفاظت چاہتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ یہ زنجیریں اپنے دروازوں کے اندرونی طرف لگانے کے بجائے جرائم پیشہ لوگوں کے دروازوں کے بیرونی طرف لگانے کی کوشش کریں۔"

یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا اور میں احمقوں کی طرح اسے دیکھتا رہ گیا۔



رشید افروز

جب برا وقت ہو، سایہ بھی برا لگتا ہے
آج ہر شخص ہمیں، ہم سے جدا لگتا ہے

دشتِ امید کی بہکی ہوئی خاموشی میں
اک ترا نام ہی بس حرفِ دعا لگتا ہے

سبز پتوں پہ چمکتی ہوئی شبنم نے کہا
رات ڈھل جائے تو ہر رنگ نیا لگتا ہے

ہم بھری بزم میں چپ ہیں کہ ہمیں تیرے سوا
اب کوئی اور پکارے تو برا لگتا ہے

وہ تو ہم تھے کہ تجھے بھیڑ میں پہچان لیا
تجھکو یہ وہم کہ تو سب سے جدا لگتا ہے

زرد مٹی کے سوا کیا ہے بدن کا جادو
کیوں مرا عکس مجھے اس کے سوا لگتا ہے؟

چند سکوں کے لئے نفس کو بیچا جس نے
وہ پریشاں ہے کہ ہر شخص خدا لگتا ہے

زندگی ہم ترے ممنون بہت ہیں، لیکن
تو نے احسان جتایا تو برا لگتا ہے

● ۵۵ - پراچینا سوسائٹی، سرکھیج روڈ - احمد آباد - ۳۸۰۰۵۵



اسعد بدایونی

نہ شاہزادی کم فہم کی دہائی دے
وہی بتا مجھے جو کچھ تجھے دکھائی دے

میں اس طلسم میں محصور ہوں زمانے سے
وہ شاہزادہ ادھر آئے اور رہائی دے

کبھی تو میں بھی کسی آسمان پر پہنچوں
مجھے بھی صورتِ سیارگاں دکھائی دے

مرے چراغ کی لو میں ہزار چہرے ہیں
میں چاہتا ہوں بس اک شکل ہی دکھائی دے

سوالِ دہر کا کوئی جواب تو ہوگا
صدا جو گونج رہی ہے اگر سنائی دے

یہ لوح کھوئے ہوئے لشکروں کو لائیگی
مگر یہ لوح تری آنکھ کو دکھائی دے

● شعبۂ اردو، علیگڈھ مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ

سلیمان خمار

چاہت کا لگان دے رہا ہوں
میں دل نہیں جان دے رہا ہوں

میں نے ہی کئے ہیں قتل سارے
منصف کو بیان دے رہا ہوں

مکتب میں پڑھے نہیں تھے چہرے
اب اِس طرف دھیان دے رہا ہوں

سایۂ شجر دھوپ سے ہیں باتیں
کس کس کو زبان دے رہا ہوں

بے پر ہے خیال کا پرندہ
میں اس کو زبان دے رہا ہوں

لائے تو کوئی سکۂ فکر
سوچوں کی دکان دے رہا ہوں

● انتخاب بک ہاؤس، اشرمحل روڈ - بیجاپور (کرناٹک)

سید حامد حسنین

۵۔ سلور لائن اپارٹمنٹس، ایکزٹ لے، (ایم۔ ڈی۔ پی) کوہ فزا، بھوپال۔۱

جدید انسان اور ماضی کا کوہان

تحقیقی عمل پر ایک انشائیہ

تحقیق کو بڑا اعتبار حاصل ہے۔ لیکن جسے تحقیق کہا جاتا ہے وہ تجسس، عرق ریزی قیاس اور منطق کی کرشمہ سازی سے وجود میں آنے والا ایک عمل ہے۔ اس عمل کی ابتدا حقیقت کی اندھیری کوٹھری میں تاک جھانک کے علاوہ تجسس سے ہوتی ہے۔ اور اس کی انتہا چند ادھورے حقائق پر۔ وہ حقیقت جس کی تلاش میں محقق بڑے بڑے جتن کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسا چھلاوہ ہے۔ جو منطق اور قیاس کے پھیلائے ہوئے۔ بڑے سے بڑے جال کو جل دے جاتا ہے۔ اس کے باوجود تحقیق کے لئے دنیا اپنے بہترین وسائل اپنے بہترین دماغ اور اپنا بہترین وقت صرف کر رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انسان غربت، آفات، مرض و موت سے زیادہ اس انجانی حقیقت کے اندھیرے سے خوف کھاتا ہے۔ جو اسے گھیرے ہوئے ہے۔ جو کہ افلاس، بیماری اور موت کو وہ جانتا ہے۔ وہ اس کو شعوری طور پر بے چین نہیں کرتیں۔ وہ اس کو یہ احساس نہیں دلاتیں کہ اس کا وجود کسی طرح ادھورا ہے۔ شاید عدم واقفیت جہل، لاعلمی اس کی شعوری ہستی کو کسی گالی کی طرح جھنجوڑ دیتی ہے۔ اور اس کی شعوری انا اور عقلی مردانگی کے لئے ایک للکار بن کر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اگر وہ تجسس کے سراب کے پیچھے نہ دوڑے تو اس کا لاشعور اسے عقل و فہم کے لحاظ سے ناکارہ ہونے کا طعنہ دے گا۔

ورنہ کیا وجہ ہے کہ وہ حال پر حادثات کی یلغار غیر یقینی پن کی پرچھائیں اور طبعی معذوریوں کے استبداد سے مقابلے کے لئے اپنی توجہ اپنی مقدرت اور اپنے وسائل کو استعمال کر کے لمحہ بہ لمحہ سانس سانس لیتی اور دھڑکتی زندگی کو بامعنی اور بھرپور بنانے اور آسودگی سے ہم آغوشی کی تمنا کو اظہار بخشنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اور اس کی بجائے ماضی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے ٹوٹے ٹھیکروں کو لا کر جتن کر کے برآمد کر کے ان پر جمی گرد کو اپنی پلکوں سے چنتا ہے۔ بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہڈیوں کو سمیٹ سمیٹ کر ادھورے ڈھانچے کھڑا کرتا ہے۔ دریدہ صفحات کی الٹ پھیر میں عمریں صرف کر دیتا ہے۔ اور اسی کو تہذیب کا انعام اور اپنے ترقی یافتہ شعور کی معراج سمجھتا ہے۔

آج کا تہذیب آشنا انسان اپنی پیٹھ پر ماضی کا کوہان اٹھائے ہوئے ہے جو گھڑی کی ہر ٹک کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ کہیں روایت کا ریشمی جال بچھا کر کہیں تاریخ کی فضیلت نشان دستار پہن کر کہیں جدلیاتی عمل کی بیڑیاں بن کر اور کہیں طبعی وراثت کا آسیب بن کر ماضی کا یہ احساس تہذیب یافتہ فکر و شعور کے تلوؤں میں برابر کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے۔

مگر میرا "میں" میرا طبعی "میں" وہ "میں" جس نے نہ منطق کی سیڑھی کندھے پر اٹھائی ہوئی ہے۔ اور نہ عقلیت کا جبہ پہنا ہوا ہے۔ وہ ماضی کے کھٹکے سے بے نیاز ہے۔ میرا یہ "میں" حال کا لاڈلا ہے۔ اس "میں" نے لمحہ لمحہ کو کوک کے پینے سے دودھ پیا ہے۔ اور اس کی دھڑکن اپنے بطن میں اتاری ہے۔ اسی دھڑکتے حال کی وجہ سے میرے گوشت اور کھال کے قالب میں سڑاند نہیں پیدا ہوتی۔ اس قالب کو بنانے والی ہڈیوں، اور اعصاب میں احساس و تاثر کی بجلی دوڑتی پھرتی ہے۔ اور اسباب کے منہ زور گھوڑے پر زین کسنے کے لئے ضروری توانائی اور حرکت فراہم ہوتی ہے۔ یہی لمحہ بہ لمحہ دھڑکتا وجود بے کائنات کی بے کنار دھواں دھواں فضا میں ایک منفرد مقام بناتا ہے۔ اسی "میں" کی وجہ سے میں اپنے اندر دھڑکتے ہزاروں دوسرے "میں" سے الگ بھی ہوں اور جڑا ہوا بھی ہوں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ وہ اجداد کے ہاکر بس ڈرائیور، ڈاکئے، ٹریفک کانسٹبل اور ان جیسے انسان جن سے میری زندگی کا منظر نامہ بھرا ہوا ہے اپنے تجربات سے بالاتر حقیقی زندگی میں ماضی کے آسیب سے سراسیمہ نظر نہیں آتے۔ صدیوں پیچھے کی تہذیب کے کھنڈر سے بے نیاز انسان کی زبان بھی۔ وہ دراصل

سے نا آشنا تھی۔ شاید اس کے لیے ماضی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کا زندگی کے ساتھ راست معاملہ تھا۔ خوف، ایذا، اور راحت اس کے احساس کی نلیوں سے گزر کر پہنچتے تھے۔ اس کے تجربے کی گرفت اس کے مشاہدے کے دائرے اور اس کے ذہن کی کمند کے باہر جو دنیا تھی وہ اس سے مستغنی تھا۔ طبعی حوادث، اور فطرت کی طاقتیں اس کی تجرباتی زندگی پر اکثر چھاپہ مارتیں لیکن وہ انہیں خارج کا معاملہ تصور کرتا اور اپنے اندرون کو ان کے تسلط سے آزردہ نہ ہونے دیتا۔ اسی لیے وہ لاعلمی کے اندھیروں میں پنپنے والے توہمات سے ڈرتا، ان کے آگے سجدہ کرتا، چڑھاوے چڑھاتا۔ اور پھر ان پر شعور کے دروازے بند کر دیتا۔ وہ انہیں اپنی طبعی تجرباتی زندگی کی سوکن بنانے کے لیے اپنے شعور کی دہلیز کے اندر قدم نہیں رکھنے دیتا۔ ماتم ماضی اور اندیشہ فردا کے سرطان سے اس کا تجرباتی وجود محفوظ تھا۔

ہماری آج کی عقلیت اس قدیم انسان کو تہذیب سے عاری اور اس کے طرز حیات کو تاریک بتاتی ہے لیکن تہذیب نے بعد کے انسان کو کیا دیا ہے۔ شعور کا جلد ضرر جستجو کا سراب، اندیشوں کا غول بیابانی اور قیاس کی کٹھ پتلیاں۔ وہ سب جو اسے عقلیت کے خول میں بند کر کے اس کی فوری فطری اور جذباتی زندگی کو منفی، مجبور اور مجہول بنا کر پیش کرتا ہے۔ تہذیب نے گنبد جیسے سر والے بونوں کو جنم دیا ہے۔ اور ان گنبدوں میں کتابوں سے عرق چوس چوس کر چھتے بنانے والی مدھو مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور اس کی گونج کے شور میں دل کی دھڑکن اکثر کہیں منہ لپیٹ کر سو جاتی ہے۔ دانشوری کے دعویداروں نے بلند و بالا عمارتیں کھڑی کی ہیں۔ جن کی چہار دیواری میں تجرباتی زندگی سے سیاسی ہے کر منطق کی تیلیوں سے نظریات کی شاخوں پر اپنے فہم و شعور کے لیے نئے نئے گھونسلے بنائے رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شعوری وجود کے آدھے حصے کو ماضی کے مردہ خانے کی حیثیت کرایے پر اٹھا دیا ہے۔ اور باقی آدھے میں وہ کارگہ کھڑی کر رکھی ہے جس میں ان کے تخیل کی مکڑی اپنے لعاب دہن سے دن رات قیاسات کے رنگ برنگے تار تانتی رہتی ہے۔

لہٰذا تہذیب حاضر کا بیشتر عقلی کاروبار ماضی کے دھندلکوں سے برآمد کیے جانے والے ریزہ ریزہ حقیقتوں کی بازیافت قیاسات کی ساخت و بافت اور نظریات کی تشکیل و پرداخت پر توقیر اشتغال پر مشتمل ہے۔ مجرد نظریات، منطقی تصورات، بیچ در بیچ قیاسات بلند بانگ اصطلاحات کے دھوم دھڑکے دار سرکس میں منطقی ٹریپیز (TRAPEZE) پر بڑے بڑے نظریہ ساز اس طرح اپنے مشاقانہ کرتب دکھانے میں مصروف ہیں کہ آنکھیں برابر اوپر لگی رہتی ہیں۔ اور عام تماش بین یہ بھول جاتا ہے کہ کرسی کے نیچے لگی ہوئی گھاس کی پتی اس کے ٹخنے کو سہلا رہی ہے۔

یہ نظریاتی پھلجھڑیاں یہ عقلی گلدستے یہ تحقیقی تحفے تہذیبی دنیا کے خزانوں میں سے اپنا بڑا بھاری حصہ مانگتے ہیں جبکہ دن بھر کی تھکن کے بعد پیٹ بھر نوالہ، مرغی کے بچے پہ چوں چوں کرتی جان کے لیے درد کش دوا، دلوں سے ملنے والے سکون، ظلم و جبر کے شکنجوں میں پھنسی انسانیت کو انصاف اور تحفظ کی امید کی کچھ معمول کی روزمرہ کی سی چیز سمجھ کر ان دیکھی کر دی جاتی ہے۔ اور یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ یہ لمحہ بہ لمحہ آگے سرکتی زندگی نبض کی دھڑکن کے ساتھ تل تل بڑھتی ہے خون کی دھار، عضلات شکم کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ پھیپھڑوں کی خلا میں آتی جاتی یہ سانس ہی سب سے قیمتی سونا ہے۔ یہ جلد جو گرم و سرد و سخت و نرم کے احساس کو اپنے آغوش میں جگہ دیتی ہے۔ یہ ذہن جو آسودگی اور بیزاری، غم اور راحت کا گہوارہ ہے یہ ہونٹوں پر میٹھی لکیر بن جانے والا تبسم اور یہ پیشانی پہ گھٹتی بڑھتی شکنوں کی شکل میں ابھرنے والا نوشتہ درد ہی حقیقت کے اصل معانی ہیں۔ ان کی جھولی میں اترنے والے تاثرات ہی زندگی کی ٹھوس ناقابل تردید مستحکم اور معتبر سچائیاں ہیں۔

کیا نئی صدی کا استقبال کرنے والا انسان ان سچائیوں کو قبول کر سکے گا یا میری نسل کی طرح پس پشت دھکیلتا دھواں دھواں بادلوں میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کی جانب اپنا ایک قدم بڑھائے ماضی کا قوی ہیکل بت اس کا بھی مرکز پرستش بنا رہے گا۔ ماضی کا وہ قدم جو حال میں ہے میرے کندھوں پر ٹکا ہوا ہے۔ اس سے میرے شانے شل ہو چکے ہیں۔ کیا میرا مقدر یہی ہے کہ میں ماضی کے اس بے شکل بت کے آگے سرنگوں رہوں اور تحقیق ماضی کو منتہائے نظر سمجھوں۔

لیکن اس تحقیق کا ماحصل کیا ہے۔ چند ادھورے حقائق کچھ نامکمل نتائج کچھ قیاس کچھ رد اور دو چار جو کبھی چار نہیں رہتا کبھی گھٹتا ہے اور کبھی بڑھ جاتا ہے۔ تحقیق میں کوئی حرف آخر نہیں۔ اس میں نہ ادبیت کی آبرو ہے۔ اور نہ کوئی قول فیصل کا شرف۔ تحقیق اگر کچھ کرتی ہے تو بس یہ کہ وہم ہی واضح کر دے کہ ہم ابدیت کے سفر میں ایک درماندہ مسافر ہیں ہم چاہیں یا نہ چاہیں ہم میں سے جو شعوری صلاحیتیں رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں انہیں اپنی طبعی زندگی کے ساتھ اپنا شعوری سفر بھی جاری رکھنا ہے۔ اگر ہم نے ماضی کا دامن تھاما ہے تو ہمارا مقدر ہوگا کہ ہم ماضی کے اندھیرے اور فنا کے غلاف سے حقیقت غلاف سے حقیقت کو ذرہ ذرہ برآمد کر کے اپنی ہتھیلی پر سجا کر آسودگی حاصل کرنے کا جتن کرتے رہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ آسودگی مستقل اور پائیدار ہوگی اور کیا اس میں خود اپنا منتہا آپ بننے کا دم ہے۔

مٹھی بھر نظمیں

ظہیر غازی پوری



پیکر تراشی عوامل

ہر آہٹ
ہر دستک
میری توجہ کا مرکز بنتی ہے

میں تازہ ہواؤں
لمحوں کے ساتھ اٹھتی ہوئی آوازوں
خوش رنگ شفق زاروں
ہر آن بدلتی جہتوں
موسم کی جدید رنگ قباؤں
رنگین اداؤں
خوش آہنگ نواؤں
سبزہ زاروں
مخمل مخمل نرم زمینوں
سرخ سجیلے پیرہنوں سے

روز تراشا کرتا ہوں
ایسے پیکر
جو دنیائے شعر و ادب میں
لاثانی بن جاتے ہیں
یا ادوار کو مہکاتے ہیں

...نے دیکھا

...رد صحو
...ائیں الفاظ کی
...سی دھندلا گئی
...م — ترسیل کا
...ت — ابلاغ کی
...ہم نا سی لگی
...ب وہ بوسیدہ رجحان
چھپا یا رہا !
...لو
...ت و آواز پہ
...کر و انداز پہ
...ہ فن پہ کالی ردا جیسی
گر دا ٹ گئی
...نویت کا گھر لٹ گیا
...شہر احساس میں
...شت جذبات میں
...ہشی رہ گئی
...ہ سی رہ گئی !

خیر مقدم

سرخ
پیلی
سنہری کرن
صبح دم
روز جب میرے کمرے میں
آ جاتی ہے
کھڑکیوں سے
شگافوں سے
مہمان بن کر
فقط چند لمحوں کی خاطر
تو میں
سوچنے لگتا ہوں
کس طرح میں اسے
اپنے اندر کہیں قید کر لوں
کہ عکس اس کا
اترا کرے
میرے ہر لفظ میں
رنگ و بو کی طرح !

ایک جائزہ

اخباروں کی خبریں
پڑھتے پڑھتے
اکثر سوچنے لگتا ہوں
صرف اپنے
ملک میں چھپنے والے
اخباروں سے
اک نوعیت کی خبریں
یکجا کر لوں تو
جھوٹ
سرفہرست آئے گا !

انتباہ

اگلے صفحات پر جو بکھرے ہیں
آئینے وہ مری نظر کے ہیں
ٹھیس لگنے پہ ٹوٹ جائیں گے
اور بکھریں گے کرچیاں بن کر
ان سے ہوں گے دل و نظر زخمی
اس حقیقت سے انحراف کوئی
کر سکا ہے، نہ کر سکے گا کبھی !

...روش بدلی

...سی آئینہ بن گئی
...ہی واقعہ بن گئی
...ہوں سنگ گنجینہ ہوا
...نتہائے دریدہ ہوا
...نظریات کی جنگ میں
...وہ جسم و جاں تنگ ...
...گئی آگہی
...ہ کی آگہی !

ہاشمیہ کالونی ۔ محلہ گیلی ۔
ہزاری باغ ۔ ۸۲۵۳۰۱ (بہار)

تو اور میں
[مختصر ترین نظمیں]

عزیز اندوری

(۱)
تو ہے جھونکا ایک ہوا کا
جو میرے جسم کو چھو جاتا ہے
لیکن پھر بھی
ماحول کی سردی گرمی میں
جانے کس جانب چل دیتا ہے
میں وہ "پر" لاؤں کہاں سے
جو تیری جانب
مجھ کو لے کر اڑ جائیں

(۲)
تو تو دریا کی لہروں کی صورت
بہتی، ناچتی — گاتی
میری اور آ تو جاتی ہے
لیکن، میں اک ساحل ہوں
مجھ کو چھو کر
پھر دریا کی لہروں میں، گم ہو جاتی ہے
اور میں بے بس
اپنی جگہ سے چل کر
ان لہروں میں مجھ کو
کیسے ڈھونڈوں
جن میں تو گم ہے

(۳)
تو، تو آوازوں کا ایک سمندر ہے
جو موجوں کی صورت
پل پل پیدا کرتا ہے
لیکن میں قربت کی صورت
تیری آوازوں کی ٹھنڈک کو
لمحہ دو لمحہ محسوس تو کر سکتا ہوں
اور جب تیری آوازوں کی ٹھنڈک
مدھم ہو جاتی ہے
تو میں
سورج کی گرمی سے تپنے لگتا ہوں

(۴)
تو، تو ٹھنڈک کا احساس ہے جس کو
میرے ذہن و دل نے محسوس کیا ہے
لیکن جب بھی
موسم کی لو میں ٹھنڈک کا یہ احساس ...
مردہ ہو جاتا ہے
میرے ذہن و دل کو
حالات کی شعلہ باری
جھلسا دیتی ہے

آنند لہر

ہائی کورٹ چیمبر نمبر ۔ ۲۹، صدر کورٹ جموں ۔ ۱۸۰۰۰۱

اور پتھر رو پڑا

لوگ بھیڑ کا حصہ بن چکے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں، ڈنڈے، تختیاں، تھیلے اور ان کا اعلان تھا "آج گرا کر دم لیں گے۔ آج توڑ کر ہی دم لیں گے۔ اس نعرے کے ساتھ وہ آگے بڑھنے لگے دوڑنے لگے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے آگے نکلنا چاہتا تھا۔ بھیڑ کا حصہ بننے کے بعد وہ ایک نہ ختم ہونے والی دوڑ کا حصہ بن گئے۔ دوڑ جو نہ آگے دیکھتی ہے اور نہ پیچھے جس کا مقصد صرف ایک دوسرے سے آگے نکلنا ہوتا ہے۔ اور اس آگے نکلنے کی کشمکش میں لوگ ایک دوسرے کے پیچھے ہو جاتے ہیں اور انہیں ایک دوسرے کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا موقع مل جاتا ہے۔

پھر وہ اتنا تیز دوڑنے لگے کہ ان کی رفتار پیچھے رہ گئی اور تہذیب پاؤں کا ساتھ نہ دے سکی۔ سانس ان کے پھیپھڑوں کو چھیڑنے لگی کیوں کہ اُن کے نعروں نے ہوا کو چھلنی کر دیا تھا اور وہ فضاؤں میں پھیلنے لگی تھی۔ کیوں کہ ہوا نے انہیں زندگی دینے کا وعدہ تو ضرور کیا تھا مگر شرط یہ لگائی تھی کہ وہ دوسروں کو بھی سانس لینے دیں گے۔

سورج بھی انہیں دیکھ رہا تھا مگر اس بات پہ پریشان تھا کہ اتنی روشنی ہونے کے باوجود انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

آخر لوگوں نے اُسے گرا دیا اور ایک پتھر بول پڑا۔ پوچھنے لگا

"میرا کیا قصور ہے" "تم اس عمارت کا ایک حصہ ہو" "مگر کیا کسی عمارت کا حصہ بننا پاپ ہے۔ کسی تعمیر کا حصہ بننا گناہ ہے"

لوگوں کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا کیوں کہ وہ بھیڑ کا حصہ بن چکے تھے۔ بھیڑ جو سب کچھ دیکھتی ہے مگر اُسے کچھ نظر نہیں آتا۔ بھیڑ کہ اس کی آنکھیں ہوتی ہیں مگر وہ دیکھ نہیں سکتی۔ اس کے کان ہوتے ہیں مگر سن نہیں سکتی۔ اس کی زبان ہوتی ہے مگر بول نہیں سکتی۔

پتھر نے پھر کہا "مجھے مت مارو، میرا کوئی قصور نہیں ہے"

"مگر تم خون سے لت پت ہو اور زخمی بھی ہو۔ ان زخموں کی کیا وجہ ہے"؟

"ان زخموں کی وجہ پوچھتے ہو تو اچھی طرح سنو۔ میں ہمالیہ کی چوٹی پر رہا کرتا تھا اور میں شِو کا چہیتا پتھر تھا"

"تو تم بھی ہماری طرح شِو بھگت ہو؟" "غلط غلط تم بالکل شِو بھگت نہیں ہو سکتے اور نہ ہی تم شِو بھگت ہو"

"مگر کیوں؟" بھیڑ میں سے ایک شخص نے پوچھا "اس لئے کہ شِو بھگت گراتے نہیں بلکہ بناتے ہیں۔ شِو ایک خیال ہے، ایک آواز ہے، جو کہیں کسی نام سے پکاری جاتی ہے اور کہیں کسی نام سے"

وہ تمام لوگ اُس پتھر کو گھور کر دیکھنے لگے "مجھے کیوں گھور رہے ہو اور مجھے گھور کر کیا لوگے میں تو پہلے ہی زخمی ہوں"

یہ کہہ کر پتھر نے پھر اپنی بات جاری رکھی "ہوا یہ کہ میں ہمالیہ کی چوٹی سے رام اور رحیم کے گھروں کو دیکھا کرتا تھا۔ ان کے آنگنوں میں کھلنے والے پھولوں کی خوشبو کو سونگھا کرتا تھا۔ ان کی آپسی محبت اور پیار نے میرے اندر نیچے آنے کی خواہش پیدا کی۔ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو گئی۔ ایک دن شِو آئے اور میں ان کے احترام میں کھڑا نہ ہوا۔ شِو کو مجھ سے ٹھوکر لگ گئی اور میں نیچے آ گیا۔ میں یہاں بہت خوش تھا۔ یہاں تک کہ اپنے شِو کو بھی بھول گیا۔ شِو ایشور کا روپ ہے اور ایشور کے کئی نام ہیں۔ رام اور رحیم......

اپنے اپنے خیال کے مطابق ایشور کی پوجا کرتے تھے۔ کوئی اُسے نماز کہتا، کوئی پوجا۔ ایک عمارت کو ایک مندر کا نام دیتا تو دوسرا مسجد۔

ایک دن ان میں یہ غلط خیال پیدا ہوا کہ ایک کی پوجا دوسرے کی نماز کو کمزور کرتی ہے۔ انہوں نے پوجا گھروں اور نمازوں کو ایک

دوسرے کا دشمن بھی پیدا ہوا۔ ایک نہ ختم ہونے والی لڑائی میں مشغول ہو گئے۔ اونچے گھروں کے سوراخوں سے خزاں کی ہواؤں کے بدلوں کو دیکھتے رہے۔ آہستہ آہستہ ان کی آنکھوں میں نفرتوں کے بھوت تعمیر ہوئے اور ان میں غلط فہمیوں کی فصل پیدا ہوئی اور جب یہ فصل کٹی تو رشتے مرے، تعلقے مرے، تعلقات مرے وہ دونوں بہنوں اور برسوں میں لڑ پڑے۔ لمحوں کو کھانے لگے۔ یہ جانتے ہوئے بھی وقت کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ یہاں تک کہ زندگی دینے والے ہواؤں کے دشمن بن گئے اور پھر لفظوں کے بیوپاری ہو گئے۔ لکیروں نے گھروں کو بانٹا۔ دیواریں تعمیر ہوئیں۔ میرا جسم کئی ٹکڑوں کا حصہ بن گیا۔ کوئی ٹکڑا اِدھر گرا تو کوئی اُدھر۔ لیکن میرا بڑا حصہ ایک عمارت کا حصہ تھا جسے کچھ لوگ مندر کہتے تھے تو دوسرے مسجد۔

لیکن میں اس بات پر خوش تھا کہ میں ایک اعلیٰ عمارت کا حصہ تھا جسے کچھ لوگ مندر کہتے تھے اور کچھ لوگ مسجد، چلو یہ بھی خوشی کی بات تھی کیونکہ ایک امید تو تھی کہ کبھی نہ کبھی لوگ مل سکتے ہیں ایک ہو سکتے ہیں۔ ایک بات اور سنو ہم پتھر ہیں۔ ہمارا کوئی دل نہیں ہوتا، ہمارا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر ہم ہر مذہبی عمارت کی بنیاد ہیں۔ مندر توڑ کر مسجد بنا دو یا مسجد توڑ کر مندر، پتھر کو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ پتھر تو جانتا ہے کہ مندر اور مسجد میں پوجا جانے والا خدا ایک ہے۔ ایشور ایک ہے۔

یہ سن کر بھیڑ کے لوگ وہاں سے کھسکنا شروع ہو گئے اور بھاگنے لگے۔ پتھر نے زور سے کہا۔ سنو میری بات سنو" قدرت نے، دریاؤں، پہاڑوں، درختوں، پرندوں کی آواز کو موسموں میں نچوڑ کر ایک لفظ تیار کیا جسے بعد میں شبنم میں دھو کر تمہیں سنایا مگر تم نے سننے سے انکار کر دیا۔

تم سے بھی یہ پوچھا گیا تھا کہ قتل تمہارے سامنے ہوئے تھے لیکن دلوں میں چھپی ہوئی تحریک نے تمہیں زبان کھولنے نہ دی۔

پتھر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا " کائنات نے تمام سورجوں کی روشنی کو جمع کر کے اسے کروڑوں برسوں کی سیاہی میں نچوڑ کر نوکیلی ایک کرن کو تمہیں دیکھنے کو کہا مگر تم مندروں اور مسجدوں کے جھگڑوں میں مصروف رہے۔

پہاڑ سے کچھ دور لوگوں کو پوجنے کا منصوبہ بنانے سے پہلے تم یہ بھول گئے کہ یہ تمہیں روشنی اور ٹھنڈک دیتا ہے۔

اور پتھر رو پڑا۔ پھر کہنے لگا میں پتھر ہوں نا اس لئے روتا ہوں۔ مجھ میں درد ہے اور تم انسان ہو نا اس لئے محسوس نہیں کر سکتے۔ قتل ہوتے ہوئے دیکھتے ہو، بہتے خون میں تمہارے پاؤں لت پت ہیں"۔

پھر وہ واپس آ گئی اور پوچھنے لگی " تم واپس ہمالیہ اپنے شیو کے پاس کیوں نہیں جاتے "کیونکہ میرے بدن پر رام اور رحیم کا خون ہے اور ایسی حالت میں شیو مجھے قبول نہیں کریں گے"۔

" مگر تمہارا خون دھل کیسے سکتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا" اب تم سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کیونکہ تم پتھر نہیں رہے اور لوگ ہوتے ہو، اب بول سکتے ہو، دیکھ سکتے ہو، سن سکتے ہو۔ لوگوں نے پوچھا " ہم پتھر کیوں بنتے رہیں" " نعروں کا شوق، شہرت کو جیتنے کا شوق، زمین کی رفتار کو پکڑنے کا شوق تمہیں پتھر بنا رہا ہے"۔

" اچھا بتاؤ تمہارا خون کیسے دُھل سکتا ہے"۔ لوگوں نے پوچھا

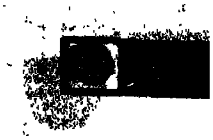
" اگر رام اور رحیم ایک دوسرے کے دُکھ میں رونا شروع کر دیں تو ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو میرے خون کو دھو سکتے ہیں اور میں شیو کے پاس جا سکتا ہوں بابا"؟

بقیہ صفحہ ۴۴ — ری چیک

کیوں؟ اور پھر جب اتنا کسی کام سے نیچے گئی تو میں وہ پیکٹ اس کے سرہانے رکھ آئی جہاں سائیڈ ٹیبل پر اس کے بچپن کی تصویر مسکرا رہی تھی اور ساتھ ہی اس کی الماری سے وہ گڑیا بھی اٹھا لائی جو میری امی نے اس کے لئے بچپن میں ہاتھ سے بنا کر بھیجی تھی۔ لال غرارے اور دوپٹے میں ملبوس دلہن بنی گڑیا وہ گڑیا میں نے اپنی الماری میں چھپا دی اور خود کو بستر پر گرا دیا۔

بھی سمجھا ہوتا۔ اب بھی آپ [illegible] تو بہت ممنون رہوں گا۔ شمارہ ۴ کے آخری صفحہ [illegible] ڈاکٹر [illegible] کی کتاب (ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات) [illegible] شائع ہوئی ہے اس میں [illegible] میری ہے اور اس میں میرا نام اس طرح [illegible] نذر صدیقی لکھا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ [illegible] میں [illegible] نظیر صدیقی نام کے [illegible] صرف میں ہوں اور گزشتہ [illegible] سال سے میں اپنا نام اس طرح نظیر صدیقی لکھتا [illegible] کیا [illegible] کی ادبی دنیا کو یہ بات معلوم نہیں کہ میرا نام کس طرح لکھا جاتا ہے۔ (یہ کہتے ہوئے مجھے افسوس ہے)

[illegible]





حیدر قریشی

بب اس نے خاک اڑانے کا ارادہ کرلیا ہے
ہم نے دل کے صحرا کو کشادہ کرلیا ہے

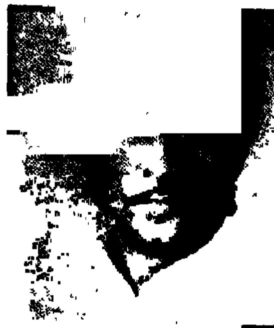
مدیں وہ کرگیا ہے پار سب جور وستم کی
سو ہم نے صبر پہلے سے زیادہ کرلیا ہے

نہیں اس جیسی عیاری تو لکن ہی نہیں تھی
ہمانے سے ذرا بس استفادہ کرلیا ہے

پھر ایسا ہے کسی کی سرزمینِ دل کا جادو
بت کا سفر اب پاپیادہ کرلیا ہے

چلو حیدرؔ غنیمت ہے یہ صندل کی مہک بھی
خریداروں نے تو لکڑی کا برادہ کرلیا ہے

SÜDRING-75
65795-HATTERSHEIM, GERMANY



مقیم اثر بیاولی

ہوا کی سسکیاں بھی سن رہا ہوں
میں جب سے آنسوؤں میں بس گیا ہوں
لپٹ جاتی ہے اجڑی شاخ مجھ سے
میں زخموں کا اچھوتا سلسلہ ہوں
برہنہ ہو نہ جائے اپنی ہستی
گریبانِ محبت سی رہا ہوں
پہنچنا آسمانوں کا ہے مشکل
لہو کی اس بلندی پر کھڑا ہوں
زباں چکھ کر مجھے حیران ہوگی
نئی رت کا انوکھا ذائقہ ہوں
مجھے لگتی ہے اپنی ذات کم تر
مجھے خود سے الگ جب دیکھتا ہوں
ہوا پہنے گی ہر موسم میں مجھ کو
میں اپنے عصر کی ایسی قبا ہوں
مرے دریا کے رخ پڑھنا سمجھ کر
میں اپنی چاروں سمتوں میں بہا ہوں
گلی کو شاہراہوں سے ملا کر
گھٹن کو روشنی سے جوڑتا ہوں

● ۲۶۱ - ایم - ایچ - بی کالونی - مالیگاؤں - ۴۲۳۲۰۳



شمیم طارق

بساطِ نبض پہ سانسوں کو مات ہے کہ نہیں
یہ زیست خودکشی شاطر کی گھات ہے کہ نہیں

چراغِ خونِ شہیداں کی لو سے پوچھیں گے
کہ زیرِ خنجرِ قاتل حیات ہے کہ نہیں

ہر ایک ریشۂ جاں میں حشیشی فکر کا زہر
یہ نسلِ نو کی تباہی کی بات ہے کہ نہیں

سحر نے روز لکھے روشنی کے افسانے
مگر خود اس کا بھی انجام رات ہے کہ نہیں

نگار خانۂ معنی سے آرہی ہے صدا
ہر ایک حرف میں اک کائنات ہے کہ نہیں

تڑپتی موجوں میں اب بھی ہے پیاس کا منظر
کنارے پہ اپنے پشیمان فرات ہے کہ نہیں

جو "یارِ غار" کا مفہوم دے گئی طارق
ہزار صبحوں پہ بھاری وہ رات ہے کہ نہیں

● فلیٹ ۲۰، مرزبان مینشن، پاٹیکلہ فروٹ مارکیٹ، بمبئی ۲۷

عابد جعفری

10-1235. RADOM STREET PICKERING,
ONTARIO CANADA L1W-1J3



زنجیر

کسی نے دروازے پر دستک دی.....

میں نے دروازہ کھولا.....ایک سفید فام نوجوان ہاتھ میں تھیلا لئے کھڑا تھا۔

"دیکھئے آپ نے دروازہ کھول دیا... بغیر یہ اطمینان کئے کہ دروازے کے دوسری طرف کون ہے۔ میں کوئی مجرم بھی تو ہو سکتا تھا"

"جی! کون ہیں آپ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"فکر مت کیجئے، آپ خوش قسمت ہیں کہ میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔ ڈاکوؤں اور چوروں کے گروہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے" آنے والے نے مسکرا کر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں تحفظ مالکان کمپنی کا ایک کارندہ ہوں، آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اپنے دروازے میں پیپ ہول بنوائیں گے؟"

"کیوں؟" میں اب تک متعجب تھا۔

"آج کل جرائم بہت بڑھ گئے ہیں صاحب، جرائم پیشہ لوگ شرفا کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں اور دروازہ کھلتے ہی اہل خانہ کو اسلحے کے زور پر لوٹ لیتے ہیں۔"

"اچھا... پھر"

"پھر یہ کہ اگر آپ کے دروازے میں پیپ ہول ہوگا۔ تو آپ دروازہ کھولنے سے پہلے اس میں سے جھانک کر یہ اطمینان کر سکتے ہیں کہ آنے والا کوئی اجنبی تو نہیں ہے۔"

"ہوں! کتنے پیسے ہوں گے۔" میں اس کی بات سے متفق ہو چلا تھا۔

"صرف بیس ڈالر۔"

"اچھا لگا دو"

میں نے حامی بھر لی اور وہ میرے دروازے میں ڈرل سے سوراخ کرنے لگا، اور اس میں پیتل کی نلکی لگانے میں، جس کے دونوں سروں پر چھوٹے چھوٹے دو گول عدسے لگے ہوئے تھے اسے بمشکل دس منٹ لگے۔

"غالباً آپ اخبار نہیں پڑھتے۔" اس نے اپنے اوزار سلیقے سے تھیلے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"پڑھتا ہوں... کیوں۔"

"اگر آپ اخبار پڑھتے ہیں تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ آج کل جرائم کس تیز رفتاری سے بڑھ رہے ہیں۔"

"ہاں جرائم ان دنوں کچھ زیادہ ہی ہو گئے ہیں۔" اس کی کسی بات سے انکار مشکل تھا۔

"تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے دروازے میں یہ معمولی سا تالا اور کمزور سی زنجیر آپ کی حفاظت کے لئے کافی ہے۔"

"کیا کافی نہیں؟" میں نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

"کیا بات کرتے ہیں جناب..... یہ زنجیر تو ایک جھٹکے سے ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ ایک مضبوط زنجیر اپنے دروازے میں لگوائیں۔"

"اچھا" مجھ پر پھر خوف طاری ہونے لگا۔

"یہ دیکھئے! یہ زنجیر جو ہم دروازوں میں لگاتے ہیں، کس قدر مضبوط ہے۔ اس کارڈ کے ذریعے اس زنجیر کی پائیداری کی مکمل ضمانت دی جاتی ہے۔ دیکھئے" اس نے زنجیر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ اور بات جاری رکھی۔

"اس زنجیر کو کوئی مائی کا لال نہیں توڑ سکتا۔"

"اچھا..... " مجھے زنجیر اور اس کی باتوں میں کچھ منطق سا لگا۔ "کتنے کی ہے؟"

"صرف پچیس ڈالر کی"

"لگا دو" میں اب پوری طرح خوفزدہ ہو چکا تھا۔

اس نے پندرہ منٹ میں ایک اور زنجیر میری چوکھٹ میں لگا دی۔

"میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ جتنی جلدی ہو سکے یہ تالا بھی تبدیل کروا لیجئے۔"

"کیوں؟" میری گفتگو میں بس سوالات رہ گئے تھے۔

"یہ تالا اتنا پائیدار نہیں ہے، اسے کوئی بھی ایک کریڈٹ کارڈ کی مدد سے کھول سکتا ہے۔ بتاؤں کیسے۔"

"بتاؤ" میں نے حیرانی سے کہا

وہ باہر چلا گیا اور میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اندر سے تالا لگا لیا۔ مگر وہ واقعی کریڈٹ کارڈ کی مدد سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

"میرے خدا"، میرے منہ سے نکلا۔

"دیکھا کس قدر ناپائیدار ہے یہ"

"ہاں واقعی۔ تم نے تو اسے یوں ہی کھول لیا۔"

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ اس تالے کو بدلوا لیجئے۔" وہ مسکرایا۔

"اچھا تو تم تالا لگانے کا کام بھی کرتے ہو۔؟"

"ہاں! کیوں نہیں، ہمارا تو کاروبار ہی یہ ہے کہ ہم گھروں کے مالکان کو تحفظ مہیا کریں۔ یہ دیکھئے میڈ ان جرمنی تالہ، مضبوطی کی مکمل ضمانت کے ساتھ جو اس ڈبے میں ہے — اطمینان کر لیجئے۔۔۔ اس تالے کو توڑنے یا کسی اور چابی سے کھولنے کی کوئی کوشش کارگر ثابت نہیں ہو سکتی۔"

"چلو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ یہ کتنے کا ہے۔؟"

"صرف پچھتر ڈالر کا، لگوائی مفت۔"

"لگا دو بھائی۔۔۔" میں مجبور ہو چکا تھا۔

"مگر اس تالے کو لگانے سے پہلے آپ کو مضبوط لوہے کی بنی ہوئی یہ پلیٹ اپنی چوکھٹ میں لگوانی ہوگی۔" اس نے ایک مربع نما پلیٹ میرے ہاتھ میں تھما دی۔

"کیوں۔۔۔ یہ کیوں لگوانی ہوگی؟"

"تاکہ کوئی دروازہ نہ کھول سکے۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ تالا بہت مضبوط ہے۔ اس کی ضمانت بھی تم دے رہے ہو تو پھر یہ پلیٹ۔۔۔"

"اس کو پڑھیئے" اس نے تالے کے ڈبے میں سے ضمانت نامہ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔۔۔

"اس پلیٹ کے بغیر ضمانت نامہ قابلِ عمل نہیں۔"

"کیوں"

"اس لئے جناب! کہ تالا بنانے والی کمپنی تالے کی ضمانت دیتی ہے آپ کی چوکھٹ کی نہیں، اور آپ کی چوکھٹ لکڑی کی بنی ہوئی ہے، جو عموماً پائیدار نہیں ہوتی۔ اس کی سو فیصد پائیداری کے لئے ضروری ہے کہ لوہے کی یہ پلیٹ لگائی جائے۔"

"یہ پلیٹ کتنے کی ہے۔"

"پچیس ڈالر۔۔۔ لگوائی سمیت۔"

"لگا دو"

اس نے میری چوکھٹ پر پلیٹ لگائی اور تالا فٹ کر دیا۔

"اب آپ بالکل محفوظ ہیں" اس نے ماتھے سے پسینہ خشک کیا اور پیسے لے کر چلتا بنا۔ دوسری ہی ہفتے میرے گھر میں چوری ہو گئی۔ خیریت ہوئی کہ اس وقت گھر میں کوئی موجود نہ تھا۔

چنانچہ گھر کی قیمتی چیزوں ہی سے ہاتھ دھونا پڑا۔

دروازے کی نئی زنجیر اور قفل سلامت تھا۔ جس کی ضمانت میرے پاس تھی البتہ عقب کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔

شام کو کھڑکی کی مرمت کرنے والا آ گیا اور کھڑکی میں نیا شیشہ فٹ کرنے لگا۔

"تمہارے پاس کوئی ایسا شیشہ بھی ہے، جس کی مضبوطی کی ضمانت ہو، میرا مطلب ہے ایسا شیشہ جسے چور ڈاکو توڑ نہ سکیں۔"

"ضمانت، اور وہ بھی شیشے کی! کیا بات کرتے ہیں جناب۔" وہ مسکرا دیا۔

"کیوں؟ بلٹ پروف شیشے بھی تو ہوتے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔"

"جناب بلٹ پروف شیشے بندوق کی گولی روک سکتے ہیں مگر کوئی بھی شیشہ ضرب کی شدت برداشت نہیں کر سکتا۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"زیادہ سے زیادہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ گھر کی تمام کھڑکیوں کے اندرونی طرف لوہے کا جال لگوا دیں۔ تاکہ شیشہ ٹوٹ بھی جائے تو بھی کوئی اندر داخل نہ ہو سکے۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "مگر اس طرح آپ کا گھر جیل کا سماں پیدا کرنے لگے گا۔"

[باقی صفحہ ۱۳۱ پر دیکھئے]





عذرا پروین

عرفان گزیدگی

یں نے اپنے اندر اندر
جتنا جو کچھ چُن رکھا تھا
یں نے اپنے آپ سے اپنے بارے میں
جو کچھ بھی سُن رکھا تھا
ں نے اپنے آپ کو جتنا جیسا جیسا فرض کیا تھا
یں اس سے بھی اور سوا تھی
ی ٹھی میں
ں پائی تھی
ک بھی تھی، جتنی میں ہوا تھی۔
بن اپنی سب جہتوں سے
تعارف ہو جانا خود کو کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے'
ھ رہی ہوں
ندگی آنکھیں سکھی،
رفان گزیدہ آنکھ نے دیکھا ہے
ے ابدی ابدی خسارہ۔

۱۴/۳۰۱ عبدالعزیز روڈ، چوک، لکھنؤ-۳

شبنم عشائی

ایک نظم

بستر
اک بے خوابی کا صحرا ہے
سناٹے پھلانگتے پھلانگتے
ٹوٹ کر
بکھر جاتی ہوں
ہر رات
پلاسٹر آف پیرس کی
سفید تہہ
خود پہ چڑھا لیتی ہوں
اور جب
صبح ہوتی ہے
تو
بستر پہ
ایک مکمل پائی ہوں
جس کا تسلسل
ہزار خانوں میں بٹ کر بھی باقی رہتا ہے۔

عشائی منزل، اننت ناگ - ۱۹۲۳۱ - کشمیر

اسنیٰ بدر زبیری

تمہارے لفظوں سے باہر میں

اور جب
میں نے تمہیں
تمہارے لفظوں سے باہر نکال کر دیکھا
تو مجھے اپنا چہرہ
بہت بے رونق اور بے کشش لگنے لگا
کہ
تم تو کوئی آسمانی چیز ہو
پھر میں نے تمہیں
زمینی کیوں سمجھا

اور اب
جب کہ تم ہی سچے ہو
تو اپنے سچ سے
کبھی محروم نہ رکھنا
ورنہ مجھے اپنے چہرے کی بدصورتی
اور اپنے رویّے کی عفونت
خود سے نفرت کرنا سکھا دے گی۔

امان شہید روڈ، ہمیر پور - ۲۱۰۳۰۱

عذرا نقوی
P.O.BOX 5478 REYADH - 5843
(SAUDI ARABIA)

رین چیک

اوپر اثنا کے کمرے میں اسٹریو پوری آواز سے بج رہا تھا گھر میں داخل ہوتے ہی میرا موڈ خراب ہو گیا۔ میڈونا کی آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی۔ وہی منحوس گانا۔

"PAPA DON'T PREACH"

حامد اپنے کمرے میں نہ جانے کیا کر رہا تھا، بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے گھر میں بھونچال آیا ہوا ہے۔ ایک تو کناڈا کے گھر لکڑی کے ہیں لکڑی کے کھوکھلے اندر سے اوپر سے چکنے، چمکدار اور اندر سے کھوکھلے۔ کوئی اوپر کے کمروں میں زور سے چلے بھی تو لگتا ہے کہ اوپر گھوڑ دوڑ ہو رہی ہے میرا موڈ خراب موسم کی وجہ سے بھی خراب تھا۔ باہر سردی ہے کہ توبہ اور دا دپر سے رات جو برف گری تھی سڑک اب شیشے کی طرح چکنی ہو گئی ہے۔ چلنا بھی مشکل اور گاڑی چلانا بھی مشکل۔ میں نے کمرے میں نظر ڈالی تو جی ہی جل گیا۔ سنڈے کا دبیز اخبار آیا تھا اور اس کے سارے صفحے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ کافی کی جھوٹی پیالیاں اور کشن بھی بے ترتیب پڑے تھے۔ میں حسب عادت خود بخود بڑبڑانے لگی۔ سوائے بڑبڑانے کے اور کر بھی کیا سکتی ہوں۔

"ہاں! ہاں معلوم ہے نا کہ ابھی وہ نوکرانی آئے گی بازار سے خریداری کر کے۔ جھٹ مار کر خود کرے گی صفائی'....

نوکرانی ہی تو میں ہوں اس گھر میں.... بلکہ مہترانی بھی ڈرائیور بھی ..... باورچی بھی "......

اتنے میں جیسے پھر ایک زلزلہ سا آیا، اثنا طوفانی انداز سے اوپر سے اتر کر چلاتی ہوئی آ رہی تھی۔ اسے ایکسر سائز کے چست لباس میں دیکھ کر میرا دل اور بھی جلا۔ وہ چیخ رہی تھی۔

"آپ نے اتنی دیر کر دی..... آپ کو معلوم تھا نا! مجھے گیارہ بجے 7.00 P.M. جانا تھا۔ ایکسر سائز کے کلاس کے لئے۔ سینڈی میرا وہاں انتظار کر رہی ہو گی۔ آپ گاڑی لے گئیں۔ کہا تھا آپ نے دس بجے آنے کو اب دیکھئے گھڑی، ساڑھے گیارہ بج چکے۔ مجھے دیر ہو گئی "۔

میں نے بہت ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"چلو ایکسر سائز کی کلاس تو وہاں ہر گھنٹے بعد ہوتی ہے، اب چلی جاؤ اصل میں آج مجھے کئی کام کرنا تھے "

اثنا بالکل آپے سے باہر ہو گئی۔

"وہاں سینڈی میرا ویٹ کر رہی ہو گی۔ آپ کے لئے تو کچھ نہیں ہوا میرا پروگرام تو اپ سیٹ ہو گیا۔

YOU HAVE NO SENSE OF RESPONSIBILITY

میں بھی اب پھٹ پڑی۔

"ہاں! ہاں مجھے کسی طرح کی ذمہ داری کا احساس نہیں ہے۔ تفریح کرنے گئی تھی نا!..... نوکر نہیں ہوں تم سب کی۔ گھنٹوں سپر مارکیٹ میں لگے ہفتے بھر کی گروسری خریدنے میں۔ اِدھر اُدھر ادھر کے سارے کام بھی تو مجھے ہی سر پڑ آتے ہیں.... اور پھر کون سی قیامت آجائے گی۔ اگر سینڈی تمہارے بغیر ایکسر سائز کرے گی۔ "

اثنا نے زور سے پیر پٹخا

"YOU ARE IMPOSSIBLE MOM"

میں آج خود کو قابو میں نہیں رکھ پا رہی تھی ۔

"بکواس بند کرو..... اور تم سے کہا تھا نا میں نے، آج چھٹی ہے ذرا ویکیوم کر لینا گھر میں، صفائی کر لینا..... مگر تمہیں ہوش کہاں... اور بند کر دو یہ منحوس اسٹریو

نفرت ہے مجھے اس گانے سے اور گلوکارہ سے ..... کیا گا رہی ہے صاحبزادی فرما رہی ہیں باپ سے کہ میں کنواری ماں بننے والی ہوں.... پاپا مجھے نصیحت مت کرو ..... ہاں! ہاں نصیحت نہ کریں تو کیا سر پر بٹھائیں کہ واہ! واہ! بیٹی بڑا نام روشن کیا ہے تم نے پالنا "

مجھے اپنے لہجے اور الفاظ پر خود بھی حیرت ہوئی ۔۔۔۔ یہ میں
ہوں رخسار رحمان، جو اپنے دھیمے مزاج اور نرم لہجے کے لیے مشہور تھی۔
انتا دھڑام سے دروازہ بند کر کے نکل گئی۔ جاتے جاتے اس کا یہ جملہ میرے
کانوں میں چھید کر گیا۔
"FRUSTRATED WOMEN!
MAKES EVERY ONES LIFE MISERABLE"

وہ اوپر گئی اور اپنا پرس اور کوٹ لے کر واپس آئی اور گاڑی کی
چابی میرے سامنے سے اٹھا کر جانے لگی۔ میں نے کہا۔
"اب گاڑی لے جا رہی ہو تو جلدی آنا۔ شام کو مسز صدیقی کے گھر کھانے
پر جانا ہے۔ شاید تمہارے پاپا کی گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے"
انتا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
"مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔ کسی بھی بورنگ جگہ ۔۔۔۔ کیا ہوتا ہے
وہاں، پاپا اور دوسرے سارے لوگ ایک کمرے میں بیٹھ کر انڈیا اور پاکستان
کی پالیٹکس ڈسکس کریں گے۔ بحث کریں گے۔ کمرے میں بیٹھ کر اسلامک
ریولوشن لائیں گے اور کوئی کسی کی بات نہیں سنے گا ـــــ اور لیڈیز
دوسرے کمرے میں جمع ہو کر کھانے اور کپڑوں کی باتیں کریں گی ۔۔۔۔
مسز پاشا اپنی PREACHING شروع کر دیں گی کہ نیل پالش لگانے
سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ان سے پوچھئے گا کہ یونیورسٹی میں ان کی بیٹی کیا
کرتی ہے!
سب کے سب "HYPOCRATES
اور انتا باہر نکل گئی۔

میرا دل چاہا کہ اٹھ کر دو چانٹے رسید کر دوں اس کے منہ پر لیکن مجھے کیا
یہ آفت بلائی تھی؟ ۔۔۔۔۔۔۔ دو برس ہوئے جب کسی ایسی
بدتمیزی پر ارشد نے بیٹی کو ایک چانٹا مار دیا تھا۔ آفت آ گئی تھی۔ اسکول
پرنسپل ورکر نے بلا بھیجا تھا ہمیں یہ بتانے کے لیے کہ یہ CHILD
ABU ہے، یہ ہے، وہ ہے۔ اس کے بعد سے ارشد نے تو بیٹی سے تمیں
بولنا بھی بند کر دیا تھا لیکن اس وقت بات تو انتا کو دل کو لگتی ہوئی کہہ
دل تو میرا بھی گھبراتا ہے ان بورنگ دعوتوں سے۔ مگر کریں بھی کیا اس
اجنبی سے شہر میں بہت ہوا تو شاپنگ مال چلے گئے، اور اب تو شاپنگ
سے نفرت ہو گئی ہے ۔۔۔۔ آج ہی کی تو بات ہے پورا ایک گھنٹہ لگا
ہے ایک اسٹور میں۔ وہاں VACUAME کلیئر سیل پر لگا تھا
دام پر ایک دو نہ تو لکھا ہوا تھا۔ جب تک میں شیلف تک پہنچی۔ مال
ربر مینیجر کے پاس جا کر کہنا پڑا تب اس نے مجھے رین چیک دیا جواب

یہ رین چیک کی سلپ دکھا کر اگلے ہفتے یا جب بھی نیا مال آئے گا مجھے دکھینا
کلیئر سیل والی قیمت پر مل جائے گا۔ کیا خوب اصطلاح نکالی ہے۔ ان
امریکنوں نے، رین چیک، لیکن آج کا میرا سارا دن غارت ہو گیا۔
اس کے پیچھے۔ اب گھر آئی ہوں تو صاحبزادی کی بدتمیزی اور بدمزاجی۔
میرا دل چاہ رہا ہے کہ کسی پر غصہ کروں مگر کس پر؟ ۔۔۔۔ اس
گھر میں ہر ایک کو غصہ کرنے کا، موڈ خراب کرنے کا حق ہے۔ سوائے
میرے چھٹی کے دن میرا کام اور بڑھ جاتا ہے ۔۔۔۔ شکایت کرو تو میاں
جھٹ سے کہہ دیتے ہیں چھوڑ دو نوکری ۔۔۔۔ صرف وقت گزاری کے
لیے میں نے کپڑوں کے اسٹور میں کام لے لیا تھا ۔۔۔۔ تاکہ گھر کے
دھندوں کے علاوہ بھی مجھے پتہ چلے کہ میں بھی ہوں ۔۔۔۔ تیرہ سال
ہو گئے اس منحوس شہر میں ۔۔۔۔ خود کو تو جیسے اب بھول ہی گئی ہوں
پھر مجھے انتا کا آخری جملہ ڈسنے لگا۔
"فرسٹریٹڈ عورت ۔۔۔۔۔"
ہاں اب تو میں صرف یہی رہ گئی ہوں ۔۔۔۔ میری فرسٹ
کلاس سوشیالوجی کی ڈگری پڑی ہو گی کسی کونے میں اور ڈیبیٹ سے جیتے
ہوئے سارٹیفکٹ بھی نہ جانے کہاں چلے گئے۔
مجھے خبر بھی نہیں ہوئی اور میرے سر کے نیچے رکھا ہوا کشن آنسوؤں
سے بھیگ گیا ۔۔۔۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔
عامر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "آپ روئیں نہیں
آپ لوگ انتا کو سمجھنے کی کوشش کریں"
بے اختیار مسکراہٹ میرے لبوں تک آ گئی
"بیٹے سمجھنے کی کوشش"
انتا کی اردو ابھی خامی تھی کیوں کہ وہ چھ سال کی عمر میں ہندوستان
سے آئی تھی۔ عامر کی اردو بہت صاف ہوتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا
"امی! میں زینک کے ساتھ شام کو جاؤں گا فلم کے لیے"
"اور مسز صدیقی کے گھر؟" ـــــ میں نے پوچھا
عامر مسکرایا "COME ON MOM میں وہاں کیا کروں گا"
وہ میرے گال پر پیار کر کے چلا گیا ـــ میں مسکرا دی،
شیطان کہیں کا۔ میرا بیٹا کتنا لمبا ہو گیا ہے تیرہ سال کی عمر میں کتنا اچھا
ہو گیا ہے اور باتیں کتنی سمجھداری کی کرتا ہے۔
انتا جب اس عمر میں آئی تھی تو تب ہی سے گھر کا سکون ختم
ہو گیا تھا، ہر بات پر ہنگامہ ہمیں سوشل کا سٹم کبھی نہیں سمجھ سکتی

اور شور نس بننے میں پاپا کو کیوں اعتراض ہے اپنی دوستوں کے ساتھ سلمبر پارٹی میں کسی کے گھر رات کو کیوں نہیں رک سکتی۔ ہر وقت بد مزاجی چڑچڑا پن پڑھائی کی طرف بھی توجہ نہیں دیتی تھی ۔۔۔ بس بے ہنگم سے حلیے بنانا آنا ہائی اسکول میں تھی جب نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ ارشد کی اور میری باقاعدہ اسکول کی سوشل ورکر کے ساتھ میٹنگ ہوئی، ہمارا ایک معاہدہ کرایا گیا اپنی بیٹی کے ساتھ کہ ہمیں کیا کیا کرنا ہے اور اسے کیا کیا کرنا ہے ۔۔۔ سوشل ورکر میز کی دوسری طرف بیٹھی ہمیں کس اعتماد سے سمجھا رہی تھی کہ ہمیں اس ملک میں اپنے بچے کیسے پالنے چاہئیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انتا کے ڈیٹ پر کسی لڑکے کے ساتھ جانے سے ہمیں کیوں پریشانی ہوتی ہے اور اب تک ہم اس معاہدے ہی پر چل رہے ہیں۔ ارشد نے تو خود کو مصروفیت کے خول میں بند کر لیا تھا وہ ہیں اور ان کا آفس ہے بکھرے کاروبار ہیں۔۔۔ اب رہ گئی تنہا میں اپنی بیٹی سے نپٹنے کے لئے اس کے بعد کالج میں داخلے کا ہنگامہ انتا کی ضد تھی کہ ٹورانٹو جا کر پڑھوں گی اور مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ صرف گھر سے دور رہنے کا بہانہ ہے اب جب کہ مجبوراً انہیں اپنی یونیورسٹی میں داخلہ لینا پڑا ہے اسے تو تب سے شدید موڈ آف ہے اس کا کیا کریں اس لڑکی کا کہاں چلی گئی وہ میری پیاری سی گڑیا، کتنی جان دی ہے میں نے اس کے لئے۔ ہر ضد پوری کی ہے بچپن میں اس کی میں نے۔

اور نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

شکر ہے کہ شام کو ارشد کی گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ کیونکہ انتا کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ رات کو ایک بجے کے قریب جب ہم لوگ مسز صدیقی کے گھر سے واپس آئے تو انتا اور عامر سو چکے تھے۔

دوسرے دن اتوار تھا سب ہی دیر سے سو کر اٹھے ۔۔۔ عامر صبح ہی صبح اپنے کسی دوست کے ساتھ فون پر پروگرام طے کر رہا تھا وہ لوگ SKIING پر جا رہے تھے ۔۔۔ انتا کچن میں بیٹھی کارن فلیکس کھا رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر اس نے اپنا پیالہ اٹھایا اور اوپر چلی گئی مجھے یاد آیا کہ آج گیارہ بجے تو ہمیں مسجد جانا ہے مسز شیخ نے قرآن خوانی کرائی ہے۔ ان کے سسر کا لاہور میں انتقال ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا، چلو آج کا دن بھی گیا۔

ارشد کی گاڑی آج پھر اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی مجبوراً دوسری گاڑی لینی پڑی جسے انتا نے خود اپنے لئے نامزد کر لیا تھا۔ جب میں گاڑی کی سیٹ پر بیٹھنے لگی تو دیکھا وہاں انتا کا چھوٹا پرس پڑا ہوا تھا جس میں وہ اپنے میک اپ کا سامان رکھتی ہے پرس کو اٹھایا ہی تھا کہ اس میں سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکل کر گر گیا،

اس سے پہلے کہ ارشد کی نظر اس پر پڑے۔ میں نے جلدی سے پیکٹ پر اپنا بھاری برف کا بوٹ رکھ دیا مسجد میں سپارہ پڑھتے وقت وہ پیکٹ بچھو کی طرح میرے پرس میں پڑا رہا اور میرے ذہن میں ڈنک مارتا رہا میں جیسے تیسے گھر آئی انتا کے کمرے کے سامنے سے گذر کر ہی مجھے اپنے بیڈ روم میں جانا تھا۔ شکر ہے کہ ارشد نیچے ہی بیٹھ کر T.V پر میچ دیکھنے لگے انتا کے کمرے کے سامنے سے گزری تو کمرے سے اس کی آواز سنائی دی وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی میرے کان میں صرف یہ جملہ پڑا

"OH! HE'S SO COOL SO CUTE"

میں اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑی ۔۔۔ میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا ۔۔۔ سرہانے رکھا فون بار بار اکسا رہا تھا کہ مجھے اٹھا لو، اور سن لو معلوم کر لو کہ کون ہے وہ کم بخت COOL لڑکا جو بہت CUTE بھی ہے۔ شاید مائک ہو یا جان یا شاید اردن ۔۔۔ لیکن؟ اگر انتا کو پتہ چل گیا کہ میں اس کا فون سن رہی ہوں تو قیامت ہی آ جائے گی؟! اونہہ! مجھے اب کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ اور اب رہ ہی کیا گیا ہے۔

اور میں نے فون کا ریسیور اٹھا لیا انتا اپنی دوست ثمینہ چودھری سے باتیں کر رہی تھی۔

"کل بہت مزہ آیا ثمینہ۔۔۔ پہلے میں اور مائک یونہی گھومتے رہے۔ پتہ ہے کل میں نے بیئر آرڈر کر دی ۔۔۔ چھی چھی کتنی بدبو تھی ۔۔۔ مائک اتنا کیوٹ ہے ہنسنے لگا اور خود وہ بیئر پی گیا اور میں نے سیون اپ پر اکتفا کی۔ کل مجھ میں غصہ بھی بہت بھرا ہوا تھا۔ اور کل ہم دونوں نے خوب لمبا ڈا کیا۔ گیارہ بجے تک ہم دونوں ڈانس کرتے رہے YOU KNOW ثمینہ کل میرا موڈ اتنا خراب تھا کہ میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔

MY MOM IS DRIVING ME CRAZY

میں اتنے غصے میں تھی کہ ۔۔۔ مگر مائک اتنا سویٹ ہے کہ ڈانس کے بعد مجھے گھر چھوڑ گیا۔

HE BEHAVED LIKE A PERFECT GENTLEMAN

اور پتہ ہے کیا بولا جاتے جاتے ۔۔۔۔

"I DID'NT WONT TO TAKE ADVANTAGE OF YOUR BAD MOOD TODAY, BUT ----- I AM TAKING A RAIN CHECK"

میں نے دھیرے سے فون رکھ دیا، دماغ بالکل خالی سا تھا، نہ جانے

[باقی صفحہ ۲۴۷ پر دیکھئے]



ضمیر درویش

..ِ خوشگوار دسمبر کی دھوپ ہے
..بس میں جل رہے ہیں وہ اندر کی دھوپ ہے

..دھوپ کے غضب سے ڈراؤ گے تم مجھے
پپلاتی دھوپ مرے گھر کی دھوپ ہے

..ے تو زلف بھی نہ بچا پائے گی تری
..ہربان یہ میرے مقدر کی دھوپ ہے

..ے مجھ پہ آکے کسی تیغ کی طرح
..بچائے رکھ یہ مرے سر کی دھوپ ہے

..سین شام کو جھلسا نہ دے کہیں
..ے نوا کے ساتھ جو دن بھر کی دھوپ ہے

..ں لوٹ جائے گی درویش کی طرح
..یں جھانکتی ہوئی باہر کی دھوپ ہے

..ی۔ ۵۱ بی، ریلوے کالونی نارتھ، مراد آباد۔ ۲۴۴۰۰۱

نذیر آزاد

گل نہیں ہوں مجھ سے کیوں کر رنگ و بو لیجائیے
جستجوئے بے سبب ہوں کو بہ کو لے جائیے

اس سے پہلے در بدر پھرنے لگے تا گوش و لب
ذہن و دل کے حاشیوں پر گفتگو لے جائیے

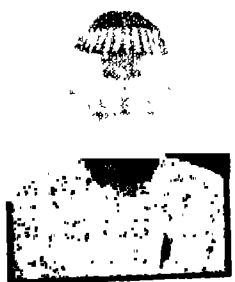
اب بھی میرے ظرف میں تھوڑی نمی ہے تہ نشیں
تلخیٔ ایام، خونِ آرزو لے جائیے

سوچ کے دھاروں میں بہہ جانے سے پہلے آپ بھی
ذائقے کے واسطے تھوڑا لہو لے جائیے

یاد کے سائے بھی داخل ان میں ہو پاتے نہیں
ایک صحرائے جنوں یادشتِ ہو لے جائیے

بس یہی دونوں ہیں واقف آپ کے اعمال سے
اعتبارِ دوست یا چشمِ عدو لے جائیے

آزاد منزل، کوٹھل پھوامان ۔ ۱۹۲۲۳۰۱



حبیب احمد ساجد

دن میں ہے فکرِ شبِ تاریک، غیر معتبر
جاہلوں میں نکتۂ باریک، غیر معتبر!

قلب میں بغض و عداوت کا سلگتا ہو الاؤ
اور ہونٹوں پہ فقط تضحیک، غیر معتبر!

ردّ و کد ہر چیز پہ کرنے سے پہلے سوچ لے
معتبر کیا؟ کیا ترے نزدیک غیر معتبر!

سیکھنا چاہو تو سیکھو! ایک ہے بس ایک سے
ہر کسی سے علم و فن کی بھیک، غیر معتبر!

صد مخاطب ہو اگر ساجد، تو تبل ....
اسکی تائید، یا تحریک غیر معتبر!

۱۲/۱۹۴ ایم آئی ماسٹر ... ...

★ احمد صغیر صدیقی۔ ہسپل کمرشل بنگلوز ساؤتھ انلی —— کراچی

اپریل کے شاعر میں "۶ خط — باتیں ہزار" نہایت دلچسپ لگا۔ ایسا کوئی سلسلہ چلنا چاہئے۔ اس میں سبھی نے خوب لکھا ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی اور پروفیسر عالم خوش کے خطوط تمام کے لئے۔ خوش صاحب نے اچھی باتیں لکھی ہیں۔ رہے مناظر عاشق صاحب سو وہ ان نادروں میں سے ہیں جو ہر ایک کو اعلیٰ انعام کر اپنے لئے سیڑھی بنانے کے عادی ہیں۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے احمد ہمیش صاحب کی بڑی تعریف سے وکالت کی ہے اور لکھا ہے کہ آپ نے انہیں اور ان کے جریدے کو نظر انداز کیا ہے۔ آنند صاحب نہیں جانتے کہ خود احمد ہمیش صاحب بھی نظر انداز کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ آنند صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کو تشکیل پر تبصرہ کرنا چاہئے تھا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات سن لیجئے۔ روزنامہ "جنگ" (کراچی) میں شفیع عقیل صاحب کتابوں پر تبصرہ کرتے ہیں۔ تشکیل کے سرورق پر لکھا ہوتا ہے کہ تیس سال کی تحریروں کا بہترین انتخاب۔ ش ع نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: احمد ہمیش صاحب نے اپنے انتخاب کو جب خود ہی بہترین قرار دے دیا ہے تو پھر اس پر کوئی کیا تبصرہ کر سکتا ہے۔ شاعر کے اس شمارے میں عرفان صدیقی صاحب کی غزل بھی ہے۔ عرفان صاحب غزل کے بہت اچھے شاعر ہیں۔ افسوس ان کی یہ غزل متاثر نہ کر سکی۔ اس شمارے کے مکتوبات میں سہیل اختر صاحب کا خط مجھے اچھا لگا۔ مئی کے شمارے میں گوپی چند نارنگ صاحب کا طالبانہ فاضلانہ مضمون شروع ہوا اور چکر دیتا ہوا ختم ہو گیا۔ اس شمارے کی غزلیں واجبی سی لگیں۔ صرف صدف جعفری کے ہاں اچھی شاعری کے کچھ امکان نظر آئے۔ مکتوبات میں ڈاکٹر [illegible] ، رستوگی کا خط پڑھا۔ رستوگی صاحب بہت گہرے ناقد ہیں۔ ان سے شاعر کیلئے مضامین لکھوایئے۔ شکیل اعظمی کا خط خوب ہے۔ نند آزاد نے بھی کام کی باتیں لکھی ہیں۔ ہو سکے تو شاعر میں نظموں کے (اور غزلوں کے بھی) تجزیے کا سلسلہ شروع کیجئے ——

★ عرفان صدیقی: عشرت منزل، حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج لکھنؤ۔

"شاعر" باقاعدگی سے تو نکل ہی رہا ہے۔ حسن اشاعت اور خوش ترتیبی کے لحاظ سے بھی منفرد ہے۔ ادھر کئی خطوط بہت بحث طلب نظر آئے۔ خصوصاً ستیہ پال آنند صاحب کا خط۔ تجرید یا اختلاف دونوں صورتوں میں اس پر ادارتی حاشیے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ان کے بنیادی مفروضات پر شاعر کا ادارتی تجزیہ بھی سامنے آنا چاہئے۔

★ قمر نقوی: 6207 S INDIANA POLIS
TULSA, OK 74136 U.S.A

میں آپ کے اداریے بھی پڑھتا ہوں اور سارا رسالہ بغور مطالعہ کرتا ہوں۔ شاعر میں شائع ہونے والی نثری نظموں کے حوالے سے کچھ لکھنا چاہتا ہوں یعنی نثری نظم کے بارے میں۔ ادھر آپ کے رسالے میں یہ بحث پھر تازہ ہو گئی ہے۔ نثری نظم جسکو "نثم" کہنا چاہئے اس کی عمر بھی کوئی تیس چالیس سال ہے، لیکن اس کی نوعیت کے بارے میں غالباً آپ کا اور آپ کے بارے میں لکھنے والوں کا ذہن صاف نہیں ہے۔ نظم یا "نثم" شاعری کی ایک قسم ہے اور شعر ایک فطری فن ہے جو تصورات کے جمال اور احساسات کے کیف سے مرکب ہو کر ایک ایسے بصیرت افروز آہنگ میں ڈھل جاتا ہے جو جذباتی تموج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ گو ہر شخص کے شعور کی سطح یکساں نہیں ہو سکتی لیکن ہر وہ شخص جو شعر گوئی کا دعویدار ہوتا ہے یا جو شعری تخلیق کا باعث بنتا ہے خواہ وہ "نثم" وہ مظاہر و حقائق کے انکشاف کی کوشش میں مصروف ہوتا ہے۔ اخلاقی و معاشی سیاسی و معاشرتی ماحول کا تجزیہ کی اور اس تجزیئے کی ہمہ گیر کیفیت، یہ ہے وہ سب کچھ جسکی ترکیب شعر کو وجود عطا کرتی ہے۔ اگر شعر یا نظم میں یہ اوصاف نہ پائے جا سکیں تو پھر وہ ایک سعی مہمل بن کر رہ جاتی ہے۔ جس کی مثال وہ تحریریں ہیں جو شاعر کے حالیہ شماروں میں شائع ہوئی ہیں۔ یا دیگر ادبی رسائل میں شائع ہو رہی ہیں۔ اور ادب کا حصہ بن رہی ہیں۔ نثر کے چھوٹے چھوٹے جملوں کو نظم کی شکل میں لکھ دینے سے نہ تو وہ جملوں کا مجموعہ نظم بن سکتا ہے نہ ہی اس کا خالق شاعر۔ ذہنی الحاد، خام خیالی اور فکر و نظر کی کوتاہی کی دلیل بیشک بن جاتا ہے۔ بیان کی عریانی کو ادب کا مقام عطا کرنا غلطی ہے۔ یہ موضوع میری کتاب "اردو ادب میں بے ادبی کی تاریخ" میں مفصل زیر بحث آیا ہے۔ اس قسم کی عریانی سے لکھنے والے کی ذہنی کم مائیگی، باطنی غلاظت اور کور ذہنی کو ظاہر کرتی ہے۔ نثر، نثم یا شعر میں ہمہ گیری و پیچیدگی کے ساتھ منطقی اور ذہنی تبدیلیاں، تمثیل اور الجھے ہوئے جملے جنکو لکھنے والا خود کو جدیدیت رنگ طرز تجرید کہہ سکتا ہے یا وہ غریب و عجیب الہیئت ترکیبیں جو نہ صرف نامانوس، عقلی استدلال سے مجہول اور رنگ ادب سے منحرف ہوں، وہ قاری کو فی الفور غور کرنے پر مجبور ضرور کرتی ہیں لیکن اس غور کرنے کا نتیجہ؟ —— جس شخص کا ذہن صاف، علم ہو خیالات روشن ہوتے ہیں اس کی تحریر کو، مشکل نامانوس تراکیب مجہول جملوں اور پیچیدہ عبارتوں نہیں درکار ہوتا۔ صاحب علم کی تحریر سادہ اور عام فہم ہے۔

★ ناصر بغدادی: —— 8/14 MEMAR SQR
HAN-E-IQBAL
KCHI-75300

ادب کی مجبوریاں، محبت کی مجبوریوں سے زیادہ کٹھن ہوتی ہیں۔ ہر قدم پر کانٹوں کے جھنڈ کھڑے ہیں۔ مگر ایک بات کہنا چاہوں گا۔ آپ کی ادبی کوششوں میں مداح ہوں۔ شاعر کی اشاعت اور اس کے ادبی ا برقرار رکھنے کی خاطر نہ معلوم کتنی بار آپ نے ادب ہمالہ کو سر کیا ہوگا۔ یہ مجھے نہیں معلوم اور شاید آپ بات سے واقف نہیں ہوں گے۔ مغربی ادب کے میں یا میرے مضامین کے متعلق آپ کے بعض استفسار کیلئے عرض ہے کہ اس کرہ ارض کی سرحدیں سکڑ چکی مواصلاتی نظام کی وجہ سے اب مشرق اور مغرب کے اور حد فاصل بہت کم رہا ہے۔ تشدد، وحشت اور جنس حوالے سے جو ادب پیش کیا جاتا ہے۔ وہ اب محض مغ میراث نہیں رہا۔ مشرق میں اب جو کچھ ہو رہا ہے ا سے بعض چیزوں کو دیکھ کر مغرب بھی شرم کرنے لگا ہے۔ اور ویسے بھی ادب میں مغرب و مشرق تخصیص کا میں قائل نہیں۔ زمانہ بہت آگے نکل چکا۔ عرض اب ایک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ وہ زمانہ دور نہیں جب اس کرہ ارض کے ادب کا مقابلہ دوسرے سیارے کے ادب سے ہوگا اور دیگر دنیاؤں کی تلاش کا چاہتا ہے۔ یقیناً وہاں بھی ہم جیسے دیوانوں کی ایک تعداد اپنے افکار کے حوالے سے ادب کی تخلیق میں ہوگی۔ ہم تو شاید وہ دن دیکھنے کیلئے نہیں ہوں گے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب دوسرے سیاروں کا ترجمہ اس کرہ ارض کے جرائد میں شائع ہوگا۔ اس وقت بھی شاعر تندرست و توانا ادب کی خدمت مصروف ہوگا۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو یا کسی بھی سے متعلق ہو، ہمیں اس سلسلے میں تعصبات سے گریز کرنا چاہئے۔ ادیب اور ادب ساری دنیا کے ہوتے ہیں اور اس تناظر میں ساری دنیا کے ادب مستحق ہوتا ہے۔ شاعر میں آپ ملکی اور غیر ملکی ادب کے تراجم شائع کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں وقعت بڑھ جاتی ہوگی ——

...جمال: ...ران ٹانگ...(ڈویسا)

...نمبر ۲ میں "۲ خط — باتیں ہزار" کے خطوط
...سلیم شہزاد نے حقائق پر مبنی باتیں کہی ہیں۔
...انھوں نے آپ کی تحریر (اداریہ) پر گنجلک، مبہم
...دماغ اور موضوع کو گڈمڈ کر دینے کا الزام لگایا
...ہے۔ متعلق آپ کے تصور، مابعدالطبیعاتی سوچ، مذہب
...سائنسی علوم کی بے پناہ ترقی وغیرہ پر اختلاف کا
...صاحب نے سلیم شہزاد کے خط کو (اپنے خلاف)
...قدری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ہے۔ ہر
...زاد نے شعوری طور پر آپ کے اٹھائے گئے
...دید جس طرح سے کی ہے اس میں اختلاف کی
...ہے۔ اشعر نجمی نے آپ کے اس نظریے کی تائید کی
...سب بیزاری نے دانشوری کی ایک نئی تعریف کو
... "مذہب بیزاری سے دانشوری کی نئی تعریف کا
...دو میں آتا ہے معنی دارد؟ — جبکہ مذہب سے
...ادو بھی دانشوری کی روشن مثال سمجھا جاتا رہا
...ہے کہ کسی دہریے کی لغت میں یہ الٹی گنگا بہتی
...کوئی شک نہیں کہ اشعر نجمی نے مذہب کو مقدم
...زد دیا ہے۔ لیکن انہوں نے محض آپ کو خوش
...آپ کو خوش فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی
...عباسی کے ترقی پسند جدیدیت اور جدیدیت
...سے کا انداز دامن کشِ دل ہے۔ ترقی پسندوں
...کے بابوؤں کو اب سنجیدگی سے سوچنا ہے کہ
...اب تک کیا کھویا اور کیا پایا۔ مناظر عاشق ہرگانوی
...بخشش کی تحریر کو ہضم نہ کرنے کی شکایت کی
...نے اپنے اختلافات کے جواز میں دلائل بھی
...ہیں۔ حقیقت ہے کہ جس زبان کا جو لفظ ہو اسے
...استعمال کرنا چاہیے۔ زبان کے ساتھ انصاف کا۔ یہی
...کسی زبان کے لفظ کو بگاڑ کر یا توڑ مروڑ کر یا اسے
...کے حوالے سے کہنا یا گلہ درست مان لیا جائے تو
...ی اپنی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ مناظر عاشق نے
...پر کچھ اعتراضات کئے ہیں یہاں یہ ضرور ہے کہ
...ہرگانوی کی تحریر میں ایک سادگی بھی ہے بلکہ خود نمائی اور تعلّی
...م بخشش نے اپنے خط میں اپنے محققانہ مطالعے سے
...۔ لیکن ہر جگہ انگریزی کے ٹکڑے اور حوالے
...نگی کر کے تھک جاتے ہیں۔ ستیہ پال آنند نے اپنے
...میں اور ہمیشہ سے اپنی ... کا حق ادا
...اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہمیشہ سے جد...

کے تعلق سے ذکر تھم ہوئے ہیں اور ان کی تحقیقات کی روشنی میں ان کی ادبی شخصیت کو نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے لیکن ہر چیز اپنی حدوں کے اندر ہی اچھی لگتی ہے۔ ستیہ پال آنند نے ضرورت سے زیادہ بڑی بات کہہ دی ہے۔ شمارہ نمبر ۵ میں شکیل اعجاز کا خط توجہ طلب ہے۔ صلاح الدین پرویز نے آپ کے نام جو خط لکھا ہے صرف اس کے متن ہی سے نہیں بلکہ صلاح الدین پرویز کے نام سے ہی شکیل اعجاز جیسے بہت سارے لوگ الرجک ہیں۔ صلاح الدین پرویز کی نظمیں کیسی ہیں؟ وہ کیا لکھتے ہیں؟ ادب میں ان کا شعری قد کیا ہے؟ شکیل اعجاز جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے کہ کچھ سمجھیں یا مدیر کو مشورہ دیں کہ "آپ اس قسم کی شاعری کو شاعر میں شائع کر کے کون سا کارنامہ انجام دینا چاہتے ہیں۔" شکیل اعجاز کیا یہ جتانا چاہتے ہیں کہ وہ مدیر شاعر سے زیادہ باشعور اور تخلیقات کے معیار کو پرکھنے والے ہیں۔

★ اخلاق آہن سوانی: بدھ بچہ بازار، آسنسول ...

'شاعر' کا شمارہ اپریل اور مئی میرے پیش نظر ہے۔ اس کے حصہ نظم پر اپنی حقیر رائے پیش کر رہا ہوں۔ شمارہ نمبر ۴ کے صفحہ ۴۲ پر بخشش اکبرآبادی کی غزل کا مطلع یوں ہے:

بکھر گئے ، جو کہ آندھی کے وار
وہی چند پتے شجر میں رہے

پہلے مصرعے میں لفظ 'کہ' زائد ہے صرف وزن کو پورا کرنے کیلئے رکھا گیا ہے دوسرے مصرعے میں "پتے شجر میں رہے" ترکیب غلط ہے۔ یہاں شجر پر رہے کا محل ہے کیوں کہ پتے پیڑ کے اندر نہیں اوپر ہوتے ہیں۔ صفحہ نمبر ۵۴ پر علی عباس امید کی غزل کا ایک شعر یوں ہے:

فروغ جشن بہاراں کے ہیں امیں وہ لوگ
کہ جن کی شاخ پہ موسم بھی مہربان نہیں

شعر کا مفہوم الجھا ہوا ہے۔ 'جن کی شاخ پہ' کا اشارہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جشن بہاراں کی طرف ہے یا لوگوں کی طرف، جس طرف بھی ہے، غلط ہے۔ صفحہ نمبر ۴۹ پر خالد بشیر کی غزل کا ایک شعر ہے:

میری آنکھوں پہ بھی گرد ہوں وہی
اور تمہارا عکس بھی [illegible] ہوا

اس شعر کا پہلا مصرعہ خارج از وزن ہے۔ اسی صفحہ پر افضل لوید لیہ کا شعر 'سر لگا ہوا ... لگا ہوا' لکھے ہیں 'جن کی ترتیب بالکل غلط ہے۔ ایک شعر میں متعدد کو متعدد لکھا ہے جو غلط ہے۔ متعدد ... کے ساتھ ہی صحیح ہے۔ مگر

اور سمندر کے تھکنے کے ساتھ ستر غلط ہے۔ شمارہ نمبر ۵ کے صفحہ نمبر ۲۲ پر نجیب اشرف کی غزل کا مطلع یوں ہے:

سنہری سیپوں کو پالنے کا الیمان لئے
جھکے رہو یونہی کاندھوں پہ آسمان لئے

اس شعر کے وزن میں 'اُلیان' آتا ہے جبکہ صحیح لفظ 'الیمان' ہے مگر یہاں 'ی' ساقط ہو گئی۔ اسی صفحہ پر جاوید ناصر اپنے اشعار میں "تصویر کرتا رہتا ہے" - زنجیر کرتا رہتا ہے جبکہ تصویر بنانا اور تقدیر بنایا جاتی ہے۔ بنانے کے معنوں میں کرنا غلط ہے۔ صفحہ نمبر ۲۷ پر احسن حیدر کی غزل بھی شائع ہوئی ہے۔ مطلع کا پہلا مصرعہ ہے:

ہزاروں ذات رہیں ایک ذات کے اندر

ہزاروں صیغۂ جمع ہے اور ذات صیغۂ واحد۔ اس لئے یہ ترکیب غلط ہو گئی۔ اسی غزل میں ایک مصرعہ ہے:

دل و نگاہ کے کن معاملات کے اندر

یہاں وزن میں 'معاملات' آتا ہے، جبکہ لفظ 'معاملات' ہے اس طرح 'ع' ختم کر دی گئی۔ اسی غزل کے مقطعے میں 'ذات' 'صفات' 'بات' اور 'بہت' کے قوافی کے ساتھ 'تلفظ' کا قافیہ لایا ہے۔ کہ میں نہیں آیا 'ت' کا قافیہ 'ط' کیسے استعمال کر لیا گیا۔ یہ تو صوتی اعتبار سے بھی غلط ہے۔ صفحہ ۲۹ پر قمر تسنیم ارم کی غزل کا ایک مصرع یوں ہے:

یوں لگتا ہے کہ جیسے سورج ہوں

لفظ 'یوں' کا 'و' اور 'ن' گر گیا اور صرف 'ی' باقی رہ گئی۔ تسنیم عابدی کی غزل کا ایک مصرعہ یوں ہے

شہر لے ویران کہیں تو اجاڑ

اس میں 'کہیں' کو وزن میں گرایا گیا ہے جبکہ لفظ وزن میں صحیح ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ شاعر کے ادبی معیار کو برقرار رکھنے دیجئے۔

★ تنویر علی۔ [illegible] OHIO

میں آپ کی ممنون ہوں کہ نہ صرف آپ نے میرے رسالے 'ندا' کی اشاعت پر مبارکباد دی بلکہ شاعر میں رسالے کا نام اور پتہ بھی شائع کیا۔ میرے پاس بہت سے خطوط آرہے ہیں شاعر کے حوالے سے۔ آپ میری [illegible] کر رہے ہیں ورنہ اس ملک میں اردو زبان کو [illegible] بے حد دشوار ہے۔ امریکہ کر یہاں کی صرف [illegible] اپنی زبان "اردو" سے کٹ کر رہ گئی ہے۔ 'ندا' کی اشاعت سے ایک ادبی ماحول بن گیا ہے۔ 'ندا' کا [illegible] شمارہ شائع ہونے والا ہے۔ ندا کے کچھ شمارے [illegible] شاعر کے حوالے سے منتخب ہو کر شائع کر دی۔

قلم کاروں سے گزارش ہے کہ وہ نہ صرف رسالہ 'ندا' اپنے نام جاری کروائیں، اپنی غیر مطبوعہ معیاری تخلیقات بھی تنویر علی صاحب کو بھجوائیں۔ ادارہ)

★ [illegible] الدین اطہر: مجنوں پال دار، تجمل آباد۔ (مہاراشٹر)

شمارہ نمبر۵ میں انیس رفیع کی کہانی 'دو آیہ' کی چند سطریں یہ ہیں:

"سنہ ادا کھل رہا ہے...... کھیے سے سن رہے ہیں سر" پورے افسانے میں یہ چند کھلی ہوئی سطریں معیاری ادب نہیں ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ شاعر کا معیار بلند رکھیے۔ اس شمارے کی غزلیں عمدہ ہیں۔

★ افضل حسین: ۱۳۹-اے پی سی روڈ، کلکتہ — ۸۹

'شاعر' پابندی کے ساتھ مل رہا ہے۔ گھر کے دیگر افراد بھی شوق سے پڑھتے ہیں۔ فاکروں میں بھی 'شاعر' کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ نئی نسل کا یہ رجحان خوش آئند ہے۔ یہ آپ کی لگن اور کاوشوں ہی کا ثمر ہے۔ گروہی تعصب اور مفاد پرستی کے ماحول میں اپنے محدود وسائل کے باوجود آپ ہر ماہ پابندی سے 'شاعر' شائع کر رہے ہیں، گویا جہاد کر رہے ہیں۔ اپریل اور مئی کے شمارے اپنے معیاری مندرجات کے اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہیں۔۔۔۔

★ نجیب رامش: ۸-۲۰۳-۲۰ روی شنکر نگر، بھوپال

مئی ۹۵ء کے شاعر میں میری غزل کم و بیش پوری کی پوری کاتب محترم کے قلم کی نذر ہو گئی۔ تیسرے شعر کے مصرعہ اول 'وہ سنگ در ہی ہے ایسا جہاں سے لوٹے ہو' اس میں 'ہے' کتابت سے رہ گیا ہے۔ چوتھے شعر میں میر کا مشہور لفظ 'حیرتی' بدل کر 'خیرتی' ہو گیا ہے۔ اور آخری شعر میں تیشے کی جگہ 'شیشے' ہو گیا ہے۔ کاتبوں کی تعریف کو سے بہتر طور پر مولانا محمد علی جوہر فرما چکے ہیں۔

★ عرفان احمد ۔ آزاد نگر، کٹنی (بردوان)

شمارہ نمبر۵ میں انیس رفیع کی کہانی 'دو آیہ' پڑھ طبیعت بہت بے چین ہو گئی۔ ان کے افسانے میں بہت تشنگی اور پیچیدگی ہوتی ہے۔ اور بعض بعض جملے ادبی فصاحت سے عاری ہوتے ہیں۔ کیا کوئی لڑکی جو کبھی کسی مرد کی اسٹوڈنٹ رہ چکی ہو، اس کی بدنگاہوں اور ذہنی الجھنوں کے ڈالے کیلئے اپنے کانوں کے بند کھول کر اس کا ماہرہ اپنی ہتھیلیوں کے بیچ دبا سکتی ہے؟ اور کیا اپنے مربی و محسن کی تمام اخلاقی صداقتیں اس کی نگاہوں کے سامنے لٹ گئے، کسی بے حیائی کا مظاہرہ کر سکتی ہے؟ — فیروز عابد کا افسانہ 'نقابدار' بھی ادبی فصاحت سے عاری بہت ہلکا پھلکا معلوم ہوا۔ دونوں افسانے ذہن پر بوجھ بن گئے۔ تاہم خورشید کی کہانی 'تجارت' کا آغاز ہی بہت بھونڈے ماحول سے ہوا ہے۔ آپ کو افسانے کی تکنیک اور فن کی گہرائیوں سے واقفیت نہیں معلوم ہوتی۔ افسانے کا اختتام ایک سمجھتے ہوئے سماجی پہلو پر ہوا ہے، جو غنیمت ہے۔ دراصل اسرار گاندھی کا افسانہ "وہ جو راستے میں کھو گئی" ہی افسانوی حصے کی جان ہے۔ عبداللہ کمال کی غزل خاص طور پر پسند آئی۔

★ تار انجرن رستوگی۔ بروبادی، گوہاٹی ۷۸۱۰۰۸

اپریل اور مئی کے شمارے ایک ساتھ موصول ہوئے۔ شاعر کا ہر شمارہ چونکہ ادبیاتی کہکشاؤں سے منور ہوتا ہے لہٰذا تردد تاخیر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ بہرکیف مسرت ہوئی کہ اب ہر شمارہ وقت پر شائع ہو رہا ہے۔ اپریل کے شمارے میں 'خط۔ باتیں ہزار' معلوماتی نمبر ہے اور اس میں سلیم شہزاد کی تحریر بر اعتبار سے درخورِ اعتنا ہے۔ مگر ستیہ پال آنند صاحب کے فرمودات اپنی اشتہاریت ہی کے غماز ہیں۔ نخلِ شاعر کے تحت عرفان صدیقی اور فصیح اکمل کی غزلیں دلکش نہیں ہیں۔ اور نظر ثانی چاہتی ہیں۔ افسانے بھی اچھے ہیں لیکن غزلیں تغزل کی توانائیوں سے محروم ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میری سمجھ ہی متاثر ہو گئی ہو، شمارہ مئی میں صغیر احمد صدیقی کی غزل معیاری ہے۔ ان کے مجموعہ کلام کا نام ہے 'اطراف' جو ذو معنی ہے۔ الف پہ فتح 'چاروں اور' اور الف پہ کسر کے معنی ہیں، معاینہ کرنا، احتساب کرنا وغیرہ — اور صدیقی صاحب کی شاعری میں یہ دونوں صفات موجود ہیں۔ عبداللہ کمال کی غزل پسند نہیں آئی۔ دھواں، کھنا ابھی تک روز مرہ میں شامل نہیں ہے۔ لہٰذا ان کا مطلع بے معنی سا نظر آنے لگا۔ موضوع انسانی حقوق کے سانحے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کی تحریر ہے جو فلسفیانہ، بشریاتی، و امرانیاتی و ادبیاتی کوائف سے بھرپور ہے۔ نارنگ صاحب قابلیت کے لحاظ سے ایک قاموس کا نام ہے۔ قمر قدیر ارم، تسنیم عابدی اور صدف جعفری کی غزلیں اچھی ہیں۔ اس شمارے کے افسانے بھی اچھے ہیں۔

★ صلاح الدین پرویز۔
POST BOX 4551
RIYADH-11412 (SAUDI ARABIA)

شاعر میں شکیل جمالی کا خط پڑھ کے بہت دکھ ہوا، اس لئے نہیں کہ وہ خط میرے خلاف لکھا ہے بلکہ وہ خط ایک کچے ذہن کی پیداوار ہے۔ تمہارا سادہ ادبی ہے اور ایسے رسالے میں اگر ادب سے ادب کی بات کی جائے تو اچھی لگتی ہے۔ کوئی ادب کا مسئلہ ہو، کوئی نیا خیال ہو، کسی افسانے کا تخلیقی جائزہ ہو یا کسی نظم کے باطن کو سمجھنے کی کوشش کی جائے یا اس پر بحث کی جائے تو اچھا لگتا ہے۔ یہ گالیاں بکنے کا رواج جو ہمارے ادب میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ یہ رواج ختم کر دینا چاہئے۔ شکیل کا خط شائع کرنے سے پہلے تم ان سے کہتے، 'میاں! تھوڑا پڑھو، جان کھپاؤ، جوگی بنو، برباد ہو اور پھر اس بربادی سے تخلیق آباد کرو، پھر میری ان کیلئے دعا ہے کہ وہ پہلے بزرگوں کی طرح لکھیں، پھر بزرگوں کا ادب پڑھیں، پھر کچھ لکھیں———'

چاہا خط ہے، تم میری جان کے قریب ہو اور تمہارا رسالہ تمہارے لئے لکھ رہا ہوں—

★ دل تاج محلی۔ ۲۶ چاندنیا اسٹریٹ، ناگپاڑہ، بمبئی—

'شاعر' کے شمارے برابر موصول ہو رہے ہیں۔ سیماب اکبر آبادی کے اقوال زریں، فکر امروز، مقدس مشن ہیں۔ کاش کہ اہل قلم حضرات اس سے فیض حاصل کریں۔ شاعر کا معیار آپ کے مزاج اور خاندانی روایات کا آئینہ دار ہے۔ رسالہ ۶۶ سال سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ یہ غیر معمولی بات ہے۔ انشاء اللہ آپ کے رسالے اور آپ کے خانوادے کی علمی و ادبی اور وطنی خدمات کا اعتراف کیا جائے گا۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی میراث ہے۔

★ مرزا حامد بیگ۔ F.D. COLLEGE
[illegible]K (PAKISTAN)

'شاعر' کے دونوں نئے شمارے موصول ہو گئے ہیں۔ شمارے خوب ہیں، سرورق بطور خاص، ہم عصر اردو ادب کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں سفید ہو گئیں۔ یقیناً یہ ایک اہم ہو گی۔ خاص نمبر کے لئے افسانے کے متعلق میری کتاب "افسانے کی روایت" سے حوالے کے ساتھ جو چاہیں شائع کیجئے۔ پچھلے دنوں محمود ایاز صاحب نے سوغات کیلئے کا گوشہ مرتب کرتے وقت بغیر حوالے کے میرا ۔۔۔ میں اس مسئلے پر الگ سے کچھ لکھوں گا۔

★ طارق صدیقی۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۷۷، دوبئی۔

'شاعر' پابندی کے ساتھ مل رہا ہے، اپریل کے شمارے خوب ہیں۔ آپ کے رسالے کا معیار ہے۔ شاعر، ادیب، محقق، تنقید نگار، اس سے زیادہ ہوتے ہیں۔ مجھ جیسا کم علم قاری بھی اس سے استفادہ کر لیتا ہے۔ لیکن عام قاری کیلئے اس میں کچھ نہیں۔ یہی وجہ اس کی توسیع اشاعت میں رکاوٹ ہے۔ یہ بات آپ بخوبی جانتے ہیں۔ بہرحال اس میں آپ کے رسالے کے توسط سے عالموں اور فاضلوں کی محفل کا تماشہ کی تماشائی۔ شاعر کے ہر شمارے کا ادبی محفل سے تھوڑا بہت استفادہ۔

★ نظیر صدیقی۔ [illegible]

شاعر کے دو شمارے موصول ہوئے۔ آ۔۔۔ ہندوستان شاعر نمبر کی شائع کی تجدید۔ کاش آپ نے مجھے

[باقی صفحہ پر دیکھئے]

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
جاری شدہ ۱۹۳۰

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم
اشاعت کا ۶۶واں سال
علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد ـــ ۶۶
شمارہ ـــ ۸
فون: ۳۸۲۹۹۰۴

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۵ روپے

زرِ سالانہ ۷۵ روپے ◆ لائبریریوں سے ۹۰ روپے

تاعمر خریداری ۳۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۵۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر ـ ۱۵ پونڈ

فکرِ امروز

تاثیر صرف اس شعر میں پیدا ہو سکتی ہے جو شاعر کے دلی جذبات کا آئینہ اور اس کی کیفیاتِ حقیقی کا ترجمان ہو۔ جب تک کہنے والا اپنے کلام کا اثر خود اپنے دل و دماغ پر محسوس نہ کرے اس وقت تک وہ دوسروں کی سماعت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ یہیں محسوس شاعری کی ضرورت ہے۔ مفروضہ خیالات کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ طرز پراثر، پیرایہ متین، اسلوب نیا، طریقہ اچھوتا، زبان نہ ملّایانہ، نہ بازاری، روزمرّہ درست محاورات برمحل تراکیب چست، الفاظ بے ساختہ اور جملے شستہ ہوں کہ نہ حرف دبے، نہ زبان الجھے نیز تقلیدی مضامین، اور موضوعات سے احتراز ہونا چاہیئے۔

مختصر یہ کہ ہمارے ہونٹوں سے وہی صدا نکلے جو ہمارے دل سے اٹھی ہو اور ہم ایک ایسا گنبد بن کر نہ رہ جائیں جس میں صرف دوسروں کی آواز گونج سکتی ہے۔ اگر ہماری آواز دل سے نکلی ہوئی نہیں ہے تو کم از کم دل سے نکلی ہوئی معلوم تو ہونی چاہیئے۔

[دسمبر ۱۹۳۵ء]

سیماب اکبرآبادی

شاعر

ہم عصر اردو ادب نمبر

[دو جلدوں میں]

اردو شعر و ادب کے ایک خوب سیرت عالمی گاؤں
۲۱ ویں صدی کے نام

*

تعمیر و تشکیل کے نا تمام منظر نامے

باب مقالات

● ۶۰ سے زائد ناقدینِ ادب نے ہم عصر شاعری، افسانہ، ڈرامہ، ناول، تنقید، طنز و مزاح، سوانح، تحقیق، فنونِ لطیفہ اور اردو زبان و ادب کے مختلف مسائل پر فکر انگیز مضامین لکھے ہیں۔

ابنِ فرید — ابوالکلام قاسمی — احمد سہیل
اخلاق اثر — اسلم حنیف — اطہر فاروقی
ایشور کمار — ایوب جوہر — بشر نواز
تاراچرن رستوگی — جمیل جالبی — حامدی کاشمیری
حنیف نقوی — خورشید احمد — خورشید سمیع
دیویندر اسّر — رضا نقوی واہی — سحر انصاری
سعید انجم — سلیم اختر — سلیمان اطہر جاوید
سلیم شہزاد — سیّد حامد حسین — سیّد مبارک علی
شمس الرحمٰن فاروقی — شمس بدایونی — شمیم صبائی متھراوی
شوکت حیات — شین کاف نظام — شہاب سرمدی
ظفر کمالی — ظہیر احمد صدیقی — ظہیر غازی پوری
عبدالقوی ضیاء — عبداللطیف اعظمی — عتیق اللہ
عصمت جاوید — علی جواد زیدی — علی حماد عباسی
علی سردار جعفری — عنوان چشتی — قاضی قیصر الاسلام
قمر جمیل — کالی داس گپتا رضا — کاوش بدری
کرامت علی کرامت — کمال احمد صدیقی — گوپی چند نارنگ
گیان چند جین — لطف الرحمٰن — محمد حسن
محمد منصور عالم — محمود ہاشمی — نامی انصاری
نثار احمد فاروقی — نظام صدیقی — وارث علوی
وزیر آغا — وہاب اشرفی — یوسف سرمست

باب افسانہ

● ۱۶۰ سے زائد مشاہیر اور تازہ کار افسانہ نگاروں کے غیر مطبوعہ افسانے۔
● عظیم افسانہ نگاروں سے منسوب ذیلی ابواب
● ہر باب کی ابتدا ایک زندہ شاہکار کہانی سے
● معاصر اردو کہانی پر لکھی گئی اہم تنقیدی کتابوں کے حوالے، تجزیے اور اقتباسات۔
● خاص نمبر میں شامل ہر افسانہ نگار کے فن پر نقادوں کی رائے۔
● اردو افسانہ: داستان سے کہانی تک

افسانہ نگار

آصف فرخی — آصف نقوی — آصفہ نشاط
آغا بابر — آغا سہیل — آمنہ ابوالحسن
ابرار ترمذی — ابراہیم اختر — ابنِ کنول
ابنِ اسماعیل — احمد ہمیش — احمد یوسف
احمد صغیر — اختر یوسف — اسرار گاندھی
اشفاق احمد — اسلم خان — افتخار نسیم
اقبال متین — اکرام باگ — امجد جاوید
امراؤ طارق — انجم عثمانی — انل ٹھکر
انور خان — انور زاہدی — انور قمر
انیس رفیع — اوپندر ناتھ اشک — اوم کرشن راحت
ایچ عسیم — ایم۔ منوجہ — ایوب جوہر
بشیر بردیپ — بانو قدسیہ — بلراج ورما
بنتِ مسعود — بیگ احساس — تسکین زیدی
جمشید مسرور — جوگندر پال — جیلانی بانو
حبیب کیفی — حسن جمالی — حیدر قریشی
حسین الحق — حمید سہروردی — خالد…
خالد سہیل — خورشید اکرم — خورش…
دیویندر ستیارتھی — ذکیہ مشہدی — رام ل…
رتن سنگھ — رشید امجد — رضا…
رضاء الجبار — رضوان احمد — رفیع…
رفیع منظور الامین — ریاض قاصدار — زاہدہ…
زیتون بانو — زیب اختر — ساجد…
ساگر سرحدی — سریندر پرکاش — سعید…
سلام بن رزاق — سلطان جمیل نسیم — سلطان…
سلیم اختر — سیّدہ حنا — شام بار…
شاہد اختر — شاہین نظر — شرون کما…
شفق — شفیع مشہدی — شکیب…
شکیلہ رفیق — شمس نعمانی — شموئل…
شمیم حیدر — شوکت حیات — شہناز…
شیخ سلیم احمد — ش۔ اختر — ش…
ش۔ مظفر پوری — صدیق عالم — صغرا م…
صغیر رحمانی — صفیہ صدیقی — طارق چ…
طاہر نقوی — ظفر اوگانوی — عابد ج…
عارف الوہاب — عارف خورشید — عبا…
عبدالصمد — عبدالعزیز خان — عذرا…
عذرا پروین — عذرا نقوی — عشرت…
عطا عابدی — علی امام نقوی — علی…
علی حیدر ملک — عوض سعید — غض…
غلام محمد — فاروق راہب — فرحت…
فیروز عابد — فیصل ایم فاروقی — قاسم خو…
قاضی عبدالستار — قمر جہاں — قمر قد…
قاضی حسن کوثر — قیصر تمکین — قیوم…
کرتار سنگھ دگل — کشمیری لال ذاکر — کلام ح…

کنور سین گربچن سنگھ گلزار
گلزار جاوید محافظ حیدر محسن عثمانی
محمد انور خان محمد مظفر الدین فاروقی مختار سعید
مرزا حامد بیگ مشتاق مومن مشرف عالم ذوقی
مصطفیٰ کریم مظہر الزماں خان مقدر حمید
م۔ق۔ خان منظور الحق شیخ منظر کاظمی
منیر الدین احمد مہدی ٹونکی ناصر بغدادی
نثار راہی نریندر سنگھ بھاٹیہ نسیم محمد جان
نعیم کوثر نعیمہ ضیاالدین نور الحسنین
نور پیرکار منیر مسعود وریندر پٹواری
ولی محمد چودھری ہرچرن چاولہ یوسف عارفی

طویل کہانیاں ، ناولٹ ، ناول

کئی طویل کہانیاں ، ناولٹ ۔ نئے قلم کاروں کے زیر قلم ناولوں کے ابواب معاصر اردو ناول پر تنقیدی شذرات ۔

آمد یوسف الیاس احمد گدی جیتندر بلو
خالد اگاسکر خالد سہیل سید محمد اشرف
عبد الصمد عذرا پروین مشرف عالم ذوقی
ولی محمد چودھری

باب ڈراما

نامور ڈرامہ نگاروں کے ساتھ نئے ڈرامہ نگاروں کے جدید ڈرامے ، معاصر اردو ڈراما ، اردو تھیٹر ہندوستان میں جدید تھیٹر ۔

آنند لہر اقبال نیازی انل ٹھکر
جاوید دانش زاہدہ زیدی شمیم حنفی
ظہیر انور فردوس حیدر کمال احمد
مبین صدیقی محمد حسن

باب طنز و مزاح ، انشائیہ

طنز و مزاح اور انشائیہ کے نامور قلم کاروں کی تازہ تحریریں ۔ تازہ کار قلم کاروں کے تخلیقی شگوفے ۔ معاصر طنز و مزاح انشائیہ کی صورتِ حال ۔

طاہر اشر پرویز یداللہ مہدی حسنین عظیم آبادی
لیپ سنگھ شفیقہ فرحت شکیل اعجاز
نعیم احمد فضل حنیف فیض احمد فیض
مجتبیٰ حسین محمد اسد اللہ یوسف ناظم

●

نقد و نظر

شاعر کو موصولہ ۱۹۹۰ء کے بعد کی مطبوعات پر تبصرے ۔ کئی اہم کتابوں کے طویل تجزیے کتابوں کی باتیں ۔

انور خان بشیر نواز مہاراج کھیمانی
جاوید اقبال حامد اقبال صدیقی حامد اللہ ندوی
حمید الماس ساجد رشید شین کاف نظام
صفدر امام قادری عبد الاحد ساز عتیق اللہ
محافظ حیدر ندا فاضلی یعقوب راہی

باب شاعری

- معاصر عالمی اردو شاعری کا ضخیم ترین غیر مطبوعہ انتخاب
- ۱۵۰۰ سے زائد شعرا کی شمولیت
- مشاہیر شعرا کا کلام [بخط شاعر]
- کلاسیکی روایت کے امین بزرگ شعرا
- نئی نسل کے شعرا
- نو واردانِ شاعری
- مابعد جدید شاعری پر شذرات

آدم نصرت آذر بارہ بنکوی آدش سوز آزاد گرداسپوری
آزاد گلاٹی آس زیدی آشا پربھات آشفتہ چنگیزی
آفاق صدیقی آفاق عالم صدیقی آفاق فاخری آفتاب شکرپوری
آفتاب اقبال شمیم آفتاب عالم آل احمد سرور آمر صدیقی
ابرار احمد ابراہیم اشک ابو محمد سحر ابوالخیر کشفی
اثر قصوری ابہام رشید احتشام اختر احترام الاسلام
احسان شاہ احسن شفیق احسن عزیز احمد سعید
احمد سوزی احمد ظفر احمد ظہیر صدیقی احمد عارف
احمد کمال احمد کمال پروازی احمد فراز احمد محفوظ
احمد منظور احمد نثار احمد ندیم قاسمی احمد رضی
احمد وصی احمد ہمیش اختر آزوی اختر الایمان
اختر بستوی اختر جمال اختر سعید خان اختر شاہجہانپوری
اختر ضیائی اختر لکھنوی اختر نقوی اختر ہوشیارپوری
اخلاق بسوانی ادا جعفری ادیب سہیل اد یب نشاط
ارشاد بارزی ارشد جمال ارشد صدیقی ارشد کمال شاد
ارشد عبد الحمید ارشد کمال اشہد ساجی پوری ارمان نجمی
اسد رضا اسد رضوی اسرار احمد دانش اسرار اکبر آبادی
اسعد بدایونی اسلم بدر اسلم ثاقب اسلم حنیف
اسی بدر زبیری اشرف انصاری اشرف سلیم اشرف عادل
اشہر علیگ اشفاق انجم اشفاق حسین اشفاق عادل
اشفاق قلق اشہد ہاشمی اطہر راز اظہر عباد

اظہر فارقی اظہار سلیم اظہار مسرت اظہر سعید خان
اظہر عنایتی اعجاز نیر اعتماد صدیقی اعجاز احمد اعجاز
اعجاز تابش اعجاز معتبر اعزاز افضل افتخار اجمل شاہین
افتخار امام صدیقی افتخار انجم افتخار عارف افتخار قیصر
افتخار نسیم افضال ملک افضال نوید اقبال انجم
اقبال خلش اقبال کرشن اقبال مسعود اقبال ملک
اکبر حمیدی اکبر حیدرآبادی اکبر علی خان عرشی زادہ اکرام تبسم
اکرام خاور اکرم کمال اکرم نقاش اکمل امام
امام اعظم امان اختر امان اللہ ساغر امتیاز نسیم
امجد اسلام امجد امیر قزلباش امیر حمزہ ثاقب امین اعجاز
انجم سیماب انجم رعنا انجم عرفانی انجم مظہری
اندر کمار دت ندیم اندر موہن کیف انعام الحق جاوید انعام قدیر
انوار انجم انوار فیروز انور ادیب انور انصاری
انور امیر انور تاباں انور حسین انور انور شیخ
انور مینائی انور ندیم انیس احمد خان انیس اشفاق
انیس انصاری انیس سلطانہ انیس تنویر اوم پرکاش ندیم
اویس احمد دوراں اے۔بی۔بہار ایم۔آئی۔ساجد ایم۔ایس۔
ایم۔ اے۔ مشتاق ایم۔ قمر الدین ایم۔ کے۔ اثر ایم۔ ایم۔ رضا
ایوب صابر باقر مہدی باقر نقوی باسط نقوی
بخش لائلپوری بدر عالم خلش بدر نظیری بسمل عارفی
بسمل نقشبندی بشر نواز بشیر بدر بشیر سیفی
بشیر فاروقی بسراج کمار بسراج کول بسراج شفا
بقیر نظیر الحسن بکرماجیت اعجاز بیکل اتساہی پرتپال سنگھ بیتاب
پردیپ ساحل پرکاش تیواری پرکاش ناتھ پرویز پرکاش فکری
پرویز اختر پرویز رحمانی پروین راجہ پروین صدیقی
پروین کمار اشک پروین شاکر پریم کمار نظر پیغام آفاقی
پیسا سنگھ بنر پی۔ ایل۔ رتن پیرزادہ قاسم تابش دہلوی
تابش مہدی تاج پیامی تاج سعید تحریر بسمل
تحسین منور تسلیم نیازی تسنیم عابدی تشنہ
تنویر سامانی تنویر تابش تنہا تماپوری توصیف تبسم
توقیر جمال ثروت حسین ثمر انکاری ثمینہ
ثمینہ راجہ ثناگورکھپوری جابر حسین جاوید اختر
جاوید اختر آزاد جاوید اشرف جاوید اکرم جاوید ناصر
جاوید ندیم جذب عالم جنون شکوہ آبادی جعفر شیرازی
جعفر عسکری جگن ناتھ آزاد جلیس نجیب آبادی جلیل شاد
جمال اویسی جمال قریشی جمشید مسرور جمیل احمد
جمیل الدین عالی جمیل الرحمٰن جمیل فاطمی جمیل قریشی
جنید حزیں لاری جوہر راہی جمن اریب جوہر صدیقی
جینت پرمار چندر بھان خیال حیدر قریشی حامد اکمل
حامد کمال حامد مجاز حباب ہاشمی حبیب حسن
حسن رضا حسن شکیل مظہری حسن عابد حسن نعیم
حسن عزیز حسن فرخ حبیب منور حسن

آتش حفیظ انجم حفیظ بنارسی حسن نواز سیفی سرونجی سیما فریدی شاداب رضی شاد عباسی عمران راقم عمران عظیم عنبر بہرائچی عنبر شمیم
ناظم اشرف حکیم منظور حکیم یوسف حسین حمایت علی شاعر شاذ رحمانی شارق اقبال شارق عدیل شارق کیفی عین تابش عین رشید غالب عرفان غضنفر
عثمانی حمید الماس حمیرہ رحمان حنا انجم شاغل ادیب شان الحق حقی شان بھارتی شاہ حسین نہری غضنفر غزنی غلام حسین ساجد غلام ربانی تاباں غلام مرتضیٰ راہی
نگر حنیف ترین حنیف کیفی حنیف نجمی شاہد اختر شاہد عکونوی شاہد جمیل شاہد رضا غنی عجاز غوث محمد غوثی غیاث متین فاخر جلال پوری
لکھنوی حیدر قریشی خ۔ زماں انصاری خالد اختر شاہد عزیز شاہد کبیر شاہد کلیم شاہد لطیف فاروق انجینئر فاروق شفق فاروق شکیل فاطمہ حسن
اقبال یاسر خالد بشیر خالد جاوید خالد جمال شاہد ماہلی شاہد نجیب آبادی شاہد میر شاہدہ حسن فخر رضوی فراق جلالپوری فراغ روحی فرحت احساس
یسین تحال خالد رحیم خالد سعید خالد عبادی شاہدہ نسیم شاہین اقبال شاہین بدر شاہین مفتی فرحت زاہد فرحت قادری فرخ جعفری فردوس گیاوی
عبداللہ خالد کفایت خالق بھٹی خان جمیل شائق مظفرپوری شائستہ یوسف شبیر آصف شبنم رومانی فریاد آزر فرید پربتی ف۔ س۔ اعجاز فصیح اکمل
ادیونس خسرو متین خضر برودوی خلیل الرحمٰن راز شبنم شکیل شبنم عثمانی شبنم مناوری شجاع خاور فصیح اللہ نقیب فضا ابن فیضی فضل افضل فضل تابش
ل تنویر خلیل مامون خمار قریشی خواب اکبر آبادی شجاع شاہ فرخی شرر غازیپوری شرف کمالی شریف احمل فضل المتین فضیل جعفری فکری بدایونی فوق کریمی
شید اظہر خورشید افسر بسوانی خورشید اکبر خورشید رضوی شعیب نظام شفق سوپوری شفیق سلیمی شفیق خالد فہیم جوگاپوری فہیم نادر فیاض الدین صائب فیاض رفعت
ید سحر خورشید طلب خورشید وحید خوشتر مکرانوی شکیب ایاز شکیل اعظمی شکیل جمالی شکیل قمر فیروز اختر فیروز مرزا قاصر مجیبی قاضی انصار
بود بخاری دلدار ہاشمی دلکش غازیپوری دلنواز صدیقی شکیل مظہری شگفتہ طلعت سیما شمس بدایونی شمس تبریزی قاضی حسن رضا قاضی رئیس قاضی سلیم قاضی سمیع اللہ
دیپ بادل دیپک شمیم دیپک قمر ذاکر وارثی شمس رمزی شمس فرخ آبادی شمیم انور شمیم صبائی متھراوی قائم علی غوری قتیل شفائی قمر ادیب قمر جمیل
الدین شایاں ذکا صدیقی ذکی بلگرامی ذکی طارق شمیم طارق شمیم فاروقی شمیم قاسمی شمیم یوسفی قمر سنبھلی قمر قدیر ارم قمر نقوی قمر علی قمر
شان ساگر راج نرائن راز راج کھیتی راجندر ناتھ رہبر شناور کرتپوری شوکت عظیم شوکت ماہری شہاب اختر شہاب قیصر علی حسان قیصر الجعفری قیصر شمیم قیوم خضر
بیش سیفی راحت اندوری راحت حسن راز اناوی شہاب اشرف شبیر رسول شہریار شہزاد احمد کاشف قمر کالی داس گپتا رضا کامران نجمی کاوش بدری
ر اعظمی راشد آذر راشد حسن راشد راشد احمد راشد شہناز نبی شہید انجکونوی شین کاف نظام شین میم حنیف کاوش پرتاپگڑھی کاوش عباسی کبیر اجمل کرامت بخاری
شد انور راشد راشد جمال فاروقی راغب شکیب راغب مرادآبادی صابر آفاقی صابر ابوہری صابر زاہد صابر ظفر کرشن ادیب کرشن کمار طور کرشن مراری کرشن موہن
کاش راہی راہی فدائی راہی قریشی رحمان جامی صابر فخرالدین صابر کاسگنجوی صادق صبا اکرام کریم خال ساز کریم مودھوی کفیل آزر کفیل اکمل
تا مرہوی رزاق افسر شاہ آبادی رشید اعجاز رشید افروز صدف جعفری صدیق مجیبی صغرا عالم صفدر رضا کلیم صادق کلیم ضیاء کمار پانی پتی کمال جعفری
شید امکان رشید منظر رشید عیاں رضا اشک صمد انصاری صہبا وحید صلاح الدین نیر ضمیر درویش کوثر مظہری کیف بلگرامی کیفی سنبھلی کیلاش ماہر
نا صفی رضا حیدری رفعت سروش رفیع اعظم عابدی ضمیر کاظمی ضیار لانجم ضیا جالندھری طارق غازی گلزار بخاری گلشن کھنہ گوہر شیخ پوری لطیف
قی الظم رفیق جعفر رفیق راز رفیق سندیلوی طارق متین طارق نعیم طفیل چترویدی طلعت عرفانی لطیف شاہد م۔ خاور ماجد الباقری ماہ طلعت زاہدی
منا رمز آفاقی رونق شہری رونق نعیم طیب آزاد ظفر اقبال ظفر اقبال ظفر ظفر امام مبارک انصاری مبارک شمیم متین نیازی مجاز لوری
رؤف جاوید رؤف خلش رؤف خیر رؤف رحیم ظفر صہبائی ظفر غوری ظفر گورکھپوری ظفر مرادآبادی مجید اختر محبوب راہی محبوب عالم غازی محسن احسان
رؤف رضا رئیس الدین رئیس ریاض الدین عطش ریاض لطیف ظفر ہاشمی ظہیر آتش ظہیر بابا ظہیر غازی پوری محسن بھوپالی محسن بھنگانوی محسن رضا ظہوری محسن زیدی
ریحانہ محمد علی زاہد سلامی زاہدہ امر زاہد کمال ظہیر ناشاد عابد اشرفانی عابد جعفری عابد مناوری محمد اجمل نیازی محمد احمد رمز محمد اختر رضوی محمد اظہار الحق
زاہدہ زیدی زبیر رضوی زبیر شفائی زینت اللہ جاوید عارج میر عارف سیمابی عارف شفیق عاشور کاظمی محمد ایوب واز محمد رفیع محمد صبیح الدین محمد صلاح الدین پرویز
زین رامش ساجد حمید ساجدہ زیدی ساحر افغانی عاصم شہنواز شبلی عاصی کاشمیری عالم خورشید عامر ریاض محمد علوی محمد علی اثر محمد فیروز محمد قاسم دہلوی
ساحر شیوی ساحل احمد سارنہ سافر جیدی عباس دانا عبدالاحد ساز عبداللہ کمال عبدالحمید محمد کلام آزاد محمد مختار علی محمد مشتاق شارق محمد ممتاز راشد
ساغر شفائی ساقی فاروقی ساقی جاوید شہری ستنام سنگھ خمار عبدالرب فاخر عبدالسلام کوثر عبدالصمد تپش عبدالرحیم نشتر محمود ایاز محی الدین عادل مختار احمد انصاری مختار احمد ہاشمی
ستیہ پال آنند سجاد مرزا سجاد سید سحر سعیدی عبدالقادر راز عبدالمتین جامی عبرت مچھلی شہری عتیق احمد عتیق مختار شمیم مخدوم اشرف محمود سعیدی مدحت الاختر
سخاوت شمیم سراج اجملی سردار ابہام سردار شفیق عتیق اللہ عتیق انظر عذرا پروین عذرا نقوی مدہوش بلگرامی مرتضیٰ علی شاد مرغوب علی مسرور جالندھری
سرشار بلند شہری سرفراز شاکر سردار صہبائی سرور ساجد عرش صدیقی عرش صہبائی عرفان پھنوی عرفان صدیقی مسرور عابدی مسلم شہزاد مشتاق جاوید مشتاق سنگھ
سرور عالم راز سعید الرحمن سعیدی سید الظفر چغتائی سعید روشن عرفانہ عزیز عزیز اندوری عزیز پریہار عزیز تمنائی مشتاق شاد مشتاق انجم مشتاق مہدی مصباح انجم
سعید عارفی سعید قیس سلطان احمد جمال سلطان اختر عزیز قیسی عشرت دہلوی عشرت ظفر عشرت قادری معصوم اقبال ٹونکی مصطفیٰ مومن منصور سبزواری مضطر مجاز
سلمیٰ صنم سلیم انصاری سلیم سرفراز سلیم شہزاد عصمت مظفری عطاء الحق قاسمی عطاء الرحمٰن طارق عظمیٰ عارف مظفر ایرج مظفر حنفی مظفر فریدی مظفر وارثی
سلیمان خمار سوہن راہی سہیل احمد زیدی سہیل اختر عفت زریں عقیل شاداب عقیل گیاوی علقمہ شبلی مظہر امام مظہر سعید مظہر علی شاد مظہر محی الدین
سہیل شفیق سہیل فاروقی سہیل کاکوروی سید احمد سحر علی احمد جلیلی علی جواد زیدی علی سردار جعفری علی ظہیر معصوم انصاری معصوم نظر معظم عزم معین احسن جذبی
سید احمد شمیم سید شکیل دسنوی سید محمد رافق زبیا سیفی پریمی علی مختار مبارکپوری علیم اللہ حالی علیم صبا نویدی عمران انصاری مغنی تبسم مغیث الدین فریدی مقیم اثر بیاوی ملک زادہ جاوید

...نسیم ممتاز شکیب منشاء الرحمٰن خان منشا منصور اعجاز
...ود احمد منظر اعجاز منظر سلطان منظر مزمل
...ور رانا منظور چند چراغ منظور ہاشمی منیر سیفی
...اب حیدر نقوی مہدی پرتابگڑھی میکش اجمیری نازش قادری
...اداد آبادی ناشر نقوی ناصر زیدی ناصر شہزاد
...م جعفری ناظم سلطانپوری ناقد نقشی ناوک حمزہ پوری
...احمد نثار نثار ترابی نجم عثمانی نجیب رامش
...ن ضلی ندا النواز نذیر آزاد نذیر قیصر
...تچپوری نریش نزہت صدیقی نسیم سحر
...م سید نشتر اکبرآبادی نشتر خانقاہی نصرت گوالیاری
...غزالی نصر قریشی نصر ملک نصیر احمد ناصر
...ر پرواز نظام اختر نظام الدین نظام نظام ہاتف
...رضوی نظیر صدیقی نعمان شوق نعیم صبا
...صدیقی نعیم ضیاء الدین نکہت بریلوی نور الحسن ہاشمی
...ی نور نور جمالی نور جہاں ثروت نور جہاں نوری
...دیاس نوشاد احمد کریمی نوشی گیلانی نوید ہاشمی
...یراج پوری نیر جہاں نیر گنگوہی واجد قریشی
...جمال والی آسی وامق جونپوری وحید اختر
...اغا وسیم بریلوی وسیم قریشی وسیم مینائی
...صدیقی وقار خلیل وقار ناصری وقار واثقی
...شاہین وویک وشال ہارون شیدا ہارون فراز
...ظفر زیدی ہما صدیقی ہیرانند سوز یاسمین حمید
...گل یٰسین افضال یٰسین بیگ یعقوب تصور
...ہاشمی یعقوب یاور یوسف اعظمی یوسف بیگ جمال
...نقی یوسف جمال یوسف عثمانی یوگیندر بال ثائر

ادبی مذاکرے

...پسندی سے جدیدیت نئی دانشوری

...ذوقی ابن فرید احمد سہیل
...صری اظہار اثر اصغر علی انجینئر
...یدی امیر عارفی ایم جمال عمری
...صدیقی حمید الماس ادریس احمد دوراں
...کشمیری تاراچرن رستوگی بلراج کومل
...سمیع سید انیس شاہ جیلانی حیدر قریشی
...اختر رفعت سروش سید حسن
...چغتائی سید احمد شمیم سید خورشید عالم
...حنیف سید محمد عقیل شان الحق حقی
...چاری طلعت رضوی برقی شکیب ایاز
...فرحی عبدالقوی دسنوی عبدالقوی ضیا
...مغنی عنوان چشتی غلام ربانی تاباں

قمر رئیس مجروح سلطانپوری محمد حسن
محمد فیروز شاہ مخمور سعیدی مصطفیٰ کریم
مظفر حنفی معین احسن جذبی ناصر عباس نیّر
نظیر صدیقی وزیر آغا

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مسائل

ابرار احمد ابرار مجیب احمد سہیل
ارشد مسعود ہاشمی بدر عالم خلش پروانہ ردولوی
تاباں نقوی توقیر احمد خان رؤف نعیمی
رفیق عالم رفعت اختر سرمد صہبائی
سرور ساجد سلیم اختر سید مجیب الرحمٰن
سید یحییٰ نشیط سیفی سرونجی شمیم انور
صفدر امام قادری طاہر تونسوی عین تابش
غلام حسین ساجد محمد ایوب واقف محمد نعمان خان
مرزا خلیل احمد بیگ مناظر عاشق ہرگانوی منظر اعجاز

شاعری سے نثر کی طرف، نثر سے شاعری کی طرف

احمد سہیل اظہار اثر اقبال متین
اکبر حمیدی تنویر احمد علوی جاوید شنٹے
حامدی کاشمیری حنیف نقوی خالد سہیل
رتن سنگھ زاہدہ زیدی ساجدہ زیدی
سلام سندیلوی سلطان سبحانی سید ضمیر جعفری
شارب ردولوی شکیب ایاز شمس الرحمٰن فاروقی
طلعت رضوی برقی ظہیر احمد صدیقی عصمت جاوید
علیم اللہ حالی عنوان چشتی کرامت علی کرامت
کشمیری لال ذاکر گلزار گیان چند جین
لطف الرحمٰن محمد حسن مسعود حسین خاں
مناظر عاشق ہرگانوی نامی انصاری وجاہت علی سندیلوی
یوسف ناظم

تاریخی اساس شعر و ادب پر قارئین کی رائے

آدم نصرت آغا افضال مرزا آفاق عالم صدیقی
احسان آوارہ احمد عبدالعلیم قادری احمد علی شاد فاروقی
ارمان نجمی اسریٰ رشید اشرف قادری
اشعر نجمی اطہر سلطانہ نسیم امام اعظم
ایم۔ اے۔ عامر بشیر احمد بلقیس فاطمی
پریم پال اشک تسنیم بلخی تنویر علوی
جیالال ساز حسن نظامی حق نواز
حیدر جعفری سید خالد حسین خان ذوالفقار تابش
سلیم جعفری سید کاشف رضا سید فضل اللہ مکرم
شاداب رضی شفیق شاہین شفیع شیخ

عبدالواسع خان عبدالوحید عزیز اکبر آبادی
غیاث قریشی قاضی فراز احمد قمر الزماں مبارکپوری
قنبر علی خان قیام انیس قیوم سید
کاشف تجریدی کاوش عباسی گربچن چندن
متین انصاری مشیل آصف محمد اسد اللہ
محمد اسلم محمد اطہر خان محمد حامد
محمد حنیف مستری محمد فاروق اعظم محمد حید...
مختار الحق منصور قیصر مسرور عابدی
معین شاداب م۔ق۔ سلیم نثار پاشا
نسیم فاطمہ نعیمہ ضیاء الدین ہارون شیدا...
یوسف تقی

افسانہ: ۱۹۶۰ء کے بعد

ایک بہت مختلف و منفرد ادبی مذاکرہ جس میں ۱۰۰ سے زائد، جدید و قدیم افسانہ نگاروں، افسانے کے نئے نقادوں اور کہانی کے قارئین نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے۔

ابراہیم اشک ابن اسماعیل ابواللیث جاوید
احمد رشید احمد سعید اختر یوسف
ارتضیٰ کریم ارشد سراج ارشد نیاز
اسرار گاندھی اشرف جہاں بیگم اظہار صہبائی
اظہار عالم اقبال حسن آزاد انجم آرا انجم
انور امام اے۔ خیام بانو سرتاج
بشیشر پردیپ جاوید اقبال جلیل عشرت
جی کے مانک ٹالہ خالد جاوید خورشید ملک
ذاکر فیضی رضا الجبار رفعت صدیقی
رفعت نواز سعید انجم سہیل وحید
سید احمد قادری شان الحق حقی شاہد اختر
شاہد انور شاہد جمیل شاہنواز قریشی
شکیلہ رفیق شمس فاطمی شمع خالد
شموئیل احمد شمیم عالم صدیقی شہاب ظفر اعظمی
شہزاد منظر شہناز کنول صبا اکرام
صغیر رحمانی ضیاء الرحمٰن حیدر طاہر نقوی
عابد سہیل عباس خان عتیق احمد
عذرا اصغر عذرا پروین عزیز...
عشرت بیتاب علیم اشرف عقیل...
علی امام علی تنہا علی حیدر ملک
علی عمران عین رشید غلام...
غلام حسین ساجد فرحت جہاں فضیل...

نیاز احمد رفعت | قاسم ندیم | قرۃ العین طاہرہ
ثمر تقدیر امام | قدیر زماں | قیصر اقبال
قیصر زماں | معین صدیقی | محمود احمد قاسمی
محمد ظہور مظفر | محمد بشیر مالیرکوٹلوی | مختار ٹونکی
مہ لقا بیگ | مشتاق احمد نوری | مشتاق انجم
مصطفیٰ کریم | مظہر جمیل | مظہر سلیم
معین الدین عثمانی | م۔م۔ راجندر | منظور وقار
مجیب قیصر | نذیر احمد یوسفی | نریندر سنگھ بھاٹیہ
نثرین احسن فتیحی | نسیم محمد جان | نسیم بن آسی
نعیم کوثر | نکہت ریحانہ خان | نند کشور وکرم
ہارون ایوب | یوسف عارف

غزل پر تنقیدی مکالمہ

غزل پر شاعر کے ایک ہنگامہ خیز تاریخی و ادبی معرکے کا اختتامیہ۔ ایک نئے تنقیدی آغاز کے ساتھ ۷۰ سے زائد نئے پرانے قلم کار اس بحث میں شامل ہیں۔

آر پی کپور | ابراہیم اشک | احتشام اختر
احمد سہیل | اشعر نجمی | اظہر نیر
اعجاز حسنی | انور سدید | انور مینائی
بدر عالم خلش | بلقیس ظفیر الحسن | پروین کمار اشک
پریم پال اشک | تاراچرن رستوگی | جلیس نجیب آبادی
جینت پرمار | حسین الحق | خمار قریشی
خوشبیر اکبرآبادی | دیوندر اسر | ذکاء الدین شایاں
رفیق عالم | سلیمان اطہر جاوید | شاہد عزیز
صادقہ نواب | صغیر رحمانی | ظفر ہاشمی
عابد صفی | عالم خورشید | عبرت مچھلی شہری
عتیق انظر | علیم اللہ حالی | صبیح صدیقی
مرتضیٰ علی شاد | مشتاق انجم | مظہر امام
منظر اعجاز | موسیٰ مجروح | وسیم احمد فریدی

گوشے

ترتیب میر اور میریات
توقیت سیماب اور سیمابیات
اعجاز صدیقی — ممتاز صدیقی
ژاک دریدا — اور کئی نام

مکالمہ - مصاحبہ

احمد علی، انور سجاد، م۔ الف رضی
شمس الرحمٰن فاروقی، غلام عباس، فراق گورکھپوری
قرۃ العین حیدر، محمد علی صدیقی اور کئی نام

اردو کی نئی بستیاں

اردو کی نئی بستیوں کے شعر و ادب پر تازہ ترین مضامین، جائزے، معلوماتی شذرات۔ ادبیت کچھ

سوانحی لغت

- خاص نمبر میں شامل سیکڑوں قلم کاروں کے مستند سوانحی اشاریے
- سیکڑوں قلم کاروں کے تازہ ترین پتے
- قلم کاروں کی تصاویر [البم]
- اردو کے تمام موجودہ ادبی رسائل کی فہرست اور دیگر تفصیلات

وفیات

مرحوم قلم کاروں کے سوانحی اشاریے، غیر مطبوعہ تحقیقات۔ مضامین اور دیگر معلومات۔

— آشنا لفظ لفظ —

- مکاتیب مشاہیر کے عکس [مع حواشی]

— چہرہ چہرہ یاد ہے —

- پرانی یادگار تصاویر

— بازیافت —

- قدیم و نایاب کتابوں کے عکس مع تعلیقات

★

- ناول۔ ڈراما۔ طنز و مزاح اور ادب کے دیگر مسائل پر کچھ اور ادبی مذاکرے۔

ایک مکمل حوالہ جاتی کتاب

مصورانِ خاص نمبر

جینت پرمار۔ سلطان سبحانی
علاّم الہندی

محدود صفحات اور نامکمل INDEX کی وجہ سے قلم کاروں کی یہ فہرستیں ابھی ادھوری ہیں۔ پاکستان، بنگلہ دیش اور اردو کی نئی بستیوں کے کئی اہم اور نئے نام ان فہرستوں میں شامل ہونا باقی ہیں۔

جلد اول کی اشاعت میں بہار اسٹیٹ اردو اکاڈمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

جلد اول

ضخامت: ۸۰۰ سے زائد صفحات — قیمت: ۱۶۰ — روپے

شاعر کے مستقل خریداروں کے لیے مجلد اول کی رعایتی قیمت

۱۱۰ روپے ✻ مع رجسٹری خرچ

اشاعت نومبر ۹۵ میں

ایجنٹوں کو معقول کمیشن

اعزازی کاپی کیلئے اصرار نہ کیجیے گا

● ہم عصر اردو ادب نمبر میں کتب و رسائل اور نیک خواہشات کے اشتہار ●

خاص نمبر میں کتب و رسائل اور نیک خواہشات کے اشتہارات کیلئے صفحات مختص کئے گئے ہیں۔ اگر آپ اپنی کتاب، رسالہ یا نیک خواہشات کے طور پر اپنا کوئی خوب صورت شعر، کوئی نثری جملہ، فقرہ یا کوئی ادبی بات بے شمار لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہوں تو رعایتی شرح اور دیگر تفصیلات طلب کیجئے۔

★ اردو کی نئی بستیوں کے رفیقانِ شاعر کے لئے خاص نمبر کی رعایتی قیمت، رجسٹری خرچ، کتب و رسائل اور نیک خواہشات کی رعایتی شرح اور دیگر معلومات علٰحدہ سے ارسال کی جا رہی ہیں

★

سرورق

پرشتہ در گرد نم انگشتہ دوست

عمل

پرینکا رستوگی [بنارس]

معزز قارئین کرام

کم صفحات لیکن زیادہ اور وقیع مواد کا ایک اور شمارہ آپ کے مطالعہ کے لئے پیش ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر [جلد اول] سے قبل کا یہ آخری شمارہ، جولائی ٩٥ء کے شمارے کے فوراً بعد شائع ہو رہا ہے۔ خاص نمبر کی بے طرح مصروفیات کے باوجود اس شمارے کی اشاعت اس لئے بھی ضروری سمجھی گئی کہ خاص نمبر کے طویل ترین انتظار کی شدت میں کچھ کمی واقع ہو۔ آپ سے شاعر کا رابطہ بنا رہے۔

جولائی ٩٥ء اور اب اس شمارے میں آپ نے ہم عصر اردو ادب نمبر کا تفصیلی اعلان ملاحظہ کیا ہوگا۔ اور آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ کتنا غیر معمولی کام ہے۔ لیکن اردو شعر و ادب کے اس عالیہ گاؤں کی تعمیر تنہا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس کی تعمیر میں بے شمار قارئین شاعر کا خلوص، ان کی دعائیں، سینکڑوں قلم کاروں کی ادبی کاوشیں، طویل انتظار اور بے پناہ تجسس شامل رہا ہے۔ آپ کی حوصلہ افزائیاں ہماری حرارت اور قوت بنی ہیں۔

ہم آپ تک پہنچ رہے ہیں

ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد اول کو نومبر ٩٥ء تک شائع کر دینا ہے۔ اسے وقت پر شائع کرنے اور اسے معیاری و مثالی بنانے کے لئے آپ کے اسی تعاون کی ضرورت ہے جو شاعر کو حاصل رہا ہے۔ آپ سے عملی تعاون کے مختلف منصوبے لے کر ہم آپ تک فرداً فرداً پہنچ رہے ہیں۔ چاہے آپ شاعر کے قلم کار ہوں یا قاری۔ تاریخی ہم عصر اردو ادب نمبر اور شاعر کے لئے آپ کا ہر ممکنہ تعاون بے حد ضروری ہے۔

قلم کاروں سے

کئی ماہ کی مسلسل کوششوں اور بہت احتیاط کے ساتھ ہم عصر اردو ادب نمبر کے قلم کاروں کی فہرستیں ترتیب دی گئی ہیں۔ حروف تہجی کا INDEX اب بھی نامکمل ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ آپ کا نام کسی باب میں شامل ہونے سے رہ گیا ہو۔ اگر ایسا ہوا ہے تو اس کے لئے ہم بے حد معذرت خواہ ہیں اور گذارش کرتے ہیں کہ ہم سے رابطہ قائم کیجئے آپ کی شمولیت کے بغیر اردو شعر و ادب کے خوبصورت اور خوب تر عالمی گاؤں کی تعمیر نامکمل ہی رہے گی۔

کچھ اور توجہ طلب باتیں

ہم عصر اردو ادب نمبر تین ماہ کی اشاعتوں پر مشتمل ہے یعنی ستمبر، اکتوبر اور نومبر ٩٥ء۔ دسمبر کا شمارہ، نومبر کے آخر تک شائع کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد خاص نمبر کی جلد دوم شائع کی جائے گی۔

خاص نمبر کسی کو بھی اعزازی یا مفت نہیں دیا جائے گا۔ وہ قلمکار ہوں یا قاری۔ اعزازی کاپی کے لئے اصرار نہ کیجئے۔

شاعر کے مستقل خریدار خاص نمبر کی رعایتی قیمت جلد ادا کریں۔ جن خریداروں کی طرف شاعر کے بقایاجات ہیں ان کی ادائیگی کے بغیر خاص نمبر ارسال نہیں کیا جائے گا۔ اور بعد میں بھی تعمیل نہیں کی جائے گی۔ ایجنٹ حضرات اپنے پیشگی آرڈر سے مطلع کریں۔

[illegible]



تعبیر

قاضی سلیم

بخط شاعر

سوتے جاگتے چاند ستاروں کی
مخمور نگاہوں نے دیکھا
ننھے بوٹے، ننھے پودے
اور چھتنار، تناور پیڑ جواب تک
اپنے اپنے استھانوں پر پھلتے پھولتے۔
دور ہی دور سے
صرف ہواؤں کی پیغامبری پر خوش تھے
اپنی لمبی اور گھنیری چھایا کے تانے بانے بنتے
اپنا اپنا پراگ جیبوں کو بھجواتے
قدموں میں کچھ پھول نچھاور کرتے
پتوں کا سنگیت
سناتے
سنتے
کھو جاتے
بوجھل اور گھنی راتوں میں جب شاخیں
سپنوں کے بوجھ سے جھک جاتیں
تب سو جاتے

•

سوتی جاگتی آنکھوں نے دیکھا
آج من کی
گیہوں، گیہوں کی پیو من کی
جلتی پیاس بھڑک کر —
کال کی رنگیاؤں میں پھیل گئی
ایسے —
ٹھنڈی برفیلی جھیل میں
سورج کا ایک دہکتا ٹکڑا ٹوٹ گرا
چاروں اور مسلسل شور
دھماکے — زلزلے دھچکے،
دھاڑتے پربت،
جھنجھن جھنجھن،
گرج گرج برساتیں
جانے کتنی صدیوں کے دن تھے
کتنی صدیوں کی وہ راتیں

•

سوتی جاگتی آنکھوں نے دیکھا
خاموشی ہی خاموشی ہے
جیسے کانوں میں لیکن گونج رہی ہیں
سناٹوں کی سانسیں
سنکھوں سیپوں میں جیسے بس جاتی ہیں
ساگر کی دھیمی دھیمی آوازیں

آوازوں کی تہہ میں
گانا بھولی جیسے
ٹوٹے بکھرے لفظ
ادھورے بول
دور فضا کی گھٹی گھٹی دھند میں
اک بے آواز پھڑکتی مچھلی
بھولا بھٹکا سا بے چین بگولا
تنہا ڈولتا اڑتا پھر
یہاں — وہاں
دبی چھپی اک ہلچل سی
پھیر بدل کی خواہش سی
اک سازش سی

لگتا ہے
شاید اندھے پاتالوں میں
شانت اکیلی اونگھتی گائے
سینگ بدلنے والی ہے

•

سوتی جاگتی آنکھوں نے دیکھا
آج انہیں پیڑوں پودوں کی نس نس میں
بہتے رس کے بدلے
خون کی دھارا جاگ اٹھی
تب تپ کر برتا تے ہوئے
آپس میں ملے
مضبوط جڑیں دھرتی سے اکھڑیں

— [illegible]
● گل مہر، عثمان پورہ ریلوے اسٹیشن روڈ۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر)



نشتر خانقاہی

عمرِ رواں کا تند تھپیڑا، شعلہ جیسا چمکنے لگا
ہار کے وہ بھی تٹ پر بیٹھی، میں بھی آخر تھکنے لگا

سوکھے کھیت میں سرسر کرتی خشک ہوا خاموش ہوئی
بیت گیا جو ماساوت کا، زخم پرانا پکنے لگا

تارے گھر کی منڈیروں پر یوں چمکے جیسے دیپ جلیں
دھند دھوئیں کی چادر میں پھر سارا منظر ڈھکنے لگا

چھوڑ کے بات ادھوری لب پر تجھ کو اب ختم کروں
تیری آنکھیں بجھنے لگی ہیں، میرا دیپ بھڑکنے لگا

کس کو خبر تقدیروں میں کب تیرہ شبی ہے کب تنویر
چھائی رات اماوس کی جب پورا چاند چمکنے لگا

سوچ کے مجھکو حیرت ہے تو اے جیون زہر اپنا
دیتے دیتے زچ نہ ہوا، میں پیتے پیتے چھکنے لگا

لفظوں بیچ چھپا کر خود کو، اس نے مجھے مرعوب کیا
کی سن کر بے معنی باتیں، میں بھی مہمل بکنے لگا

● چمندہ روڈ، محلہ چاہان، بجنور (یوپی)

◆

غلام مرتضیٰ راہی

نہ جانے کس کے خیالوں میں کوہ سار ملے
گزرنا جب بھی ہوا، محوِ انتظار ملے
اچھلتے کودتے لہراتے آبشار ملے
بلندیوں سے اترتے ہوئے سوار ملے
انا کو کر لیا دیوار کی طرح حائل
پھر اس کے دونوں طرف دونوں بیقرار ملے
کبھی درندے، کبھی پرندے، پرندے غائب ہیں
اگا میں پھر کوئی جنگل تبھی شکار ملے
نہ جانے کس کے نشانے میں ہو گئے حائل
تھے کس کے تیر جو پتھر کے آر پار ملے
بہت گمان تھا حقیقت کا سامنا کرنا
کئی تو آئینے کے روبرو فرار ملے
بجائے نقشِ قدم، آب و دانہ چھوڑ آیا
کہ مجھ کو ڈھونڈنے والوں کو سبزہ زار ملے
ہوا، رنگ و نسل، رنگ پھول پھل جدا سب کے
طرح طرح کے درختوں کی اک قطار ملے

● ۱۳۵ - پانی، فتح پور — (یوپی)



آفاق صدیقی

کسی خیال کی صورت کسی گماں کی طرح
رواں دواں ہیں مگر گردِ کارواں کی طرح

اس آرزو سے جو پیاری تھی اپنی جاں کی طرح
ہوئی ہے پرورشِ غمِ مرگِ ناگہاں کی طرح

وفورِ شوق میں سجدوں سے بے نیاز ہوئی
مری جبیں بھی ترے سنگِ آستاں کی طرح

نہ راس آئی ہیں فصلِ گل کی رعنائی
بہار میں بھی ہے موسمِ خزاں کی طرح

یہ کیا خبر تھی کہ اس روپ میں بھی ہیں صیاد
نظر تو آئے تھے کچھ لوگ باغباں کی طرح

گلہ نہیں کہ ابھی ہم سفر ہیں خوابیدہ
ہمیں تو رہنا ہے بیدار پاسباں کی طرح

اسیرِ فکر و نظر ہے ہر آدمی آفاق
کوئی زمیں کی طرح کوئی آسماں کی طرح

● آر - ۱۱۳، سیکٹر ۱۴ - اے، بفر زون، نارتھ کراچی

مرزا حامد بیگ
مغل سرائے۔ بجلی گھر روڈ، اٹک شہر (پاکستان)



آوازیں

نئی نسلیں اپنے بڑے بوڑھوں سے سنتی آئی ہیں کہ ایسا ہوتا ہے۔ کب ہوتا ہے؟ کیوں کر ہوتا ہے؟ کچھ پتا نہیں۔ بس ہوتا ہے کوئی پکارتا ہے۔

اور صدیوں کے پھیلاؤ میں، یوں بھی لمحہ بھر کے لئے وقت کروٹ لیتا ہے اور بس۔ ہم آواز کے رخ پر سفر کرتے ہوئے کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں۔

اس روز بھی یہی کچھ ہوا

جب میں ڈیوٹی پر پہنچنے کے لئے اپنے گھر سے نکلا تھا اور میرے قدم، ہسپتال کی بجائے ریس کورس کی جانب نکل جانے والے رستے پر اٹھ گئے تھے۔ یہ میرا اس شہر میں پہلا دن تھا۔ اور میں چہل قدمی کرتا ہوا بے خیالی میں بھٹک گیا تھا۔

میرے لئے وہ راستہ نیا تھا۔ پر جیسے کوئی کھینچے لیے جاتا تھا اس روز آسمان صاف تھا اور میں شہر کے ہنگاموں سے دور آوارہ خرامی کرتا ہوا بہت دور نکل گیا تھا۔

ریس کورس کی جانب سے پسینے میں تر، تھکے ہارے گھوڑوں پر چاق و چوبند جوکی، لانگ بوٹ اور پھندنے والی ٹوپیاں پہنے قطار در قطار واپس لوٹ رہے تھے اور میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا، ایک اجاڑ، بنگلے کے پچھواڑے اکیلا رہ گیا تھا

میں وہاں کتنی دیر رکا ہوں گا، کچھ پتہ نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ سڑک پر دور دور تک کوئی نہیں تھا اور وہ قدیم طرز کی عمارت ٹھنڈے گہرے سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں واپس مڑ چلا تھا کہ پیچھے سے دوڑ کر آتے ہوئے ایک بوکھلائے ہوئے بچے نے میرا راستہ روک لیا۔

«کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟ ذرا میرے ساتھ آئیں۔»

میں انکار نہیں کر سکا اور اس تیز قدم اٹھاتے اور ہوا میں پیرتے ہوئے بچے کے پیچھے نشتم پشتم گھسٹتا چلا گیا۔ اس اجاڑ بنگلے کی حد بندی گزار کر ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ طویل راہداریوں پر وہ میری رہنمائی کرتا، ہوا کے دوش پر اڑ رہا تھا۔ پھر وہ مجھے اس عمارت کے طویل نیم تاریک برآمدے سے گزار کر ایک ہال نما کمرے تک لے گیا، جہاں دوہرے پلنگ پر سفید براق کمبل میں لپٹی پٹائی ایک خاتون جانکنی کے عالم میں پڑی تھی۔

وہ تیس سال سے یقیناً زیادہ کی نہیں رہی ہو گی۔ لیکن اس وقت تو وہ ایک ہڈیوں کا پنجر تھی اور اس کا سانس اکھڑ چلا تھا میں نے چاروں طرف نگاہ کی۔ اس کی تیمارداری کو وہاں کوئی نہیں تھا، البتہ وہ ہوا کے دوش پر سوار لڑکا۔

مجھے مریضہ میں زندگی کی کوئی رمق باقی نظر نہیں آئی، اور یہ کہ اس وقت میرے پاس سوائے اسٹیتھوسکوپ کے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اس لڑکے کو چند ضروری ہدایات دیں اور ادویہ کی پرچی لکھ کر تپائی پر رکھتے ہوئے بوجھل قدموں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

ہسپتال کے ہنگامے میں مجھے وہ مریضہ نہیں بھولی، لیکن میں وہاں نیا نیا تھا اور میری وہاں آمد سے متعلق لکھت پڑھت اکتا دینے والی تھی۔ نئے ساتھیوں سے تعارف کا سلسلہ طول پکڑ گیا۔ اور میں خواہش کے باوجود اس طرف، دوبارہ خبر گیری کے لئے نہیں جا سکا۔

اس واقعے کو کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور میں بھول بھلا گیا تھا۔ آخر کیا کچھ یاد رکھا جائے۔ ہم لوگوں کے ساتھ

تو اکثر ایسا ہوتا چلا آیا ہے ۔ لیکن سنتے ہیں کہ صدیوں کے پھیلاؤ میں کبھی ۔ یوں ہی لمحہ بھر کے لیئے وقت کروٹ لیتا ہے اور بس ۔

کوئی پکارتا ہے اور ہم آواز کے رخ پر سفر کرتے ہوئے کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں ۔

آج بھی یہی کچھ ہوا ۔

میں حسب معمول ہسپتال سے پہلی شفٹ بھگتا کر، تھکا، ٹوٹا ہوا گھر لوٹا تھا کہ یکایک احساس ہوا جیسے کچھ بھول رہا ہوں۔ کوئی بات، جو بہت ضروری تھی ۔ کوئی کام ، جو رہ گیا ، یا جیسے کسی سے ملنا تھا اور نہیں مل پایا تھا۔

یوں ہی کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گیا ۔ لیکن ایک عجیب طرح کی بے چینی تھی جو کسی کروٹ چین نہ لینے دیتی تھی ۔ سامنے میز پر اسٹیتھو سکوپ چمک رہا تھا اور آپس میں باہم الجھے ہوئے گرم دستانے اس کے ساتھ دھرے تھے ۔ سفید ایپرن البتہ اتار کر رکھنا یاد نہیں رہا تھا، سو وہ پہنے ہوئے تھا ۔

ایک عجیب طرح کی بے چینی تھی ۔ ہسپتال سے نکلتے وقت بھی میں بہت جلدی میں تھا اور دس منٹ پہلے ہی اٹھ آیا تھا جیسے گھر پر کوئی ضروری کام ہو ۔ لیکن گھر پہونچ کر پھر وہی بے چینی بس ، جیسے کوئی بات تھی ۔ کوئی کام تھا جو ہونے سے رہ گیا ، یا جیسے کسی سے ملنا تھا ۔ پر کس سے ملنا تھا ؟ ۔ کوئی بھی تو نہیں تھا ۔

میں نے کہا نا کہ وہاں میری جان پہچان نہ ہونے کے برابر تھی ۔ آبادی میں کوئی بھی تو ایسا نہیں تھا ۔ جس سے میل ملاقات رہی ہو ۔ ہسپتال کے سارے عملے سے کچھ ہی دن پہلے ، اور زندگی میں پہلی بار ملا تھا ۔ لیکن ان صدیوں کے پھیلاؤ میں کہیں انجانے میں کیا ہوا ایک وعدہ تھا جو رہ رہ کر یاد آتا تھا وہ بات ، جو کسی سے کہنا تھی اور کہہ نہیں سکا تھا ۔ یا کوئی کام جو تکمیل چاہتا تھا ۔ لیکن اس وقت کچھ بھی تو یاد نہیں آ رہا تھا ۔

میں اٹھ کھڑا ہوا ۔ میز کی ساری درازیں کھول کر ایک ایک کاغذ کا پرزہ پڑھ ڈالا ۔ کتابیں الٹ پلٹ دیں ۔ پہنے ہوئے کپڑوں سمیت الماری میں ٹنگے ہوئے کپڑوں کے جھولتے گریبان جیب دیکھ ڈالے ۔ کچن میں جہاں میں نے آج تک آگ نہیں جلائی تھی ، ہو آیا ۔ باتھ روم میں ٹوتھ پیسٹ اور برش کے ساتھ نلکے کھولی ہوئی صابن کی ٹکیہ اور بالٹی پر ٹنگے ہوئے مگ کے علاوہ صرف ایک بلب روشن تھا ۔ جو کچھ ہی دیر پہلے میں نے خود روشن کیا تھا ۔ باتھ کی ریلنگ خالی تھی اور ہینگر پر میری نیم خشک قمیض جھول رہی تھی سب کچھ اپنی جگہ پر تھا ۔ لیکن کچھ تھا جو معمول سے ہٹ کر تھا ۔

میں نے سب کچھ اسی طرح پڑا رہنے دیا اور میز پر سے اسٹیتھو سکوپ اور دستانے اٹھا کر ایپرن میں ہی باہر نکل آیا ۔

میں ہسپتال کی طرف لوٹ جانا چاہتا تھا تاکہ وہاں بھی جا کر اطمینان کر سکوں ، لیکن میرے قدم ریس کورس کی جانب نکل جانے والے راستے پر اٹھ گئے ۔ میں نے بہت چاہا کہ اس ویران سڑک کی طرف نہ جاؤں لیکن قدم تھے کہ روکے نہیں رکتے تھے ۔ میں جانتا تھا کہ وہاں اب کچھ بھی نہیں رہ گیا ہوگا ، پر میں چلتا گیا ۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا اور سڑک کے دونوں اطراف میں سفیدے کے ستواں درخت چھتری بنے کھڑے تھے ۔ میں دائیں ہاتھ کی خاردار تاروں کی باڑ اور بائیں طرف کے خاموش مگر آباد گھروں کی قطار کو گزار کر اس اجاڑ بنگلے کی حدبندی تک پہونچ گیا ۔ میں شاید ریس کورس کی طرف دور کھلے میں نکل جانا چاہتا تھا ۔ لیکن میرے پاؤں بوجھل ہوتے گئے اور میں ایک بار پھر اس ویران بنگلے کے گیٹ پر رکتا چلا گیا ۔

اس وقت خاصی روشنی تھی اور عصر کی اذانیں ابھی نہیں ہوئی تھیں ۔ میں جانے کتنی دیر وہیں ٹھہرا رہا ۔ پھر میں نے ریس کورس کی طرف نکل جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور زنگ آلود آہنی گیٹ کو اندر کی جانب دھکیل کر اس پختہ راہداری پر چل نکلا جس کی سرخ اینٹیں رات کی بارش نے دھو ڈالی تھیں ۔ میں نے دیکھا کہ آپس میں الجھتی اور ہر طرف پھیلتی ہوئی گھاس کی کٹائی کو ایک عرصہ ہو چلا ہے اور زردی مائل نم گھاس پر گیلے پتوں کے انبار لگے ہیں ۔ پختہ راہداری کی دو طرفہ جانب انجیر اور حنا کی قد قد بہ قطاروں میں کسی اکیلی فاختہ کی چیخ میرے لئے راستہ بناتی چلی جا رہی تھی شام کی بھیگتی ہوئی ہوا میں ابھی ہلکی ہلکی خنکی کا احساس باقی تھا اور میں اپنی دھن میں نیم تاریک برآمدے کی سیڑھیوں تک جا نکلا تھا ۔

یکایک کھانستا کھنکارتا ہوا ایک سایہ برآمدے کی سیڑھیاں

اتر کر میرے سامنے آ ٹھہرا۔

"صاحب۔ کس طرف جانا ہے آپ کو؟" معمر رسیدہ چوکیدار نے اپنی سانس درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں ایک مریض کو دیکھنے آیا تھا، میں ـــ بہت دن ہوئے پھر آنا ہی نہیں ہوا اس طرف ـــ"۔ میں نے جواب میں کہا، اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"جی ـ کب کی بات کر رہے ہیں آپ؟ یہاں تو کوئی نہیں رہتا۔ مجھے یہاں چوبیس برس ہو گئے، چوکیداری کرتے۔ ہاں مجھ سے پہلے شاید ـــ"

"اچھا، لیکن میں تو یہی کوئی ہفتہ پندرہ دن پہلے آیا تھا یہاں۔" میں وہیں ٹھہر گیا تھا۔

"صاحب ـ بھول رہے ہیں آپ۔ میں تو رات دن یہیں ہوں۔ البتہ کبھی بازار تک ہو آتا ہوں اور بس۔"

میں اس سے کیا بحث کرتا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور میں وہاں سے چل دیا تھا لیکن میرے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ ایسے میں اس نے مجھے سنبھالا دیا اور دو گھڑی وہیں رک جانے کو کہا۔ وہ اور جانے کیا کچھ کہتا رہا تھا۔ لیکن میں کچھ بھی تو نہیں سن پا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں اس کے پیچھے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

اندر کا نیم تاریک راستہ میرا دیکھا بھالا تھا اور وہ مجھے برآمدے سے گزار کر ڈرائنگ روم کی طرف لے جانا چاہتا تھا لیکن میری نظریں ہال نما کمرے کی متلاشی تھیں۔ پھر میں چلتے چلتے ٹھٹھک کر ایک پیتل جڑے دیو ہیکل دروازے کے سامنے ٹھہر گیا اور اس نے میرے اصرار پر دروازہ کھول دیا

میں نے دیکھا کر خالی کمرے میں دوہرے پلنگ پر سفید براق کمبل تہہ کیا رکھا ہے اور بس۔ میں نے خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ کر تپائی پر سے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ اٹھا لیا۔ اس پر چند ہی روز پہلے کی تاریخ درج تھی۔

میں چوکیدار سے کیا بحث کرتا کچھ دیر بیٹھ کر چلا آیا

جب باہر نکلا ہوں تو یاد آیا کہ چوکیدار سے اس ہوا کے دوش پر سوار لڑکے کے بارے میں پوچھنا تو میں بھول ہی گیا باہر کی خاموش سرد راہداری پر سے گزرتے ہوئے میں نے اوپر نگاہ کی، جہاں انجیر اور چنار کے درختوں پر انگنت ستارے جھک آئے تھے اور شفاف سیاہ آسمان پر ٹھہرے ہوئے چاند کا رنگ زرد تھا۔ ❀

◆ بقیہ صفحہ ۲۸ اگر فردوس بر روئے زمیں است ◆

تڑتڑاہٹ اور چڑچڑاہٹ جس میں بوڑھوں، نوجوانوں، عورتوں دوشیزاؤں اور کم سن بچوں تک کی مختلف ہم آہنگ چیخیں شامل ہیں اور ان کے ساتھ درخت کی ایک خاص گھٹی گھٹی فریاد،

"آزا ـــ آزا ـــ آ"

"کچھ، پرچ، کرچ، کچھ"

جنگلیوں کے غلک بوس قہقہے،

پتوں کی تڑتڑاہٹ،

آندھیوں کا شور،

اتھل، پتھل۔

درخت کے کٹتے ہوئے ڈھیر کے ڈھیر لوتھڑے،

اور کٹ کٹ کے گرتی، چرمراتی درخت کی جڑیں،

چڑ ـــ،

چڑ ـــ،

چڑ ـــ،

پھیلتے، کانپتے، تھرتھراتے اندھیارے،

رفتہ رفتہ ساکت ہوتے مناظر،

اور ساکت منظروں کے بطون سے،

رفتہ رفتہ جیسے نمودار ہوتا،

گھٹ گھٹ کر ابھرتا،

ٹھہر ٹھہر کر گونجتا ـــ

"اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمیں است وہمیں است وہمیں ـــ"

پردہ !! ❀

ترسیلِ زر کا پتہ:



ظفر گورکھپوری

ٹھر گئے سب تارِ قبا کے، مدت ہوئی نوابی چھوٹے
غذ پہ تہذیب بچی ہے، کیسے خوش القابی چھوٹے

پر توطھی میں رکھ لیجے، پرچھائیں، خاشاک، غبار
یا جانے کس موڑ پہ آکر ہم سے خانہ خرابی چھوٹے

نا برہن کے آنچل جیسا پژمردہ بے رنگ، اداس
ت آتے ہی قریۂ جاں میں یادوں کی مہتابی چھوٹے

یا تیری گود کشادہ، ندی تیری باہنہ بڑی
ت اپنی پہچان کی ٹھہری جھیل سے کیوں مرغابی چھوٹے

ت سفر ہے، اپنے لہو کا سبزہ اپنے ساتھ رکھو
نے کب منظر کھو جائیں جانے کب شادابی چھوٹے

جانے بستی کو آکر کر تو دیا سیراب مگر
رول اور دروازوں سے کیا کیا رنگ گلابی چھوٹے

۳۰۲-A، فلوریڈا، شاستری نگر، اندھیری (ویسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۵۳



افتخار نسیم

ہاتھ ہاتھوں میں نہ دے بات ہی کرتا جائے
ہے بہت لمبا سفر یوں تو نہ ڈرتا جائے

جی میں ٹھانی ہے کہ جینا ہے بہر حال مجھے
جس کو مرنا ہے وہ چپ چاپ ہی مرتا جائے

خود کو مضبوط بنا رکھے پہاڑوں کی طرح
ریت کا آدمی اندر سے بکھرتا جائے

سرخ پھولوں کا نہیں زرد اداسی کا سہی
رنگ کچھ تو مری تصویر میں بھرتا جائے

مجھ سے نفرت ہے اگر اس کو تو اظہار کرے
کب میں کہتا ہوں مجھے پیار ہی کرتا جائے

گھر کی دیوار کو اتنا بھی تو اونچا نہ بنا
تیرا ہمسایہ ترے سائے سے ڈرتا جائے

1111 N. CLARK STREET
CHICAGO, IL 60610 USA



حسن عباس رضا

جو خواب آنکھوں میں روشن تھے ستارہ وار ٹوٹے
پھر اس دکھ میں نہ جانے ہم بھی کتنی بار ٹوٹے

طوافِ یار میں دریوزگی پر لاج کیسی ہو
تعجب کیوں محبت میں اگر پندار ٹوٹے

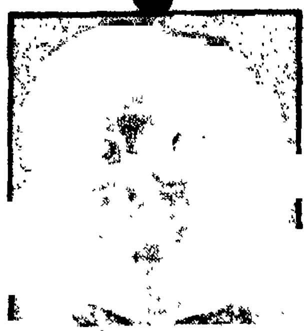
کوئی صورت بھی اب اپنی نہیں پہچانی جاتی
سو خواہش ہے کہ یہ آئینۂ زنگار ٹوٹے

اب اس حیرت سرائے سے نکلنا چاہتے ہیں
کوئی سیل بلا آئے تو یہ دیوار ٹوٹے

ہمیں بھی زعم اپنی سخت جانی پر بہت تھا
مگر اس کارزارِ جاں میں آخر کار ٹوٹے

ہمارے خواب دریا بیچ بہتے جا رہے تھے
کبھی ہم اس کنارے، اور کبھی اس پار ٹوٹے

جی کے ۹۱۵، پیاچہ کالونی، شالا [illegible]



شکیلہ رفیق

۳۰۔۴۳ سی بلاک۔ ۵ منزلہ، گلشن اقبال۔ کراچی۔ (پاکستان)

باکس نمبر نو اور دس

جب میں نے اسے دوسری بار دیکھا۔ تب وہ کچھ مختلف نظر آیا۔ پتلون تھی تو بیگی طرز کی ہی لیکن ہیٹ سے میچ کرتی ہوئی۔ سرمئی رنگ کی جیکٹ۔ کالی پتلون اور کالی ہیٹ۔ پہلے میں نے ایک سرسری نگاہ اس پہ ڈالی۔ آج وہ اس روز سے کہیں بہتر نظر آ رہا تھا۔ جس دن میں نے اسے توجہ کے قابل ہی نہ جانا تھا کہ اس کا لباس موسم سے قطعاً مطابقت نہ رکھتا تھا۔ ادھر میں، اس وقت تک لباس کا انتخاب ہی نہیں کرتی جب تک کہ موسم کا صحیح اندازہ نہ لگا لوں۔ پاکستان میں بوندا باندی ہوتے ہی میں دھانی یا اودا رنگ منتخب کر لیا کرتی تھی۔ سردی میں گہرے رنگ اور گرمی میں رنگ اور لباس دونوں ہلکے۔ پھر احباب سے اس سلیقے کی داد بھی وصول کیا کرتی تھی۔ مگر، یہاں ٹورنٹو میں نہ وہ سلیقہ رہا نہ ہی ویسے باذوق احباب کہیں نظر آئے۔ نظر آیا تو مارک! جو لباس کی حد تک تو بے ڈھنگا ہی نظر آ رہا تھا۔

اپنی فطرت سے مجبور ہو کر میں نے اس پر اک اور نگاہ ڈالی۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی اور، مجھے اپنی جانب یوں دیکھتے پا کر اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"ہائے! گڈ مارننگ"

اس نے یہاں کی تہذیب کا مظاہرہ کیا۔

"ہائے" میں بھی اب یہاں کی رسم و روایت سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ چہل قدمی کے سے انداز میں میرے نزدیک آنے لگا۔ میں محتاط ہو گئی۔ کیوں کہ ابھی میں یہ نہ جان سکی تھی کہ اس جسم کے کندھوں پر جو سر رکھا ہے اور اس میں جو مغز ہے اس کا وہیچنگ کیسی ہے۔ اس نے قریب آ کر سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا پھر شگفتہ مسکراہٹ سے بولا۔

"آپ لباس کے معاملے میں بہت CHOSY نظر آتی ہیں"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ میں روز آپ کو یہاں دیکھتا ہوں۔ جب آپ یہاں ڈاک نکالنے آتی ہیں۔"

"اچھا! مگر میں نے تو آپ کو آج ہی دیکھا" میں صاف جھوٹ بول گئی۔

"ہاں۔۔۔ صبح کے وقت میں کبھی کبھار ہی آتا ہوں"

"تب پھر؟ آپ روز مجھے کیسے دیکھتے ہیں؟"

"اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے"

اس نے ہاتھ اٹھا کر سامنے والی بلڈنگ کی جانب اشارہ کیا جس کے کسی اپارٹمنٹ میں اس کا بیڈ روم ہوگا۔ مجھے قدرے تعجب یوں ہوا کہ میں بھی اس بلڈنگ میں رہائش پذیر تھی۔ مگر میں نے اس کی بات کا جواب صرف مسکراہٹ سے دیا۔

"مجھے مارک کہتے ہیں" اس نے کہا

"میں سیمیں ہوں" پھر ہم دونوں ہنس دیئے۔ شاید اس بات پر کہ کس قدر جلد ہمیں تعارف کا خیال آیا۔

اس روز کے بعد سے مارک نے اپنا وقت تبدیل کر لیا۔ اب وہ بھی صبح گیارہ بجے آ جاتا اور ہم دونوں ڈاک چیک کرنے کے بعد قریبی پارک کی بنچ پر بیٹھ کر گھنٹہ دو گھنٹہ بات ضرور کرتے۔

مارک کی پیدائش تو اٹلی کی تھی مگر وہ پچاس برس پہلے کینیڈا آ گیا تھا۔ یہاں اس نے ایک مقامی عورت سے شادی کی۔ جس سے ایک بیٹی اور دو بیٹے ہوئے۔ وہ سب بھی اب یہیں کینیڈا کے مختلف شہروں میں رہتے بستے ہیں۔ سب تعلیم یافتہ اور اچھی نوکریوں پر فائز۔ مگر یہاں کے دستور کے مطابق کوئی بھی ماں باپ کے ساتھ نہیں۔

مارک کی اپنی بیوی سے علیحدگی کوئی بیس برس قبل اس وقت ہوئی جب ان کی پہلی اولاد ریٹا (RITA) کی تربیت کے سلسلے میں ان میں اختلافات شروع ہوئے۔ اس کی بیوی، نئے زمانے کی ہونے کے باوجود، چند پرانی روایات کو برقرار رکھنا پسند کرتی تھی۔ وہ بچوں کو ہر معاملے میں آزادی دینے کی مخالف تھی جب کہ مارک اس بات کو بچوں کی شخصی آزادی کے خلاف ظلم قرار دیتا تھا یہ بحث اتنی ہی پرانی تھی جتنی ریٹا کی عمر۔ مگر اس کا اختتام بیس برس قبل اس وقت ہوا جب صرف سولہ سال کی عمر میں ریٹا نے انہیں بوائے فرینڈ سے حاملہ ہونے کی خبر سنائی۔

اپنی کہانی سناتے ہوئے جب وہ اس لمحے پر آیا تب ہی میرے ذہن نے کہا تو ــــــ "سنگل مرد" کا قصہ اتنے پہلے سے چلا آرہا ہے

اس کے بعد ایک زوردار اور آخری لڑائی کے بعد دونوں میں علاحدگی ہوگئی بچے بھی بٹ گئے۔ لڑکے ماں کے ساتھ چلے گئے اور بیٹی مارک کے ساتھ۔

پھر یہ سلسلہ بھی چند ماہ ہی چلا اور ریٹا پھر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ہی رہنے لگی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھنا چاہتے تھے۔ شادی کا سوال تو اس کے بعد آتا ہے۔

اب ان کے بھی دو بچے ہیں مگر انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ شاید وہ اب تک ایک دوسرے کو سمجھ اور پرکھ رہے ہیں۔ ادھر دونوں بیٹے بھی اب برسوں سے ماں کے ساتھ نہیں ہیں۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے مارک نے کئی بار کوشش کی کہ اس کی صلح اپنی بیوی سے ہوجائے اور وہ دونوں ایک بار پھر ساتھ رہنے بسنے لگیں۔ مگر، وہ عورت مارک کے ساتھ پوری زندگی تو کیا اب ایک لمحہ بھی گزارنے کو تیار نہ تھی۔ اور یوں۔ اسے تنہا رہتے ایک جگ بیت گیا تھا۔

مارک کی کہانی سن کر صرف ایک ساعت کو میرا جی چاہا کہ میں بھی اسے اپنی کہانی سناؤں۔ پھر میں نے اسے ٹال دینا ہی بہتر جانا یوں کہ مارک نے مجھ سے کچھ بھی تو نہ پوچھا تھا۔

لیکن۔ کیا میں نے مارک سے کچھ پوچھا تھا؟ لیکن کیا میں نے مارک سے کچھ پوچھا تھا۔

میں نے خود سے سوال کیا۔

نہیں ــــ بلکہ اس نے خود ہی مجھے ایک مخلص اور اچھی دوست جان کر سب کچھ بتا دیا تھا۔ شاید اپنا غم بانٹنے کے لئے مگر ــــ...

یمین خان! کیا تمہیں غم بانٹنے کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا تم کسی کو ان دکھوں کی کہانی سنانا نہیں چاہتیں جو تمہیں پیٹر PETER سے ملے؟۔

پیٹر! PETER جو بالکل تمہارے خوابوں کے شہزادے کی مانند تھا۔ سرخ و سفید رنگت، نیلی آنکھیں، سنہرے بال (کہ مشرق کی بیشتر لڑکیوں کے خواب ایسے ہی ہوتے ہیں)

یہ لڑکیاں جب مغرب کے کسی ملک میں آتی ہیں تو لڑکوں سے میل جول کو "آزادی" جیسا خوبصورت نام دے کر خود کو اپنے ملک کی باقی تمام لڑکیوں سے الگ، بے حد خوش نصیب جان کر..... اس آزاد فضا میں بہت بلند پروازی کا مظاہرہ کرنے لگتی ہیں۔ بنا یہ سوچے کہ پرواز کا سلیقہ نہ ہو تو ایک ہی جھٹکے میں نیچے بھی گرا جاسکتا ہے۔

پیٹر کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے میں نے بھی تو کچھ نہ سوچا تھا ــــ سوچا تو اس روز جب میری ایک بات کے جواب میں وہ بولا۔

"میں تو شادی بیاہ کا قائل ہی نہیں"

"آں!! یہ بات تم نے پہلے کیوں نہ کہی؟"

"تم پوچھ لیتیں ــــ کم از کم یہاں کی ایسی روایات سے تو تم واقف ہوگی ہی۔ خاصہ عرصہ گزارا ہے یہاں ماسٹرز کے لئے آئی تھیں نا!

"ہوں...... ماسٹرز کے لئے آئی تھی"، میں صرف یہی کہہ سکی۔

پیٹر کی نیلی آنکھوں کے سحر میں گرفتار ہوکر، اپنے تئیں میں مذہب، معاشرے اور روایات کی قید سے نکل آئی تھی اور پیٹر کا وہ جملہ شاید اسی بغاوت کی سزا تھی۔ لیکن پیٹر تو میری سانولی رنگت اور بھنورا سی آنکھوں کے سحر میں گرفتار ہوگیا تھا۔ اس نے تو کوئی بغاوت نہ کی تھی۔ نہ ہی کسی پچھلی قید سے رہائی کی کوشش اس نے کی تھی۔

لہٰذا وہ ــ قصوروار تھا نہ سزاوار

والدین نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے لئے یہاں بھیجا تھا اور وہ مقصد پورا ہو چکا تھا، اور اب مجھے واپس جانا تھا۔ لیکن پیٹر سے کھائے زخموں کو دوسرے بھی دیکھیں، اس کی جرأت میں کہاں سے لاتی؟

جب کہ اس بات سے بھی بخوبی واقف تھی کہ واپس ہوتے ہی وطن میں میری بولی، ہاٹ کیک کی طرح لگے گی اور نہ صرف مجھ سے بڑے، ہم عمر بلکہ مجھ سے چھوٹے بھی مجھ سے شادی پر رضامند ہو جائیں گے کہ میں نے کوشش کر کے یہاں کی شہریت جو حاصل کر لی ہے۔

مگر.... میں.....

سیمیں خان! ضمیر کی قوت سے شکست مان کر یہاں سے واپس نہ جانے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔

پھر اس کے بعد نہ تو کسی سے دوستی کی اور نہ ہی شادی کے بارے میں سوچا۔ زندگی یوں بھی کیا بری ہے!!

اب میں یہاں ایک سرکاری ادارے میں اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ چھٹی کے دو روز یعنی ہفتہ اور اتوار ایک اسپتال میں رضاکارانہ خدمات انجام دیتی ہوں۔ جس سے مجھے بہت سکون ملتا ہے۔ یوں میں نے خود کو اتنا مصروف کر لیا ہے کہ والدین، ملک اور پیٹر تو کیا مجھے اپنی ذات کے بارے میں بھی سوچنے کا وقت نہیں ملتا ہے۔

اب کئی برس بعد مارک نے مجھے واپس ماضی میں دھکیل دیا تھا۔

مارک کو مجھ پر بہت رشک آتا ہے کہ میرا بیٹا مجھے ہر دوسرے ہفتے خط لکھتا ہے۔ مارک جب بھی میل باکس کھولتا ہے۔ اس میں اس کے لئے کوئی خط نہیں ہوتا۔ بس اشتہاری کاغذات کی بھرمار ہوتی ہے۔ البتہ اس کی بیٹی گاہے گاہے اسے ایک چھپا ہوا کارڈ ڈال دیتی ہے۔ جس کی عبارت بھی اسے لکھنی نہیں پڑتی اور وہ صرف YOUR'S EVER LOVING لکھ کر چھٹکارا حاصل کر لیتی ہے۔

جب میں بے حد اشتیاق سے اپنے بیٹے کا خط پڑھ رہی ہوتی ہوں، عین اسی لمحے مارک کی سرمئی آنکھوں میں حسرتوں کے بادل در آتے ہیں۔ جو کبھی کبھی حسد کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں

اور وہ کہہ دیتا ہے۔

"تو خبر کا میل باکس بھرے!! پر..... دس نمبر......"

اور اس کی زبان خشک سی ہو جاتی ہے۔ وہ مزید دکھی نظر آنے لگتا ہے۔

ادھر میں مسکرا دیتی ہوں

ہم لوگوں کو دکھ دینے میں کتنے فیاض ہوتے ہیں مگر خوشیوں کی تقسیم میں خساست اولیت اختیار کر لیتی ہے۔ مارک جیسے مخلص ساتھی کو یہ اذیت دے کر میں کتنی طمانیت محسوس کرتی ہوں۔ میرے چہرے پہ اطمینان و سکون کی خنک چاندنی بکھر جاتی ہے۔

میں ــ ایسی تو نہ تھی۔

میں ایسی کیوں ہو گئی ہوں۔ کیوں؟

مارک کبھی بھی یہ نہ جان سکے گا کہ۔ میرا کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔

بقیہ صفحہ ۲۰ رسالدار کا انٹرویو

چنانچہ مجھے باہر لان میں بٹھا کر رسالدار صاحب نے پورا قصہ سنایا جس کا لب لباب تو وہی تھا جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ لیکن اس کو سنانے میں انہوں نے پورا ایک گھنٹہ لگا دیا۔ میں جب بھی انہیں ٹوکتا مجھے یہ کہہ کر ڈانٹ دیتے کہ بڑے صاحب نے تجھے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ خود کم بولنا اور مجھے زیادہ بولنے دینا۔

انٹرویو جس طرح ریکارڈ ہوا تھا اسی صورت میں ٹیلی کاسٹ ہو گیا۔ دوردرشن نے البتہ مجھ پر پابندی لگا دی کہ آئندہ مجھے انٹرویو کرنے کا کوئی پروگرام نہیں دیا جائے گا۔

حب الوطنی کا جذبہ مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور میں اپنے دیش کے سپاہیوں کی بہادری کے کارنامے سن سن کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میرے دل میں بار بار خیال آتا ہے کہ کاش رسالدار بدلو سنگھ کو دشمن اپنی حراست میں لے لیتا۔



رؤف خیر

بچھڑ کے لمحۂ آتش سے امتحان میں ہوں
میں ایک بم ہوں مگر کب سے بر فدان میں ہوں

نہ تیر میں نہ کماں میں نہ آن بان میں ہوں
میں کامیاب نشانے میں اور نشان میں ہوں

زمین ہی میں سکوں ہے نہ آسمان میں ہوں
جو بے حرم ہے ابھی تک اسی اذان میں ہوں

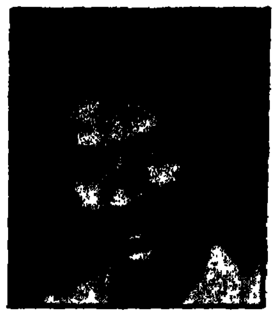
کبھی ہوا تھا جو میرے ہی نام پر تعمیر
سرمایہ دار کی صورت اسی مکان میں ہوں

ادھر ہے کھائی تو ہے خندہ زن ادھر ابلیس
بڑے سلیقے سے دونوں کے درمیان میں ہوں

ابھی یہ قوم مجھے مان کر نہیں دیتی
ابھی میں شعب ابوالہول کی امان میں ہوں

حریف خیر تو اک حرف ناگزیر بھی ہے
زمیں حرف شناسوں کے خاندان میں ہوں

● ۱۹/۲۰۲-۱۰-۹، رسالہ بازار، گولکنڈہ، حیدرآباد



مدحت الاختر

جو زندگی گذار رہے ہیں بھلی تو ہے
اس میں بھی شک نہیں کہ کہیں کچھ کمی تو ہے

تو نے بدلتے وقت میں مجھ کو بھلا دیا
اب تک تری کلائی میں میری گھڑی تو ہے

پہناؤں کیا لباس کہ رہ جائے اس کی شرم
دنیا مری نگاہ میں ننگی کھڑی تو ہے

وہ اک جھلک دکھا کے ہمیں چاہے لوٹ لے
اس کے قدم سے شہر میں رونق ہوئی تو ہے

مدحت اسی پہ صبر کرو اور کچھ نہیں
تم ہو کسی کی یاد ہے اور زندگی تو ہے

● نیا گودام، کامٹی ۴۴۱۰۰۳ ضلع ناگپور (مہاراشٹر)



ثمینہ راجہ

راہیں کھونے والے منزل بھولنے والے لوگ
ہم دل کی آواز پہ سر پٹ دوڑنے والے لوگ

ایک چراغ نیم شبی لے کر ان گلیوں میں
چہرا چہرا اپنا پرتو ڈھونڈنے والے لوگ

اپنی لو میں رہنے والے غم سہنے والے
اپنی کھوج میں اکثر خود ہی کو کھونے والے لوگ

پل دو پل کو رستہ ہی کوئی روشن کر جائیں
تارے کی مانند فلک سے ٹوٹنے والے لوگ

اپنی آنکھیں گروی رکھ کر وقت گذارے جائیں
اک خاموش محبت دل میں پوجنے والے لوگ

● ۳/۲۴-III رنا ۲ ۱/۲ اسلام آباد

دلیپ سنگھ

۵۹/۴، راجندر نگر، نئی دہلی ـ ۱۱۰۰۶۰

رسالدار کا انٹرویو

دوردرشن کے دہلی سٹیشن نے ایک بار مجھے خط لکھا کہ مجھے کسی کا انٹرویو لینے کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے فلاں تاریخ کو صبح گیارہ بجے متعلقہ پروڈیوسر سے ملنا ہوگا۔

میں جب مقررہ تاریخ اور وقت پر پروڈیوسر کے کمرے میں پہنچا تو وہاں ایک اور بزرگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ عمر تو شاید ان کی پچھتر کے اوپر ہوگی لیکن صحت ماشاءاللہ بہت اچھی تھی۔ ان کی بڑی بڑی مونچھوں نے ان کے چہرے کو اور بھی رعب دار بنا رکھا تھا۔ پروڈیوسر نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ رسالدار بدلو سنگھ صاحب ہیں اور دنیا کی پہلی اور دوسری عظیم جنگوں میں اپنا بہادری کا لوہا منوا چکے ہیں۔ فوج سے انہیں اس قدر محبت ہے کہ ان کے بیٹے اور پوتے بھی فوج میں ہیں۔ آپ کو ان ہی کا انٹرویو لینا ہے۔ مزید ہدایتیں دیتے ہوئے پروڈیوسر کہنے لگا کہ اچھا انٹرویو وہ ہوتا ہے جس میں انٹرویو لینے والا کم اور دینے والا زیادہ بولے۔ آپ بھی یہ بات ذہن میں رکھئے گا۔ جب میں رسالدار صاحب کے ساتھ ان کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو کہنے لگے کہ رسالدار صاحب دوسری جنگِ عظیم میں مصر کے مورچے پر دشمن کے گھیرے میں آ گئے تھے اور پھر بڑی بہادری سے اس گھیرے سے نکل آئے تھے۔ آپ وہ واقعہ سنانے کے لئے انہیں ضرور کہیے گا۔ درشکوں کو اچھا لگے گا۔

وہاں سے نکل کر میں رسالدار صاحب کو دوردرشن کے میک اپ روم میں لے گیا۔ رسالدار صاحب پوچھنے لگے کہ یہاں کیا ہوگا۔ میں نے بتایا کہ یہ لوگ آپ کو ٹی وی پر پیش کرنے کے لئے تیار کریں گے۔ رسالدار صاحب کہنے لگے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ میں اس کام کے لئے گھر سے تیار ہو کر آیا ہوں۔ یہ کہتے ہی وہ کمرے سے باہر نکل پڑے۔ بڑی مشکل سے میں انہیں بہلا پھسلا کر واپس لایا اور سمجھایا کہ یہ لوگ آپ کو اس طرح سنوار اور سجا دیں گے کہ آپ واقعی رسالدار لگیں گے۔ میری بات سنتے ہی بدلو سنگھ بولے "اس کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ میں گھر سے اپنا ڈسچارج سرٹیفکٹ ساتھ لایا ہوں جس پر صاف لکھا ہوا ہے کہ میں فوج میں رسالداری کے عہدے پر پہنچ کر ہی ڈسچارج ہوا تھا۔ دکھاؤں تجھے؟" میں تو ان کا جواب سن کر ہتھیار ڈالنے کو تیار ہو گیا۔ لیکن میک اپ آرٹسٹ نے منت سماجت کر کے انہیں کرسی پر بٹھا لیا اور ان کے چہرے پر پوڈر لگانے لگا۔ اس عرصے میں میرا بھی میک اپ ہوا۔ میک اپ آرٹسٹ نے اپنا کام ختم کرنے کے بعد رسالدار صاحب کو آئینہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے اب آپ کے چہرے پر کتنا رعب داب ہے آپ واقعی رسالدار لگ رہے ہیں"۔ یہ سنتے ہی انہوں نے جواب دیا کہ اگر تم اتنا پاؤڈر لگا کر کبھی میرے پاس فوج میں بھرتی ہونے آتے تو میں تمہیں خچر کور میں بھی نہ لیتا۔ یہ کہتے ہوئے رسالدار صاحب نے اپنے چہرے پر لگا ہوا پوڈر اپنی پگڑی کے شملے سے پونچھ دیا۔

رسالدار صاحب کے ساتھ سٹوڈیو کی طرف جاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میں جس مہم پر جا رہا ہوں اس میں کامیاب ہو کر نکلنا آسان نظر نہیں آتا۔

اسٹوڈیو پہنچے تو فلور منیجر نے کیمرہ آن کروا دیا۔ کیمرہ آن ہوتے ہی ہم دونوں کی تصویریں سامنے رکھے مانیٹر پر آ گئیں۔ تصویر دیکھ کر رسالدار صاحب نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا کہ تصویر میں تو تو بھی اچھا خاصہ فوجی لگ رہا ہے۔ حالاں کہ تیرے قد کے آدمی کو فوج میں کوئی گھاس بھی نہ ڈالے۔ اسی لئے میں سینما میں دکھائی جانے والی عورتوں کو خوبصورت نہیں مانتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب ٹرک بازی ہے۔

فلور منیجر نے ہم سے کہا کہ کچھ بولیئے تاکہ آپ کی آواز کا ٹیسٹ ہو سکے۔ پہلے اس نے مجھے بولنے کو کہا۔ یہ سنتے ہی رسالدار صاحب نے میری طرف دیکھا اور کہا اچھا تو بھی میری طرح اناڑی ہے اور میری طرح پہلی بار یہاں آیا ہے۔ میرا ٹیسٹ ہو گیا تو رسالدار صاحب سے کہا گیا کہ وہ کچھ بولیں۔ انہوں نے پوچھا کیا بولوں؟ فلور منیجر نے کہا کہ آپ کچھ بھی بول دیجئے۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی آواز درشکوں تک پہنچ رہی ہے یا نہیں۔ رسالدار صاحب نے بڑی پاٹ دار آواز میں کہا ،، اے بہیر بھائی سن رہی ہو، میں دوردرشن سے بول رہا ہوں ،، رسالدار صاحب کی آواز کی گرج سنتے ہی فلور منیجر نے سر پیٹ لیا اور کہنے لگا ،، رسالدار صاحب آہستہ بولیئے ،، رسالدار صاحب کہنے لگے۔ ،، بھائی میں بات کر رہا ہوں اپنی بہیر بھائی سے۔ تو اسے جانتا نہیں ہے وہ اونچا سنتی ہے۔ اگر میں آہستہ بولوں گا تو میری بات شاید تمہارے دوسرے درشکوں کو سنائی دے جائے لیکن میری بیوی کے پلے نہیں پڑے گی۔ ،،

بڑی مشکل سے رسالدار صاحب کو راضی کیا گیا کہ وہ اپنی نارمل آواز میں بولیں۔ انہیں راضی کرنے کے لئے فلور منیجر پروڈیوسر لکھ کر دینے کو تیار ہو گیا کہ اگر ان کی آواز ان کی بیوی تک نہ پہنچی تو وہ نوکری سے استعفیٰ دے دے گا۔

انٹرویو شروع ہوا تو میں نے پہلا سوال داغا ،، رسالدار صاحب ہمارے درشکوں کو اپنا نام بتائیے۔ ،،

،، کون سا نام بتاؤں درشکوں کو ،، رسالدار صاحب بولے ،، نام تو میرا میرے باپ نے رکھا تھا بدلو سنگھ لیکن کبھی اس نے مجھے اس نام سے پکارا نہیں۔ وہ مجھے منگلو کہتا تھا کہ میں منگل وار کو پیدا ہوا تھا۔ ماں میری مجھے بلونگڑا کہتی تھی کہ ہمارے ہاں بلونگڑے بھی تیرے قد کاٹھ کے ہوتے تھے۔ ننھیال میں مجھے ٹینڈو کہتے تھے کہ ان دنوں میرے سر پر بال نہیں تھے۔ بعد میں اُگ گئے تھے پھر پھیل گئے۔ فوج میں مجھے شکرا کہتے تھے کہ میں دشمن پر حملہ اس طرح کرتا تھا جیسے شکرا چڑیوں پر کرتا ہے۔ میری بہیر بھائی مجھے چھوہیرے کا باپو کہتی ہے حالانکہ چھوہیرا خود پچاس کے پیٹے میں ہے۔ تو بول درشکوں کو کیا نام بتاؤں۔ ،،

ایک سیدھے سوال کا اتنا لمبا جواب سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ گھبراہٹ کے عالم میں میں نے کہا بدلو سنگھ چلے گا۔

رسالدار صاحب بولے ،، کیسے چلے گا سسرے۔ آج تک تو چلا نہیں میں تو خود اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے کہ میں بدلو سنگھ ہوں اپنا ڈسچارج سرٹیفکیٹ ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتا ہوں۔

اگلا سوال کرنے سے پہلے میں نے کہا۔ ،، رسالدار صاحب آپ مجھے سسرے نہ کہیں تو مہربانی ہوگی۔ یہ سنتے ہی رسالدار صاحب نے میری ٹھوڑی پکڑ کر کہا ،، برا مان گیا ہے سسرے۔ ارے میں تو اپنے چھوہیرے کو بھی سسرے کہتا ہوں۔ یہ کوئی گالی تھوڑے ہی ہے۔ یہ تو ہماری بول چال کی بھاشا کا ایک ایسا لفظ ہے جس کے بغیر ہماری زبان نہیں چلتی۔ برا نہیں ماننا سسرے۔ ،، میں نے کہا۔ میرے برا ماننے کی بات نہیں ہے رسالدار صاحب۔ ٹیلی ویژن والے برا مانتے ہیں ،، کہنے لگے ،، بات تیرے میرے بیچ ہو رہی ہے وہ سسرے بیچ میں کہاں سے آ گئے۔ اس مقام پر مجھے فلور منیجر نے اشارہ کیا کہ بات کو آگے بڑھاؤ۔ چنانچہ میں نے اگلا سوال داغا۔

،، رسالدار صاحب آپ فوج میں بھرتی کیوں ہوئے۔

،، بھائی میرے سسرے ماں باپ کی کون سی جاگیر تھی جو میں کھاٹ پر پڑا روٹیاں توڑتا رہتا۔ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ سو فوج میں بھرتی ہو گیا۔ ،،

،، آپ کچھ اور بھی تو کر سکتے تھے۔ ،،

،، مثلاً ؟ ،، رسالدار صاحب نے پوچھا

،، دکان داری کر سکتے تھے، سبزی بیچ سکتے تھے۔

،، ارے سسرے ... چھ فٹ لمبا اور ۴۲ انچ چوڑی چھاتی والا آدمی سبزی بیچتا کیا اچھا لگتا ،، یہ کہنے کے بعد رسالدار صاحب نے محسوس کیا کہ انہوں نے ایسی بات کہہ دی ہے کہ ان کا حق بنتا ہے کہ وہ اس پر دو منٹ تک قہقہہ لگا سکیں۔ چنانچہ انہوں نے قہقہہ لگایا اور میں ان کا منہ تکتا رہا جب ان کی ہنسی تھمی تو انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا ،، ہاں تو اگر آلو پیاز بیچنا شروع کر دے تو بیچ سکتا ہے کہ بھگوان نے تیری شکل و صورت ایسی ہی بنائی ہے۔ ،،

یہ کہنے کے بعد انہوں نے پھر ایک بھرپور قہقہہ لگایا جس کے دوران میں بیوقوفوں کی طرح ان کا منہ تکتا رہا۔

اسی لمحے فلور منیجر نے اشارہ کیا کہ یار بات کو آگے بڑھاؤ کل پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔ میں نے سوچا سیدھا معرکہ والے واقعے پہ آ جاؤں جس کی طرف پروڈیوسر نے اشارہ کیا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا ،، رسالدار صاحب۔ آپ ایک دفعہ معرکے میں دشمن کے نرغے میں

آگئے تھے اور پھر بڑی بہادری سے نکل گئے تھے۔ ہمیں وہ قصہ سنائیے۔ ،،

سالدار صاحب نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا۔

،، لگتا ہے تو نے سن رکھا ہے۔ ،، میں نے فوراً وضاحت کی

،، نہیں نہیں۔ میں نے کہاں سن رکھا ہے ،،

رسالدار بولے۔ ،، اگر سن نہیں رکھا تھا تو پھر تجھے کیسے پتہ ہے کہ میں صرف میں دشمن کے نرغے میں آگیا تھا۔ تو میرے ساتھ تو تھا نہیں۔ میں نے کہا۔ رسالدار صاحب میں آپ کے ساتھ تو نہیں تھا لیکن بہادروں کی بہادری کے قصے بھی کبھی چھپے رہے ہیں ،، رسالدار صاحب میرا جواب سن کر خوش ہوگئے اور کہنے لگے۔ تو پھر سنو۔

شام کا وقت تھا۔ پانچ نہیں تو ساڑھے پانچ بجے ہوں گے میں اپنے یونٹ کے دس سواروں کے ساتھ گشت لگا کر کیمپ کی طرف آرہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ دشمن کے سپاہی سامنے بندوقیں تانے کھڑے ہیں۔ وہ تعداد میں چوں کہ ہم سے چار گنا تھے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ مقابلہ کرنے کی بجائے پیچھے لوٹ جانے میں ہی بہتری ہے چنانچہ میں نے اپنے سواروں کو حکم دیا کہ اباؤٹ ٹرن ہو جاؤ۔ جوں ہی ہم اباؤٹ ٹرن ہوئے۔ مڑے تو ہم نے دیکھا کہ پیچھے بھی دشمن کی فوج کھڑی ہے۔ اب ہمیں تشویش ہوگیا کہ ہم گھر گئے ہیں۔ میرے قریب سپاہی دیال سنگھ تھا کہنے لگا،، رسالدار صاحب حکم دیجئے کہ اب کیا کیا جائے۔ ،، میں نے کہا سسرے دم لے۔ ابھی تو میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے کہ کیا کیا جائے، تجھے حکم کیا دوں،، ہم لوگ چپ چاپ گھوڑوں پر بیٹھے رہے۔ ہم بھی چپ، ہمارے گھوڑے بھی چپ، اتنا تو تیرے کو پتہ ہی ہوگا کہ گھوڑا آدمی سے زیادہ سمجھدار ہوتا ہے۔ ،، مجھے پتہ تو نہیں تھا لیکن میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملانا ہی بہتر سمجھا۔

رسالدار صاحب بولے ،، میں اپنے گھوڑے پر سوار اپنے دماغ کا پورا زور لگا کر سوچ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ لیکن سمجھ میں کچھ آ نہیں رہا تھا۔

رسالدار صاحب یہاں تک پہونچے تو فلور منیجر نے ہاتھ گھما کر مجھے اشارہ کیا کہ صرف ایک منٹ رہ گیا ہے۔ گفتگو کو سمیٹنا شروع کرو۔ اس کا اشارہ رسالدار صاحب نے بھی دیکھ لیا۔ مجھے کہنے لگے کہ یار۔ کیا نام ہے تمہارا، دیپ سنگھ، وہ سامنے کھڑا چھوکرا سسرا بڑا پریشان لگ رہا ہے۔ اسے کوئی تکلیف ہے کیا؟ ،،

اب فلور منیجر کے ساتھ میں بھی گھبرا گیا کہ کل آدھا منٹ رہ گیا تھا میں نے زبردستی بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ،، رسالدار صاحب نے جرأت سے کام لیا اور دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے گھیرے سے باہر نکل آئے۔

میرا جملہ مکمل ہوا تو کیمرے آف کر دیئے گئے اور فلور منیجر اور میں نے سکھ کا سانس لیا۔ میں اپنی کرسی سے اٹھنے ہی والا تھا کہ رسالدار صاحب نے زبردستی مجھے بٹھاتے ہوئے کہا ،، یہ تو نے کیسے کہہ دیا سسرے کہ ہم دشمن کے گھیرے سے باہر نکل آئے۔ ہم تو ابھی تک گھیرے میں ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کیا جائے ،،

میں نے کہا ،، رسالدار صاحب، وہ فوٹوگرافر جو ہمارا فوٹو لے رہے تھے، ان کے جانے کا وقت ہوگیا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا گفتگو کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ ،، رسالدار صاحب کہنے لگے ،، وہ جائیں اپنی ماؤں کی ... میں۔ سوال تو نے کیا تھا تو جواب سنے بغیر کیسے جا سکتا ہے چنانچہ میں بیٹھ گیا اور رسالدار صاحب نے اپنا قصہ آگے بڑھایا ،، میں بہت دیر تک سوچتا رہا اور دشمن کی فوج کی طرف دیکھتا رہا۔ اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ اس نرغے سے بچ نکلنے کا بس ایک ہی راستہ ہے۔ دشمن کو یقین دلاؤ کہ ہم نے ہار مان لی ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ گھوڑے بڑھاتے ہوئے ہم دشمن کی طرف چل دیئے اس طرح جیسے گرفتار ہونے جا رہے ہوں۔

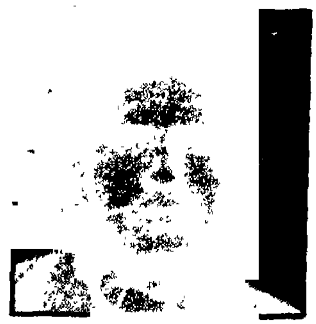
رسالدار صاحب یہاں تک پہنچے تھے کہ کسی نے اسٹوڈیو کی بتیاں بجھا دیں۔ میں نے کہا ،، رسالدار صاحب چلئے باہر چل کر بات کرتے ہیں۔ ،، ارادہ میرا یہ تھا کہ ڈیوٹی آفیسر سے چیک لے کر کھسک لوں گا رسالدار صاحب میرے ساتھ ڈیوٹی آفیسر کے کمرے میں گئے۔ ڈیوٹی آفیسر نے انہیں چیک دیا تو کہنے لگے کہ میں نہیں لوں گا۔ میں نے تو پورا قصہ سنایا ہی نہیں۔ ڈیوٹی آفیسر سمجھدار آدمی تھا کہنے لگا۔ چیک تو لیجئے باقی کا قصہ اگلے پروگرام میں سنا دیجئے گا

رسالدار صاحب نے یہ سن کر چیک لیا اور جیب میں ڈال دیا۔ لیکن میں جب اپنا چیک لے کر رخصت ہونے لگا تو انہوں نے مجھے گردن سے پکڑ لیا اور کہا۔

،، تو کہاں جا رہا ہے سسرے۔ پوری بات سنے بغیر پیسے وصول کر لیئے۔ یا تو چیک واپس کر یا پھر میری پوری بات سن۔ ،،

[باقی صفحہ ۱۷ پر دیکھیے]

مھتاب حیدر نقوی



جو ہم نے خواب دیکھے ہیں دولت اُسی کی ہے
تنہائی کہہ رہی ہے رفاقت اُسی کی ہے

کارِ جنوں میں اپنا کوئی دخل ہی نہیں
صحرا اُسی کا اور یہ وحشت اُسی کی ہے

نظارہ درمیاں رہے رَت جگا کریں
قامت اُسی کا اور قیامت اُسی کی ہے

کب کوئی شہرِ شب کی حدیں پار کر سکا
یوں مُفت جان کھونے کی عادت اُسی کی ہے

ہم بھی اداس رات کے پہلو میں ہیں مگر
ٹھہری شبِ فراق جو ساعت اُسی کی ہے

● ۲۱۹/۲/۳۱، جمن ولا، صحاب باغ، انوپ شہر روڈ، ملہ، ایم۔یو، علیگڑھ-۲۰

پرویز رحمانی



عکس در عکس آئینہ تقسیم
ایک بندے پہ سو خدا تقسیم

خنجروں پر لہو کی صدا آمٹ
سوز بانوں میں ذائقہ تقسیم

چشم در چشم موج موج فرات
دل بہ دل جیسے کربلا تقسیم

انفرادی شکار، چہ معنی
چار بازو میں فاختہ تقسیم

خوان لے کر فرشتے اُترے تھے
مفلسی کر گئی انا تقسیم

کھولتا کون پاؤں کی بندش
ہر قدم پر تھا راستہ تقسیم

● فریڈس کمپاؤنڈ، ڈرگ روڈ، ٥، رانچی ۸۳۴۰۰۲ (بہار)

ذکاء الدین شایاں



شورِ صد رنگ سے، خاموش ہی ہوتے رہنا!
زیست پہ ہنسنا، کبھی بے صدا روتے رہنا!

صبح بھی آ کے جگا دینے کی ہمت نہ کرے
شبنمیں شب سے لپٹ کر یونہی سوتے رہنا!

دل کا کیا ہے؟ وہی بکھرے ہوئے بے مصرف خواب
تم تو آنکھوں میں نئے پھول پروتے رہنا!

اس نے تو بخشی تھی خوشیوں کی تازہ سوغات
اب یہ دھبہ ہے۔ اسے اشکوں سے دھوتے رہنا

ابر و سیلاب کی برکت ہے کہ زمیں کی خواہش!
صرف صحراؤں کے ہونٹوں کو بھگوتے رہنا!

● نزد اولڈ ڈاک پوسٹ آفس بکرا- پیلی بھیت

صدیق عالم
۱۵-اے تارک دتہ روڈ، کلکتہ - ۷۰۰۰۱۹

چور دروازہ

یہ لکڑی کے ایک گھوڑے کی کہانی ہے جو اپنے چاروں پہیوں پر کسی بھی سمت دوڑ سکتا ہے۔ یہ دو فیٹ لمبا اور اتنا ہی اونچا ہے۔ اس کے کان اٹھے ہوئے ہیں۔ مگر دم سے آدھے بال جھڑ چکے ہیں۔ یہ گھوڑا میں نے ایک کباڑی کی دکان سے خریدا ہے۔ صرف دس روپئے میں شاید جو بچہ اس سے کھیلا کرتا تھا اب وہ بڑا ہو چکا ہے۔ اسے یہ گھوڑا یاد بھی نہ ہوگا کیونکہ ہم اپنے بچپن کے کھلونے یاد نہیں رکھتے۔ ایک دن اسے یادداشت کی کال کوٹھری میں، کسی تاریک کونے میں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، اس سمت جہاں سورج باہیں پسارے ہمارا انتظار کرتا ہے۔ زندگی کا اگلا سفر اس سورج کے گرد قائم رہتا ہے۔ لیکن اس لکڑی کے گھوڑے نے کیوں اپنی توجہ میری طرف کھینچ لی کہیں اس لئے تو نہیں کہ یہ سستا مجھے مل گیا تھا۔ لیکن اس لکڑی کے گھوڑے کا اب میں کیا کروں۔ میرے بچوں کا ذکر بیکار ہے... اور اب یہ نمائش کی چیز نہیں رہی کہ ڈرائنگ روم میں کہیں سجا کر رکھا جائے۔ کسی کو تحفہ بھی نہیں دے سکتا سوائے نوکر نوکرانیوں کے بچوں کو۔ اور نوکر کے نام پہ میرے پاس بوڑھے ابوبکر کے علاوہ اور ہے کون؟ اور اس کی بھی بیوی ہے نہ بچہ۔ آہ! ... ابھی خریدے دس منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو گیا ہوں۔ واقعی ہمیں ہرگز یہ حق نہیں پہونچتا کہ ہم اس کے ساتھ جو بھی چاہے کریں کیونکہ یہ محض لکڑی کا ایک بےجان گھوڑا ہے، ہنہنا نہیں سکتا، گھاس نہیں کھا سکتا، تانگہ نہیں کھینچ سکتا اور قد میں اتنا بڑا ہے کہ شطرنج کی بساط پہ بھی نہیں کھڑا ہو سکتا۔ میری عمر پچپن سال کی ہو چکی ہے اور اس گھوڑے کو سینے سے لگا کر چلتے وقت یقیناً میں مضحکہ خیز نظر نہیں آر ہا ہوں۔ لیکن یہ کاٹھ کا گھوڑا کیوں رہ رہ کر مجھے میری بیوقوفی یاد دلا [illegible]

... کسی نالے میں ڈال دوں، یا کسی بھکاری بچے کے حوالے کر دوں؟ یا اسے واپس کباڑی کی دکان پر لے جا کر پانچ روپئے میں بیچ کر باقی کے پانچ روپئے بچا لوں۔

جب تک یہ سب کچھ یا اس میں سے کسی ایک پر معاملہ طے نہیں ہو جاتا کیوں نہ اس کاٹھ کے گھوڑے پر ایک نظم کہہ ڈالوں۔

کاٹھ کا گھوڑا، کاٹھ کا گھوڑا
کھائے زیادہ، دوڑے تھوڑا

مگر یہ نظم بے بنیاد ہے، سچائی سے دور۔ کاٹھ کا گھوڑا نہ کھا سکتا ہے، نہ دوڑ سکتا ہے۔ کاٹھ کا گھوڑا صرف جل سکتا ہے اور ہر کاٹھ کا گھوڑا آخر میں ضرور جلتا ہے، راکھ کی صورت زمین سے مل جاتا ہے۔ لکڑی، کوئلہ یا فوسل بن کر دوبارہ نکل آنے کے لئے، اور کبھی کبھی ایک بار پھر لکڑی کے گھوڑے میں ڈھلنے کے لئے۔

میں ایک جگہ، ایک گھنے درخت کے نیچے ٹھہر کر (یاد رکھئے ہم لوگ اس وقت کلکتہ کے پارک سرکس میدان کے باہر سی آئی ٹی روڈ پر چل رہے ہیں، یا جہاں آپ مناسب سمجھیں!) گھوڑے کا معائنہ کرنے لگتا ہوں۔ گھوڑے کا پیلا رنگ گھس کر سفیدی مائل ہو چلا ہے اور دانتوں کا سفید رنگ سیاہی مائل، اور تیلیوں کا سیاہ رنگ تو اڑ ہی چکا ہے۔ یقیناً اسے میں نے سستے میں نہیں خریدا ہے۔ یہ تو اتنا بدرنگ اور پرانا ہے کہ اور اپنے جوڑوں پر اتنا کمزور پڑ چکا ہے کہ دس روپئے میں اسے سستا نہیں کہہ سکتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ مجھے ٹھگ لیا گیا ہے۔ یہ گھوڑا کسی بھی بچے کو پسند نہیں آ سکتا، کیونکہ بچے بالکل نئے چمکتے ہوئے کھلونے پسند کرتے ہیں، اس بات سے قطع نظر کہ ان کی قیمت کیا ہے۔ واقعی، ... کھلونے صرف بچے خرید سکتے ہیں۔ میرے جیسے بوڑھے نہیں جو صرف [illegible]

پوچھے تو بتاؤں گا کہ میں نے پانچ روپئے میں خریدا ہے۔ نہیں! اس جسامت والے گھوڑے کے لئے یہ ایک بہت ہی حقیر رقم ہے۔ تو کیوں نہ قیمت اتنی بڑھا کر بولوں کہ اس قیمت کی چکاچوندھ میں اس گھوڑے کے عیوب چھپ جائیں۔ مثلاً پچاس روپئے۔ کاش اس کا داہنا کان اوپری کنارے سے تھوڑا ٹوٹ نہ گیا ہوتا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس ٹوٹے ہوئے کان کے باوجود، ہم اسے پچاس روپئے نہ سہی، اس کی قیمت تیس روپئے تک ضرور لے سکتے ہیں۔

" واہ واہ، کیا خوبصورت گھوڑا ہے (آداب گفتگو)، کتنے میں خریدا ہے ؟

تیس روپئے میں "

بہ سستا ہے۔ میرا مطلب ٹھیک ہے، بس ذرا کان کا کونا اگر ٹوٹ نہ گیا ہوتا "

نہیں، نہیں، تیس زیادہ ہوں گے۔ بیس کہا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی خطرہ نہیں۔ اور پھر پہلی بار دکاندار نے بیس روپے ہی تو کہے تھے۔ بھلا اس کی قیمت دس روپئے کیوں ہونے لگی۔ وہ تو بھاؤ تاؤ کر کے قیمت میں نے گرا دی۔ ورنہ دکاندار کی قیمت فروخت تو بیس روپئے تھی بیس روپئے۔

تو معاملہ بیس روپئے پر طے ہو گیا۔ لیڈی برابرن کالج سے لڑکیاں باہر آ رہی ہیں۔ شاید ان میں سے ایک نے میرے گھوڑے کی طرف ہی اشارہ کیا ہے۔ انگریزی میں کچھ کہا بھی ہے۔

A MYTHICAL HORSE

واقعی۔ کہیں یہ کوئی طلسمی گھوڑا تو نہیں جو رات ایک جیتے جاگتے گھوڑے میں تبدیل ہو کر میرے گھر کی دیواریں توڑ ڈالے۔ نہیں عرصہ ہوا کہ انسان پر یہ ساری چیزیں ہونا بند ہو چکی ہیں۔ اس حد تک بند ہو چکی ہیں کہ انسان اپنی پیاس مٹانے کے لئے اسے کتابوں اور کروڑوں روپئے کی لاگت کے ساتھ پردۂ سیمیں تک لانے پر مجبور ہو گیا ہے۔ مگر مجھے بھلا ان قصے کہانیوں سے کیا کام؛ میں تو ایک ٹھوس عملی انسان ہوں اور ان چیزوں کو صرف اس حد تک قبول کرتا ہوں کہ یہ انسان کا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ مگر کیا یہ بے جان گھوڑا اتنا طاقتور ہے کہ انسان کے نفسیاتی مراحل میں مزاحم ہو سکتا ہے۔ اب ہم اس دور سے گزر رہے ہیں جب گھوڑے صرف ریس کورس میں دیکھے جا سکتے ہیں یا اکے دکے گھوڑے گاڑیوں میں جتے ہوئے جو چوڑی چکنی سڑکوں پر دلکی چال چلتے

ہوئے، عہد پارینہ اور کلکتہ کے تناظر میں انگریزی دور حکومت کی یادگار نظر آتے ہیں۔ بے چار پہیوں پر دوڑنے والی وکٹوریا، جن کے کوچوان تمام کے تمام مسلمان ہوتے ہیں یا پھر ہم گھوڑے پردۂ سیمیں پر دیکھتے ہیں جہاں وہ بہادری کے ناقابل یقین کارنامے دکھاتے نظر آتے ہیں۔ کیا واقعی گھوڑے بہادر ہوتے ہیں ؟ یا وہ اپنی جان بچانے کے لئے بگٹٹ بھاگتے ہیں، گڑھوں اور نالوں کو پھلانگتے ہیں اور سوار اپنی جان بچانے کے لئے اس کی گردن سے لپٹے ہوتے ہیں۔ آہ! میرا کاٹھ کا گھوڑا اس نقطۂ نظر سے ہرگز بزدل نہیں۔ ٹھیک ہے کہ وہ ندیاں نالے نہیں پھلانگ سکتا، گولیوں کے طوفان سے نہیں گزر سکتا، مگر آپ اس پر بزدلی کا الزام نہیں لگا سکتے کیونکہ آپ تو اسے کسی بھی انسانی یا حیوانی جذبے سے منسلک نہیں کر سکتے۔ یعنی میرے کاٹھ کے گھوڑے میں سوپرمین کی خصوصیات موجود ہیں۔ یا پھر یوں کہ آپ اسے فوق الاسپ بھی کہہ سکتے ہیں۔ فوق الاسپ یعنی ! SUPER HORSE یکایک مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا دل اس کے دل کی دھڑکنوں کو سن رہا ہو یا شاید یہ میرے اپنے دل کی دھڑکنوں کی بازگشت ہو کیونکہ لکڑی کے گھوڑے کے پاس دل نہیں ہوتا۔ لیکن کیا انسان کے پاس دل ہوتا ہے یا محض گوشت کا ایک لوتھڑا جو دوران خون سے مجبور ہو کر دھڑکتا رہتا ہے دھک دک، دھک دک،

میں کہاں جاؤں، اس کاٹھ کے گھوڑے کے ساتھ میں گھر نہیں جا سکتا، نہ ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان سڑکوں پہ بھٹک سکتا ہوں۔ مجھے اس کے لئے کوئی جواز ڈھونڈنا ہوگا۔ اس زندگی کی طرح جس کا ہمیں علم نہیں ہوتا کہ کیا مقصد ہے؟ مگر نہیں، کچھ لوگ اس مقصد سے واقف ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ان کا اپنا ایک اصطبل ہوتا ہے جس کے اندر وہ کاٹھ کا گھوڑا رکھتے ہیں۔ میں سڑک کے کنارے چائے کی ایک گندی دکان کے سامنے کاٹھ کے گھوڑے کو بنچ پر رکھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ بنچ فٹ پاتھ کے ممنوع علاقے پر دھری ہے اور راہگیروں کو دکان کے سامنے سے گزرتے وقت فٹ پاتھ سے سڑک پر اتر کر چلنا پڑتا ہے۔ لیکن ان میں سے کچھ دکان اور بنچ کے درمیانی علاقے سے بھی گزر جاتے ہیں۔ راہگیر جب میری پشت سے یعنی فٹ پاتھ سے سڑک پہ اتر کر گزرتے ہیں تو مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، مگر وہ جب میرے اور دکان

کے بیچ سے گزرتے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرا تعلق اس دکان سے مفقود ہو گیا ہو اور میں انسانی ہجوم میں ایک بینچ اور کاٹھ کے ایک گھوڑے کے ساتھ ڈھکیل دیا گیا ہوں۔ چلتے پھرتے جانے کیوں مجھے ایسا لگنے لگتا ہے جیسے راہ گیروں نے میری پشت سے جانا بند کر دیا ہے اور اب وہ میرے سامنے سے گزر رہے ہیں۔ میں بھٹی کے رخ پر بیٹھا ہوں جس پر ایک بھٹی سی کڑاہی میں دودھ ابل رہا ہے [جیسے اس کے اندر کوئی خرگوش ڈبکیاں لگا رہا ہو] میں محسوس کرتا ہوں کہ گزرتے وقت ان کی رفتار ارادتی طور پر سست پڑ جاتی ہے۔ وہ سوالیہ نظروں سے کاٹھ کے گھوڑے کا جائزہ لیتے ہیں مسکراتے ہیں یا نہیں بھی مسکراتے۔ ان کی انگلیاں ایک پل کے لئے گھوڑے کو چھونے کے لئے بے چین ہو اٹھتی ہیں۔ مگر ان کے پاس نہ تو زیادہ وقت ہوتا ہے نہ اس کا فیصلہ کہ وہ اپنی خواہش کی تکمیل میں کہاں تک جائز قرار دئے جائیں گے۔ مجھے اپنے کاٹھ کے گھوڑے پر فخر کا احساس ہونے لگتا ہے۔ آج دنیا میں ایسی چیزیں ہیں ہی کتنی جو اتنی اہمیت کی حامل ہوں کہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکیں؟ اس کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا اور اپنی اس کوشش میں کچھ تو تاریخ کا حصہ بھی بن جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ یہ کاٹھ کا گھوڑا تاریخ کا حصہ نہیں بن سکتا۔ مگر یہ جب اپنے آج میں اپنے موجود لمحے زندہ ہے تو اسے مستقبل بعید کی فکر کیوں ہو۔ میں چائے کا پیسہ چکا کر کاٹھ کے گھوڑے کو بغل میں دبا کر چل پڑتا ہوں تھوڑی دور چل کر میں پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ دکان میں بلا کی بھیڑ ہے۔ بینچ نالے میں گری ہوئی ہے اور لوگ ایک جیب کترے کو پکڑ کر اس کی خاطر کر رہے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ میرے کاٹھ کے گھوڑے کا کارنامہ ہے مجھے اس کے لئے افسوس ہوتا ہے۔

شام ہو چکی ہے۔ یہ شہر کا ایک ایسا علاقہ ہے جہاں اب بھی گھنے درخت دستیاب ہیں جن کے پتّوں سے چھن چھن کر کارپوریشن کی روشنیاں فٹ پاتھ پر متحرک راہگیروں پر ٹھہر رہی ہیں۔ میرے داہنی جانب لیڈیز پارک ہے، بائیں جانب نیشنل میڈیکل کالج کے طلباء کا ہاسٹل جو اب ہاسٹل کم اور بھوتوں کا مسکن زیادہ نظر آتا ہے۔ شاید ایسا اس لئے ہے کہ اب میڈیکل کی ڈگری لوگوں کو متاثر نہیں کرتی۔ ڈاکٹر اتنی بھاری تعداد میں اُگ آئے ہیں کہ آلو پیاز کی طرح سستے لگنے لگے ہیں۔ گرچہ ان میں سے کچھ زندگی سے بھی زیادہ مہنگے ثابت ہوتے ہیں، ریس کورس میں دوڑنے والے گھوڑے کی طرح۔ مگر ہر ڈاکٹر ریس کورس کا گھوڑا نہیں ہوتا۔ کچھ کاٹھ کے گھوڑے بھی ہوتے ہیں، اور کچھ کباڑی کی دکان پر بکتے ہیں۔ بھئی، یہ تو حد ہو گئی۔ اب مجھے اس کاٹھ کے گھوڑے کے بارے میں کوئی فیصلہ کر ہی لینا چاہئے۔ آخر قارئین کب تک اس کاٹھ کے گھوڑے سے دلچسپی لیتے رہیں گے۔

تو ــــ ایک لمحے کے لئے اس کاٹھ کے گھوڑے کو بھول جاتے ہیں اور حضرات اس فرصت کو غنیمت جان کر کیوں نا تھوڑا سا اپنا تعارف ہو جائے۔

میں شجاعت ملا ہوں، ایک بڑا ہی پھسپھسا سا انسان، جس نے زندگی بھر صرف سرکاری نوکری کی ہے اور بس۔ کہنے کے لئے دو ایک باتیں اور بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ میں نے اپنی مادری زبان بنگلہ میں چند کہانیاں بھی لکھی ہیں جنھیں کہ کبھی چھپوانے کا موقع نہیں ملا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ یہ تمام کہانیاں صرف کوّوں پر لکھی گئی ہیں۔ ایک بھی گھوڑے پر نہیں۔ کوّوں کے علاوہ ان کہانیوں میں اور کوئی کردار ہے ہی نہیں۔ اسی لئے تو انھیں میں سب سے چھپائے رکھتا ہوں۔ دراصل، جانے کیوں، اس کے باوجود کہ، اور اس کا کیا کیا جائے کہ ذہنی طور پر اس بات کے لئے پوری طرح تیار رہتے ہوئے بھی کہ میں قلم صرف انسانوں پر لکھنے کے لئے اٹھاتا ہوں، اختتام کے بعد جب میں اپنی کہانیوں کو پڑھتا ہوں تو ان میں صرف کوّے ہی کوّے ملتے ہیں، انسان اشرف المخلوقات کا ان میں دور دور تک پتہ نہیں ہوتا۔ میں تو کئی بار انھیں جلانے کی ناکام کوشش بھی کر چکا ہوں، مگر آسمان پر اڑنے والے کوّوں کی طرح میرے تخلیق کئے ہوئے کوّے بھی بڑے ڈھیٹ ثابت ہوتے ہیں۔ اگر اس وقت میں اس گھوڑے کے ساتھ اٹک نہ گیا ہوتا تو آپ کو ان کوّوں کی کہانیاں ضرور سناتا۔ کوّے جو آپ کے ارد گرد منڈلاتے رہتے ہیں مگر آپ انھیں نہیں دیکھتے۔

تو فی الحال اس گھوڑے پر قناعت کی جائے۔ کاٹھ کے اس گھوڑے پر۔

تو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ کاٹھ کا گھوڑا میرے لئے واقعی ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ کب تک میں اسے اپنے

ساتھ چپکائے رکھوں گا؟ اس کے اندر خوبیاں دریافت کرتا رہوں گا اس کی قصیدہ خوانی کرتا رہوں گا جب تک۔ اسے کباڑی کے پاس بیچنے والا اس پر مرثیہ بھی پڑھ چکا ہوگا۔ مگر فی الحال تو میرے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ اسے لے کر گھر کے اندر داخل ہونے کا ہے۔ الو بجر کیا سوچے گا؟ اور میری بیوی؟

پہلے تو اسے اس کاٹھ کے گھوڑے میں یقین نہیں آئے گا۔ پھر وہ میری طرف مشتبہ اور لایعنی نظروں سے دیکھے گی۔ ممکن ہے کچھ کہہ ڈالے۔ مگر گمان غالب ہے کہ وہ خاموش رہے گی۔ اور اس کی اس خاموشی کا میں سامنا نہیں کر سکتا۔

کاش! ہمارے گھر میں ایک چور دروازہ ہوتا۔ پھر تو میں اس چور دروازے سے اندر داخل ہو کر اپنے کباڑ خانے میں آ چھپا دیتا۔ چور دروازے اور کباڑ خانے! کلکتہ جیسے شہر میں یہ تصور سے باہر کی چیزیں ہیں ایک طرح کی عیاشی۔ خیر کوئی بات نہیں، انسان چاہے تو کیا نہیں کر سکتا۔ وہ تو سامنے کے دروازے تک کو چور دروازے میں بدل سکتا ہے: میں بیوی سے کہہ دوں گا یہ کاٹھ کا گھوڑا میرے ایک دوست کی امانت ہے۔

ٹنگ ٹانگ۔

میری بیوی دروازہ کھولتی ہے۔ لایعنی نظروں سے میری طرف تاکتی ہے۔ گذشتہ پچیس برس سے میرے ساتھ رہتے رہتے وہ تھک چکی ہے۔ ہندوستانی عورت ہے، قبر تک میرا ساتھ دینے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی ہے۔

"یہ کیا خرافات اٹھا لائے؟" وہ کہتی ہے۔

"کاش!" میں کہتا ہوں "بیگم اتنی جلد کسی نتیجے پر پہنچنا اچھا نہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو، میں نے یہ کاٹھ کا گھوڑا اپنی مرضی سے خریدا ہے؟ بیگم تھوڑی دیر رک جاؤ، میں تمہیں اس گھوڑے کی کہانی سناتا ہوں۔"

"تم نے کبھی کوئی کام کی بات نہیں کی۔" بیوی کہتی ہے۔

میں گھوڑے کو صوفے کے کنارے رکھ کر مسکراتا ہوں۔

"کام کی بات کرنے کے لائق دنیا میں آج تک میں نے کوئی قصہ پیش آتے نہیں دیکھا۔"

"اچھا یہی سہی!" میری بیوی کہتی ہے "چلو تمہاری کہانی سنی جائے۔ مگر پہلے میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں مگر کیا چائے پی کر آئے ہو؟"

"ہاں! پی کر آیا ہوں، مگر ایک کپ اور پیوں گا۔ شکریہ" میں پیالے تھامتے ہوئے کہتا ہوں۔ "دراصل آفس سے واپسی پر اکثر میں اس کاٹھ کے گھوڑے کو دیکھا کرتا تھا۔ بیگم زندگی جب ایک ہی ڈھرے پر چل نکلے تو وقت کسی چٹان کی طرح راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اسے سر کرنے کے لئے انسان کسی نہ کسی چیز کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لوگ اس کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے۔ پھول اگانے سے لے کر خون کرنے تک اور سمندر کی تہہ میں اترنے سے لے کر خلاء میں رنگ ریزی تک۔"

"تم ہمیشہ کے فلسفی، کبھی تو انسان بنو۔"

"نا بیگم، نا۔ جب تم نے حامی بھر لی ہے تو تمہارا اخلاقی فرض ہے کہ کہانی سنو۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے یہ گھوڑا خرید لیا کیونکہ مجھے لگا یہ مجھے چٹان کے اس پار لے جائے گا جہاں زندگی کے کچھ ان دیکھے لمحے اب بھی باقی ہیں۔"

"یہ کاٹھ کا گھوڑا؟" بیوی ہنستی ہے۔

"ہاں اس لئے کہ یہ کاٹھ کا گھوڑا ہے۔ گوشت پوست کا جیتا جاگتا گھوڑا نہیں جسے لوگ ریس کورس میں دوڑاتے ہیں اور جس کی دم سے آگے بالوں کو چوم کر رہ جاتے ہیں۔ کاٹھ کا گھوڑا اپنا ایک مزاج رکھتا ہے بیگم۔ یہ اپنے آپ میں ایک مکمل اکائی ہے جس میں ماضی حال اور مستقبل ضم ہو جاتے ہیں۔ یہ ابتدا اور انتہا سے ماورا بھی ہے اور رفتار کے روایتی عمل سے بعید بھی۔ یہ دنیا کی نفی کرتا ہے اور پورے فلکیاتی نظام کو منتہاؤں کے سپرد کر کے اپنے نہ ہونے کا عمل جاری رکھتا ہے۔ یہ ہمیں ایک ایسی جہت میں لے جاتا ہے جہاں صرف بچے جا سکتے ہیں یا شاید وہ بھی نہیں جا پاتے۔"

"اول تو اس میں مجھے کوئی کہانی نظر نہیں آتی۔ دوسرے بچے اس گھوڑے پر بیٹھ کر اصلی گھوڑے کا خواب دیکھتے ہیں یہ صرف ایک ڈمی ہے بوڑھے، ایک پراسی اور تمہارا ذہن بہک گیا ہے۔"

"کہانی۔" میں کہتا ہوں "واقعی بیگم، حیرت کا مقام ہے کہ تم اب بھی الف لیلیٰ اور داستان امیر حمزہ کی آنکھوں سے اس گھوڑے کی کہانی کو دیکھ رہی ہو۔ تم نے اس طرح کبھی نہیں دیکھا

جواب بھی اس کی پیٹھ پر بیٹھا اسے مہمیز لگا رہا ہے۔"

"اوہ، اوہ۔ میں سمجھ گیا۔ تم سمجھ رہی ہو، وہ بچہ میں ہوں۔ بہتر ہے، اس کاٹھ کے گھوڑے کو پرے رکھو۔ ٹی وی پر نو بجے کا پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ اسے دیکھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ پھر وقت ملے گا تو اس کا تذکرہ لے بیٹھیں گے۔ ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں!"

اس رات ایک دوسرے میں گم ہوتے ہوئے میں نے.... بیگم کی آنکھوں میں چند نادیدہ لمحوں کو جاگتے دیکھتا ہوں۔ پسینے کی بوندیں اس کی تنگ پیشانی اور ناک پر ابھر آئی ہیں۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ کی لکیر بن گئے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ جنسیاتی عضلات اپنے کام میں مصروف ہیں، وہ شاید کچھ اور ہی سوچ رہی ہے۔

"جانتے ہو.... " وہ میرے سر کے پچھلے سرے کو دونوں ہتھیلیوں سے تھام کر میرے چہرے کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہتی ہے۔ "مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے کاٹھ کے گھوڑے کی آنکھیں جاگ رہی ہیں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اور مجھے یہ اچھا لگ رہا ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے اندر کا خلا بھر رہا ہے۔"

"عورت.... " میں.... اس کے وجود میں پوری طرح ضم ہوتے ہوئے کہتا ہوں۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس عمر میں تمہارے اندر یہ بات بھی نظر آئے گی۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ کسی بھی چیز کے لئے ہم اس کاٹھ کے گھوڑے کے ممنون ہیں۔ یا طویل عرصہ کے انجماد کے بعد یہ ایک نئی زندگی کی شروعات ہے یا کہکشاں ایک نئے ستارے کی تخلیق کر رہا ہے۔"

"مگر مجھے یقین تھا، مجھے یقین تھا۔" وہ مجھے پاگلوں کی طرح چوم رہی ہے۔ "تم کسی دن یہ کرشمہ ضرور کر دکھاؤ گے۔ تم ایک حیرت انگیز انسان ہو۔ تم نے زندگی کو ہمیشہ ایک نئے معنی سے ہم کنار کیا ہے مجھے یقین ہے۔ میرے تخلیقی مرکز کے آسمان پر آج تمہارے ستارے ضرور پہنچ پائیں گے۔"

زندگی کو نئے معنی سے ہم کنار کون نہیں کرنا چاہتا بیگم، مگر کوئی زندگی کو واقعی زندگی کا مقام دے کر تو دیکھے۔ اور ستارے کتنے بھی لمبے سفر میں کیوں نہ ہوں، وہ کہیں نہیں جاتے۔ اکثر ہم ان کی جھوٹی روشنیوں کے سہارے خود کو دلاسا دیتے رہتے ہیں جب کہ ان کا وجود قرنوں قبل منتشر ہو چکا ہوتا ہے۔

دو ماہ بعد، میں کاٹھ کے گھوڑے کو چپ چاپ کباڑی کی دکان میں واپس بیچ آتا ہوں۔ اس سے ہماری ازدواجی زندگی میں کوئی فرق تو نہیں آتا مگر اس سال گرمی کی تعطیل میں جب ہمارے دونوں لڑکے جو ہماری تمام کوششوں کے باوجود دھند کی چادر سے باہر آ ہی جاتے ہیں اور جنھیں میں رد نہیں کر پاتا، اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ہمارے ساتھ ٹھہرنے آتے ہیں تو میری بیوی کاٹھ کے گھوڑے کا ذکر ان کے ساتھ لے بیٹھتی ہے۔

"رات گہری ہو جانے پر اس کی آنکھیں زندہ ہو جاتی تھیں۔"

"کیا سچ!، تو یہ طلسماتی گھوڑا ہی تھا پاپا۔" میری چھوٹی بہو پوچھتی ہے۔ جو شاید دلی کی کسی یونیورسٹی میں ڈپارٹمنٹ آف آرکیالوجی سے منسلک ہے کیونکہ مجھے اس کے چہرے سے ایسا ہی لگتا ہے۔

"اس سے پوچھو، میں نے تو نہیں دیکھا۔" میں دیوار کی طرف جھک کر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہتا ہوں۔ "عورت اب بس بھی کرو، بچے بور ہو رہے ہوں گے۔"

"اور ایک دن وہ کاٹھ کا گھوڑا اچانک غائب ہو گیا۔" میری بیوی مجھے ان سن کرتے ہوئے کہہ رہی ہے۔

"میں اسے واپس کباڑی کی دکان میں بیچ آیا ہوں، آدھی قیمت پر۔ جہاں اب بھی وہ رکھا ہے کیونکہ اسے اور کوئی خریدنے والا نہیں۔ اور بیگم میں نے جانے کتنی بار تمہیں بتایا ہے۔"

اس رات میری بیوی.... مجھے جگا کر کھڑکی سے باہر اشارہ کرتی ہے جہاں چاندنی سے لبریز بادلوں میں تارے دھندلے چمک رہے ہیں۔

"تم کچھ دیکھ رہے ہو؟" ——— "ہاں"

"یہ نادہی، کاٹھ کا گھوڑا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ مگر وہ مسکرا رہی ہے۔ میں.... ٹیبل لیمپ جلا کر اس کی جھریوں کا جائزہ لیتا ہوں پھر باہر نظر دوڑاتا ہوں۔

"ہاں! میں دیکھ سکتا ہوں۔" میں.... ٹیبل لیمپ بجھاتے ہوئے کہتا ہوں۔ "وہ کاٹھ کا گھوڑا ہمیشہ اس چاند کے ہالے میں دکھائی دیتا ہے تم میرے سینے سے لگ کر اسے محسوس کر سکتی ہو۔ اور جان! ہم اکیلے نہیں ہیں۔ تمہاری کوکھ سے بچے نہیں ہوئے تو کیا ہوا، ہم سے یہ چاند تو کوئی نہیں چھین سکتا۔ ہم اپنا دریچہ کھول کر چاند سے ہمیشہ اس کاٹھ کے گھوڑے کو ادھار لے سکتے ہیں۔ دنیا کیسی بھی ہو اتنی بھی بے رحم نہیں کہ ہمارے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو تراش لیں ✿"

ہائیکو

نسیم سحر

کانٹے چن چن کر
زخمی ہو جاتے ہیں ہم
باتیں سن سن کر

◆

ساون آنکھوں میں
آکر بیٹھ گیا گویا
ہجر کی راتوں میں

◆

اچھے موسم میں
کانٹوں کو بھی دیکھو تو
اچھے لگتے ہیں

◆

سورج کے آگے
ہم نے آپ کھڑی کر لیں
برف کی دیواریں

◆

برف پگھل جائے
یہ خواہش تو ہے لیکن
جسم نہ جل جائے!

◆

مایوسی کی دھول
خوابوں کے گلدستے میں
سارے سوکھے پھول!

◆

اتنے رنگ بکھرے
ہم نے زمیں کے خاکے میں
خود بے رنگ ہوئے

◆

اکثر ہی اب کیوں
پوچھتا رہتا ہوں خود سے
کیا میں زندہ ہوں؟

● P.O. BOX 5925, JEDDAH-21432 (SAUDI ARABIA)

قاضی رئیس

دوہے

کنٹھ کنٹھ میں چیخ ہے کنٹھ کنٹھ میں گیت
جیسی انگلی ساز پر ویسا ہی سنگیت

◆

ممتا ساگر پیار کا بہتا میت بہاؤ
جس نے جانا راز یہ لگے کنارے ناؤ

◆

منکا پھیرے بے نظر من اترے نہ نور
موسیٰ درشن کر گئے ملّا کھوجے طور

◆

تو ہی دشمن ہے مرا تو ہی میرا میت،
تجھ سے جیتیں ہار ہے تجھ سے ہاروں جیت

◆

جھوٹی شہرت شہر میں مکھ دیکھی پہچان
سچا ہے فنکار تو دے نہ اس پہ دھیان

● ا لبیرا - ۹۱، باری کالونی، اورنگ آباد (مہاراشٹر)



سجاد مرزا

نہ اس سے کہنا

نہ اس سے کہنا
کہ آج کی شب اداس چہرہ اجال دیکھے
نہ اس سے کہنا
کہ برف آنکھوں میں چاہتوں کے ہلال دیکھے
نہ اس سے کہنا
کہ برف رت میں ہرے درختوں کی چھال دیکھے
نہ اس سے کہنا
کہ اپنی دھرتی کا حسن دیکھے جمال دیکھے
نہ اس سے کہنا
کہ جا کے پردیس اپنے گھر کا بھی حال دیکھے!
نہ اس سے کہنا
کہ اپنے ماضی کی عظمتوں کا کمال دیکھے
نہ اس سے کہنا
کہ سرد موسم میں ہجرتوں کا ملال دیکھے
فقط یہ کہنا
کہ اپنی آنکھیں ہماری آنکھوں میں ڈال دیکھے

● ۲- گوبند گڑھ- گوجرانوالہ (پاکستان)

مبین صدیقی
قلعہ گھاٹ کالونی، دربھنگہ - ۸۴۶۰۰۴



"اگر فردوس بر روئے زمیں است"

تعارف :- جنگل، بلند قامت درخت، جھاڑیوں کا ہجوم۔ مختلف علاقہ مناظر، روشنی اور موسیقی کی مختلف جہتیں اور پراسرار ماحول۔

— پہلا منظر —

[اسٹیج صبح کی حسین جھلملاتی کرنوں میں نہایا ہوا، ہلکے ہلکے کہرے میں چھپی برفیلی پہاڑیاں،
زندہ پہاڑیوں کے ماتھے پر رقصاں جھرجھر .... جھرنے!
رنگ برنگے خوبصورت درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلۂ حسن،
درختوں میں من موہک پھلوں اور پھولوں کے حسین جھرمٹوں کی اٹھکیلیاں،
پھولوں، پھلوں اور پاغوں پر ٹپکتی، چمکتی جھرجھر برفیلی موتیوں سی بوندیں
منظر، مدہوش، رومانی فضا،
............،
چڑیوں کی چہچہاہٹ اور ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ،
"چوں۔ چوں"
"پھڑ۔ پھڑ"
یک لخت،
چڑیوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ، چوں چوں کرتی کھلی چونچیں اور پہاڑوں کا حسن سب ایک دم سے ساکت! اور ان ساکت نظاروں کے درون سے رفتہ رفتہ جیسے نمودار ہوتا اور ٹھہر ٹھہر کر ابھرتا، گونجتا ہوا یہ شعر

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

پردہ!]

— دوسرا منظر —

[طویل اسٹیج کے ایک چھوٹے سے کونے میں بہت چھوٹا سا ابھرتا اور چمنستان کا ایک ذرا بھر نظارہ! بقیہ حصوں میں کھلے میدان کی ہریالی

اسٹیج کے دوسرے کونے میں پھلوں سے لدا، ہواؤں میں جھومتا پھلوں کی مدہوش کن خوشبو بکھیرتا ایک بہت بڑا تناور درخت، جس کے چاروں طرف سخت دھوپ ہے۔

اسٹیج کے تیسرے کونے سے ایک جنگلی نمودار ہوتا ہے۔ کافی ہراساں اور پسینے میں شرابور ہے۔ قوی ہیکل نیم برہنہ جنگلی۔ وہ عجیب سی چال چلتا ہوا درخت کے سائے میں آکر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگتا ہے۔ لیکن درخت کے سائے میں آنے کے بعد اس کی وحشت کچھ کم ہوتی ہے۔ چہرے کا خوفناک اتار چڑھاؤ بھی رفتہ رفتہ طمانینت میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ جھومتے پھلدار درخت کی خوشبو ہوتے ہوئے اسے مدہوش کئے دیتی ہے۔ کچھ ہی لمحوں میں اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگتی ہے کہ معاً ایک بڑا سا پھل پیڑ سے ٹپک کر اس کے سر پر گرتا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر آنکھیں کھولتا ہے اور اس کی تیز تیز نگاہیں سر سے پھسل کر زمین میں لڑھکتے ہوئے پھل پر جم جاتی ہیں۔
منظر ساکت / وقفہ]

[کچھ لمحوں کے بعد،
اس کی نگاہیں جوں کی توں پھل پر،
بار بار وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے،
جھک کر پھل کو زمین سے اٹھاتا ہے،
ٹٹولتا ہے،
اور کسی بھوکے بھیڑیے کی مانند اس پر ___،
"چپ، چپ، چپ"
منظر ساکت / وقفہ]

[کچھ لمحوں کے بعد ___،
اس کی کھچڑی داڑھی اور ہونٹوں سے پھل کا رس ٹپکتا ہے۔

اور وہ ،
نگاہیں اٹھائے ، ہونٹوں پر زبان پھیرتا ،
بڑی حسرت سے ،
درخت کے دوسرے پھلوں کو دیکھ رہا ہے ایک ٹک ، ایک ٹک.....
منظر ساکت / وقفہ]

[کچھ لمحوں بعد — ،
یکایک وہ ایک جھٹکے کے ساتھ درخت کی جڑ کی طرف مڑتا ہے ۔ درخت کو نیچے سے اوپر تک بہت تیز نگاہوں سے گھورتا ہے ۔ پھر جیسے غیر شعوری طور پر اپنے پاؤں زمین پر پٹکتا ہوا درخت کے گرد چکر کاٹنے لگتا ہے ۔ درخت کی جڑ میں بہت منظم طریقے سے نوکیلے باڑ لگائے گئے ہیں جن کا سلسلہ درخت کے ساتھ بہت بلندی تک جاتا ہے —— درخت کے گرد چکر کاٹتا ہوا وہ ایک لمحہ کو رکتا ہے نوکیلے باڑ پر نگاہ ڈالتا ہے ۔ یہاں تک کہ نوکیلے باڑ کے ساتھ ساتھ اس کی نگاہ درخت کی انتہائی بلندیوں تک جا کر اٹک جاتی ہے ،
منظر ساکت !
وقتِ غروبِ آفتاب !
دھند کی آمد آمد !
پھیلتے ، کانپتے اندھیرے
ڈوبتا اسٹیج !

پردہ !!]

—— تیسرا منظر ——

[اسٹیج پر صبح کی سفیدی چھائی ہوئی ہے ۔ اور ایک کونے سے سفیدی کو چیرتی ہوئی سورج کی آڑی ترچھی کرنیں جھلملا رہی ہیں ....
درخت کی جڑ میں جنگلی بے سدھ پڑا ہوا ہے اور سورج کی تیز تیز کرنیں اس کے جسم پر جیسے دستک دے رہی ہیں ،
چھن — ،
چھن — ،
چھن — ،
معاً پھر ایک بڑا سا پھل اس کے اوپر گرتا ہے ۔ وہ چونک کر اٹھتا ہے پہلے آنکھیں ملتا ہے ، پھر اپنی لال آنکھوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے اور پھر چونک اٹھتا ہے ،
پھل ہی پھل —— ،،

اس کے چاروں طرف درخت سے جھڑے ہوئے پھل بکھرے پڑے ہیں ۔ ایک لمحہ کو خوشی اس کے چہرے پر کوندتی ہے ، ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا انہیں ٹٹولتا ہے اور — ،
" چپ ، چپ ، چپ "
منظر ساکت / وقفہ]

[اس کی کھچڑی داڑھی اور ہونٹ پھل کے رس سے بھیگے ہوئے ہیں مگر اس کی ہوسناکی میں کوئی کمی نہیں ۔ وہ اسی درندگی کے ساتھ تن کر کھڑا ہوتا ہے ۔ عجیب سی وحشت کے ساتھ درخت کے چکر کاٹتا ہے اور دو تین چکروں کے بعد تقریباً چونک کر اپنی کمر ٹٹولتا ہے ۔ پھر جیسے مطمئن ہونے کے بعد کمر سے بندھی اپنی کلہاڑی نکال کر ، ہاتھوں میں تولتا ہے ۔ ایک نظر اپنی تیز چمکیلی کلہاڑی پر ڈالتا ہے ، ایک درخت کی جڑ سے لپٹے نوکیلے باڑ پر اور ایک جھٹکے کے ساتھ درخت پر حملہ — ،
" کھینچ ! — ،
" آآآ — ،
وہ ایک دم سے گھبرا کر ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہے ۔ کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر جاتی ہے ۔ خوف اور دہشت سے کانپتا ہوا کبھی وہ درخت کی جڑ کو دیکھتا ہے ۔ کبھی دور دور تک ویران گرد و پیش کو — ،

منظر ساکت / پردہ]

—— چوتھا منظر ——

[اسٹیج پر روشنی کبھی پھیلتی ہے ، کبھی ایک دم سے سکڑ جاتی ہے موسیقی لرزہ براندام —— نیم تاریکی اور نیم اجالے کے درمیان اسٹیج پر جنگلیوں کا ایک ہنگامہ خیز ہجوم اپنے اپنے ہاتھوں میں بھالے برچھی ، تلوار اور کلہاڑیوں کے ساتھ درخت پر حملہ آور ہیں ۔ بیک وقت سیکڑوں وار اور ہزاروں چیخیں — ،
" کھچ ، کھچ ، کھچ ، کھچ ، کھچ "
" آ ، آ ، آ ، آ ، آ ، آ ، آ ، آ — "
کسی نے پھل پر زبان چلایا اور کسی معصوم بچے کی چیخ فضا میں گونج گئی — درخت کی شاخوں کو ایک دوسرے سے ملا کر اس طرح رسیوں سے جکڑ دیا گیا ہے جیسے بہت سے انسانوں کے ہاتھ پاؤں ایک دوسرے سے ملا کر باندھ دئے گئے ہوں ۔ درخت کے

[باقی صفحہ ۷۷ پر]



حامد اقبال صدیقی

کوئی نہیں تھا ہنر آشنا تمہارے بعد
میں اپنے آپ سے الجھا رہا تمہارے بعد
یہ میری آنکھیں بڑی تیز روشنی میں کھلیں
میں چاہتا بھی تو کیا دیکھتا تمہارے بعد
ہر ایک بات ہے الجھی ہوئی زباں تلے
ہر ایک لفظ کوئی بد دعا تمہارے بعد
بس ایک لمحۂ ہجراں ٹھہر گیا مجھ میں
نہ واقعہ، نہ کوئی سانحہ تمہارے بعد
تو کیا کشش بھی مری لے گئے، تم اپنے ساتھ
کوئی تو دیکھتا چہرہ مرا تمہارے بعد
یہ زندگی کا نیا زاویہ کھلا مجھ پر
میں خود سے کتنا قریب آ گیا تمہارے بعد
بڑے قرینے سے رشتے سجائے تھے سارے
بکھر بکھر گیا ہر سلسلہ تمہارے بعد
مرے مزاج کی یہ بے اصولیاں چاہیں
تمہارے جیسا کوئی دوسرا تمہارے بعد
تمہارے بعد خزاں ہو، بہار ہو، کچھ ہو!
کہاں رُتوں سے مرا رابطہ تمہارے بعد
وہ رنگ رنگ طبیعت، سخن سخن حامدؔ
سنو! وہ شخص کہیں کھو گیا تمہارے بعد

● ۲۲۸-۲۰۲، دریا محل بلڈنگ، تیسرا منزلہ روم نمبر ۱۳، پی۔بی مارگ بمبئی ۴۰۰۰۰۴



ریاض لطیف

جو بکھرا تھا بدن میں وہ منظم ہو نہ پایا
خلا کا لمس صدیوں میں مجسم ہو نہ پایا

رگوں کی تنگ گلیوں میں بھٹکتا ہی رہا وہ
زمانوں کا لہو لیکن کبھی نم ہو نہ پایا

مری پہنائیاں مفہوم اپنا کھو چکی تھیں
میں اپنے آپ میں لیکن فراہم ہو نہ پایا

ادھوری کائناتوں کو سمٹتے دیکھتا ہوں
یہاں بھی سلسلہ اپنا مسلم ہو نہ پایا

کئی مسمار دنیاؤں کا مجھ میں گھر تھا پھر بھی
میں اپنے سانس کی دھرتی پہ پیہم ہو نہ پایا

ریاض اپنی اڑانوں کا فلک بھی منفرد ہے
سمٹتا ہی گیا لیکن کبھی گم ہو نہ پایا

● ۴۔ ڈانڈی گرہ پول، کالو پور، احمد آباد ۳۸۰۰۰۱ (گجرات)



شاهد لطیف

لوگوں سے دوستی کی، پہاڑوں کو سر کیا
میں نے ترے خیال کے آگے سفر کیا

وہ شب کہ پھوٹتی تھی ہر اک شے سے روشنی
میں نے اس ایک شب کو مسلسل بسر کیا

رکھتا چلا گیا ہوں تری راہ میں چراغ
تجھ پر اعتبار تجھے معتبر کیا

اپنی زمیں پہ نہ رہی اپنی ہی گرفت
لوگوں نے آسماں کی طرف کیا سفر کیا!

تنہا رہے تو بکھرے خیالوں کے درمیاں
اکثر تجھے تلاش کیا، گھر کو گھر کیا

تم بھی تو جی رہے ہو خسارے کی زندگی
ہم سے تعلقات کا سودا اگر کیا

● معرفت روزنامہ انقلاب ۱۵۶، ڈی۔ این روڈ، بمبئی

مکتوبات

★ افسر نسیم، [illegible] حیدرآباد-۲

[شما]رہ بہت عمدہ ہے۔ اداریہ لاجواب ہے۔ افسانوں اور [غزلو]ں کا انتخاب بھی خوب ہے۔ محمور سعیدی کی غزلیں اور [...] لال ذاکر کی غزل نے متوجہ کیا۔ اور سب سے زیادہ لائق [تحسین] ہے افسانہ "میری فرینڈس..." بے ساختہ آپ سے مل کر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

★ [قاس]م انور، ۱۳ آئی [illegible] روڈ، کلکتہ-۲۳

شاعر پابندی سے نکل رہا ہے اور ہر شمارہ ترقی کی منزلیں [طے ک]ر رہا ہے۔ اور یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ تحسین آمیز جملے [لکھنے کا] مجھے شوق نہیں ہے۔ پتہ نہیں کیوں شاعر سے ایک [...] لگاؤ سا رکھتا ہوں۔ حالانکہ ہم ایسے نوجوانوں کیلئے 'شب [...]' ہی سب کچھ ہے۔ لیکن آپ کے حسن ترتیب نے اپنے [پڑھ]نے والوں کا ایسا ذہن بنادیا ہے کہ وہ "شاعر" کے گرویدہ [ہو] گئے ہیں۔ 'تجربات' کے تحت آپ جو اداریے لکھ رہے [ہیں و]ہ قابل ستائش ہیں۔ ان اداریوں میں جو تلخی ہے، جو [...]ن ہے، اس کی اس دور میں ضرورت بھی ہے۔ اردو کے [...] سے مسائل کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے۔ اس پر [...]ی سے اہل فکر کو غور کرنا چاہئے۔ تازہ شمارے کا اداریہ بھی [...] تلخ حقیقت ہے۔

★ منصور سبزواری، نوح، ضلع گوڑگاؤں (ہریانہ)

برادرم اسلم حنیف نے 'شاعر' شمارہ ۶ میں میری ایک [غزل] کے مطلع پر جو اعتراض کیا ہے، وہ صحیح ہے۔ ہوا یوں کہ [...] "کا ایک کین SLIP OF PEN کے باعث ہو گیا ہے لیکن میرے [...] مسودے میں یہ مصرع یوں لکھا ہوا ہے:

[...] راکھ ہوا ہوں ، باہر سے تابندہ ہوں

[اس] مصرعے کو یوں بھی لکھا جاسکتا ہے

اندر راکھ ہوں ، باہر سے تابندہ ہوں

[...]ر اور سودا کے اتباع میں فعل کا استعمال، وہ محل نظر [نہیں] ہے۔ تازہ شمارے میں محمور سعیدی کی چاروں غزلیں [...] جاندار ہیں۔ حامدی کاشمیری کا مضمون 'معاصر اردو تنقید' [...] ایماندارانہ شکایت ہے۔ ہمارے تنگ نظر، گروہ بند [نقاد]وں پر اس کا اثر ہونے سے رہا۔ اب تو تخلیق کاروں کو [چاہئ]ے کہ خود احتسابی کا عمل تیز کریں اور نقادوں کی بیساکھیوں کو [پھ]ینکیں۔ کشمیری لال ذاکر اور تمثیل شاداب کی غزلیں [...] ہیں۔

★ فیاض رفعت، سٹیشن ڈائرکٹر، [illegible]

[اس] شمارے میں مظہر امام، ساجد حمید، راج نرائن راز اور [...] کا کلام بطور خاص پسند آیا۔ سلطان جمیل نسیم کی کہانی '[...]' عصری منظر نامے کی دلدوز تصویر کشی کرتی ہے۔ ایسے کی زندگی باہر ہمارے دل و جگر میں نوک سناں کے مانند اترتی چلی جاتی ہے۔ انسانی زوال کی تمام تر وحشت جس حسن و اہتمام کے ساتھ کہانی میں پیش کیا ہے اس کے لئے سلطان جمیل نسیم مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد [illegible] کی کہانی "میری فرینڈس..." [illegible] کی شگفتگی کیلئے یاد رکھی جانے کی۔ ساجدہ رشید کی کہانی کا اسلوب بھی پر کشش ہے۔ محمور سعیدی کی چاروں غزلیں قوت نمو کے اعتبار سے لاجواب ہیں۔ ایسی دلدوز غزلیں کم کم ہی ہو پاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ چاروں غزلیں اپنے ڈکشن اور تازہ احساس و افکار کے اعتبار سے غیر معمولی ہیں۔ تمہارے شذرات لوگ توجہ سے پڑھنے لگے ہیں۔ [illegible] دو زبان آگئی ہے۔

★ منظور ہاشمی، اے-۱، نذیر احمد روڈ، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

تازہ شاعر میں جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ کی غزل میں ایک پورا مصرع عرفان صدیقی کی مشہور غزل کا آگیا ہے۔ عرفان صدیقی کی غزل جو ان کے شعری مجموعے 'سات سماوات' میں شامل ہے۔ اس غزل کا شعر ہے

اے خدا کتنے کو ہے تو بیے زمیں کا رابطہ
دیکھ میں دست دعا ہوں اور تم ہونے کو ہوں

موصوف نے "میں" کی جگہ 'اب' رکھ دیا ہے۔ آج کل غریب اردو شاعری پر ایسا وقت پڑا ہے کہ اچھے رسائل کے مدیران گرامی بار بار اعلان فرماتے ہیں کہ خبردار انہیں شاعری نہ بھیجیں کہ غزلوں، شاعری کی بھیڑ دروازے پر کھڑی دستک دے رہی ہے اور منتظر ہے کہ مدیر محترم کی نگاہ انتخاب اس پر پڑ جائے اور وہ اسے شائع فرماکر تمام شعراء پر احسان فرمائیں۔ شاعری کی ایسی ناقدری اور تحقیر تو کلیم الدین احمد نے بھی نہیں کی۔ میری تجویز یہ ہے کہ جو مدیران محترم اردو شاعری سے پریشان ہیں، وہ اپنے رسائل میں شاعری بالکل شائع نہ کریں تاکہ ان کا یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

★ شاکر [illegible]، بھوپال۔

شمارہ نمبر ۶ میں پروفیسر حامدی کاشمیری کا مقالہ 'معاصر اردو تنقید۔ چند سوالات' لاجواب ہے۔ یہ مقالہ تنقید کے موضوع پر خاص اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ ایک معاصر اردو نقادوں پر بے لاگ تنقید کرتے ہوئے بغیر کسی خوف کے ان کو آڑے ہاتھوں بھی لیا ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ آپ سے اور مقالہ نگار سے ناراض بھی ہو جائیں۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ اس مقالہ کو پڑھنے کے بعد نقاد حضرات کم از کم نئی نسل کے قلمکاروں پر اب ضرور توجہ دیں گے۔ شفیقہ فرحت صاحبہ کا خط پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ بھی [...] بننے کی تیاری میں ہیں۔ ساجدہ رشید کا افسانہ "[...]" ایک اچھا تجربہ ہے جبکہ پلیٹ فارم پر دیپک کا قرض ذرا بھی متاثر نہ کرسکا۔

★ کوثر مظہری، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

شاعر کا شمارہ ۱۲/۶ ایک تازہ کار شمارہ ہے۔ آپ کی محنت اور ذوق جستجو نے شاعر کو نکھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس شمارے میں حامدی کاشمیری کا مضمون 'معاصر اردو تنقید' چند سوال' مختصر ہے مگر اہم اور توجہ طلب ہے۔ کئی ایک گوشوں میں جھانکنے کیلئے دریچے کھول دیتے ہیں۔ آج کی تنقید کا جو حال ہے وہ وہی ہے جو حامدی صاحب نے لکھا ہے۔ مستند اور مستحکم حضرات نئی نسل پر قلم اٹھانا کسر شان سمجھتے ہیں۔ یہی بات لیکر میں نے ایک مضمون "مسئلہ نقاد پیدا کرنے کا" لکھا تھا جو ۵ جون کے قومی آواز (دہلی) میں شائع ہوا تھا اور جو بحث کا موضوع بھی بنا تھا۔ دراصل شمس الرحمن فاروقی صاحب کے اس موقف کو کہ "ہر نسل اپنا نقاد خود پیدا کرتی ہے" کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

★ نذیر احمد قریشی، [illegible] پوسٹ [illegible] بنگلور۔

شمارہ نمبر ۶، صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے خوب ہے۔ اداریہ بہت صاف اور تلخ ہے۔ واقعی اردو سے محبت کرنے والوں کیلئے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ اب یہ ہم اردو والوں اور اردو سے روٹی کمانے والوں پر منحصر ہے کہ ہم اردو کیلئے کیا کر سکتے ہیں۔ ایک طرف تو اردو کی ترویج و اشاعت کیلئے بیرونی ممالک میں جدوجہد کی جارہی ہے لیکن اس زبان کی جو [...] ہوئی ہے۔ وہاں پر ہر سطح پر اس کے خلاف جو تدبیریں ہیں اس میں خود اردو والے بھی شامل ہیں۔ تازہ نظم کا حصہ [...] ہے۔ ایک حقیر مشورہ یہ ہے کہ شاعر میں انٹرویو بھی شائع کریں۔ [illegible]

★ عطاء الرحمن صدیقی، پوسٹ بکس [illegible] قطر۔

شاعر کے تازہ شمارے میں آپ کا اداریہ اردو کے [...] کیلئے خاصہ فکر انگیز ہے اور بڑی تشویشناک صورت حال کا ترجمان بھی۔ خدا خیر کرے... اور آپ جیسے مخلص اردو والوں کو [...] عطا فرمائے تاکہ اردو کی مسیحائی کا فریضہ انجام دیا جاسکے کیونکہ:

کاروان کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

آپ اردو کی نئی بستیوں کے حوالے سے فکرمند ہیں [...] حقیقتاً آپ کی فکر اس حوالے سے زیادہ گہری اور واقفیت [...] [illegible]

یہاں بھی ادارے کے سلسلے میں غفلت اور کوتاہی کی وہی داستان ہے یعنی لوگ زبان کی خدمت کو بھول کر شعر و ادب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں بلکہ خدمت کم اور نمائش و نمائندگی زیادہ چاہتے ہیں۔

★ اطہر سلطان نسیم، پی ایچ ڈی، رانچی

شمارہ نمبر ۶ کے تمام مشمولات مجموعی طور پر پسند آئے۔ شاعر کے مطالعے سے ایک طرح کا ادبی سکون حاصل ہوتا ہے کیوں کہ یہ رسالہ کسی مخصوص فکر و نظر یا کسی خاص گروپ کے شعر و ادب کو نہیں بلکہ مختلف النوع اور متعدد ادبا و شعرا کی معیاری تخلیقات اس رسالے میں شائع ہوتی ہیں۔ اس شمارے میں حامدی کاشمیری صاحب کا مقالہ "معاصر اردو تنقید" چند سوالات خاصے توجہ طلب ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ انہوں نے عصری آگہی کے ساتھ موجودہ تنقیدی رویوں کے ساتھ معاصر تنقید کے زوال کی طرف بھی توجہ مبذول کروائی ہے۔ سلطان جمیل نسیم کی کہانی میں بعض جگہ الفاظ کا ہتک آمیز انداز میں استعمال قابل تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ "گرکے" اور "بڑھاکے" جیسے الفاظ قاری کو ادبی لطافت سے محروم کرتے ہیں۔ باوجود یہ کہ انکی کہانی میں وسوسے اور سہمے اندیشے قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ جتیندر بلو کی کہانی "قرض" پسند آئی اس میں انہوں نے جیتا جاگتا ابھرتا کردار قاری کے سامنے بہت ہی عمدگی کے ساتھ ابھار دیا ہے۔ یہ کردار حقیقت سے بہت قریب ہے اور ہمارے سماج میں ہر جگہ موجود ہے۔ ساجدہ رشید کی کہانی "ملکہ" ہندوستان کے مشترکہ سماج کے زوال اور مشترکہ اقدار کے ٹکراؤ کی عکاسی کرتی ہے۔ دھریندر استھانا کی کہانی "میری زمینیں..." میں ایک سیاسی خوف کو تخلیقی سطح دی ہے۔ لیکن ان کی کہانی میں عورت بنیادی طور پر محض جنسی تلذذ و تسکین کا وسیلہ ہی بن کر رہ گئی ہے۔ غزلوں میں خاص طور پر مظہر امام، ہدایت کاشف، عقیل جمال، شکیل اعظمی، اطہر فاروقی اور بلراج کومل کی غزلیں پسند آئیں۔ آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح خاصے کی چیز ہے۔ بلاشبہ تلخ، چبھتا ہوا لہجہ لئے ہوئے۔ اس بار بھی آپ نے اردو زبان کی موجودہ صورت حال پر کئی صحیح سوال اٹھائے ہیں۔ نئی نسل کو بطور خاص اس طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

★ شکیب رضوی، آرکنسٹ، ...، لاہور

جرات میں آپ نے جس المیے کی طرف توجہ دلائی ہے وہ ہمارا اپنا ہے۔ بقول نظیر اکبر آبادی، ہم خود ہی صید ہیں اور خود ہی جال۔ بے شک آپ نے اندازِ جسارت سے کام لیا ہے مگر اس جسارت کو اگر اجتماعی طور پر اپنایا گیا تو یقیناً زہر گھلا ہوا ایک جام عصر میر اور سقراط کے ہاتھوں میں ہوگا۔ آج لفظ لفظ میں مرحوم صلاح الدین پرویز کے خط اور تصویر دیکھ کر ...

پانی کی زمین میں محمود سعیدی کی چاروں غزلیں بہت پسند آئیں۔ یقیناً انہوں نے اشعار کی تخلیق میں شعلے بند کر دئیے ہیں۔ مظہر امام کی غزل کے آخری دو شعر اچھے لگے۔ رنج زندگی کی نظم نے دل کو اسیر اور دماغ پر اثر چھوڑا۔ شکیل شاداب کی نظم بھی اچھی ہے۔ مرتضیٰ زیدی ساجد شفقی اور آزر تقوی کی غزلوں میں کئی اچھے شعر پڑھ کر خوب سے خوب تر کی جستجو کو زور سے زور ملا۔ جتیندر بلو کی کہانی "قرض" ایک اچھی اور بہتر کہانی ہے۔ ساجدہ رشید کی "ملکہ" اور نور الحسنین کی "حراست" میں اوکھے پن کی جھلک ہے۔ مگر نیر جہاں نے سائیز فولس بڑے مزے میں لکھا ہے۔ خاص طور پر رومانیک ایج کی شاعری کا بہت خوبصورت تعارف کیا ہے۔ وہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔

★ ذکاء الدین شایاں، کریا پیل سمت

شاعر کا تازہ شمارہ مطالعہ میں آیا۔ آپ کے اداریے کی بیشتر باتیں میرے ایک مضمون میں بھی کیسے وارد ہو گئیں؟ یہ مضمون میں نے ہماری زبان (دہلی) کو کچھ ہی روز قبل بھجوایا ہے اس کا ابتدائی حصہ قارئین شاعر کی نذر ہے۔

اردو زبان کے تلفظ اور رسم الخط کے تعلق سے آج جو سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ سامنے آیا ہے۔ وہ بولنے اور پڑھنے والی زبان کا ہے۔ اس زبان پر اس وقت تین طرف سے حملے کئے جا رہے ہیں۔ (۱) انگریزی میڈیم تعلیمی ادارے (۲) ہندی میڈیم کی تعلیم (۳) ہندوستان کی صوبائی مقامی زبان کی مختلف و ماحول صوتیات کے ساتھ الگ الگ مذاہب کی لسانی تعلیم۔ اردو زبان انہیں کے درمیان ایسے ڈوبتے ہوئے شخص کی مانند معلوم ہوتی ہے جو انفرادی حیثیت سے اپنے سر اور ہاتھوں کو اس سیلابی فضا کے تند و تیز دھاروں سے بچانا چاہتا ہے۔ لیکن یہ رو اتنی شدید ہے کہ اس کا زندہ رہنا خاصہ مشکل ہے۔ اردو اب صرف چلن کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی صوتی شکستگی قریب قریب دم توڑ چکی ہے۔ غیر مسلم طبقے کی زبان سے قطع نظر خود مسلم معاشرے کی زبان انتہائی غلط تلفظ کے ساتھ رائج ہو چکی ہے عام بول چال کی زبان میں آپ کو اس طرح کے الفاظ بڑی فراوانی سے سننے کو مل جائیں گے مثلاً کبر (خبر) تاجا (تازہ) گلتی (غلطی) کم (غم) باگ (باغ) کھیال (خیال) کانون (قانون) سریپھ (شریف)۔ یہی نہیں کہ اس طرح کے الفاظ غیر تعلیم یافتہ لوگ ہی بولتے ہیں بلکہ باعلم اور تعلیم یافتہ افراد بھی اس زبان کے عادی ہو چکے ہیں۔ بولنے اور پڑھنے کے علاوہ اردو لکھنے کا مسئلہ تو غضب ہو گیا ہے۔ ہمارے جن موجودہ فلموں کے گیتوں پر نئی نسل سر دھنتی ہے یا جو مکالمے ادا کئے جاتے ہیں ان میں لفظوں اور مکالموں کی اردو زبان کو بڑے اطمینان سے مسخ کیا جا رہا ہے۔ اور غلط تلفظ کی مسخ شدہ اردو زبان آج ہماری گفتگو کا حصہ بن چکی ہے۔ ہمارے مکالمہ نگار اور فلم نگار اردو زبان کو دل کھول کر بگاڑ رہے ہیں۔ تحریری دنیا میں صحافت اور پوسٹر بھی بگڑی ہوئی اردو زبان یا عموماً ہندی رسم خط میں شائع کئے جاتے ہیں۔ نظم، قوالی، مشاعرہ جیسے سیاسی جلسیں مختلف انداز سب جگہ یہی حال ہے۔ اس ماحول میں میر، غالب، اقبال، اور فیض کو اعلیٰ ہے، جگر مراد آبادی، جہاں اکبر آبادی، اور فراق وغیرہ جیسے اردو کے قدیم اور جدید کی خدمات سے آج کی نسل کیا فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ جبکہ پہلے تلفظ اور رسم خط، بلا تفریق مذہب و ملت اردو ادب کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اور آج وہ علم و ادب سے باہر کر دیا گیا ہے۔ دستاویزات اور اسناد وغیرہ میں جو نام درج کئے جاتے ہیں غلط تلفظ سے اتنے مشہور ہو چکے ہیں کہ اصل نام کی پہچان اور حیثیت مشکوک ہو گئی ہے۔ غ، ف، ق، ذ، ز، ض، ظ، ش اس طرح کے حروف کی آوازیں بگڑتی جا رہی ہیں۔ اگر اسلامی مدارس کی عربی زبان اردو کے لہجے کو قرأت کی طرف مائل کر رہی ہے تو ہندی زبان اسے اپنے لہجوں میں گرفتار کر چکی ہے۔ لیکن بات وہیں پر ہے کہ "اردو زبان بہت ترکی (ترقی) کر رہی ہے" اردو کو ترقی کی راہ پر روکا جا رہا ہے۔ اردو کی بقا کیلئے ہندی رسم خط کا قالب ضروری ہے۔

★ محمود ہاشمی، ڈی-۵، ...، نئی دہلی

آپ کی رائے اپنی جگہ قطعاً درست ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کیلئے مضمون اور قومی آواز (دہلی) والے سوالوں کے عرض ہے کہ اب سے پہلے بھی اپنے ہم عصروں کے بارے میں میں نے ہی بعض امور کی نشاندہی کی ہے۔ حسن نعیم، بلراج مینرا، SO CALLED جدید رجحان والے (میرا مضمون: ایک خطرناک میلان، مطبوعہ خون رواق) وحید اختر (اردو کے میگافون) اور لسانی تنقید (ناگ وغیرہ) انجمن ... ہندوستان (شعور) اور دوسری جگہوں پر ایک تنگ یا عصر دوسرے اور ہم عصر یہ سب میرے وجود میں شامل ہیں۔ لیکن میری مشکل یہ ہے کہ اپنے عہد کی کیفیتوں اور بے ہودگیوں کو میں SHARE کرتا ہوں۔ الا ہضم نہیں کر پاتا۔ اس میں شدت کرب سے تڑپ اٹھتا ہوں تو اس طرز کی تحریریں سامنے آتی ہیں۔ ان تحریروں کے پس منظر میں کوئی ذاتی مقصد مطلقاً نہیں ہے۔ یہ احساس ہے کہ ہم میں سے اکثر بہت سے ہیں، خود غرض ہیں، جعلی ہیں، خوشامدی ہیں، دھوکا دینے والے ہیں۔ اصلیت کچھ اور ہے جو تعلقات کے دبیز پردوں میں کہیں چھپ جاتی ہے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ بہر حال ابھی یہ سبھی سب لوگ میری دنیا ہیں۔ میرے ذائقے ہیں۔ یہ تلخیاں بھی ہیں۔ مٹھاس بھی ہے، اگر اس کا اظہار کر دیا جائے تو ... ہے۔

فکرِ امروز

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو زبان کو ادبی حیثیت اور علمی فضیلت اہلِ قلم نے دی ہے۔ مگر آج اہلِ قلم ہی اپنی زبان اور اس کے متعلقات سے اس قدر غافل اور بے پروا ہیں کہ اگر زبان جہل مرکب بنتی جا رہی ہے تو شاعری بھی یکسر مضحکہ بن گئی ہے۔ علی العموم آج شاعری کا نصب العین صرف تفریح رہ گیا ہے۔ یہی شاعری جو کبھی ملک و قوم کے روحانی سکون کا باعث اور اطمینانِ قلب کا سبب سمجھی جاتی تھی آج بہ حیثیت مجموعی، بے نتیجہ، بے کار اور بے اثر ثابت ہو رہی ہے۔

[۲۷ فروری ۱۹۳۲ء خطبۂ صدارت۔ مشاعرہ انٹرمیڈیٹ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ]

سیماب اکبرآبادی

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰

شاعر

یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۶واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد ــــ ۶۶
شمارہ ــــ ۱۲

فون: ۳۸۴۹۹۰۳

دسمبر ۱۹۹۵ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۷ روپے

زرِ سالانہ ۷۵ روپے ◆ لائبریریوں سے ۹۰ روپے

تا عمر خریداری ۳۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۵۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر ـ ۱۵ پونڈ

Heartly Greetings on the occasion of the First Diwali in Shivshahi



Shri Manohar Joshi
Chief Minister



Shri Gopinath Munde
Dy. Chief Minister

*

Removing darkness
from every mind
And leading us
on the path of light
with a host of Peoples
Welfare Schemes
Diwali is here.

Rekindling hopes in
the hearts of the People
and showering flowers
with enthusiasm
Diwali is here.

Rejoicing with ecstasy,
the Shiv Sena - BJP
Alliance reiterates its resolve
To fulfil promises
On the auspicious occasion
of Diwali

Directorate General of Information and Public Relations,
Govt of Maharashtra

سرورق
رقصِ طوفانِ جنوں
عمل
سلطان سبحانی

نظام صدیقی۔ شہزاد منظر۔ سلیم شہزاد
محمود حسین۔ ظہیر غازی پوری۔ اکبر حیدرآبادی
شفیع مشہدی۔ غالب عرفان۔ تاجی انصاری
محمد رشید ملک۔ عنبر نقوی۔ اسرار اکبرآبادی
قاضی فیروز احمد۔ راہی قریشی۔ سخاوت شمیم
خلیل تنویر۔ سلطانہ ارمان فاروقی۔
نور درویش۔ شارق عدیل۔ اقبال جاوید
احسان الحق۔ کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی۔ عبدالغنی تمنا
مقصود الٰہی شیخ۔ ستیہ پال آنند۔ رام لعل
رفیق انجم۔ عشرت ظفر۔ تابان ضیائی
اختر یوسف خان۔ سیّد علی کلیم۔ آفاق صدیقی

شاعر کے قارئین سے مکالمہ

معزز قارئین!

دسمبر ۹۵ء کا یہ شمارہ، ہم عصر اردو ادب نمبر کے بجائے، آپکے مطالعے کے لئے پیش ہے۔ آپ کو حیرت تو ہوگی! خاص نمبر کے لئے آپ کا شدید انتظار اور تجسس خاصہ مضطرب بھی ہوگا۔ حسب وعدہ ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد اوّل نومبر میں شائع ہوجانی چاہئے تھی۔ یقین کیجئے کہ ہماری تمام تر کوششیں یہی رہیں کہ نومبر نہ سہی دسمبر کے آخر تک خاص نمبر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

لیکن ــــــ

جولائی اور اگست کے شماروں میں اردو شعر و ادب کے خوبصورت عالمی گاؤں کی تعمیر و تشکیل کے ناتمام منظر ناموں کی اشاعت کے بعد ہمیں پوری اردو دنیا سے مبارک بادی کے خطوط، تار، اور ٹیلی فون موصول ہو رہے ہیں۔ یوں بھی خاص نمبر کو تیزی سے مکمل کرنے کے سبب مصروفیات بے طرح تھیں کہ موصول ہونے والی ڈاک کا دباؤ بڑھ گیا۔ ٹیلی فون اپنے معمول سے کہیں زیادہ موصول ہونے لگے۔ بے شمار قلم کاروں کے خطوط کے ساتھ مضامین نثر و نظم کا گویا ایک سیلاب امڈ آیا۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کے لئے پوری اردو دنیا سے قلم کاروں کی فہرستیں ترتیب دینے کے دوران ناموں کے INDEX اور کارڈس بنائے جا رہے تھے۔ اگست کے شمارے کی اشاعت تک اعلان شدہ فہرستیں نامکمل تھیں۔ اردو دنیا کے اہم، معتبر اور مشاہیر قلم کاروں سے مراسلت کے ساتھ نئے اور تازہ کار قلم کاروں کی فہرستیں ترتیب دینا آسان نہیں تھا۔ اس کا احتمال تھا کہ جو کچھ ہم خاص نمبر میں دینا چاہتے ہیں اس کے لئے کئی نام یا تو اندراج میں آنے سے رہ گئے۔ یا پھر شامل ہی نہیں ہو سکے۔ لیکن خاص نمبر کے تفصیلی اعلان کے بعد تو صورت حال یکسر ہی بدل گئی بزرگوں کے مشورے، دوستوں کے مکالمے، دنیا کے نقشے پر پھیلے ہوئے اردو قلم کاروں کی تخلیقات اور خاص نمبر کی تخلیقی ترتیب۔ ہم نے تو صرف دو جلدوں ہی کا خواب سوچا تھا۔ یہاں تو تیسری جلد کا جواز روشن ہوتا جا رہا ہے حالاں کہ خاص نمبر میں بے شمار ناموں کی یکجائی سے زیادہ ہم اپنے خواب تعبیروں کو کوئی نیا تخلیقی روپ دینے کی سعی پیہم میں مصروف تھے بہرحال! ہم شکر گزار ہیں۔ ان بے شمار قلم کاروں کے جنھوں نے اپنی تخلیقات ارسال کیں۔ حالاں کہ ایک نئی صورت حال، خاص نمبر کی ترتیب و تہذیب پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئی ہے۔

ہم عصر اردو ادب نمبر کا جس بے صبری سے انتظار کیا جا رہا ہے اور پوری اردو دنیا سے جو تعاون ہمیں حاصل رہا ہے اس نے جہاں ہمارے حوصلے بہت بلند کئے ہیں وہیں خاص نمبر کو زیادہ وقیع، معیاری، متنوع دلچسپ اور معلوماتی بنانے کے لئے مزید اضافوں اور تبدیلیوں پر بھی مجبور کیا ہے۔ یقین کیجئے کہ خاص نمبر کے لئے آپ کی سوچ انتہاؤں اور ہمارے تمام اعلانات سے آگے وہ بہت آگے کوئی فقید المثال کارنامہ ہی ہوگا۔

خاص نمبر کا ہر باب اپنے آپ میں کسی وقیع اور ضخیم کتاب سے کم نہیں تو صورت حال یہ ناگزیر ہو گئی ہے کہ آپ سے آپ کے شدید انتظار سے کچھ وقت اور مانگ لیا جائے۔ یہ پلکوں کی سوئیاں ہمارے لئے بھی تکلیف دہ ہیں۔ یقین کیجئے کہ ہم آپ کے انتظار سے باخبر ہیں۔ ہماری ہر ممکنہ جستجو یہی ہے کہ خاص نمبر جلد از جلد شائع ہو جائے۔ اب یہ خاص نمبر [جلد اوّل] جنوری ۹۶ء میں آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ انشاء اللہ

ہم عصر اردو ادب نمبر کی اشاعت میں تاخیر اور بے طرح مصروفیات کے دوران دسمبر ۹۵ء کا یہ شمارہ نہایت ہی کم وقت میں اشاعت پذیر ہو رہا ہے اور دسمبر ہی میں آپ کو مل جائے گا۔ اس شمارے کو بھی آپ شاعر کے سابقہ شماروں ہی کی طرح پسند کریں گے اس شمارے کی اشاعت کا ایک مقصد یہ بھی رہا ہے کہ آپ سے رابطہ بنا رہے۔ آپ کے انتظار کی شدت میں کچھ اور صبر شامل ہو جائے۔ واضح رہے کہ ہم عصر اردو ادب نمبر [جلد اول] ستمبر، اکتوبر اور نومبر ۹۵ء تین اشاعتوں ہی پر مشتمل ہوگا اس طرح ۱۹۹۵ء کی فائل مکمل ہو جائے گی۔

■ خاص نمبر کے مشمولات

خطوں اور ٹیلیفون کے ذریعے ہم سے استفسار کیا جا رہا ہے کہ ہم عصر اردو ادب نمبر کی دونوں جلدوں کی مشمولاتی تقسیم کس طرح کی جا رہی ہے پہلی جلد میں کیا ہوگا اور جلد دوم میں کیا؟ ایک جلد میں شاعری ہوگی تو کیا دوسری جلد نثر پر مشتمل ہوگی؟ کون کس جلد میں ہوگا، کسے کہاں شامل کیا جا رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ عرض ہے کہ خاص نمبر کی دونوں جلدیں مضامین نثر و نظم سے آراستہ ہوں گی اور تقریباً تمام ابواب دونوں جلدوں میں شامل رہیں گے ہر باب میں شامل قلم کار حروف تہجی کے تحت آئیں گے۔ سب کچھ تخلیقی عمل کے تحت آ رہا ہے۔ جب تک ایک جلد مکمل ہو کر ہمارے ہاتھوں میں نہیں آ جاتی ہم بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دونوں جلدوں کے کام ایک ساتھ ہو رہے ہیں اور جلد اوّل کی اشاعت کے تین ماہ بعد دوسری جلد شائع کر دی جائیگی

■ قلمکاروں سے التماس

ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ ہم عصر اردو ادب نمبر کی دونوں جلدوں میں شامل ہونے والے ہزاروں قلم کاروں کو فرداً فرداً ان کی تخلیقات کی اشاعت کے بارے میں بروقت اطلاع دینے سے قاصر رہے ہیں یا ان بے شمار قلمکاروں کو ان کی تخلیقات کی عدم اشاعت کی اطلاع نہیں دے سکے ہیں جو مسلسل خطوط سے تقاضہ کر رہے ہیں، استفسار کر رہے ہیں حالاں کہ ممکنہ کوشش یہی رہی ہے کہ تمام قلم کاروں تک ہم پہونچ سکیں۔ انہیں مطمئن کر سکیں۔ یہ بے حد صبر آزما اور دشوار کام ہے۔ خاص طور پر شاعری کے باب میں۔

ہزاروں شعراء کے استفسارات کا جواب تقریباً ناممکنات میں سے ہے لہذا اصرار نہ کیجئے۔ انتظار کیجئے۔ اپنی تخلیقات جو خاص نمبر کے لئے ارسال کی ہیں کہیں اور ارسال نہ کیجئے۔ اور اگر آپ اپنی تخلیقات کہیں اور شائع کروانا چاہتے ہوں تو از راہ لطف و کرم ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعے اطلاع دیکر ہم سے تعاون کیجئے۔ دیر سویر ہی سہی، ہم آپ تک پہونچ رہے ہیں۔

■ اعزازی کاپی اور وی پی

قلم کار ہوں یا شاعر کے مستقل خریدار، شاعر خرید کر پڑھیں یا اعزازی طور پر شاعر پڑھنے والے تمام قارئین شاعر سے مودبانہ گذارش ہے کہ وہ اعزازی کاپی کے لئے اصرار نہ کریں۔ شاعر کو بچانے کے لئے اس کے مستقل

ہے کہ علاوہ خاص نمبر ملنے کے آپ کا ہر شکلہ نمبر پر تقاضہ بعد فوری ہے ۔ دی پی سے کسی کو بھی خاص نمبر ارسال نہیں کیا جائے گا ۔ ڈاک کا نظام بے حد ناقص ہے ۔

درمیان سے رسالہ غائب ہو جاتا ہے ۔ خاص نمبر کا وی پی اگر کسی وجہ سے واپس آ جائے تو ڈاک خرچ کے علاوہ واپس شدہ کاپی اس قابل نہیں رہ جاتی کہ کسی اور کو دی جا سکے ۔ خاص نمبر رجسٹرڈ بک پوسٹ ہی سے ارسال کیا جائے گا ۔

وی پی سے نہیں ۔ لہٰذا خاص نمبر (جلد اول) کے لئے اپنی رقم بذریعہ منی آرڈر ارسال کیجئے اور جلد ارسال کیجئے ورنہ بعد میں مایوسی ہوگی ۔

■ اردو کی نئی بستیوں کے رفیقانِ شاعر

شاعر کو عالمی اردو سماج سے جو پذیرائی مل رہی ہے اس کے لئے ہم اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں ، رفیقوں اور اردو کے خدمت گذاروں کے ممنون ہیں کہ ان لوگوں نے سرحدوں سے ماوراء اپنی پیاری زبان اردو کے حوالے سے شاعر کو اپنی ایک زندہ روایت تسلیم کیا ہے اور اسی کے لئے مسلسل کوشاں ہیں ہم درخواست گذار ہیں کہ :

— اگر آپ کی طرف شاعر کے بقایا جات ہوں تو جلد ارسال کیجئے ۔

— ہم عصر اردو ادب نمبر کی جو قیمت اردو کی نئی بستیوں کے لئے طے کی گئی ہے ۔ وہ بھی جلد ارسال کریں ۔

— رعایتی شرح پر خاص نمبر کے لئے اپنے اشتہارات ارسال کیجئے

— اپنے شہر کی لائبریریوں ، کتب فروشوں ، انجمنوں ، اداروں کے لئے خاص نمبر منگوائیے ۔

— اپنے احباب کو خاص نمبر کے لئے متوجہ کیجئے ۔

— اردو شعر و ادب کے اس عالمی کارواں کے بارے میں دنیا کی دوسری زبانوں کے لوگوں کو معلومات فراہم کیجئے ۔

— اگر آپ کو اپنی رقومات ، چیک ، ڈرافٹ ، بین الاقوامی منی آرڈر ، یا پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے میں دشواریاں پیش ہوں تو بذریعہ چیک اپنی رقومات ارسال کیجئے ۔

— اپنے چیک صرف THE SHAIR BOMBAY کے نام ہی سے بھر لیجئے ۔

■ خاص نمبر کے لئے اشتہارات

شاعر خوانوں سے التماس ہے کہ خاص نمبر کے لئے اشتہارات کی فراہمی میں اپنا عملی تعاون دیجئے ۔ قلم کاروں قارئین شاعر کے لئے رعایتی شرح پر ضمیمہ و رسائل کے اشتہارات کی سہولت دی جا رہی ہے ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر ہم سے نرخ نامہ طلب کیجئے ۔ اس کے علاوہ ہم چاہتے ہیں کہ شاعر کا ہر قاری کم از کم ایک یا آدھے صفحے کا اشتہار ضرور فراہم کرے ۔ اپنے علاقے ، اپنے شہر اور اپنے احباب سے اشتہارات حاصل کر کے بھجوائیے ۔ ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر اشتہارات کا نرخ نامہ ہم سے طلب کیجئے ۔

ہمیں آپ کے خط کا انتظار رہے گا ۔

● شاعر کے مستقل خریدار اسے ضرور پڑھیں ●

ہم عصر اردو ادب نمبر تین ماہ کی اشاعتوں پر مشتمل ہوگا ۔ ستمبر ، اکتوبر اور نومبر ۹۵ء ۔ اب اگر آپ کی مدت خریداری ان تین ماہ میں سے کسی ایک ماہ میں ختم ہو رہی ہے تو تجدید خریداری کیجئے اور ایک سال کا زرِ رفاقت ارسال کر کے ممنون کیجئے ۔ جس ماہ میں آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے اس ماہ کے دائرے میں سرخ نشان لگا دیا گیا ہے ۔

○ اکتوبر ○ نومبر ○ دسمبر

○ اگر آپ کی مدت خریداری دسمبر ۹۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے ۔

اگر اس دائرے میں سرخ نشان لگا ہوا ہے ۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری دسمبر ۹۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے ۔ نئے سال [جنوری ۹۶ء تا دسمبر ۹۶ء] کے لئے اپنا زرِ تعاون ارسال کر کے ممنون کیجئے ۔

آپ کی طرف شاعر کے بقایا جات

○ اگر اس دائرے میں سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا زرِ سالانہ ... کے شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا تھا ۔ ازراہِ شاعر نوازی اپنے بقایا جات اور خاص نمبر [جلد اول] کی رعایتی قیمت جلد از جلد ارسال کیجئے ۔

جاں نثار اختر

آ کہ آج [illegible] غم گیں ہے دل اور جی کو جانا ہے

تیرے چہرے پر اجالا کیوں درد کا اُف ہائے

کبھی کبھی کچھ نظر، اک ادا، بیگانہ سی ہے

کچھ سے آنکھوں کو بہلا لیا آج بھی ترسانا ہے

مسکرا اے جانِ جاناں، جانِ ادا، جانِ بہار

مسکرانے سے ترے دل کا غنچہ کھل جاتا ہے

تیری خاطر سے نبھا لیا کر نہیں سکتے ہیں ہم

کون مشکل سے [illegible] تیرے آتا ہے

آ کہ آج [illegible] جو آ بازی [illegible]

تیرے میرے دل کا [illegible] اک حسین افسانہ ہے

چاک دامن خاک دل اختر

(اعجاز صدیقی) ۱۹۴۴

جاں نثار اختر (پ: ۸ فروری ۱۹۱۴ء گوالیار - م: ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء بمبئی) [illegible]

(ادارہ)

رشید امجد

سی۔ ۵۲، لین نمبر ۱۔ ۷، گلستان کالونی، راولپنڈی، پاکستان

بے منزل منزلیں

اسے خود معلوم نہیں کہ اس گھر کے ساتھ اس کا تعلق کتنا پرانا ہے؟ وہ اس گھر میں نہ کبھی رہا ہے اور نہ کبھی اس نے دیکھا ہے، لیکن وہ اس کے کونے کونے سے واقف ہے اور جب چاہتا ہے لمحہ بھر میں اس کے اندر پہنچ جاتا ہے بس ایک پل کے لئے آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں، اور دوسرے لمحے وہ اس گھر کی ڈیوڑھی میں کھڑا ہوتا۔ ڈیوڑھی کی نیم تاریکی میں ایک دروازہ دائیں طرف کھلتا ہے جو بیٹھک میں نکل جاتا ہے۔ بائیں طرف والے دروازے کے پیچھے ایک مستطیل نما کمرہ ہے جس کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے۔ اس تہہ خانے کا جالی دار جنگلا کمرے کے وسط میں موجود ہے۔ نیچے گہری تاریکی۔

وہ کبھی اس تہہ خانے میں نہیں اترا۔ بس یہ معلوم ہے کہ اس کے اندر سردیوں میں جلانے والی لکڑی رکھی جاتی ہے۔ سنا ہے ایک بار گھر کی کوئی مرغی جنگلے سے نیچے اتر گئی تھی۔ ایک زمانے میں یہاں سامان بھی رکھا جاتا تھا۔ مرغی وہیں رہ گئی اور کسی دیوار میں سے رستے پانی نے اسے زندگی فراہم کر دی۔ ایک عرصہ بعد گھر والوں کو تہہ خانے سے چوں چوں کی آوازیں سنائی دیں تو کسی کو نیچے اتارا گیا۔ نیچے مرغیوں کا ایک پورا گھر آباد تھا۔ لیکن ان مرغیوں کو اوپر نہیں لایا گیا۔ اسے بس اتنا معلوم ہو سکا کہ جو شخص نیچے اترا تھا وہ سخت خوفزدہ اوپر آیا اور اس نے سرگوشیوں میں کسی کو کچھ کہا۔ اس کے پلے اتنا ہی پڑا کہ ان مرغیوں کی آنکھیں نہیں ہیں۔

اس نے کئی بار ان کی آنکھوں کے بارے میں سوچا لیکن کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

وہ کئی بار تہہ خانے کے دروازے کے پاس رکا۔ اندر سے آتیں چوں چوں کی آوازیں بڑی پراسرار لگتیں۔ دل چاہتا کہ ادھر جا کر انہیں قریب سے دیکھے لیکن نیم تاریکی اور یہ تصور کہ ان کی آنکھیں نہیں اس کے ارادے کی دیوار کو ڈھا دیتا۔

گھر کا یہ حصہ ہمیشہ ہی نیم تاریک رہا جس کی وجہ سے ایک عجب طرح کی سیلن زدگی وہاں آنے والے کو اوپر جانے پر مجبور کر دیتی ہے سیڑھیاں تنگ اور موڑ والی ہیں۔ دو موڑ گزرنے کے بعد درمیان والا پلیٹ فارم —— یہاں تاریکی زیادہ گہری ہے۔ اس کے دونوں طرف دروازے ہیں جو [illegible] کمروں میں کھلتے ہیں۔ یہ حصہ سب سے زیادہ ڈراؤنا اور پراسرار ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ ہمیشہ ڈر جاتا ہے اور خوف سے چیخنے لگتا ہے۔

لگتا ہے سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک ہیولہ سا حرکت کر رہا ہے۔ ایک لمبا ڈھانچہ دیوار کے ساتھ ساتھ ایک کونے سے دوسرے تک چلتا دکھائی دیتا ہے۔ جب آنکھیں اندھیرے میں کچھ دیکھنے لگتی ہیں تو دو انگارہ سی آنکھیں اپنی طرف بڑھتی محسوس ہوتی ہیں۔ لمبے لمبے بال جو نتھنوں سے نیچے لٹک رہے ہیں۔ اور ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کی آواز ——

اس کے منہ سے چیخ نکلتی ہے اور لگتا ہے جیسے اس کے اندر کوئی پتھر انگڑائی لے کر منجمد ہو گیا ہے۔ چیخ کی آواز پر اوپر دروازہ کھلتا ہے۔ ایک مشفق آواز اس کا نام پکارتی ہے۔ پتھر کی انگڑائی ٹوٹ جاتی ہے اور وہ دوڑ کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف لپکتا ہے۔ سامنے دیوار کے ساتھ حرکت کرتا ہیولہ، وہ انگارہ آنکھیں اور منہ سے نکلتی پھیری پھنکار ——

اوپر والا حصہ روشن اور پرسکون ہے۔ وہ محبت بھری بانہیں اسے اپنی حصار میں چھپا کر اس کی پیشانی چومتی ہیں۔ یہ گھر جو موجود نہیں ہے لیکن اس کا ایک ایک گوشہ اس کا دیکھا بھالا ہے۔ باہر جب ہوا کی تیزی شروع ہوا چلتی ہے تو وہ بھاگ کر اس میں داخل ہو جاتا ہے —— وہاں وہ شفیق بانہیں اسے اپنے حصار میں لینے کے لئے بے قرار ہوتی ہیں اور محبت کے رس بھرے ہونٹ اس کی پیشانی چومنا چاہتے ہیں۔ شفقت اور محبت کی یہ روشنی اوپر والی منزل سے گزرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے لیکن یہاں تک پہنچنے کے لئے درمیانی حصے سے گزرنا پڑتا ہے۔

اس حصے سے گزرنے کے [illegible]

ڈیوڑھی جس کے آگے موڑ کھاتی تنگ سیڑھی ہے سیڑھی کے اوپر وہ چوکور خلا جہاں تاریکی سیال مادّے کی طرح گاڑھی اور منجمد ہے۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ حرکت کرتا پراسرار ہیولہ ــــــ وہ انگارہ آنکھیں اور ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کی آواز ــــــ ڈر کے مارے چیخ نکل جاتی ہے۔ کچھ بھی نہیں آتا کہ یہ ہیولہ کس کا ہے اور اس تاریک خلا میں ہمیشہ کیوں موجود رہتا ہے ــــــ اس اذیت کے بعد وہ شفیق بانہیں اور محبت کے رس بھرے ہونٹ نعمت کی طرح ہیں لیکن وہ بھی یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ ہیولہ کس کا ہے اور کیوں وہاں موجود رہتا ہے۔ رات کو کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے وہ ہیولہ دبے پاؤں اوپر آ گیا ہے۔ پھر جیسے وہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹتا ہے۔ خوف کے مارے وہ شفیق بانہوں میں سمٹ جاتا ہے منہ سے آواز نہیں نکلتی ــــــ تا دیر یہ کشمکش جاری رہتی ہے پھر آہستہ آہستہ ہیولے کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگتی ہے اور ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کا شور دور ہوتا جاتا ہے۔

اسے دیر تک نیند نہیں آتی۔ شفیق بانہوں کے حصار میں سمٹے سمٹے بھی سوچتا رہتا ہے کہ یہ ہیولہ کس کا ہے۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی یہ بانہیں اسے نرمی سے اپنے حصار سے نکالتی ہیں اور وہ رس بھرے ہونٹ اس کی پیشانی پر محبت کے پھول کھلا دیتے ہیں۔ رات کا خوف پلک جھپکتے دور ہو جاتا ہے۔ دن اپنی چہکار کے ساتھ آس پاس پھیل جاتا ہے اور دن کا تو اپنا ایک چہرہ ہے۔

سارا دن مشقت کا پہیہ جسم کو ریزہ ریزہ کرتا رہتا ہے۔ گھر کی دیوار سے اس آخری دیوار تک ایک نہ ختم ہونے والی بے چینی آس پاس موجود رہتی ہے ــــــ وہ شفیق بانہیں اور وہ رس بھرے ہونٹ بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں لیکن دن کے پہیے کی کرخت آوازیں سارے تصور کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ دیوار کے ساتھ حرکت کرتا پراسرار ہیولہ آہستہ آہستہ ابھرتا ہے۔ سرخ انگارہ آنکھیں چمکتی ہیں اور ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کی مسلسل آواز ــــــ

"یہ سب کیا ہے؟" وہ خود سے سوال کرتا ہے "یہ خواب ہے یا وہ خواب ہے"

لیکن کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ خواب کون سا ہے۔ یہ جس سے وہ گزر رہا ہے یا وہ جس کا تصور اس کے اندر کہیں موجود ہے۔ وہ شفیق بانہوں کا حصار، ماتھے پر رس بھرے ہونٹوں کا بوسہ اور ان سب کے درمیان کہیں دھندلی سی نیم تاریکی میں ایک پراسرار حرکت کرتا ہیولہ، جس کی لال انگارہ جیسی آنکھوں کو وہ کسی بھی وقت دیکھ سکتا ہے اور ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کی آواز سن سکتا ہے۔

اور یہ جو اس کے اردگرد ایک کھلا خلا ہے۔ یہ کیا ہے؟

وہ شفیق بانہیں

اور یہ پراسرار ہیولہ؟

اسے ان میں سے کسی سوال کا جواب معلوم نہیں۔ جس گھر میں وہ رہتا ہے وہ ایک منزلہ ہے نہ اس کی کوئی پراسرار ڈیوڑھی ہے اور نہ اوپر والی منزل جس تک پہنچنے کے لئے کسی درمیانی تاریک خلا سے گزرنا پڑے۔

یہ گھر میں نے کہاں دیکھا ہے؟ اس نے کئی بار خود سے پوچھا ہے۔ مگر جواب نہیں ملتا۔

جواب کسی کے پاس بھی نہیں کہ وہ شفیق بانہیں اور رس بھرے ہونٹ بھی اب نہیں کہ پوچھ سکے یہ اسرار کیا ہے؟

وہ ہیولہ کس کا ہے اور یہ دو لال انگارہ آنکھیں جو اسے اب بھی ڈرا دیتی ہیں کس کی ہیں۔

یہ ہیولہ ایک تیرتے عکس کی طرح ہے کہ غیر محسوس طور پر وہ اس کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ پھر اسے کچھ احساس نہیں ہوتا ہے کہ وہ خود کون ہے اور یہ سارا اسرار کیسا ہے؟

کوئی کچھ بتانے والا نہیں بس ایک یاد سی ہے کہ ایک بار اس نے ان شفیق بانہوں میں پناہ لیتے ہوئے پوچھا تھا "یہ سب کیا ہے ــــــ یہ نیم تاریک خلا کہاں ہے؟" رس بھرے ہونٹوں نے اس کے ماتھے پر محبت کے گلاب کھلاتے ہوئے بس اتنا کہا تھا ــــــ "پگلا۔"

پھر نہ وہ شفیق بانہیں رہیں نہ وہ محبت بھرے ہونٹ، بس ہیولہ اور اس کی لال انگارہ آنکھیں باقی رہ گئیں۔

برسوں بیت گئے ــــــ ایک تیرتا عکس اس کے آس پاس کہیں موجود رہا۔ قریب آنے کی کوشش کرتا تو وہ آہستگی سے خود کو ایک طرف کر لیتا۔ کوئی پراسرار سی شے اس کے پاس سے گزر جاتی ــــــ

اسے ایک سکون سا ملتا، آخر میں اسے خود سے دور کرنے میں کامیاب گیا ہوں اور وہ اندر ہی اندر گنگناتا ــــــ لیکن اب برسوں بعد ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کی کرخت آواز سنائی دی تو وہ چونک پڑا۔

"کون ہے ــــــ؟" وہ چیخا

یوں لگا جیسے دو انگارہ آنکھیں اس کے اندر اترتی چلی جا رہی ہیں۔

[باقی صفحہ [illegible] پر دیکھئے]

غزل

تحسین فراقی

نہ ہو فنکار باقی، اس کا فن موجود رہتا ہے
پرندہ اڑ بھی جائے تو چمن موجود رہتا ہے

ہزاروں کی کلاہوں کو وہ خاطر میں نہیں لاتا
کسی میں جب تلک دیوانہ پن موجود رہتا ہے

انا کی لذتیں سرشار کر دیتی ہیں انساں کو
مگر اندیشۂ دار و رسن موجود رہتا ہے

لباس فاخرہ ہو یا کسی درویش کی گدڑی
بغیر اس کے بھی انساں کا بدن موجود رہتا ہے

یہ صحرائے جنوں ہے اس جگہ سے تیر اندازو!
سدا سینہ سپر کوئی ہرن موجود رہتا ہے

جہاں ملتا ہے کوئی ایک بھی سچ بولنے والا
وہاں انسانیت کا بانکپن موجود رہتا ہے

ہمیشہ بخت کی افراط سے محفوظ ہوتا ہے
جہاں تک دار پہنچے ہے وطن موجود رہتا ہے

تحسین الفاظ کے رستے میں رہنمائی کو
ہمیشہ کوئی نہ کوئی راہزن موجود رہتا ہے



"جنگ جاری ہے"

جنگ کے دنوں میں
اسپتال
زخمیوں سے بھرے رہتے ہیں
ان دنوں
میرا دل بھی
اسپتال بنا ہوا ہے!
دم توڑتی امنگوں
اور زخمی خواہشوں سے
بھرا ہوا ہے!
اور جنگ جاری ہے
اندر بھی باہر سے
اور باہر بھی اندر سے!

۵

۱۹۔ غالب بلاک، حسن آباد، لاہور۔ پاکستان



بشر نواز

نارسا

مجھے خواب اپنا عزیز تھا
سو میں نیند سے نہ جگا کبھی
مجھے نیند اپنی عزیز ہے
کہ میں سرزمیں پہ ہوں خواب کی
کوئی پھول ایسا کھلا سکوں
کہ جو مشک بن کے مہک سکے
کوئی دیپ ایسا جلا سکوں
جو ستارہ بن کے دمک سکے

میرا خواب اب بھی ہے نیند میں
مری نیند اب بھی ہے منتظر
کہ وہ معجزہ میں دکھا سکوں

کہیں پھول کوئی کھلا سکوں
کہیں دیپ کوئی جلا سکوں

● محلہ گھاٹی ۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر)

حامدی کاشمیری

یہ کس موڑ پر ہمسفر آ گئے
عقابوں کے سائے نظر آ گئے

بدن سے نہ کھولا تھا رخت سفر
مرے کمرے میں رہگذر آ گئے

تمہیں کو نہ زنہار آیا خیال
مرے در پہ شمس و قمر آ گئے

تہہ آب میری بصارت گئی
ہتھیلی پہ لعل و گہر آ گئے

چلا جانب بحر اکیلا نہ تھا
مرے ساتھ سنگ و شجر آ گئے

اب آبادیوں کا ہے حافظ خدا
وہی طائر شعلہ پر آ گئے

● مسعود منزل، شالیمار، سری نگر (کشمیر)

حسن عابد

کب سخن میں تابش نجم فلک کی بات ہے
دل میں جو روشن ہے، اس رنگیں دھنک کی بات ہے

تم کسی مذہب کے ہو اور ہم کسی مسلک کے ہیں
زندگی تو اک نصاب مشترک کی بات ہے

پھر شفق کے رنگ لہرائیں گے بام صبح پر
یہ سیہ وقتی، فروغ شب تلک کی بات ہے

برہنہ ہو جائے گا، پھر شب کے میخانے میں کل
یہ لباس پارسائی، شام تک کی بات ہے

کن امیدوں پر ہو کوئی، طالب دید جمال
ہوش کھو دینے کی منزل اک جھلک کی بات ہے

کل کہاں ہوگا، عناصر کا یہ ربط باہمی
زندگی! یاران محفل آج تک کی بات ہے

● ۱۰-۱۱/۱، ولایت آباد-۲، منگھوپیر، کراچی

مشتاق مومنؔ

۲۹۸ ، مورجی مینشن ، شاستری مارگ ، کرلا بمبئی ۷۰

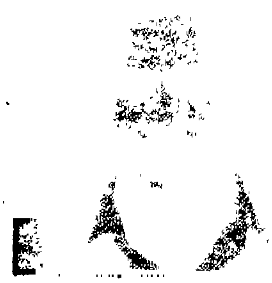
نظر بند

کلاسیں ویران تھیں ، آج پھر خالی گراؤنڈ اور بینچ ہمارا منہ
...ا رہے تھے ۔

میں اور پروفیسر ناتھ وچاک ، ڈسٹرا اور یودک بھارتی کے لئے
...وں منزلے پر یوں ہی کھڑے تھے ۔ ہمارے ایک طرف وشال ساگر
...ہریں سر اٹھا رہی تھیں دوسری طرف کلانگر تھا ۔ جہاں بال ٹھاکرے
...کلا گھنے کا نٹے دار درختوں میں چھپا ہوا تھا ۔ بائی وے سے کاروں کا
...یل فاصلہ نظر آ رہا تھا اور فلائی اوور سے پرے کاریں ، بسیں ،
...یاں ، اور ٹیمپو اتنی برق رفتاری سے آ رہے تھے کہ گمان ہوتا تھا
...ی ہماری عبادت گاہ پر چڑھائی کر دیں گے ۔ عین ہماری نگاہوں
سامنے تین چار فٹ کے فاصلے پر مسجد کا مینار تھا جس پر لگے لاؤڈ اسپیکر
...ے جا چکے تھے ۔ نیچے حوض تھا ۔ جس میں ہری کائی بہت بڑھ چکی تھی
۔ برنگی مچھلیاں بظاہر آزادانہ تیر رہی تھیں اوپر سے نیچے دیکھنے پر
...لگتا تھا جیسے حوض کے فوارے کا پانی ہم تک پہونچنے کی کوشش کر رہا
۔ مگر پریشر بہت کم تھا ۔ مسجد کے صحن میں ادھر ادھر لوگ سو رہے
... ایک شخص وضو کر رہا تھا ۔

چلو اسٹاف روم میں چلتے ہیں میں نے کہا مگر پروفیسر ناتھ ہمیشہ کی طرح
...انکار کر رہا تھا ۔

" جسٹ اے منٹ ... " اس نے نیچے دیکھتے ہوئے جواب دیا
کیا اس سے پہلے کسی کو وضو کرتے نہیں دیکھا ۔ میں نے ناتھ سے پوچھا
مجھے یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے اس نے مکالماتی انداز میں مجھ سے کہا
...یک شہزادہ نظر ، پیرام پالہ ، نرمل نگر ، دھاراوی اور ماہم پر ڈالی پھر
ا جلک کر مینار کو چھونا چاہا مگر وہ مینار کو تو نہ چھو سکا البتہ اس کی اس
...ش سے مینار پر بیٹھے جنگلی کبوتر پھڑ پھڑا کر اڑ گئے ۔
... جب یہاں آیا تھا تو مجھے یہ سب کچھ اچھا لگتا تھا ۔ کلاس



میں داخل ہونے سے پہلے میں ایک نظر سمندر کو ضرور دیکھ لیتا تھا ۔ مگر یہ
پرانی بات ہے ۔

" اور اب ؟ "

اب حالات بدل گئے ہیں کبھی خیال ہی نہیں آتا کہ ہم اتنی خوبصورت
جگہ پر ہیں ۔ ہمارے قریب سمندر سانسیں لے رہا ہے جس کے سینے میں ایک
جہان آباد ہے ۔ ہم دونوں نیچے اتر رہے تھے ۔

" کیسی عجیب اور حیرت انگیز بات " ناتھ نے کہا ۔

" کیا ؟ " میں نے پوچھا ۔

" انسان مندر میں جاتا ہے اور مندر کی گھنٹیاں بجا کر بھگوان کو
انفارم کرتا ہے ۔ تم لوگ اذان دے کر لوگوں کو نماز کے لئے بلاتے ہو ۔
پھر ہمارے بیچ یہ مہا آرتی اور مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کہاں سے آگئے ؟

" میں ابھی ناتھ کی بات کا جواب دے بھی نہ پایا تھا کہ یک لخت ناتھ
پوچھ بیٹھا ۔

" یار تمہیں کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا " میں نے کوئی جواب نہیں
دیا اور خاموشی سے نیچے اتر آیا ۔

" اسٹاف روم پر آئے تو معلوم ہوا کہ کالج کے سامنے پٹرول پمپ
پر کسی فلم کی شوٹنگ چل رہی ہے اور دور سمندر کے کنارے ایک بہت
بڑی وہیل مچھلی نیم جاں حالت میں پڑی ہے ۔ ہم دونوں پلاسٹک کی
کرسیوں پر بیٹھ گئے ۔ کشور اور جاوید پہلے ہی سے وہاں براجمان تھے
اور چائے پی رہے تھے ۔

" یار کشور بہت بری بات ہے "

" کیا بری بات ہے " کشور نے پوچھا

" تمہارے آدمی ہمارے آدمیوں کو بے تحاشا مار رہے ہیں "
میں نے کشور کے بازو میں بیٹھتے ہوئے کہا ۔

"ہم سب اس کی مذمت کرتے ہیں یہ ہماے لئے شرم کی بات ہے۔ اب تو ٹھیک ہے کمشنر نے ہنستے ہنستے کہا۔ پھر مندر مسجد کی بحث شروع ہو گئی۔ میں چاہتا تھا کہ ناتھ بھی اس بحث میں حصہ لے مگر ایسے موقعوں پر ناتھ ہمیشہ خاموش رہتا تھا۔ کیوں! یہ بات میری سمجھ میں کچھ آئی نہیں۔ شاید اس لئے کہ اس سال کالج میں اس کا تقرر ہوا تھا یا پھر وہ کسی اور چکر میں تھا۔ میں ابھی کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکا تھا کیوں کہ میں اسے سمجھنے اور جاننے کے پروسس میں تھا۔ دوسرے آدمی کو جاننے اور سمجھنے کے پروسس میں آدمی اپنے اندر خود بخود ایک خود ساختہ پروسس بنا لیتا ہے اور اپنی مرضی اور منشا کے مطابق یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اس نے سامنے والے آدمی کو جان لیا ہے۔ مگر ایسے آدمی کو کون جان پایا ہے۔

"آدمی کا شیطان آدمی ہے"۔ دوسرے روز میں میراتن کی باغ و بہار پڑھا رہا تھا کہ چپراسی نے آکر کہا۔ "صاحب بلا رہے ہیں صاحب اپنے کیبن میں بیٹھے اردو اکیڈمی سے بھیجی ہوئی کتابیں الٹ پلٹ کر رہے تھے۔

"سر آپ نے بلایا مجھے! -

ہاں بیٹھو انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ کچھ دیر وہ یوں ہی کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہے۔ پھر کتابیں شیلف میں سجا کر مجھ سے ہم کلام ہوئے۔

ہاں تو کل کا فنکشن کیسا رہا۔

بہت اچھا رہا سر۔ میں نے خوش دلی سے جواب دیا

"کیا خاک اچھا رہا۔" ان کے لہجے میں ناراضگی تھی "تم کیسے پروگرام کنڈکٹ کرتے ہو؟ "

"کیوں کیا ہوا سر؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"کل میری بڑی بے عزتی ہو گئی۔ انہوں نے اظہار تاسف کیا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتے رہے پھر سر جھکا کر انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "تم کو معلوم ہے کالج کے گیٹ پر جن طلبہ کی تم نے ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ مہمانوں کا استقبال کریں، انہوں نے کیا کیا؟ "نہیں" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ٹھیک اسی وقت جب مہمان شاعر کار سے اتر رہے تھے۔ طلبہ ان کا سواگت کرنے کی بجائے ایک دوسری کار کی طرف دوڑ پڑے جس میں فلم ایکٹر ساجھا بیٹھا ہوا تھا۔

"تو میں کیا کروں" بے ساختہ میرے منہ سے یہ جملہ نکل پڑا۔

"واہ! صاحب کا غصہ ایک دم شوٹ اپ کر گیا۔ یہ تم کہہ رہے ہو تم سا نہرو کی روزی روٹی کھانے والے۔

"سر! آپ خواہ مخواہ ڈسٹرب ہو رہے ہیں یہ محض ایک اتفاق تھا میں نے انہیں SEE OFF کرنا چاہا۔ میں اس مسئلے پر ان سے مزید گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ مگر اچانک دو ملاقاتی اندر آ گئے۔ شاید کوئی V.I.P تھے۔ کیوں کہ پھرتی سے اٹھ کر صاحب نے انہیں خوش آمدید کہا تھا۔ کورنش بھی بجا لائے تھے۔ میں مخل ہونا نہیں چاہتا تھا اس لئے ان سے اجازت لے کر میں چپ چاپ کیبن سے باہر نکل آیا۔

اچانک پھلوں کے دام ایک دم بڑھ گئے۔

نوجوانوں کی ٹولیاں پرجوش انداز میں دکانوں، مکانوں اور فٹ پاتھ پر دھندہ کرنے والوں سے چندہ وصول کرنے لگیں۔ گنپتی کے تہوار کی آمد آمد تھی۔ اسی روز گنپتی کا دوسرا دن تھا۔ سائن بس ڈپو پر اترتے ہی مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ آج ناتھ کے یہاں چلا جائے دو تین دن سے وہ کالج بھی نہیں آیا تھا میں اس کے گھر جانے کے خیال سے سائن سب وے کے پاس آگیا۔ دروازے کے پاس ہی جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ سب وے سے جائیے۔ اب سب وے میں رکھشک تعینات ہے۔

سیڑھیاں اتر کر میں نیچے گیا تو دیکھا ایک مدقوق سا رکھشک ہاتھ میں لاٹھی لئے کھانس رہا ہے۔ سب وے سنسان تھا۔ بہر کیف مجھے پروفیسر ناتھ کا فلیٹ ڈھونڈھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ فلیٹ کا دروازہ ناتھ نے ہی کھولا تھا۔ مجھے یوں اچانک دیکھ کر ناتھ ششدر رہ گیا۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ عین گنپتی کے موقع پر اس کے گھر آ جاؤں گا۔

مگر بہت جلد اس نے اپنی حیرت پر قابو پا لیا۔ سجا سجایا اس کا گھر تھا وہ سب چیزیں جو کل تک دکھاوی سمجھی جاتی تھیں مگر آج ضرورت بن گئی تھیں۔ ناتھ نے اپنے گھر میں سجا رکھی تھیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہی میں ایٹ ہوم محسوس کرنے لگا۔ سامنے ایک میز تھی اس پر بڑے سے گلدان میں منی پلانٹ پھیلے ہوئے تھے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان پلانٹس میں سے کون سا پلانٹ اصلی ہے اور کون سا نقلی۔ ناتھ بڑے موڈ میں تھا میں نے ہاتھ بڑھا کر پتوں کو چھونا چاہا تو اس نے مجھے منع کر دیا۔

"نہیں بغیر انہیں چھوئے ہوئے بتاؤ"۔ میں نے ایک ہری کچ بیالی

ہوئی بیل کی طرف اشارہ کیا۔"

"صحیح پہچانا تم نے۔" ناتھ نے زوردار قہقہہ لگایا اور آہستہ سے اس بیل کو گلدان میں سے کھینچ لیا۔ بے جان، بے حس، پلاسٹک کی بیل اس کے ہاتھوں میں تھی جس میں کوئی جشر نہ تھی۔ "اچھا اب بتاؤ" اس نے ایک مہکتا ہوا گلدان میرے سامنے رکھ دیا۔ "اس میں سے کن پھولوں میں سے خوشبو آ رہی ہے۔" ابھی میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اندر دوسرے کمرے میں سے اس کی پتنی وندنا کی آواز آئی۔

"تمہارے مترکو اندر لے آؤ۔" "چلو ڈیئر منگل مورتی کے درشن کر لیں۔" پروفیسر ناتھ نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

وہ چھوٹا سا کمرہ ان کا پوجا گھر اور مندر تھا۔ ایک کونے میں گدے پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ دونوں طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے ان کے بیچوں بیچ کسی دیوتا کی بڑی سی رنگین تصویر رکھی ہوئی تھی تصویر کے بالکل سامنے قرمزی، کاسنی اور سفید پھول قرینے سے رکھے ہوئے تھے جن کے دائیں بائیں چاندی کے شمع دان روشن تھے۔ دوسری طرف ایک گوشے میں گنپتی بپا بجے سجائے بیٹھے تھے۔ ان کے چرنوں میں پھل رکھے ہوئے تھے اگربتی کا مہک دار دھواں آہستہ آہستہ کمرے میں گردش کر رہا تھا۔ استاد روی شنکر ڈیک میں بیٹھے ستار بجا رہے تھے۔ منگل مورتی کا درشن کر کے ہم دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ جہاں موذک اور دوسری میٹھی اور نمکین چیزیں پلیٹوں میں سجی ہوئی تھیں۔ چائے کے ٹیبل پر ہم نے محبت اور مہنگائی ظلم اور فساد، اور شادی اور طلاق کے تمام مسائل ڈسکس کر لیے میں نے اندازہ لگایا کہ ناتھ گھنا اور پیچیدہ ہے اور وندنا پہلی ہی ملاقات میں مجھے صاف اور کھلے ذہن کی لگی۔ بظاہر اس کے ظاہر اور باطن میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا۔ حالانکہ تنہائی میں وندنا سے کچھ خاص بات کرنا چاہتا تھا مگر مجھے موقع ہی نہ ملا۔

میں بڑا خوشگوار تجربہ لے کر ان کے گھر سے رخصت ہوا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا گھر میں بنے ہوئے موذک بے حد لذیذ اور چائے [illegible]

[illegible] سے اتر کر میں نیچے فٹ پاتھ پر آیا تو سامنے کا منظر ایک دم سے بدلا ہوا تھا۔ بلڈنگ کے پہلو میں سڑک پر ہی ایک بہت بڑا پنڈال بنا ہوا تھا [illegible] چھوٹے چھوٹے قمقموں سے جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ گنیش جی کی سارجنک مورتی بیچ پنڈال میں رکھی ہوئی تھی۔ پنڈال سے پرے محلے کے نوجوان چھڑکنے تار تپڑی پر بیٹھے ہوئے تاش کھیل رہے تھے۔ فلمی گانا زور زور سے بج رہا تھا۔ بارش شروع ہو گئی تھی اور تیز بارش کا ان چھوا، ترو تازہ آسمان سے ٹپکتا ہوا پانی میونسپل کارپوریشن کی بنائی ہوئی نالیوں میں سے بہہ رہا تھا۔ بارش کے باوجود گنپتی درشن کرنے والوں کی طویل قطار لگی ہوئی تھی جو رینگتے چل کر راشن کی لائن میں لگی تھی۔ میرا جی چاہا کہ واپس ناتھ کے پاس لوٹ جاؤں مگر مجھے خیال آیا کہ میں اپنی آنکھیں تو وہیں بھول آیا ہوں۔ بارش کا زور کم ہوا تو میں الٹے پاؤں واپس ہوا۔ فلیٹ کا دروازہ بند تھا اندر سے ناتھ اور وندنا کی زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں کچھ غیر معیاری الفاظ بھی میرے کانوں نے سنے۔ وانادری شناخت ہوا تھا میں نے کال بیل دبائی۔ ناتھ نے دروازہ کھولا میں اپنا چشمہ بھول گیا ہوں۔ ارے اندر تو آؤ باہر کیوں کھڑے ہو۔ میں نے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر سے اپنا چشمہ اٹھایا اور معذرت کرتے ہوئے نیچے اتر آیا۔ ناتھ نے بھی مجھے نہیں روکا۔ اس واقعے کو بھی کئی دن گزر گئے زندگی اوبڑ کھابڑ راستوں پر بھاگتی رہی۔

ایسے ہی ایک دن میں پڑھا رہا تھا کہ انٹرکام پر صاحب نے مجھے بلایا اپنے کیبن میں رسمی ملاقات کے بعد وہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ بیل بج گئی اور دوسرا پیریڈ شروع ہو گیا۔ میں نے اجازت چاہی تو انہوں نے بے تکلفی سے کہا۔

"بیٹھو یار میں جانتا ہوں تم کتنا پڑھاتے ہو۔"

پھر چپراسی سے دروازہ بند کرنے کو کہا اور اسے حکم دیا کہ کسی کو اندر نہ آنے دے اور اونچی ریوالونگ چیئر پر سر ٹکا کر معنی خیز انداز میں مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے بھی ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر لیا کیونکہ جب بھی کوئی خاص اہم بات ڈسکس کرنا ہوتی تھی۔ ایسا ہی ہوتا تھا۔

پروفیسر ناتھ ابھی ابھی مجھ سے مل کر گئے ہیں۔ انہوں نے بات شروع کی۔

اوہ۔ میں سمجھا تھا سر وہ آج آئے نہیں۔

"وہ صبح سے میرے کیبن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ [illegible] ہو گئے [illegible] بہت [illegible] ہو گیا۔ کیونکہ [illegible] خاص [illegible] ٹھہر کر بات کرنے [illegible]

"کچھ دیر کے بعد انہوں نے خود ہی کہا۔ "وہ پروفیسر ناتھ کہہ رہے تھے تم ان کے گھر گئے تھے..."

"ہاں سر میں ان کے گھر گیا تھا۔" جواب میں انہوں نے کچھ نہیں کہا اپنے ہاتھ کی لکیروں کو غور سے دیکھتے رہے اور پھر گویا ہوئے"

"پروفیسر ناتھ تمہاری شکایت کر رہے تھے۔"

"نہیں سر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

"ایسا ہوا ہے نہ صرف پروفیسر ناتھ کو۔ بلکہ مجھے بھی تم سے شکایت ہے کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ پچھلے تین ماہ سے پروفیسر ناتھ تم سے تعاون مانگ رہے ہیں۔ اور تم ہو کہ نہ صرف ٹال مٹول کر رہے ہو بلکہ انہیں۔" صاحب دوبارہ اونچے بیک کی ریوالونگ چیئر پر ٹک گئے اور مجھے گھورنے لگے۔

"میں کچھ سمجھا نہیں سر۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کچھ دیر وہ اپنی ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتے رہے اور پھر میز پر جھک کر تقریباً سرگوشی کے انداز میں مجھ سے ہم کلام ہوئے۔

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ پروفیسر ناتھ مشرف باسلام ہونا چاہتا ہے اور تم نہ صرف یہ کہ ٹال مٹول کر رہے ہو بلکہ انہیں اس خیال سے باز رکھنے کی کوشش بھی کر رہے ہو؟ تم کیسے مومن ہو۔" اتنا کہہ کر صاحب پھر خاموش ہو گئے۔ یہ وقفہ مجھے اپنے آپ سے بات کرنے کے لئے بہت تھا۔ معاملہ بہت نازک تھا اور میری ذرا سی لغزش سے بات بگڑ سکتی تھی۔

"سر۔" میں نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ بات سچ ہے کہ انہوں نے تبدیلیٔ مذہب کا ارادہ ظاہر کیا تھا مجھ پر مگر .... میں رک گیا

"مگر کیا؟..."

میں نے ناتھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ آخر تم کیوں مسلمان ہونا چاہتے ہو۔ اور ابھی تک وہ مجھے CONVINCE نہیں کر سکے

تم آخر اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔

میں خاموش رہا۔

"اپنی حد میں رہا کرو۔" انہوں نے مجھے سرزنش کی۔ میں تلملا کر رہ گیا لو یہ پڑھو۔

انہوں نے میز پر رکھا ہوا ایک رسالہ کھول کر میری طرف بڑھا دیا ایک صفحہ پر سرخ روشنائی سے نشان لگا ہوا تھا۔ ایسوسی ایٹیڈ پریس آف امریکہ کی ایک رپورٹ تھی جس میں صومالیہ میں امریکی فوجیوں کے مسلمان ہونے کی خبر شائع ہوئی تھی۔

"تمہیں پروفیسر ناتھ کے فیصلہ پر کوئی اعتراض ہے۔"

"سر! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"ابھی ہم دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ کیبن کی ہری کانچ چھناکے سے ٹوٹی۔ چاروں طرف کانچ کی کرچیاں بکھر گئیں اور ا[...] ٹینس بال ہم دونوں کے بیچ ٹپا کھانے لگی۔

"ذرا دیکھو تو باہر کیا ہو رہا ہے اور چپراسیوں کو آواز دینے لگے۔

جب تک میں باہر نکلتا کاریڈور سنسان ہو چکا تھا نماز جمعہ کی ختم ہو چکی تھی ایک ہی صف میں کھڑے ہونے محمود و ایاز مسجد سے نکل کر الگ الگ راستوں پر گامزن تھے۔ ریسس ہو چکی تھی اس لئے زیادہ تر طلبہ باہر تھے۔ مسجد کے باہر تعینات فوجی بت بنے تھے۔ دو تین کم [...] اسکول بچے حیرت سے انہیں آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ باہر فٹ پاتھ پر ہمیشہ گھومنے والا پاگل [...] رائفل کی سنگین کو چھو کر زور زور سے ہنس رہا تھا۔ آج کل فوجی بھی ہمارے ماحول کا ایک حصہ بنتے جا رہے تھے۔

پروفیسر ناتھ راتوں رات ہیرو بن گیا تھا۔ اسٹوڈنٹ [...] آتے جاتے۔ اسٹاف روم کا پردہ ہٹا کر اسے دیکھ لیتے تھے۔ [...] تو اسٹاف روم میں آکر اسے سلام کرنے لگے تھے۔ صاحب کے کیبن میں بھی نئے نئے چہروں کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔

پروفیسر ناتھ اور اس کی پتنی جو اب وندنا نہیں تھی مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ پروفیسر ناتھ نے طویل رخصت لے رکھی تھی اس لئے اس [سے] ملاقات بھی نہ ہو سکی تھی۔ اس دوران شہر میں دوبارہ ہنگامے شروع ہو گئے اور میرے ذہن میں بھی فساد شروع ہو گیا۔ ظاہر ہے وہ کو[...] واڑے میں رہتا تھا اور کوئی واڑے سے بڑی بھیانک اور ہولناک خبریں آرہی تھیں۔ اس بات کو دو ماہ گزر گئے۔ دن کا کرفیو تو [ختم] ہو گیا تھا رات کا کرفیو البتہ جاری تھا۔ صاحب بھی ان دونوں [...] میں فکرمند تھے۔

ایسے ہی ایک دن رکشے کر میں پرنکشا نگر پہنچ گیا۔ [...] ناتھ کے فلیٹ پر ایک بہت بڑا تالا منہ چڑا رہا تھا۔ میں نے پا[س] پڑوس والوں سے پوچھا بھی مگر کوئی تسلی بخش جواب نہیں

[illegible]

مناسب نہیں سمجھا اور دبے پاؤں واپس پلٹ پڑا۔ بس اسٹاف پر بس بھی مجھے جلد مل گئی بس حسب معمول بھری ہوئی تھی۔ میں پیچھے ورلے کو گذارش کر کے پہلے منزلے پر آگیا۔ جہاں میں آرام سے کھڑا رہ سکتا تھا۔ سائن سرکل تک تو بس جلد ہی آگئی مگر آگے ٹریفک جام تھا بس آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی اور میری سوچ کا کچھوا ابھی رینگ رہا تھا۔

ہو سکتا ہے ناتھ نے پرتکشا نگر چھوڑ دیا ہو؟ اور کہیں اور شفٹ ہو گیا ہو؟ مگر وہ جگہ کون سی ہو سکتی ہے جہاں آدمی محفوظ و مامون ہو؟ ہو سکتا ہے وہ اپنے ہی محلے میں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا ہو؟ میرے اندیشے اور وسوسے کچھ زیادہ ہی سر اٹھانے لگے تھے۔ بس پھر رک گئی تھی۔ بس میں کھڑے کھڑے میں بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ حالانکہ جہاں میں کھڑا تھا۔ وہاں کی سیٹ خالی تھی مگر میں بیٹھ نہیں سکتا تھا کیونکہ کسی مسافر نے وہاں سے قے کر دی تھی اور اس گندگی سے نظر بچانے کے لئے میں مسلسل باہر دیکھ رہا تھا۔ سڑکوں پر کاروں بسوں اور لاریوں کی قطار رکی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ جہاں تک میری نظر جاتی تھی فٹ پاتھ پر کوکنگ گیس کے سلنڈروں کی بھی لائن لگی ہوئی تھی۔ خالی گیس کے سلنڈروں پر چاک سے نمبر لکھے ہوئے تھے اچانک اس قطار میں مجھے وندنا نظر آگئی۔

وہ اپنے خالی سلنڈر کے پاس خاموش اور اداس کھڑی تھی اس کے ایک ہاتھ میں اخبار تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں غیر ارادی طور پر گلے میں پڑے منگل سوتر سے کھیل رہی تھیں۔ اس منظر نے میری تھکن، تکلیف اور دکھ میں اضافہ کر دیا میں تو ایک ٹک اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھ میں اب کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی۔ تھکن سے چور، بے دھیانی میں، میں اس خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ❁

ترسیل زر کا پتہ

بقیہ صفحہ ۸ بے منزل مسافر

"کون ہے ——— ؟"

اس کی چیخ سن کر بیوی بھی جاگ اٹھی

"کیا ہوا ——— ؟" وہ بوکھلا گئی

"وہ نیم تاریک ڈیوڑھی بھر ———" وہ بڑبڑایا

"کون سی ڈیوڑھی؟" بیوی حیرت سے بولی

"وہی ———" اس نے کہنا چاہا۔

"لیکن کہاں ———" بیوی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا

وہ چند لمحے خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو ——— بولا، "کہیں بھی نہیں ——— کہیں بھی نہیں ——— وہ تو شاید میرے اپنے ہی اندر ہے"

بیوی کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیران پریشان اسے دیکھتی رہی مگر وہ اس کی پریشانی سے بے نیاز اسی طرح بڑبڑاتا رہا ——— "میرے اپنے اندر ——— میرے اپنے اندر" ❁

بقیہ صفحہ ۲۱ عرصہ محشر

کے بعد آنکھیں کھول دو اور پھر خود ہی تماشا دیکھو"

ایک درویش بولا "یا اللہ! یہ کیا طلسم ہے؟"

دوسرے نے کہا "یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں اور کیا سن رہے ہیں یہ کون سی قوت ہے"

تیسرے نے کہا "کہیں یہ ابلیسی قوت تو نہیں ہے؟"

عورت بولی "یہ کوئی بھی قوت ہو ہمیں آنکھیں بند کر کے اور اس کے بعد آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہیئے کہ یہ کون ہے اور اس کا کیا اثر ہے اور کیا بھید ہے؟ آؤ ہم سب آنکھیں بند کر لیں"

سب نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ہی سب نے آنکھیں بند کیں۔ بجلی کا ایک کوندا سا لپکا۔ گھبرا کر سب نے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے کہ ان کے سامنے انسانی پیکر میں ایک کیچڑ شیطان کھڑی تھی اور اس کے سر سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں جو ان سب کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے زہریلے لٹکتے ہوئے کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کس کے ہاتھ میں ہے۔ ❁

ستیہ پال آنند

بادباں اپنے سفر پر

عمر کے اس دور میں
آبی جہازوں کے نہ ہواؤں سے بھرے
سب بادبانوں سے پٹھا
دور دیسیوں کی مسافت پر اڑی آکاش میں
اونچی اڑانوں پر قلانچیں بھر رہی
کونجوں کی "ڈاروں" کو پکڑنا
آسمان مٹھی میں لے کر
ریت کی مانند ہاتھوں سے گرانا
چاند کی کرنوں کے مچھلی جال بننا
اور سمندر میں بہانا
بادلوں کے سنگ اڑ کر بھیگ جانا
کھیل سا تھا
اور یہ لگتا تھا۔ ساری زندگی اک کھیل ہی ہے
کھیلنے کے دن بہت باقی پڑے ہیں۔

عمر کے اس دور میں لگتا ہے
بادل پھٹ گئے ہیں
چاند کی کرنوں کے مچھلی جال
سارے بہہ گئے ہیں
یاد کا کورا سا اک احساس باقی ہے
کہ کیسے آسمان مٹھی میں تھا
کب ذرّہ ذرّہ انگلیوں سے گر گیا ہے
دور دیسوں کی مسافت پر اڑی
کونجوں کی ڈاریں اٹھ سے او جھل ہو گئی ہیں
بادباں اپنے سفر پر کب سے رخصت ہو چکے ہیں!

۲ ADAMS STREET, HERNDON, VA 22071 (U.S.A)



علیم رشید

شہر

شہر!
لوگ کہتے ہیں کہ تجھ سے تھک جانا
مر جانے کے برابر ہے
اور مجھے بھی کبھی کبھی ایسا ہی لگتا ہے....
تو سن میں تجھ سے صاف صاف کہہ دوں
کہ میں تجھ سے تھک گیا ہوں...

یا مجھے یوں لگتا ہے
کہ میرے سر سے اس باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے
جو اتنے دنوں میری نگہبانی کر رہا تھا

سن شہر،
اگر میں مر جاؤں
اور لوگ مجھے دفنانے لے جائیں
تو چپ کے سے تو مجھے گود میں لے لینا
اور ہاں کھوئے کہانی والی ماؤں کی طرح
مجھے آنچل میں چھپا کر بہ چیخ چیخ کر ان سے کہہ دینا:
نہیں....! یہ میرا بیٹا ہے
میرے جیتے جی یہ کبھی یتیم نہیں ہو سکتا...!
نہ ہی
میرے جیتے جی کوئی اسے مجھ سے چھین سکتا ہے...!

۱۰۴-۱-۲۸، ہری کا بارٹ روڈ ہاؤسنگ اسٹیٹ، کلکتہ-۲۹

شاهد کبیر

…ہر چہرہ نہیں ہے کیا کریں
…ں بھی چھوٹا نہیں ہے کیا کریں

…طرف ہوتا ہے منزل کا گماں
…طرف رستہ نہیں ہے کیا کریں

…کیا کرتے ہیں ہو کر نا امید
…ابھی سوچا نہیں ہے کیا کریں

…ل کو بھی یاد کر لیتے ہیں لوگ
…مگر ایسا نہیں ہے کیا کریں

…اعری ہو گی مگر شاہد کبیر
…ی کا پہنا نہیں ہے کیا کریں

سرشار بلند شہری

شمع جلی اور بجھ گئی دھواں اٹھا تا دیر
موسم کی دہلیز پہ شور ہوا تا دیر

مٹی کی اوقات کیا مٹی کا اک جسم
گرم ہوا کے زور پہ لہرایا تا دیر

نازک سی اک شاخ پر لہرایا اک پھول
خوشبو خوشبو دور تک رنگ اڑا تا دیر

وہ بھی اپنی آن کے نشے میں تھا چور
میں بھی اپنی بات پہ اڑا رہا تا دیر

اس کو اپنے حسن پہ کیا کیا غرور تھا
اس کی گلی میں آسماں جھکا رہا تا دیر

ٹھوکر لگی تو ہوش میں آیا ہوں مشہد
پر وہ میری آنکھ پہ پڑا رہا تا دیر

● ۲۸ - جیو بیٹر مل کی چال، عود میٹر
روڈ، احمد آباد

اطہر راز

[کراچی کے حالات سے متاثر ہو کر جمیل الدین عالی۔
محمد علی شاعر۔ آفاق صدیقی، جون ایلیا، سحر انصاری کے نام]

لہو مرغِ چراغاں ہے جہاں میں تھا وہاں تم ہو
خزاں فصلِ بہاراں ہے جہاں میں تھا وہاں تم ہو

نہ جانے کتنے طوفان روز آتے ہیں کراچی میں
فضا مانوسِ طوفاں ہے جہاں میں تھا وہاں تم ہو

پرندے بے یقینی کے پروں کو پھڑپھڑاتے ہیں
سیاست جامِ فیصل ہے جہاں میں تھا وہاں تم ہو

گلی کوچوں میں ہر سو گولیوں کا رقص جاری ہے
صدا تفصیلِ گریہ ہے جہاں میں تھا وہاں تم ہو

ہمیں گھر چھوڑنے کی یہ سزا دی ہے زمانے نے
بکھر جانے کا ساماں ہے جہاں میں تھا وہاں تم ہو

کبھی اہلِ نظر جس شہر کی مدفن پڑھاتے تھے
وہ اب دہشت کا میداں ہے جہاں میں تھا وہاں تم ہو

کسے الزام دیں کس کا یہ زمینی خرابہ ہے
فریبِ شہر میں انساں ہے جہاں میں تھا وہاں تم ہو

● 21 COLLWOOD GARDENS
HOLLIERS WOOD, LONDON
SW19 2DS

اغا سہیل

۲۵۵-اے محمد علی جوہر ٹاؤن ۔ لاہور (پاکستان)

عرصۂ محشر



پیر و مرشد نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے اپنے تمام مریدوں پر نگاہِ غلط انداز سے دیکھا۔ وہ تمام نظریں نیچی کئے دو زانو بیٹھے تھے اور بظاہر اپنے دھیان میں غوطہ زن تھے۔ پھر پیر و مرشد نے ہاتھ کی ایک انگلی فضا میں بلند کی اور اشارے سے جو کچھ کہا اس کی تعمیل اور تائید میں مریدان باصفا ایک ایک کر کے اُٹھے اور احتراماً رکوع کی حالت میں جھکے ہوئے پشت کی جانب سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ لیکن پیر و مرشد نے ہاتھ کے اشارے سے جو کچھ کہا اس کے نتیجے میں چار مرید بیٹھے رہ گئے اور پیر و مرشد کے قریب کھسکتے ہوئے چلے آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا" پیر و مرشد میں نے دنیا کے جس کونے اور گوشے کی سیر کی وہاں انسان کو خوابِ غفلت میں پایا۔ طمع و لالچ اور ہوا و ہوس میں ڈوبا ہوا انسان اپنی عاقبت کی طرف سے مطلقاً غافل ہے۔" دوسرے نے کہا" میں دنیا کے جس گوشے میں گیا وہ بھی اس سے مطلقاً مختلف نہ تھا۔ ہوسِ اقتدار نے سارے معاشرے کو تتر بتر کر کے رکھ دیا اور ہر جگہ ایک ایسی طبقاتی کشمکش ہے، جس میں مظلوک الحال اور غریب لوگ پس رہے ہیں۔" تیسرا بولا " میں تیسرے کھونٹ سے آرہا ہوں۔ اللہ کی بنائی ہوئی اس کائنات میں جہاں انسان کو خلیفۃ الارض بنا کر بھیجا گیا تھا وہاں انسانوں کی شکل میں شیاطین اور بھیڑیوں کی حکمرانی ہے اور انسانیت کی خواری ہے۔"

چوتھا بولا" حق کڑوا ہوتا ہے اور یہی کڑواہٹ میرے بیان میں بھی ہے۔ میں چوتھے کھونٹ سے آیا ہوں۔ اللہ کے سچے اور حقیقی بندے انسان کے بنائے ہوئے ظالمانہ نظام کے پنجۂ استبداد میں سسک رہے ہیں۔ میں کس کس سرزمین کی نشاندہی کروں اور کہاں کہاں کا ذکر کروں کہ اے پیر و مرشد انسان کو کہیں قرار نہیں کہیں سکون نہیں۔ ہم کیا کریں کدھر جائیں ہماری روح جگہ جگہ سے زخمی ہے اور ہمارے دل کی ...

پیر و مرشد نے اُن چاروں کو باری باری خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور کہا" تم سچے ہو اور تم نے سچ کی کھوج لگانے میں پوری تندہی اور ایمانداری سے کام کیا مگر ایک ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔"

وہ چاروں کے چاروں بہت مضطرب ہوئے اور بعض کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک ان میں سے زیادہ رقیق القلب تھا۔ زار و قطار رونے لگا اور اس کی ہچکیاں اُٹھ گئیں۔ پیر و مرشد نے فرمایا۔

" تمہارے قلب کی رقت تمہارے باطن کی صفائی کا اظہار ہے کہ صوفی جب تک تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن نہ کرے اپنی منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔ اور اے میرے چیلو! تم اپنی اپنی منزل کے قریب قریب پہنچ رہے ہو، لیکن ابھی منزل اتنی قریب بھی نہیں ہے، ریاضت کی ضرورت ہے۔"

رونے والا درویش بولا" ہم آپ کی نگاہِ کرم کے امیدوار ہیں۔ اپنی ذات کو سمجھنے کی منزلوں سے گزر رہے ہیں کہ آپ نے بارہا فرمایا خود شناسی ہی خدا شناسی ہے۔ جس نے خود کو جان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔"

پیر و مرشد نے فرمایا۔ " بے شک خودت را بشناس، یہی پہلی منزل ہے اور سنو کہ تم چاروں نے کائنات کی چاروں سمتوں میں گھوم پھر کر جو کچھ دریافت کیا وہ نیا نہیں ہے۔ یاد کرو کہ ہبوطِ آدم سے لے کر ہابیل و قابیل کے واقعے سے شروع ہو کر آج تک جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ ابلیس کا پیدا کیا ہوا شر ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ ابلیس ہمارے نفس پر اندر سے بھی حملہ آور ہوتا ہے اور باہر سے بھی اور یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ معاشرے کی تشکیل میں جہاں جہاں اس کے نفسِ امارہ کا بس چل سکا، اس نے اپنے اندر کے ابلیس سے رجوع کیا اور ابلیس نے وہ تفرقہ ڈالا کہ آج تک انسان اس چکر سے نکل نہ سکا۔

پہ اتنا وضاحت کہتے رہے پھر پیرومرشد نے فرمایا۔ اے میرے بیٹو! ہم سب انسان ہیں اور ہم سب کے اندر ہمارے شیاطین موجود ہیں لیکن ہم نے اپنے شیاطین کی گردنوں پر جو محتسب بٹھائے ہیں ان کے سبب اِن کی سرکشی قابو میں ہے لیکن جہاں محتسب نہیں ہیں اور ان کی جمعیت ہوا و ہوس کی ڈگر پر چلتی ہے اور جب وہ حد سے گزرتا ہے تو انسانیت کراہتی ہے، ظلم و جور پنپتا ہے۔ ابتداء ہی سے یہ کھیل جاری ہے اور آخر تک یونہی جاری و ساری رہے گا۔"

ایک درویش یہ سن کر تڑپ اٹھا اور بولا "اے پیرومرشد! پھر ہماری تکلیفِ شرعی کیا ہے ہم کس بات کے لئے مکلف کئے گئے ہیں؟"

پیرومرشد نے کہا۔ "اے فرزند! کیا تو نے نہیں دیکھا کہ ہمارا منصب اوروں نے سنبھالا ہے یہ کہ اور جہاں سے ہدایت کی روشنی پھوٹنا چاہئے اُس جگہ اور اس منصب پر بوالہوسوں کا قبضہ ہے۔"

دوسرے نے کہا "اے پیرومرشد! تو کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ جو ظلم و جور ہو رہا ہے اس پر ہم خاموش رہیں۔ نہ احتجاج کریں نہ مزاحمت کریں کہ ہمارے احتجاج اور مزاحمت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا، اور کیا نمرودوں فرعونوں اور یزیدوں کو اس صورتِ حال میں تقویت نہیں پہنچے گی؟"

ایک اور درویش بولا "یعنی دوسرے لفظوں میں شیاطین یونہی دندناتے پھریں گے اور ان کا اقتدار یونہی بڑھتا رہے گا۔"

تیسرے نے کہا "کیا درویشوں کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنی آگ میں تپتے رہیں، جلتے رہیں اور جل جل کر راکھ بن جائیں۔"

پیرومرشد نے فرمایا۔ "نہیں ایسا نہیں ہے۔ نہ ہم تپسیا پر یقین رکھتے ہیں اور نہ دنیا سے کٹ کر رُہبانیت اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن ہر نمرود کے لئے ابراہیم ہر فرعون کے لئے موسیٰ اور ہر یزید کے لئے حسین ہر ایک نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے ریاضت کی بھی ضرورت ہے اور مناسب وقت کی بھی۔"

ان میں سے ایک بولا "کیا ہم میں سے کوئی اس منصب پر فائز ہو سکتا ہے اور کیا اس وقت کو ہم اپنے قابو میں لے سکتے ہیں؟"

پیرومرشد نے فرمایا۔ "یہ سوال اپنے آپ سے پوچھو اور اپنے باطن میں ڈوب کر حساب کرو اور یاد رکھو کہ جب تک ماضی کی تمام کڑیاں جوڑ کر اپنے زمانے سے ملاؤ گے تم مستقبل کی طرف آگے قدم نہیں اٹھا سکتے۔"

ان میں سے ایک نے کہا "کیا اِس کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں اپنی ذات کی تعمیر اور تشکیل کے لئے وقت کا انتظار کرنا پڑے گا؟"

پیرومرشد نے کہا۔ "وقت تمہارے دل و دماغ کے دروازے پہ پہنچ کر دستک نہیں دے گا۔ تمہیں وقت کو خود اپنے قریب لانا پڑے گا۔"

ایک اور درویش نے کہا۔ "پھر اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنی جان سے گزر کر وقت کو دریافت کرنے پڑے گا۔"

پیرومرشد نے کہا۔ "ہاں! جو جان کو عزیز رکھتے ہیں وقت اُن سے کترا کر گزر جاتا ہے اور جو جان سے کھیل جاتے ہیں وہ وقت کو مسخر کر لیتے ہیں۔"

اُن میں سے ایک اور بولا "ہمیں نہیں معلوم کہ ہم اِس وقت کہاں کھڑے ہیں۔"

پیرومرشد نے کہا "اے بیٹو! یہ بات خود اپنے آپ سے پوچھو اور پوچھ کر خود اپنے آپ کو بتاؤ۔ مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں تمہارے بطون میں جو جگنو سے چمکتے ہوئے دیکھ رہا ہوں وہ نہیں جب تک برق کے کوندے میں بدلتا ہوا محسوس نہ کرو تمہارے اندر سرشاری پیدا نہیں ہو سکتی اور جب سرشاری پیدا ہو جائے گی تو وہی تمہاری شناخت بن جائے گی۔"

کچھ دیر کے بعد ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا اور وہ چاروں کے چاروں سر نہوڑائے بیٹھے رہے، اپنے بطون میں ڈوبے رہے۔ پیرومرشد نے اپنی عبا سمیٹی سرو قد کھڑے ہوئے اور اندر چلے گئے۔

دریا کے کنارے غروبِ آفتاب کے سبب سارا آسمان شفق گوں ہو رہا تھا۔ تا بہ حدِ نگاہ ویرانہ تھا۔ آس پاس کے درخت بھی خاموش تھے اور صمٌ بکمٌ کی صورت میں خاموشی ان پر مسلط تھی۔ اِکا دُکا پرندے آشیانوں کی طرف رواں دواں تھے۔ پیرومرشد اپنے چاروں چیلوں کے ہمراہ پا پیادہ اس ویرانے میں کسی سمت کی طرف خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ کر ایک ایک چٹان پر پیرومرشد نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پہلے خود بیٹھے اور ان کے بعد چاروں چیلے حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے۔ تب وہ گویا ہوئے۔ "اے بچو! ہر طلوع آفتاب غروب ہونے کے لئے ہماری کائنات کے اُفق پہ ظاہر ہوتا ہے لیکن جس مقام سے وہ طلوع ہوتا ہے اُسی مقام پر کسی دوسرے خطۂ ارض پہ وہ غروبِ آفتاب کا منظر

ہے۔ انسان کی زندگی بھی یہی ہے ہم عالمِ ارواح سے عالمِ موجودات میں اسی طرح آتے ہیں اور آب و گل کی اس دنیا سے سفر کر جاتے ہیں۔ بظاہر ابتداء اور انتہا کی یہی کہانی انسانی وجود کی ابتداء اور خاتمہ ہے، لیکن جو چیز زندہ رہتی ہے وہ انسان کے مادّی پیکر سے ماوراء ہے۔"

ایک درویش نے کہا۔ "یعنی روح"

پیرومرشد نے کہا۔ "بے شک روح۔ لیکن اس روح کے اندر بھی کچھ ہے۔"

ایک درویش نے پوچھا۔ "اے پیرومرشد وہ کیا ہے؟"

پیرومرشد نے فرمایا۔ "اے بیٹا! یہ وہ ہے جسے انسان خود بناتا ہے۔"

درویش بولا "روح تو حکم ربی ہے۔"

پیرومرشد نے کہا۔ "بے شک حکم ربی ہے مگر اے بیٹا! تمہارے وجود میں اس روح کے رہنے کا کوئی مقصد بھی تو ہے۔ کیا تم نے اس حقیقت پر غور کیا ہے؟!"

ایک درویش نے کہا "خودی اور اس کی پہچان۔"

"ہاں! خودی اور اس کی پہچان۔" پیرومرشد نے کہا۔ "لیکن خودی کی پہچان کیا ہے؟"

دوسرے درویش نے کہا "یہی تو راز سربستہ ہے۔"

ایک اور درویش نے کہا "ہماری ذات کے باہر جو کائنات ہے، اس کا شعور ہماری زندگی سے موت تک پھیلا ہوا ہے۔"

پیرومرشد نے کہا "بے شک یہ درست ہے۔"

"یہ شعور کیا ہے؟" ایک اور درویش نے پوچھا۔ "اور کیا جب ہم مر جاتے ہیں تو یہ شعور ختم ہو جاتا ہے یا یہ شعور مر جاتا ہے؟"

ایک اور درویش نے کہا۔ "ہماری ذات کی آگہی کائنات کی شناخت میں کیا مدد دیتی ہے؟"

ایک اور بولا "انسان اور کائنات تو خدا کی تخلیق ہے۔ معاشرے کا وجود نظر آنے والی مادّی قوّتوں سے بھی بنا ہے اور نہ نظر آنے والے مادی محرکات و عوامل سے بھی تو ہماری روح اس سماج میں کیا کردار ادا کرتی ہے۔"

پیرومرشد نے کہا۔ "اے بیٹا! میری ساری زندگی کی ریاضت اسی پر صرف ہو رہی ہے اور ابھی بہت سے بھید مجھ پر بھی آشکار نہیں ہیں انسان کی قوّت جہاں پر ختم ہوتی ہے وہاں سے کون کونسی قوتیں اپنا کام شروع کرتی ہیں۔ ہنوز اس بھید کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا۔ اگر تم میں سے کوئی اس بھید کو پالے تو میرے اندر بھی آگہی کی روشنی مزید بیدار کرے۔"

تمام درویش دیر تک سوچ بچار کرتے رہے اور غروب آفتاب کے بعد جب اندھیرا پھیلنے لگا، تارے نکلنے لگے تو یہ قافلہ یہاں سے چلا اور کسی سمت میں جا کر غائب ہو گیا۔

چاروں درویشوں کے ساتھ پیرومرشد جب اپنے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے تو وہاں پہلے ہی سے ایک خوبصورت عورت سرتاپا چادر میں لپٹی ہوئی موجود تھی۔ تمام درویشوں نے اور پیرومرشد نے حیرت سے دیکھا اور پوچھا۔ "تم کون ہو؟" عورت نے جواب دیا "میں اسی کائنات کی ایک ہستی ہوں اور میرا وجود وہی ہے۔ جسے تم جانتے ہو، لیکن پہچانتے نہیں ہو۔"

پیرومرشد نے فرمایا "بے شک تم بنتِ حوا ہو، آدم کی رفیق ہو، انسان کی ماں ہو، بہن ہو، بیٹی ہو۔"

عورت مسکرائی اور بولی "درست ہے یہ وہ رشتے ہیں جو تم نے مشخص کر لئے ہیں۔ ان کی معاشرتی حیثیت بھی ہے، قانونی بھی تہذیبی و ثقافتی بھی، لیکن میری ایک حیثیت اور بھی ہے۔"

وہ چاروں درویش چونکے اور بولے "وہ کیا؟"

عورت نے کہا۔ "میں نوعِ بشر ہوں، میری ایک جنسی شناخت ہے اور یہ کہ میں ایک عورت ہوں۔"

پیرومرشد نے کہا۔ "جب اپنی اس حیثیت کو عورت غلو کے ساتھ پیش کرتی ہے اور تہذیب کے جامے کو تار تار کر دیتی ہے تو پھر یہی بنتِ حوا شیطان اور ابلیس کی چیلی بن جاتی ہے۔"

عورت پھر مسکرائی اور بولی۔ "یہ گالی کچھ نئی نہیں ہے۔ میں نے بار بار اسے سنا ہے۔ میری ماں بہنوں نے بھی اسے سنا ہے لیکن وہ احتراماً خاموش رہی ہیں۔ میں خاموش نہیں رہ سکتی میں خود اپنی وکیل ہوں۔ میں اپنی جبلّت کے تمام محرّکات اور عوامل کو جانتی اور پہچانتی ہوں۔ میرے فطری وظائف پر جو قدغن بنیاد پرستوں نے بٹھاتے ہیں ان سے کسی طور بھی رہائی ممکن نہیں۔ کبھی مجھے قانون، شرع اور تہذیب کے خوبصورت ملبوسات میں پیش کیا جاتا ہے اور میری خواہشات پر پہرے دیئے جاتے ہیں اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ مجھے چند خوبصورت نام دے دیئے جاتے ہیں لیکن میری طمانیت و تسکین کا سامان بہم نہ

پہنچایا جاتا ہے۔

پیرومرشد نے کہا۔ "اے عورت! تو نے گھر کی چار دیواری کے باہر قدم کیوں باہر نکالا اور یہاں کیوں آئی ہے؟"

عورت بولی "کیونکہ وہ ایک قیدخانہ ہے اور اس قید خانے کو تنگ نظر لوگوں نے بنایا ہے۔"

پیرومرشد نے کہا۔ "مگر ہم تو ملا نہیں ہیں۔"

عورت نے کہا۔ "ٹھیک ہے، اسی لئے تو میں تمہارے پاس آئی ہوں تم سے فریاد کرتی ہوں کہ تم انصاف کرو کہ میری ہستی کے چاروں طرف جو حصار تم نے کھینچا ہے وہ خوف، ڈر اور مایوسی اور حرماں نصیبی کا حصار ہے۔ قدم قدم پر میرے سامنے لکشمن ریکھائیں بنائی گئی ہیں۔ اس ریکھا کو پھلانگ نہیں سکتی کہ ہر لکیر آتشیں ہے، ہر لکیر سے شعلے پھوٹتے ہیں۔"

پیرومرشد نے نرمی سے کہا۔ "تم کیا چاہتی ہو اور تمہارا مقدمہ کیا ہے؟"

عورت نے کہا۔ "میرا ذاتی مقدمہ کوئی نہیں ہے لیکن میں جنسِ لطیف کی وکیل ہوں اور اُس کا مقدمہ تمہارے سامنے لے کر آئی ہوں کہ تمہارے بنائے ہوئے معاشرے میں ہم کب تک محبوس رہیں گے۔"

ایک درویش نے کہا۔ "اے بی بی! ہم تو اللہ والے درویش ہیں، ہم خود اس معاشرے میں اسیر ہیں، جسے مفاد پرستوں نے قائم کیا ہے۔ ہم مزاحمت کر رہے ہیں، احتجاج کر رہے ہیں اور ان غلط قوانین کو توڑنا چاہتے ہیں جن میں کیا ابنِ آدم اور کیا بنتِ حوا سب اسیر ہیں۔"

عورت پھر ہنسی اور بولی۔ "کیا اکیلے تم اس حصار کو توڑ سکتے ہو؟"

پیرومرشد نے کہا۔ "نہیں! نوعِ بشر کی نصف بہتر تم ہی ہو اور بشریت کے تمام تقاضے ابنِ آدم اور بنتِ حوا میں مشترک ہیں۔ دیکھنا چاہیئے کہ اس جبریت کا ماخذ کہاں ہے۔"

ایک درویش نے کہا۔ "اے پیرومرشد! مجھے جبریت کا ماخذ مغرب نظر آتا ہے۔"

دوسرا بولا۔ "نہیں مشرق میں ہے۔"

تیسرے نے کہا۔ "شمال میں۔"

چوتھے نے کہا۔ "جنوب میں۔"

عورت ہنسی اور بولی۔ "اس تمام روئے ارض پر جبریت موجود ہے جو آدم نے تشکیل دیا ہے اور ہمارے عہد کی جبریت سب سے زیادہ ڈالا اور مضبوط ہے اور اس کو توڑنا آسان نہیں۔"

پیرومرشد نے کہا۔ "یہ درست ہے کہ اسے توڑنا آسان نہیں لیکن اولاً اس کی شناخت آسان بنائی جائے اور پھر اُسے توڑا جائے۔"

اچانک ہال میں ایک زوردار لیکن استہزے میں ڈوبا ہوا قہقہہ گونجا۔ سب نے چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ ایک درویش نے گھبرا کر سوال کیا۔ "تم کون ہو؟"

دوسرے نے کہا۔ "اگر تم کوئی نظر نہ آنے والی قوت ہو تو ظاہر کیوں نہیں ہوتے۔"

تیسرے نے کہا۔ "تمہارے اس قہقہے کا مطلب کیا ہے؟"

چوتھا بولا۔ "لیکن یاد رکھو کہ ہم تمہارے قہقہے سے مطلقاً خائف نہیں ہیں۔"

عورت نے کہا۔ "اے قہقہہ لگانے والے! اگر تو نوعِ بشر نہیں ہے تو اپنا تعارف کیوں پیش نہیں کرتا۔؟"

قہقہہ لگانے والی آواز نے کہا "میں نوعِ بشر نہیں ہوں لیکن اس سے ماورا بھی نہیں ہوں۔"

پیرومرشد نے کہا۔ "کوئی قوت نوعِ بشر سے ماورا نہیں سوائے اللہ کے۔"

آواز نے کہا "خیر یہ تمہارا خیال ہوگا میں تمہاری دنیا کا نہیں ہوں۔"

ایک درویش نے کہا۔ "کیا تم کسی سیارے سے آئے ہو۔؟"

آواز نے کہا "نہیں۔ میرا تمہاری ہی دنیا سے تعلق ہے۔"

دوسرے نے کہا "تم بولتے تو ہماری ہی زبان ہو لیکن تمہاری آواز بالکل انسانوں جیسی نہیں ہے۔"

آواز نے کہا۔ "میں انسان نہیں ہوں۔"

پیرومرشد نے کہا۔ "پھر تم ضرور انسان کی تخلیق ہو۔"

آواز نے کہا۔ "ہاں میں انسان کی تخلیق ہوں مگر انسان کی ذہنی اختراع ہوں۔"

پیرومرشد نے کہا۔ "تمہارے کام کی نوعیت کیا ہے اور تمہارا مؤکل کون ہے اور یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟"

آواز نے کہا۔ "تمہیں بتانا تمہیں بتانا ہے کہ اصل طاقت کا منبع کون ہے اور کہاں ہے۔"

سب نے یک زبان کہا "کون ہے اور کہاں ہے؟"

آواز نے کہا۔ "تم تھوڑی دیر کے لئے [illegible]

احمد کمال پروازی

یہ شرط لگا دی کوئی زینہ نہیں اترے
دیوار پہ دیوار کا سایہ نہیں اترے

کیا میری طرح تم بھی یہی سوچ رہے ہو
کیوں آج مسافر لب دریا نہیں اترے

دراصل یہ میری نہیں دریا کی نفی ہے
پانی کے لئے کوئی پرندہ نہیں اترے

ہر قول معزز مگر ایسا نہیں ہوتا
دروازے کھلیں اور اجالا نہیں اترے

یا رو مرا اسلوب بھی سقراط صفت ہے
ہو سکتا ہے معیار پہ پورا نہیں اترے

● ۲۹۴۴ [illegible] اسٹیل فیکٹری ۔ ترپ [illegible] (ایم ۔ پی)

انوار فیروز

اک آئینہ بچا مگر خود کو پاش پاش کروں
کبھی تجھے تو کبھی خود کو میں تلاش کروں

یہ آرزو ہے ترے جسم میں پگھل جاؤں
تو راز ہے تو میں اس راز کو بھی فاش کروں

ستارے ٹانک رہا ہوں پھٹی قباؤں میں
سبھی اداس ہیں کس کس کو میں نراش کروں

میں ہیرو شیما کی مانند ریزہ ریزہ ہوا
جلا ہوا ہوں کہاں جا کے بود و باش کروں

تو چاندنی ہے تو کیوں میرے گھر نہیں آتی
اندھیری رات میں تجھکو کہاں تلاش کروں

اس آئینے نے ہمیشہ مجھے رلایا ہے
جو دکھ ہی دے میں اسے کیوں نہ پاش پاش کروں

سسک رہی ہے شرافت کسے کہوں فیروز
لغت سے میں ہی حذف لفظ بدمعاش کروں

● ۵۲۸/ڈی ۔ سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی (پاکستان)

اسلم عمادی

ہے جو شہد لب کا خیال، تجھ سے جدا نہیں
کہیں ہجر ہوں کہ وصال، تجھ سے جدا نہیں

یہ زمیں ہنسے تو چمن، جلے تو شرر بہ جاں
مگر اس کا حسن و جمال، تجھ سے جدا نہیں

یہ ہوا غبار اٹھائے پھرتی ہے چار سو
کہ سبھی جنوب و شمال، تجھ سے جدا نہیں

مجھے اپنا شہر عزیز ہے تو کچھ اس لئے
کہ اب اسکی صورت حال، تجھ سے جدا نہیں

کوئی حادثہ، کوئی مسئلہ، کوئی رد و کد
کوئی بحث، کوئی سوال، تجھ سے جدا نہیں

یہی اک سبب ہے جو وقت سے نہیں خوف ہیں
کہ یہ روز و شب مہ و سال تجھ سے جدا نہیں

نئی سوچ تازہ جنون، اسلم ابھی کہاں
کہ گزشتہ شب کا خیال تجھ سے جدا نہیں

● پوسٹ بکس [illegible] کویت



شفق سوپوروی

میرا اُبھرا اُمنڈا پانی تم سے ہے
ایک ندی ہے جس کی روانی تم سے ہے

تم سے ہی سب کرداروں میں جان پڑی ہے
یعنی میری ساری کہانی تم سے ہے

تم نے ہی خیمے گاڑے ہیں آنگن میں
یہ تسکین سرائے فانی تم سے ہے

تم سے ہی مشہور بھی ہوں رسوا بھی ہوں
ذات مری جانی پہچانی تم سے ہے

تم خوشبو ہو اور میں اس کے تعاقب میں
میرا شوقِ نقل مکانی تم سے ہے

تم سے ہی بارات بنی ہے یہ گھر بار
چاند کی چاندنی رات کی رانی تم سے ہے

فراز حامدی

پیار ادھورا ایسے ہے وشواس بنا
جیسے کوئی جینا چاہے آس بنا

یادوں کی چھایا پیپل سے گہری تھی
ہم نے تجھ کو ڈھونڈھ لیا بنواس بنا

تم نے انگ لگا کر من بھی رنگ ڈالا
لوگ ہیں جوگی جا نیں سنیاس بنا

بھونرا پھول، پتنگا باتی، چاند چکور
مدھوشالا میں کون آتا ہے پیاس بنا

کچھ تو لکھ دو میرے دل کے پنّوں پر
کون امر ہو پایا ہے اتہاس بنا

اس یگ میں جیون کچھ ایسا لگتا ہے
چلتی پھرتی ارتھی ہے احساس بنا

کوئی تو مجھ میں ایسی ہو گی بات فراز
پھولوں کو چھوتا ہے کوئی باس بنا

● ۱۸۶ کشیپ مارگ، اسبھاشی بوہرہ گے جے پور ۲

ساحر شیوی

طویل رات کی کیا جانے کس جگہ ہو سحر
مری حیات مسلسل ہے ایک ذہنی سفر
ہجوم مصائب و آلام میری عمر دراز
فریب کھا نہ سکے گی کسی سے میری نظر
رہِ حیات میں اب بھی پڑاؤ باقی ہیں
خدا کرے کہ ہو اب ختم زندگی کا سفر
مرا لباس مقدس ہے جس طرح احرام
ہے مسجدوں کی طرح پاک مجھ غریب کا گھر
بھٹک رہا ہوں میں آوارہ دشتِ غربت میں
نہ موت سے مجھے وحشت نہ زندگی سے مفر
کرو زمانے میں تقسیم پیار کی خوشبو
زمانہ دے نہ سے تمہیں نام و پیام کا ساغر
مرا وجود بھی بے حس ہوا ہے پتھر سا
بہت ہی سخت لگائی ہے وقت نے ٹھوکر
جو خواہشات کا اپنی غلام رہتا ہے
اسے ستاتی ہے ہر لمحہ فکرِ سیم و زر
جدید و کہنہ روایات میں الجھتا نہیں
سخن نرالا ہے ساحر کا سیدھی اس کی ڈگر

● 47-SUTTON GARDEN,
SUNDON PARKS, LUTON
BEDS LU3, 3AE, ENGLAND



<u>معظّم ٹونکی</u>

مبارک منزل ۔ پانچ بتی ۔ ٹونک ۔ ۳۰۴۰۰۱ (راجستھان)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر

سورج لاچاری سے غروب ہو رہا تھا۔

وہ کتابوں کو سینے پر دبائے دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ خاموش خاموش۔ نظریں نیچے کئے۔ فکر میں ڈوبی ہوئی۔

ہر روز ایسا ہی ہوتا۔ اسکول کی چھٹی ہونے پر ایک دم اس پر خوف و ہراس چھا جاتا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ گھر نہیں جا رہی بلکہ واپس جیل جا رہی ہے۔ دھیمی رفتار اسے اپنی سہیلیوں اور اسکول کی دوسری لڑکیوں سے پیچھے کر دیتی۔ لیکن اسے احساس نہ ہوتا۔ اسے ایسا لگتا جیسے رات شہر پر نہیں اس کے دل و دماغ پر اتر رہی ہو۔ رات، خوف اور تنہائی والی تاریکی۔

سورج ڈوبتے ڈوبتے وہ اپنی گلی میں مڑتی۔ سامنے گھر پہ نظر پڑتے ہی وہ ٹھنڈی ہو جاتی، بے جان سی ہو جاتی۔

ماں کی کٹ کھنی آواز اسے جھنجھوڑتی۔ "آ گئی تو۔ اتنی دیر کہاں لگا دی۔؟"

وہ کچھ نہ بولتی۔ کمرے میں جا کر کتابیں رکھتی۔ ڈریس بدلتی۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلتی تو اسے دیکھ کر ماں پھر بڑبڑاتی۔

"اسکول کی ساری لڑکیاں کبھی کی آ گئیں۔ تو اب آئی ہے؟ ہر وقت بھی ہے کیا بجا ہے۔؟"

ماسٹر جی پاس ہی تخت پر بیٹھے، اسے محبت کی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولتے۔ "اسکول ہی سے تو آ رہی ہے۔ اور کہاں جائے گی۔؟ چلانے جا رہی ہو، پہلے اسے کھانا دو۔"

ماسٹر جی کی آواز اسے زہر لگتی۔ لیکن وہ خاموش رہتی۔ ہاتھ منہ دھو کر وہ کھانے کے لئے بیٹھ جاتی۔ ماسٹر جی ماں سے باتیں کرتے رہتے۔ لیکن نظریں اسی پر ٹکی رہتیں۔ اسے ایسا لگتا جیسے ماسٹر جی کی نظریں تیز دھار والی قینچی ہو جو اس کے کپڑوں کو کاٹ کاٹ کر اسے ننگا کر رہی ہو۔

وہ نظریں نیچی کئے کھانا کھاتی رہی۔

ماں اور ماسٹر جی اٹھ کر چلے گئے۔ کھانا کھا کر اس نے برتن سمیٹے اور دھونے بیٹھ گئی۔ رسوئی گھر کو صاف کر کے جب وہ برآمدے میں بیٹھی تھی۔ تو اس کا دماغ ہوا کے تیز جھونکوں کی وجہ سے کتاب کے اوراق کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ دیوار سے ٹیک لگائے زانو پر کتاب کھولے بیٹھی رہی، کھوئی رہی قریب کے کمرے سے ماسٹر جی اور ماں کی باتوں کی آواز آتی رہی۔ دونوں کی ہنسی اور ماں کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اس کے دماغ پر ضربیں لگا رہی تھی۔ اسکول جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے وہ راستے میں مورتیاں بنانے والوں کو ہتھوڑی اور چھینی سے سنگ مرمر پر ضربیں دیتے ہوئے دیکھتی اور سنتی۔ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ۔ اور اس وقت ماسٹر جی کی باتیں اور ماں کی ہنسی دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ ماسٹر جی، ماسٹر جی، ماسٹر جی!

اس نے سر کو جھٹکا دے کر ماسٹر جی کو ذہن سے نکالنا چاہا مگر چھت پر چپکی دم ہلاتی چھپکلی کی طرح ماسٹر جی چپکے رہے۔ اس کی نظریں کتاب سے اٹھ کر سامنے اندھیرے میں جم گئیں۔

"ماسٹر جی۔ ماسٹر جی۔ ہے رام ان سے کب چھٹکارا ملے گا۔؟ ایشور تو نے ہمارے باپو کو کیوں چھین لیا؟ نہ وہ مرتے اور نہ یہ سانپ ہمارے گلے کا ہار بنتا۔ باپو۔ تم ہمیں چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔؟"

وہ سسکنے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کا ذہن ماضی میں بھٹکنے لگا۔

باپو پٹواری تھے، خوب کمایا۔ خوب اڑایا۔ شراب بہت پیتے تھے۔ ٹی بی ہو گئی۔ جس علاقے کے وہ پٹواری تھے وہاں کے صدر مقام کے رہنے والے ایک ماسٹر سے ان کی دوستی ہو گئی۔ ماسٹر نند لال۔ یہی ماسٹر جی تبھی سے ماسٹر جی کی بد نیت ماں کے لئے ہو گئی۔ ماسٹر جی کا باپ سود سے خوف اور ادھار دیتے [illegible]

بیٹے نندلال کو تعلیم دلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ میٹرک سے آگے نہ بڑھ سکا۔ میٹرک کا سرٹیفکیٹ بھی ساتویں پھیرے میں لیا جیسے تیسے ٹائپ کی ٹریننگ کی۔ شروع ہی سے رنگین طبیعت کے تھے اس لئے چند برس چھوڑا نہ آس پاس کے گاؤں۔ باپ کے مرنے کے بعد وہی سود کا کاروبار سنبھالا شہر میں ہمارے ہی محلے میں مکان خرید لیا۔ شراب نوشی کی وجہ سے باپو، کا ہاتھ تنگ رہتا تھا۔ ماسٹر جی نے مدد شروع کی۔ ماں شروع میں تو ماسٹر جی کے آتے ہی چھپ جایا کرتی تھی۔ پھر ماسٹر جی کا دن رات کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ باپو دو سال تک سخت بیمار رہ کر چل بسے۔ میں اس وقت نویں کلاس میں تھی۔ ماسٹر جی نے پنشن کے لئے بھاگ دوڑ کی۔ اب ماسٹر جی آتے تو ماں تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ کر، ادھر ادھر کام کے لئے چلی جاتی۔ ماسٹر جی دیر تک بیٹھے رہتے۔ لیکن جیسے جیسے پنشن میں دیر ہونے لگی تو گھر میں تنگی آ گئی۔ ماسٹر جی گھر کا خرچ چلانے کے لئے روپئے دینے لگے۔ ماں ان کے احسانات تلے دبنے لگی۔ جب تک پنشن جاری ہوتی تب تک ماسٹر جی، ماں کے بہت قریب آ گئے۔ اتنے قریب کہ مجھے دونوں سے نفرت ہو گئی۔ ایک پڑوسی نے تو یہ بتایا کہ پنشن تو تیسرے مہینے ہی جاری ہو جاتی لیکن ماسٹر جی کوشش کے نام پر ڈھیل دیتے رہے بات صحیح بھی لگتی ہے۔ ان پڑھ ماں، ماسٹر جی کی چال نہیں سمجھ سکی اور ان کے جال میں پھنس گئی۔ روز آنہ ماسٹر جی کا آنا۔ صبح، دوپہر یا شام کئی گھنٹے بیٹھنا معمول ہو گیا۔ ہنسی، ٹھٹھے، دل لگی۔ مجھے تعجب ہوتا، ماں کیوں بھول گئی کہ وہ بیوہ ہے۔ محلے میں باتیں بننے لگیں۔ ماں سے ماسٹر جی کے ناجائز سمبندھ کی خبر پورے محلے میں پھیل گئی۔ ایک دن پڑوسی رگھوناتھ۔ پتا۔ وہ بھی ماں پر بری نظر رکھتا ہے۔ نیتا گری جس کا پیشہ ہے چند لوگوں کو لے کر ہمارے دروازے پر آ دھمکا۔

"ماسٹر جی باہر نکلو۔"

"یہ شریفوں کا محلہ ہے رنڈیوں کا نہیں"

"یہاں آوارگی نہیں چلے گی۔"

ماں تھر تھر کانپنے لگیں مگر ماسٹر جی بالکل نہیں گھبرائے۔ کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑے رہے۔ پھر لپک کر لاٹھی اٹھائی اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکے۔

"بولو ... کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"بیوہ عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ آوارگی کرتے ہو" رگھوناتھ بولا۔

"شریف عورت کو بہکاتے ہو۔" اس کے ساتھیوں میں سے ایک بولا

"کیا تیرے گھر میں تیری ماں بیٹیاں نہیں ہیں۔" دوسرے نے کہا

"خاموش!" ماسٹر جی گرجے "تم مجھے آوارہ کہتے ہو۔ پہلے اپنے گریبانوں میں جھانکو۔ رادھے شیام تیری بیٹی تیس سال کی ہو گئی۔ تو نے پیسے کی خاطر اب تک اس کی شادی نہیں کی۔ تو برہمن ہے لیکن تیری بیٹی اپنے افسر، تائی کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی ہے۔ پروفیسر صاحب آپ آپ کا منہ تو پہلے ہی کالا ہے۔ اپنی اسٹوڈینٹ کو بہکا کر تو آپ نے شادی کی ہے۔ اور رگھوناتھ جی آپ۔ سفید دھوتی کرتہ اور ٹوپی پہنے نیتا بنے پھرتے ہو۔ کیا آپ نے اسمبلی کا ٹکٹ پانے کے لئے اپنی بہن اور بیوی کو سیڑھی نہیں بنایا۔ دن رات نیتا لوگ آپ کے گھر میں شراب پیتے پڑے رہتے تھے آپ کی اس بے حیائی اور لالچ کی وجہ سے شہر کے لوگوں نے آپ کو ہرا دیا آپ کی بہن کسی منسٹر، کسی ایم ایل اے کے گھر راتیں گذارتی پھرتی ہے کس کس کا چٹھا کھولوں؟

سب کی نظریں جھک گئیں۔ ماسٹر جی اور زور سے گرجے

"تم لوگ اس وقت کہاں مر گئے تھے جب اس گھر کا مرد بیماری سے تڑپ رہا تھا کسی نے علاج کے لئے پیسہ دیا۔؟ غریب بے کس بیوہ سے مرتیو بھوج کھانے کے لئے تو سب آ گئے کسی نے پوچھا یہ پیسہ کہاں سے آیا۔؟ پنشن کے ملنے تک بھوک سے بچانے کے لئے کون کون اس دروازے پر آیا۔؟ کیوں۔ سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا؟ مجھے اس گھر سے نکالنے کے لئے وہی شخص آگے آئے گا جو میرے قرض کے پچاس ہزار روپے دے اور اس گھر کا خرچ چلانے کی ذمہ داری لے ہے کوئی ماں کا لال۔؟"

کوئی کچھ نہیں بولا۔ سب کی گردنیں جھک گئیں۔ ماسٹر جی فاتحانہ اندر آ گئے۔

اب ماسٹر جی کو کھلی چھوٹ مل گئی تھی۔ اب وہ راتوں کو بھی بے کھٹکے رہنے لگے تھے۔ ماں بھی اب بے جھجک ہو گئی تھی۔ بس مجھ سے نظریں نہیں ملاتی تھی۔ کیوں کہ وہ میرے ہر وقت خاموش اور سنجیدہ رہنے سے ڈرتی تھی۔ ماسٹر جی سے تو میں نے بات چیت کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن ان چھ مہینوں میں ماسٹر جی کی نظریں ہوسناک ہو گئی تھیں۔ آتے جاتے مجھے چھپ چھپ نظروں سے دیکھتے جیسے ہر انگ کا غور سے معائنہ کرتے ہوں ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ موقع کی تاک میں [illegible] کب یہ اکیلی ملے اور میں دبوچ لوں۔

کئی بار ایسا ہوا کہ ماسٹر جی سر کے درد کے بہلانے کر کے لیٹ گئے یہ ایسے وقت میں بہانہ کرتے جب ماں کھانا بناتی ہوتی یا نہاتی ہوتی

"ارے الکا۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ ذرا داب دے۔" میرا دل دھڑکنے لگتا۔ میں نہیں جاتی۔ دو تین بار بلاتے۔ پھر ماں چلاتی۔

ارے سنتی نہیں۔ ماسٹر جی کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ جا داب دے۔ میں ماں سے کیا کہتی۔ تعجب ہوتا۔ وہ عورت ذات ہو کر اس بدمعاش کی نیت نہیں سمجھ رہیں۔؟

میں ذرا دور ہٹ کر بیٹھتی اور سر دابنے لگتی۔ ماسٹر جی جلدی سے اپنا سر میرے زانو پر رکھ دیتے پھر تھوڑی دیر بعد کہتے۔ "زور سے دا، ہاں زور سے۔ گردن بھی۔"

"اری ایسے نہیں ایسے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ میری گردن پر رکھ دیتے اور گردن دابتے ہوئے بانڈی تک آتے۔ میں ان کا ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو جاتی۔

ایک بعد ایک واقعات فلم کی طرح اس کے سامنے آنے لگے۔ وہ کانپ کر آنکھیں بند کر کے بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگتی "ہے رام اس مصیبت سے کب چھٹکارا ملے گا۔ ہے رام میری مدد کر ہے رام میری مدد کر۔ ہے رام۔ میری۔ مدد۔ ہے۔ رام۔ میری۔"

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے سینے پر کوئی چیز رینگ رہی ہے۔ اس نے دماغ پر زور دیا اس کا سینہ کوئی آہستہ آہستہ بھینچ رہا ہے۔ اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ اس کے پاس ماسٹر جی بیٹھے تھے۔ اس نے جلدی سے ماسٹر جی کا ہاتھ اپنے سینے پر سے جھٹک دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ہے ہے ہے۔" ٹوٹے دانتوں سے ماسٹر جی کی ہنسی نکلی۔ "تو ڈر گئی۔ ٹھنڈ ہو گئی تھی۔ اس لئے تجھ پر چادر ڈال رہا تھا۔"

اس نے تیز نظروں سے ماسٹر جی کو دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔ ماسٹر جی کمرے میں چلے گئے، ماں کے پاس۔

وہ دیر تک گم صم کھڑی رہی۔ پھر چادر اوڑھ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ہے رام یہ راکشش تو حد سے آگے بڑھ گیا۔ اب میں کیا کروں۔ اس سے بچنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ ہے رام میری رکشا کر۔ بھگوان میں نے پچھلے جنم میں ایسا کون سا پاپ کیا تھا جس کی سزا اس جنم میں لڑکی بنا کر دی۔ وہ بھی اس گھر میں جہاں

دیکھو گدھ چیلوں کی طرح چونچیں کھولے میرے جسم کو نوچنے کھسوٹنے کی تاک میں ہے۔ میں اپنے جسم کی رکشا کیسے کروں۔ بھگوان تو ہی میری رکشا کر۔

وہ دیر تک روتی رہی۔ پرارتھنا کرتی رہی۔ رات اس نے کتوں کے ڈر سے سہمے ہوئے بکری کے بچے کی طرح جاگ کر کاٹی۔

۔ [illegible] پیریڈ خالی تھا وہ کلاس سے نکل کر اسکول کی باؤنڈری وال کے پاس پیڑوں کے نیچے بنی سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھ گئی۔ رات بھر کی جگار اور ذہنی پریشانی نے اس کے سر میں درد کر دیا تھا۔ وہ اپنی پریشانی کس سے کہے؟ اور کیا کہے؟۔ جب سے ماسٹر جی اس کے گھر میں رہنے لگے تھے تب سے محلے کی عورتیں اور مرد اسے نفرت کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ گلی محلے کے نوجوان چھوکرے اور اوباش مرد اسے گندی نظروں سے دیکھتے، پھبتیوں اور گندی باتوں کو آپس میں خفیہ کوڈ کی طرح استعمال کرتے تھے۔ محلے میں اس کا کوئی ایسا ہمدرد نہیں تھا جس سے وہ دل کا حال کہے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ دن تو یہاں کٹ جائے گا مگر رات کیسے گزرے گی۔؟ گھر پہونچتے ہی ماسٹر جی کا وہی راکشسی چہرہ دکھائی دے گا ان سے اپنے آپ کو کیسے بچا پائے گی۔؟

اچانک اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ نجمہ کھڑی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں اوپر تلے دو دونے رکھے تھے۔ ایک دونہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم اکیلی یہاں کیا کر رہی ہو، لو سموسہ کھا لو۔"

نجمہ۔ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور دانتوں سے سموسہ کترنے لگی۔ "بہت خوب چٹ پٹے ہیں۔ ارے تمہاری آنکھوں میں آنسو۔" الکا نے سر جھکا لیا۔ آنسو تیزی سے بہنے لگے۔

نجمہ نے اپنا دونہ ایک طرف رکھ دیا اور اس کی طرف مڑ گئی۔

"کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو۔"

ہمدردی کے الفاظ پاتے ہی الکا کی آنکھوں سے اور تیزی سے آنسو بہنے لگے۔ سسکیاں لگ گئیں۔ اس نے منہ کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ نجمہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد سسکیاں تھمیں تو اس نے آنسو پونچھے۔ نجمہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بہت نرمی سے پوچھا۔

"الکا کیا بات ہے ؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔"

الکا نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ "نجمہ! یہاں ہمارا نہ کوئی رشتہ دار ہے اور نہ محلے میں کوئی ہمدرد۔ اسکول میں ایک تم ہی ہو جس سے میں اپنے دل کا حال کہہ دیتی ہوں۔ وہ شیطان ماسٹر جس کی حرکتوں کی تمہیں جانکاری ہے۔ اب وہ حد سے زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔"

پھر الکا نے رات کا واقعہ سنایا۔ اس کے آنسو پھر نکل پڑے "نجمہ۔ اب تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں ؟" الکا نے آنسو پونچھ کر جب نجمہ کو دیکھا تو اسے تعجب ہوا۔ نجمہ کا چہرہ بالکل سفید تھا۔ بیمار کی طرح۔ بشاشت غائب تھی۔ ایک ٹک سامنے دیکھے جا رہی تھی۔ مورتی کی طرح۔

"نجمہ نجمہ تجھے کیا ہو گیا۔ بول تو سہی۔"

نجمہ نے دھیرے سے اس کا ہاتھ اپنے بازو پر سے ہٹا دیا۔ "الکا تم جن حالات سے گزر رہی ہو میں ان سے گزر چکی ہوں۔"

"کیا مطلب ؟ کیا۔ کیا تم۔"

"تم ٹھیک سمجھ رہی ہو۔ ہم میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ بڑی بہن کی شادی اجمیر میں ہوئی جہاں بہنوئی ملازم تھے۔ چونکہ میری بہن ایم اے میں فرسٹ ڈویژن تھی اس لئے وہ ملازمت کرنا چاہتی تھی۔ ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ میں ان کو نوکری مل گئی۔ دو سال پہلے ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ لمبی چھٹیاں جب ختم ہو گئیں تو یہ مسئلہ آ کھڑا ہوا کہ بچے کو کون رکھے ؟ بہن کی سسرال میں ایسا کوئی نہیں تھا جو آ کر رہے ان دنوں میرا دسویں کلاس کا امتحان ختم ہوا ہی تھا۔ بہن اور بہنوئی میرے ماں باپ کو راضی کر کے مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ گھر میں ملازمہ بھی تھی مگر بچہ میرے پاس ہی رہتا تھا۔ کچھ دنوں بعد میں نے اندازہ لگایا کہ میری بہن کی غیر موجودگی میں بہنوئی گھر پر زیادہ رہتے ہیں اور میرے قریب زیادہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ناشائستہ مذاق بھی کرتے جو مجھے ناگوار لگتا۔"

"ایک دن میں غسل خانے میں تھی، مجھے پتہ نہیں تھا کہ غسل خانے کی چٹخنی ڈھیلی کر دی گئی ہے۔ میں شاور کے نیچے جسم پر گرتے پانی کا لطف لے رہی تھی کہ اچانک چٹخنی گری — دروازہ کھلا اور بہنوئی اندر داخل ہو گئے۔ ان کے چہرے پر شیطانی بھوت سوار تھا...."

وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ سانس پھولنے لگا۔

"پھر۔ ؟" الکا نے پوچھا۔

"پھر۔" اچانک وہ بازوؤں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ خوب روئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد کہا۔

"ایسا ہر روز ہونے لگا۔ مجھے دھمکی دی گئی کہ اگر تو نے کسی سے کہا تو میں تجھے مار ڈالوں گا۔ کچھ دن تو میں اس ظالم کے پنجے میں رہی پھر ایک دن وہاں سے نکل بھاگی۔ ماں کو ساری بات بتا دی۔ ماں باپ خاموش رہے لیکن ایک دن جب میری طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو ماں کو شک ہوا۔ ڈاکٹر کو بتایا ماں کا شک صحیح نکلا۔ میں ماں بن رہی تھی۔"

اس کے آنسو پھر بہہ نکلے۔ ہونٹ تھرتھرانے لگے "آپا نے فوری طور پر دوسرے شہر جا کر میرا ابارشن کروایا۔ چھ مہینے تک بستر پر رہی۔ ایک سال تک اسکول نہیں گئی۔"

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "سچ تو یہ ہے الکا۔ مرد ذات ہے ہی خراب۔ مجھے تو اب باپ اور بھائی بھی بھیڑیے نظر آتے ہیں۔ پتہ نہیں کب ان کی بھوک بھڑک اٹھے۔ اور وہ جھپٹ پڑیں۔"

نجمہ خاموش ہو گئی۔ اس کی نظریں اب زمین پر تھیں الکا اسے ہمدردی سے دیکھتی رہی۔

اچانک گھنٹہ بجا۔ نجمہ چونک اٹھی۔ دوپٹے سے آنکھیں صاف کیں۔ کتابیں ہاتھ میں لیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ الکا نے بھی کتابیں سنبھالیں اور اس کے پیچھے ہو لی۔ سمو سے کے دونے یوں ہی رکھے رہے

"نجمہ۔ اب مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ ؟"

نجمہ ایک دم پلٹ کر کھڑی ہو گئی۔ الکا کے دونوں بازو پکڑ کر کہا۔ "میرے ساتھ تو میرے ماں باپ تھے۔ تجربہ کار اور عقلمند تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ ماسٹر جی اور تمہارے بیان کی وجہ سے تمہیں کوئی بھی قبول نہیں کرے گا۔ ماسٹر جی کا کیا بگڑے گا پھر تم رنڈیوں کی لائن میں آ جاؤ گی [illegible] ایک [illegible] شکار۔ [illegible]

بجھ ایک دم مڑی اور چل دی۔ الکا دور تک اسے جاتا دیکھتی رہی۔

وہی وقت، وہی راستہ۔ وہی گلی۔ وہی ماں۔ وہی باتیں وہی ماسٹر جی اور وہی چپ چپاتی نظریں۔

سارے کاموں سے فراغت پاکر اس نے دوسرے کمرے میں اپنی کتابیں جمالیں۔ اس کمرے میں پنکھا نہیں تھا۔ کمرے میں گھٹن اور گرمی تھی مگر اس نے برداشت کرلیا۔ بہت ہوشیار نیند سوئی۔ حالانکہ دروازے کی چٹخنی لگالی تھی۔ مگر پھر بھی ڈر بھری نظریں اس طرف اٹھتی رہیں۔ رات کو جب بھی آنکھ کھلتی وہ چٹخنی کو دیکھ لیتی۔

دوسرے دن الکا نے بجھ سے جگہ کی تبدیلی کے بارے میں بتایا تو بجھ نے اس کا ہاتھ زور سے بھینچتے ہوئے کہا۔

"مجھے انتظار ہے اس دن کا جب میں اپنے بہنوئی کو قتل کروں گی۔" اس کی آنکھیں یک لخت خلا میں جم گئیں۔

"مجھے یاد ہے وہ حادثہ۔ مجھے یاد ہے وہ منظر۔ میں نے کیسے تڑپ تڑپ کر اس سے التجا کی تھی۔ کیسی گڑگڑائی تھی۔ مگر وہ وحشی۔ میں اسے ضرور قتل کروں گی۔ میں اسے ضرور قتل کروں گی۔"

پھر اس نے الکا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "تیرا وہ کمینہ ماسٹر۔ ضرور آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ چاہے تو سات تالوں میں خود کو بند کرلے۔ تو اپنے آپ میں مضبوط رہ۔ اتنی مضبوط کہ چاہے اسے قتل ہی کرنا پڑے۔"

اور ایسا ہی ہوا۔

چار روز بعد، آدھی رات کے قریب اس کی آنکھ ایک دم کھل گئی کوئی دروازہ ہلا رہا تھا۔ چٹخنی بار بار ہلتی۔ وہ غور سے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کو دیکھتی رہی۔ پانچ سات منٹ بعد دروازہ ہلنا بند ہوگیا۔

دوسری رات بھی ایسا ہی ہوا۔ اور زیادہ دیر تک ہوا۔

تیسری رات جب وہ کاموں سے فراغت پاکر کمرے میں آئی اور دروازہ بند کرکے چٹخنی لگانا چاہی تو چٹخنی گھوم کر پوری طرح بند نہیں ہوئی۔ چٹخنی گھوم سکنے کی دونوں سائیڈ چھوٹی کردی گئی تھی۔ بجھ نے دروازہ باہر سے کھینچنے پر چٹخنی اپنے آپ نیچے گر جائے

"ارادہ ۔" اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی نظروں میں بجھ کا دانت گھوم گیا۔ ڈھیلی چٹخنی۔ بجھ۔ شیطانی وحشی بہنوئی۔

وہ کچھ دیر تک کھڑی سوچتی رہی۔ پھر دروازہ کھول کر کمرے کی طرف چل دی۔

وہ بہت دیر تک جاگتی رہی۔ اس کے دل کی تیز دھڑکنیں معمول پر نہیں آرہی تھی۔ ہر آہٹ پر وہ لرز جاتی۔ اس کا خوفزدہ دل اسے خطرے کا احساس دلا رہا تھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف چادر لپیٹ لی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ چادر اس کی حفاظت نہیں کرسکے گی۔ پھر بھی نفسیاتی طور پر اس کا ڈر کم ہوا۔ وہ آنکھیں پھاڑے دروازے کی طرف متوجہ رہی۔ اسی درمیان نیند کا غلبہ ہوا اور وہ اونگھ گئی۔

چٹخنی گرنے کی آواز سے وہ چونک گئی۔ دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ دھیرے دھیرے کھل رہا تھا پھر ایک دم ماسٹر جی اندر داخل ہوئے اور جلدی سے دروازہ بند کرکے چٹخنی چڑھادی پھر پلٹ کر انہوں نے الکا کی طرف دیکھا۔ وہ چادر منہ پر سے سرکائے ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماسٹر جی اس کو دیکھ کر پہلے ہنسے پھر دھیرے دھیرے آگے بڑھے۔ الکا اٹھ کر کھڑی ہوگئی اپنے سینے کو بازوؤں سے ڈھانپ لیا اور لرزتے ہوئے لہجے میں کہا "ماسٹر جی آپ اس سمے۔؟"

ماسٹر جی نے پورے دانت نکال دیئے۔ "ہاں نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے سوچا الکا سے کوئی کتاب لوں۔"

الکا جان رہی تھی کہ ماسٹر جی کس نیت سے آئے ہیں۔ بچ کر جاسکتی، دوڑنا بے کار ہے۔ راکششی طاقت کا وہ مقابلہ نہیں کرسکتی۔ وہ سینہ چھپائے کھڑی ہوگئی۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں ماسٹر جی الکا کے بالکل قریب آگئے۔ پھر اپنا ہاتھ الکا کے کندھے پر رکھ دیا۔ الکا نے نظریں نیچی کرلیں۔ ماسٹر جی یہ سمجھ کر آئے تھے کہ الکا مزاحمت کرے گی۔ بھاگے گی۔ چلائے گی۔ اسی لئے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ بھرپور طاقت اور ہتھیاروں سے لیس ہوکر آئے تھے۔ لیکن جب الکا نے کچھ نہیں کہا۔ کوئی مزاحمت نہیں کی تو وہ طاقت ایک دم ختم ہوگئی۔ شیطانی ہوس ابھر آئی ہاتھ لرزنے لگا۔ انہوں نے تیز دھڑکن سے اپنا دوسرا ہاتھ

انکا کے دوسرے کندھے پر ٹکا۔ انکا پھر بھی خاموش رہی۔ ماسٹر جی نے اسے ایک دم لپٹا کر بھینچ لیا اور چپا چپ پیار کرنے لگے۔ انکا کہہ اٹھی

"ماسٹر جی یہ کیا کرتے ہو۔ماں آ گئی تو۔؟"

"ہاہاہا۔" ماسٹر جی ہنسے "تو چنتا مت کر۔ میں نے اسے نیند کی گولی دے دی ہے۔ دو دن سے ایسا ہی کر رہا ہوں۔ صبح نکلنے سے پہلے نہیں اٹھ سکے گی۔"

پھر انہوں نے بہت تیزی سے اسے چومنا چاٹنا شروع کر دیا ہاتھ تیزی سے اس کے جسم پر حرکت کرنے لگے۔ سانس روکے انکا سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے چہرے پر اس کے گلے پر، گلے سے نیچے چپڑ چپڑ ماسٹر جی پیار نہ کر رہے ہوں بلکہ جیسے کوئی کتا فرش پر گرے دودھ کو اپنی لمبی زبان سے چاٹ رہا ہو۔ وہ نفرت سے بھر گئی۔ اس کے جسم پر ماسٹر جی کے رینگتے ہاتھ اسے ایسے محسوس ہو رہے تھے جیسے کئی چھپکلیاں اس کے جسم پر رینگ رہی ہوں۔

ماسٹر جی کے تھوک سے اس کے گال، ہونٹ، گلا لس گیا تھا۔ وہ وحشیوں کی طرح جگہ جگہ کاٹ رہے تھے۔ اچانک انکا نے ماسٹر جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ماسٹر جی نہیں۔ کپڑے تو میں اتاروں گی۔"

"تو۔ تو خود اتارے گی؟" وہ حیرت بھری خوشی سے بولے۔

"ہاں" وہ مسکرائی۔ "میں خود اتاروں گی۔ لیکن آپ منہ ادھر کر لو۔"

"یہ سب ہے ہے۔ میرے سامنے اتارنے میں کیا حرج ہے" خوشی کے مارے ہونٹ پھیل کر کانوں تک پہنچ گئے۔ چار دانت ... جیسی پوری طرح باہر آ گئی۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔

"نہیں ماسٹر جی" وہ شرمائی۔ "آپ تو بس آنکھیں بند کر کے ادھر منہ کر لو۔"

"آنکھیں بھی بند کر لوں۔؟" وہ پر زور خوشی سے بولے

"ہاں مجھے شرم آ رہی ہے۔"

"اچھا تیری مرضی۔" وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے گھومے انکا نے تیزی سے تکیے کے نیچے رکھا لوہے کا موسل نکالا اور پوری طاقت سے ماسٹر جی کے سر پر دے مارا۔ ماسٹر جی کی کھوپڑی میں سینکڑوں رنگین چکر گھوم گئے۔ پھر دوسرا وار۔ ماسٹر جی کا سر کھل گیا وہ چکرا کر گر پڑے۔ انکا نے آگے بڑھ کر سر پر ایک اور وار کیا۔ چھوٹے وار میں ماسٹر جی کا بھیجہ نکل آیا۔ انکا تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اس کی حالت اس پہلوان کی طرح ہو رہی تھی جو ورزش کرنے کے بعد اپنے سینے اور بازوؤں میں بہت طاقت محسوس کرنے لگتا ہے۔ انکا پورا جسم بے پناہ طاقت سے دہک رہا تھا وہ اس وقت دس شیروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ کچھ دیر تک وہ ماسٹر جی کو تڑپتا، ٹھنڈا ہوتے دیکھتی رہی۔ پھر ان پر تھوک دیا۔ موسل سے کر مڑی۔ دروازہ کھولا۔ اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

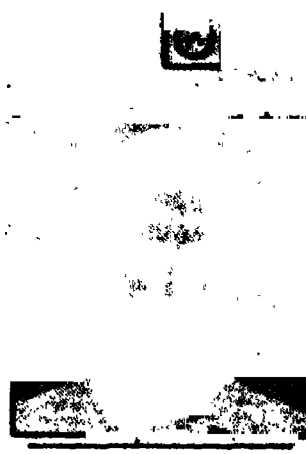
برابر والے کمرے کے بند دروازے کو زور سے لات ماری دروازہ کپکپا کر کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی نائٹ لیمپ کی روشنی میں اس نے دیکھا۔ ماں پلنگ پر سو رہی ہے۔ وہ آگے بڑھی غور سے دیکھا۔ جسم بے ترتیب پڑا تھا۔ وہ شیطان ماسٹر ابھی ماں سے کھیل کر گیا تھا۔

انکا نے ماں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ماں تیرا کوئی قصور نہیں۔ جہاں تک ہو سکا تو نے اپنے آپ کو بچایا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اب میں نہیں چاہتی کہ پھر کوئی نیا ماسٹر آئے۔ اور پھر نئی راکششی کہانی شروع ہو۔"

انکا نے موسل والا ہاتھ بلند کیا اور زور سے ماں کے سر پر دے مارا۔ ماں نے ہاتھ پاؤں سکیڑ کر جھٹکے دیئے۔ دوسرے وار میں وہ ہلکی سی پھڑکی اور ٹھنڈی ہو گئی۔

وہ ایک دم پلٹی۔ کمرے سے باہر نکلی۔ گھر کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ گلی میں سناٹا تھا۔ رات زیادہ بیت چکی تھی۔ کتے اسے دیکھ کر بھونکے مگر وہ بے خوف سینہ تانے۔ موسل ہاتھ میں لئے لمبے لمبے ڈگ بھرتی تھانے کی طرف بڑھنے لگی۔



اکرام خاور

انتظار

گرم کپڑوں کی دکانوں سے گذرتے وقت
مجھ پہ سوچوں کا انبار رہتا ہے!
سوچتا ہوں
جسم میرا کیسے برفیلی ہوا کا ساتھ دیتا ہے
سرد ہاتھوں کی قبا سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر
یہ سوچتا ہوں
زندگی سے منسلک کچھ خواب ہونے چاہئیں!!

چیخ

دوستو!
یہ کہاں سے آئی مجھے زندگی
کہ مری ہڈیوں سے
کوئی برف کی سل رگڑنے لگا ہے
رگوں میں ہمکتا لہو
منجمد ہو رہا ہے
کسی سبز و شاداب سی
شاخ کی آرزو میں
نئی کونپلوں کی تڑپ میں
ہماری جڑیں سوکھتی جا رہی ہیں۔

● سی ۱۰۸ / II، لارنس روڈ، دہلی ۳۵



سارینہ

ورہ گیت

ہماری بستی میں بنجاروں کی ٹولی آئی ہے
ایک بنجارن گاتی ہے ــ ورہ گیت
اس کی جھانجھر تال دیتی ہے
ماتھے کا جھومر بول اٹھتا ہے
او تاروں کے پار سے آواز دینے والے
کیا آسمان کے نیلے پردے کے پیچھے
اندھیرا ہے؟
اسکی ان حد چھاتی کے بھیتر بھی کوئی کونا سونا ہے؟
سورج کی کرنوں کے بیچ بھی ٹھٹھرتی ہے بے بسی؟
اور افق کو اپنے بوسوں سے لال کر دینے والے
کہیں لہریں بھی سمندر چھوڑتے وقت اداس ہوتی ہیں؟
اس کے کبھی نہ ملنے والے کنارے شکوہ کرتے ہیں؟
کیا اس اتھاہ گہرائی کے بھیتر کوئی چاہت کا سا بیج
او پریتم
تم مجھے آواز مت دو
کہ ریت پر تھرکتے یہ پیر بے دم ہو جائیں گے
اور جھانجھر ٹوٹ جائے گی
تو دیکھنا کیسے یہ تمبو اکھڑ جائیں گے
اور رقص بند ہو جائے گا

وہ بنجارن گاتی ہے ــ ورہ گیت
اور گیت ختم ہونے کے ساتھ
اس کا قافلہ
اونٹ کی پشت پر سر و ساماں باندھے
گھر کو بے گھر کر کے
اگلے پڑاؤ کے لئے
نکل پڑتا ہے
ہماری بستی سونی ہو گئی ہے
کچھ کھونٹیاں، رسّوں کے ٹکڑے
جلے ہوئے کچھ پھوس بچ گئے ہیں
جن کی مہر
وہ بنجارن میرے وجود پر لگا گئی ہے

● ۴۲۰ - ایم - آئی - جی، ہنومان نگر، کنکڑ باغ، پٹنہ - ۲۰ (بہار)

عاصم صدّیقی

میرے افکار کو افسانہ کہا جائے گا
تم نہ مانو، تمہیں دیوانہ کہا جائے گا

اپنے ہی گھر کے چراغوں کو بجھانے والو
تم کو کس طرح سے فرزانہ کہا جائے گا

ہر قدم آپ کا اٹھتا ہے ستم کی جانب
کیا یہ انداز کریمانہ کہا جائے گا

جب کہ آنگن سے خود اڑ جائیں گے سارے طائر
ایسے کاشانے کو ویرانہ کہا جائے گا

کس طرح ذہن میں بیتابی بسے گی خوشبو
جب کہ اپنوں ہی کو بیگانہ کہا جائے گا

شہر میں سنگ برستے ہیں ہر اک سو عاصم
گھر سے نکلو گے تو دیوانہ کہا جائے گا

● پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴۰۳، دمام ۳۱۴۸۱ (سعودی عرب)

کامران نجمی

صبح کو قید کریں دھوپ کو زنجیر کریں
یہ اندھیرے کہیں سورج کو نہ تسخیر کریں

جو پرستار ہیں فطرت کے یہ کب سوچتے ہیں
کس طرح تیرے خط و خال کو تصویر کریں

رات دیکھا ہے کناروں کو گلے ملتے ہوئے
آ مری جان کہ اس خواب کو تعبیر کریں

روز تپتا ہوا یہ دشتِ بلا پوچھتا ہے
تشنہ لب ایسا کوئی ہے جسے شبیر کریں

اس سے پہلے ہی طنابیں نہ زمیں کی کھینچ جائیں
ایک جہاں اور بھی اس کے سوا تعمیر کریں

اب وہ حالات ہیں نجمی نہ وہ اسبابِ غزل
کیا ضروری ہے کہ ہم پھر وہی میر کریں

● محمد عارف خان ، اردو لیکچرار ، محلہ حمالان ، سوائی مادھوپور

ذکی بلگرامی

قیام کس طرح کرتے افق کنارے پر
زمیں کے قرض میں جکڑے رہے بہانے پر
مکین ہو گئے رخصت تو پھر مکاں کیسا
مجھے یقین نہیں اینٹ چڑنے گارے پر
انا کا گہرا سمندر تھا بیچ میں حائل
میں اس کنارے کھڑا تھا وہ اس کنارے پر
ہم ایک ساتھ گذاریں کہ پھر الگ ہو جائیں
چلو یہ فیصلہ رکھتے ہیں استخارے پر
وہ ایک طائرِ تنہا نظر نہیں آتا
جو بیٹھا کرتا تھا مسجد کے اس منارے پر
بہا کے لے ہی گئی مجھ کو موجِ منہ زور
تڑپ رہا تھا مرا عکس جاں کنارے پر
زمیں نے پاؤں میں چٹکی بھری تو چونکا میں
جمی ہوئی تھی مری آنکھ اک ستارے پر
نہ جانے کتنے چراغوں کی لو کتر دی ہے
یہ اک ہوا جو چلی ہے ترے اشارے پر
جھپک رہی تھی ذکی آنکھ ہر ستارے کی
میں رو رہا تھا شبِ ہجر کے خسارے پر

● ۱/۲۵۹-۲-۲۲۱، ہائی سیٹھ کیٹ
دار الشفاء ، حیدر آباد

صفیہ صدیقی

8-TWYFORD ABBEY ROAD
LONDON NW10 7HH

ہوم ہیلپ



"گڈ مورننگ۔" مسز بیگ نے اس لمبی چوڑی لڑکی کو غور سے دیکھا جو ایجنسی کے ذریعہ ان کے یہاں کام کرنے آئی تھی۔

"گڈ مورننگ۔" وہ بھی گہری نگاہوں سے انہیں، مسٹر بیگ کو، اور ان کے فلیٹ کو، اس کے قیمتی فرنیچر کو تک رہی تھی۔

"سٹ ڈاؤن۔" مسز بیگ نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اپنا ہولڈال فرش پر رکھتے ہوئے یوں بیٹھ گئی گویا کرسی ٹوٹ جانے کا خدشہ ہو۔

"میری گاڑی کا ایکسیڈینٹ ہو گیا تھا اور میری ماما کو واپس جانا پڑا، اس کے ویزے میں توسیع نہیں ہوئی۔" انہوں نے انگریزی میں اسے صورت حال سمجھانے کی کوشش کی۔

"یو — ایکسیڈنٹ؟" اس نے ٹانگ پر چڑھے ہوئے پلاسٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے تاثر سے یہ ظاہر تھا کہ وہ تفصیلات سمجھنے سے قاصر تھی اور انہیں کو ایکسیڈینٹ کا ذمہ دار سمجھ رہی تھی۔

"نہیں، غلطی دوسرے کی تھی میری نہیں۔" انہوں نے سمجھایا "وہ بچ گیا اور ٹانگ میری ٹوٹی۔"

"ہا — ہا۔ یو ایکسیڈینٹ، سوری۔"

"نیور مائنڈ۔" انہوں نے مزید وضاحت کرنے کی کوشش چھوڑ دی اور برابر رکھی ہوئی کشتی میں سے چار دانی اٹھا کر پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگی۔ "مسٹر بیگ آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دیں گے۔" انہوں نے مسٹر بیگ کی طرف دیکھا جو اب تک ایک تماشائی کی حیثیت سے کھڑے تھے پھر اس کے اپنے کمرے میں جاتے ہی مسز بیگ نے ٹیلیفون گھمانا شروع کر دیا۔

"ہیلو زاہدہ۔ ہاں بھئی ٹھیک ہوں میں۔ نہیں پلاستر ابھی کہاں نکلے گا، نہیں ابھی تو "وہیل چیئر" استعمال کرتی ہوں۔ بوا تو پرسوں واپس پاکستان گئیں، اب ایک گوری آئی ہے مدد کے لئے "او پیئر ہے۔ کیا، ارے ہوم ہیلپ بھئی۔ غیر ملکی ہے انگریزی سیکھنے آئی ہے یہاں۔"

"نہیں، نہیں صبیحہ۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بوا چلی گئیں تو اب کام کے لئے ایک گوری آگئی ہے نا۔ آپیئر ہے یعنی ہوم ہیلپ۔ وہی سب کام کرے گی کھانا وانا تھوڑا بہت میں کر لیتی ہوں، ورنہ پھر فریزر ہے نا۔ ہوٹل سے منگا کر رکھ لیتے ہیں۔"

اور پھر وہ اپنی سب جاننے والیوں کو فون کر کر کے "آپیئر" آجانے کی خوشخبری سنانے لگیں۔ "آپیئر" اتنا عام فہم نہ تھا اس لئے انہیں بہت غصہ آتا۔ بھلا ہوم ہیلپ میں وہ بات کہاں تھی۔ دوسرے دن صبح ہی صبح چائے کی کشتی لے کر جب گرٹیا ان کے خواب گاہ میں آئی تو اس نے انہیں مطلع کیا کہ وہ دوڑنے جا رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ ہر روز صبح سویرے وہ ایک گھنٹہ دوڑنے کے لئے جاتی ہے۔ مسز بیگ اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ جنوری کے مہینے میں آٹھ بجے صبح پارک میں دوڑنا۔ عجیب لڑکیاں ہیں یہ بھی۔ انہوں نے گرٹیا کے سراپا کو دیکھا۔ کیا مردانی لڑکی ہے۔ اونچا قد۔ بال چھوٹے چھوٹے مردوں کی طرح۔ اور ٹی شرٹ کی آدھی آستینوں میں سے تندرست بازوؤں میں تڑپتی مچھلیاں نظر آ رہی تھیں۔

جمعرات کی صبح انہوں نے گرٹیا کو شاپنگ کی فہرست تھمائی اور پیسے بھی، پھر "سیلف وے" کا پتہ سمجھانے کی کوشش کی۔ ہار کر مسٹر بیگ سے بولیں۔ "جان ذرا آفس جانے سے پہلے اس کے ساتھ چلے جائیں اور سمجھا دیں کہ کس طرح شاپنگ کرتے ہیں، کہاں ٹیکسی ملے گی سامان لانے کے لئے۔" "آفس ذرا دیر سے چلے جائیں گے۔"

مسز بیگ ذرا کسمسائے لیکن کچھ بولیں نہیں۔ ان کی گریشا کو گھورتی ہوئی نگاہیں دیکھ کر وہ اس سے بولیں۔

"جیکٹ پہن لو یا سوئیٹر، گھر میں معلوم نہیں ہوتا ہے باہر سردی ہوگی۔"

روز صبح دوڑنے سے قبل انہیں چائے دینے کے لئے جب گریشا ان کے کمرے میں آتی تو اس کی بنیان نما ٹی شرٹ دیکھ کر مسٹر بیگ شرمندہ ہو جاتے اور منہ پھیر لیتے۔ وہ گھر میں بھی اسی طرح گھومتی۔ انہوں نے کئی دفعہ بیوی سے کہا بھی کہ گریشا کو ایسے لباس گھر میں پہننے سے منع کریں جن سے جسم نظر آتا ہو مگر مسز بیگ نے انکار کر دیا۔ بھلا اس ملک میں کسی لڑکی کے پہننے اوڑھنے پر اعتراض کا کس کو حق ہے۔ گوری ہے برا مان جائے گی۔

ہر جمعرات کو صبح ناشتہ کے بعد مسٹر بیگ آفس جاتے ہوئے گریشا کو شاپنگ کے لئے چھوڑ دیتے واپسی میں اس نے ٹیکسی کرنا سیکھ لیا تھا۔ چند منٹ کا تو راستہ تھا۔ سامان نہ اٹھانا ہو تو پیدل جایا جا سکتا تھا۔ اپریل کا مہینہ ختم ہو رہا تھا کبھی کبھی دھوپ تیز چمکتی اور اب اس میں حرارت بھی تھی۔ ٹنڈ منڈ درختوں میں نئی ننھی پتیاں نظر آئیں۔ ہری ہری چمکتی ہوئی، ایک دن مسز بیگ کو اپنے ٹیلیفون پر ہونے والی طویل گفتگو کے دوران اور گریشا کے تفصیلی تذکروں کے درمیان یاد آیا کہ وہ اب دوڑنے کے لئے ٹی شرٹ کے بجائے مارکس اینڈ اسپنسر کے مخملی سوٹ پہننے لگی ہے جو اسی مقصد کے لئے تھے اور گھر میں بھی بنیان نما ٹاپ کے بجائے خوبصورت بلاوز اور سوئیٹر نظر آنے لگے۔ شاید اسے کچھ عقل آگئی ہے۔ کپڑے پہننے کا سلیقہ آگیا ہے۔ کہیں دیہات سے آئی ہوگی اب کیسے مزے سے رہتی ہے بنا کمرہ، اپنا ٹی وی کیا یاد کرے گی۔ انہوں نے فخر سے سوچا۔ شاپنگ کرنا بھی سیکھ گئی ہے حتیٰ کہ ان کے لئے انڈین شاپ سے سونف و الائچی لانا بھی نہیں بھولتی۔ پھر ان کے ذہن میں ایک خیال اڑ آیا اور انہوں نے فون ہاتھ سے رکھ دیا اور سوچنے لگیں۔ اب شاپنگ میں بہت دیر کرنے لگی ہے۔ آدھے گھنٹے کے کام میں ڈیڑھ گھنٹہ لگا دیتی ہے ضرور کوئی بوائے فرینڈ ہوگا جس کے ساتھ وقت گزارتی ہے۔ ایک شبہے نے جنم لیا۔ ضرور ایسی ہی بات ہوگی کوئی نہ کوئی ہوگا۔۔۔ جب بھی تاخیر کی وجہ پوچھو۔ یہی کہتی ہے "دیر ہو گیا۔ یا نا ٹینڈ ٹو ٹیکسی"۔ یا۔ "یا کیو ویری لونگ۔"

اس کو کچھ سمجھانا یا پوچھنا بھی آسان نہیں۔ انہیں غصہ آنے لگا اگر اسے اپنے دوستوں سے ملنا ہے تو اپنے فری ٹائم میں ملے ہفتہ اتوار چھٹی ہوتی ہے۔ روزانہ شام کو اسکول جانے کی چھٹی ہوتی ہے میں ضرور پوچھوں گی۔ انہوں نے تہیہ کر لیا۔ لیکن بعد میں وہ بس سوچ سوچ کر رہ جاتیں۔ ایک گوری کی کس طرح باز پرس کی جاتی انہیں آتا نہ تھا۔

"او پیئر" رکھ لینا دوسری بات تھی۔

چھ ماہ ہو گئے تھے ان کے ایکسیڈنٹ کو۔ اب پلاسٹر اتر چکا تھا اور وہ چلنے پھرنے لگی تھیں۔ انہوں نے گریشا کی بھی چھٹی کر دی تھی۔ اس کی موجودگی سے اب انہیں ڈر لگنے لگا تھا۔ بیٹا جوان ہے اور اب موسم گرما کی چھٹیوں میں گھر آنے والا تھا اور وہ خود ملک سے باہر جانے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ گریشا کو گھر میں اکیلے کیسے چھوڑ سکتی تھیں جمی کی موجودگی میں۔

اب انہیں "میڈ" پھر بلانی ہو گی گھر کی صفائی کے لئے۔ مگر مگر "آپیئر" کی بات ہی دوسری تھی۔ کیا رعب پڑتا تھا دوسروں پر۔ آنے جانے والے کیسا گھور گھور کر دیکھتے تھے۔ سنہرے بالوں والی کو اور جب وہ سامنے آتی تو سراپا تکلف بن جاتے اور مسکرانا بند ہی نہ کرتے۔ عورتیں البتہ ناک سکوڑے بیٹھی رہتیں مسز بیگ نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ کیسا جل جاتی تھیں سب کی سب لیکن ایک مشکل لاحق ہو گئی تھی ان کو۔ ان کی رشتہ دار عورتوں اور جاننے والی عورتوں نے شک کا ایسا بیج بو دیا تھا ان کے دل میں جو دن دونی رات چوگنی ترقی کر کے درخت بنتا جا رہا تھا۔ سب ہی نے کسی نہ کسی موقع پر، مختلف طریقوں سے ایک ہی بات کہی تھی ان سے۔

"ذرا ہوشیار رہنا بیٹا ہے گھر میں۔ یہ گوریاں بڑی چالاک ہوتی ہیں۔ مردوں کو پھانسنا خوب جانتی ہیں اور پیسہ دیکھ لیتی ہیں تو پھر چھوڑتی نہیں ہیں اور تمہارا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ عمر کم ہے جمی کی۔ ارے یہ تو اور اچھا ہے اس کے لئے۔ آسانی سے جال میں پھنس جائے گا۔" وہ سب شعوری اور غیر شعوری طور پر مسز بیگ کی ہلکی پھلکی بدبختی کے لئے کوشاں بھی تھیں لیکن ان کو جتانے میں مزہ بھی آتا تھا۔ اس لئے ان کو چوکنا بھی کر رہی تھیں۔ مسز بیگ اپنے اس دو کو ترک دے سکے چاہے بیگم کے خلیفہ کا رعب جمانا کیسا

بیٹھیں۔ اور پھر جس طرح وہ فون پر باتوں باتوں میں ان سب کو مطلع کیا کرتی تھیں کہ وہ نیویارک جا رہی ہیں یا روم گویا برمنگھم یا پولٹن جا رہی ہیں۔ یہ تذکرہ وہ کبھی نہ کرتیں کہ نیویارک میں ان کی بیٹی بیاہی ہوئی تھی۔ اور روم میں ان کی چھوٹی بہن کے شوہر۔ پاکستانی سفارت خانے میں کسی معمولی عہدے پر ملازم تھے۔

مسز بیگ ان کے جذبہ انتقام سے بے خبر بظاہر خلوص سے کی گئی باتوں اور مشوروں پر غور کر کے ذرا گھبرا سی گئی تھیں اور انہیں بہت سی ایسی باتیں یاد آئیں جن سے اس شبے کو تقویت پہنچی۔ جب جمی چند دن کے لئے گھر آیا تھا تو کتنی جوش سے اس نے گریٹا سے ہاتھ ملایا تھا اور ہنس کر بولا تھا۔

”میں جمیل بیگ ہوں۔ لیکن سب مجھے جمی کہتے ہیں۔“

پھر وہ اس سے باتیں کرتا رہا تھا اور جب تک گھر پر رہا روز صبح اس کے ساتھ دوڑنے جاتا تھا۔ پھر اسے لندن گھمانے کے لئے گیا تھا اور جب اپنے لئے شاپنگ کرنے گیا تھا تو گریٹا کو بھی ساتھ لے گیا تھا حالانکہ گریٹا کے ساتھ اس طرح گھومنے پر اس کے ڈیڈی بھی جز بز ہوئے تھے اور جب مسز بیگ نے جمی سے شکایت کی تھی کہ گریٹا کو بات سمجھانا بہت مشکل ہے (گو کہ ان کو معلوم تھا کہ وہ مبالغے سے کام لے رہی ہے) اور یہ کہ انہوں نے ”سویڈش دو آپیئر“ اس لئے رکھی تھی کہ وہ سمجھتی تھیں کہ سویڈش انگریزی جانتے ہیں تو وہ ہنس پڑا تھا اور کہنے لگا۔

ممی۔ وہ تو ”فنش“ ہے فن لینڈ کی رہنے والی“

وہ انہیں مسلسل چھیڑتا کہ ”وہ تو بس اسٹیٹس سمبل ہے ممی۔“ ایک مرتبہ تو وہ جھنجلا بھی گئی تھیں۔ پھر انہیں یاد آیا کہ اب گریٹا کتنا بدل گئی ہے۔ اب اس کے بال شانوں تک آگئے تھے اور جب ایک سنیچر کی شام انہیں چھٹی کے دن وہ کہیں جانے کے لئے تیار ہوئی تھی تو کتنی حسین لگ رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر ان کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی تھی۔ اس کے سفید چہرے کی جلد میں ہلکے گلابی رنگ کی آمیزش تھی اور ہونٹ بھی ہلکے گلابی تھے۔ ہلکے بادامی رنگ کے سلک کا چوڑے پائینچوں والا پتلون اور اسی پر وا اسکرٹ نما بادامی رنگ کی چھوٹی سی جیکٹ پہنے تھی جو اس کی پتلی کمر کو نمایاں کر رہی تھی۔ یہ لباس کتنا جچ رہا ہے اس پر انہوں نے بڑا شکر ادا کیا تھا کہ جمی یونیورسٹی میں تھا

کیا یہ وہی لڑکی ہے جو ٹی شرٹ اور جینز میں آئی تھی۔ اب چہرے پر کتنی ملاحت آگئی ہے۔ یہ آرام سے رہنے کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اس کے لباس کو۔ ضرور کسی بڑے اسٹور سے خریدا ہوگا۔ اتنے قیمتی ملبوسات وہ کیسے خریدتی ہے وہ حیران ہو کر سوچنے لگی تھیں۔ ہم جو تنخواہ دیتے ہیں اس میں تو ایسے کپڑے خریدنا ممکن نہیں۔ ضرور کوئی مالدار پھانسا ہوگا۔ کتنی ہوشیار ہوتی ہیں یہ یورپین لڑکیاں۔ وہ دل ہی دل میں معترف ہو گئیں۔

گریٹا کے جسم کو دیکھ کر انہیں اپنے بدن کا خیال آیا جس کو انہوں نے ہر طرف پھیلنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ وہ شرمندہ ہونے لگیں گھر کے سامنے اتنا بڑا پارک ہے۔ لوگ دور دور سے آتے ہیں اور وہ کبھی ٹہلنے بھی نہیں گئیں۔ پھر انہوں نے خود سے وعدہ کیا جیسے ہی وہ اس قابل ہوئیں کہ دوڑ سکیں وہ بھی ضرور دوڑنے جائیں گی۔ اور کھانے پینے کا پرہیز بھی کریں گی اور جب ان کا جسم گریٹا کی طرح ستواں ہو جائے گا تو وہ بھی اس طرح کا سوٹ خرید کر پہنیں گی۔ فیشن ایبل اور کسی بڑے ڈیزائنر کا۔

اس شام جب گریٹا بن سنور کر چلی گئی تھی تو وہ بہت بے زار بے زار سی بیٹھی تنہا ٹی وی دیکھتی رہیں۔ ان کے شوہر کو کوئی کام پڑ گیا تھا وہ بھی باہر گئے ہوئے تھے اور رات میں بہت دیر سے آئے تھے۔ شاید گریٹا کے آنے کے بعد۔ جب انہوں نے گریٹا کو نوٹس دیا تھا تو انہیں بہت حیرانی ہوئی تھی کہ گریٹا مہینہ پورا کرنے کے بجائے پہلے ہی چلی گئی تھی۔ جاتے وقت اس کا سامان کتنا زیادہ ہو گیا تھا۔ بڑھیا سا نیا سوٹ کیس بھی کن کن چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ آئی تھی تو ایک بیگ لٹکائے ہوئے آ گئی تھی۔

اب وہ چلنے پھرنے لگی تھیں تو انہوں نے پندرہ دن اپنی بہن کے پاس گزارنے کا پروگرام بنایا اور گریٹا کے جانے کے بعد انہیں اطمینان ہو گیا تھا۔ پھر انہوں نے فون کر کے سب کو بتایا تھا کہ وہ ”ہالی ڈے“ پر جا رہی ہیں۔

روم سے جب وہ ہیتھرو ایئرپورٹ واپس پہنچیں تو مسٹر بیگ کے بجائے جمی ان کے استقبال کو موجود تھا۔

”ارے تم کب واپس آئے۔“ بیٹے کو دیکھ کر وہ حیران ہو گئیں

"سب خیریت تو ہے۔ تمہارے ڈیڈی تو ٹھیک ہیں نا۔"
"جی ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔ ڈیڈی مصروف تھے اس لئے نہیں آئے۔" وہ ان کے گلے لگ گیا۔
"تم اتنی جلدی کیوں آگئے؟"
"جلدی کہاں۔ آپ نے تاریخوں میں گڑبڑ کر دی ہوگی۔" وہ ان کا سامان اٹھاتے ہوئے بولا۔ پھر راستے بھر زیادہ تر خاموشی رہی۔ جمی بس ہوں ہاں کرتا رہا۔ اس کی سنجیدگی سے وہ گھبرا گئی تھیں۔ گھر پہنچتے ہی انہیں ایکدم یاد آگیا۔
"تمہارے ڈیڈی اتوار کو تو کبھی آفس نہیں گئے۔ آج کیا ضرورت پڑ گئی۔"
"آپ اطمینان سے بیٹھیں میں ابھی چائے بناتا ہوں۔" جمی نے ماں کی بات ان سنی کر دی۔ اور ان کا سامان بیڈروم میں رکھنے چلا گیا۔

"بیٹا۔ تمہارے ڈیڈی کو اتنی مصروفیت کیا ہو گئی ہے آج کل میں نے کئی دفعہ فون کیا۔ لیکن ہمیشہ "مشین" ہوتی تھی۔ شام میں۔ رات میں۔ اور جان نے کبھی میرے پیغاموں کا جواب ہی نہیں دیا۔"

جمی کرسی گھسیٹ کر ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔ "ممی بات یہ ہے۔ میرا مطلب ہے" وہ انگریزی میں بول رہا تھا۔ "ممی جب آپ نے" وہ لمحہ بھر کو رک گیا۔ "جب آپ نے ریٹا کو نوٹس دیا تھا تو وہ ہمارے ہالینڈ پارک والے فلیٹ میں چلی گئی تھی۔ ڈیڈی نے اسے رہنے کے لئے دیا تھا۔ خالی کروا کے۔" مسز بیگ حیرت سے اچھل پڑیں۔
"اسے بھلا تمہارے ڈیڈی نے یہ کیوں کیا۔ وہ کرایہ مر کر بھی نہ دے سکے گی۔ آٹھ سو پونڈ کا نقصان ہوگا ہر مہینے۔ بیڈروم کا فلیٹ اتنی شاندار جگہ پر۔ ہم نے کبھی اپنے رشتے دار کو نہ دیا کرائے پر۔ تمہارے ڈیڈی تو ایسے ہی بے وقوف ہیں۔ میں ذرا سی چھٹی اور اتنا نقصان۔ ارے ایسی مدد کرنی تھی تو ٹوٹنگ والی بلڈنگ میں کوئی کمرہ دے دیتے کہاں وہ۔" وہ تیز تیز آواز میں بولنے لگیں۔ کچھ دیر تو جمی بولنے کی کوشش کرتا رہا پھر زور سے بولا۔
"خدا کے لئے تو آپ خاموش ہو جائیں ممی۔ آپ کبھی بھی دوسروں کی نہیں سنتیں۔ میں کچھ بتانا چاہ رہا ہوں اور آپ بولنے ہی نہیں دیتیں۔" اس کے لہجے سے وہ سہم سی گئیں۔ جمی بہت مہذب لڑکا تھا۔ بالکل باپ کی طرح ٹھنڈا۔ اس نے ماں سے کبھی اس طرح سے بات نہیں کی تھی۔ وہ ایک دم سے خاموش ہو کر اسے گھورنے لگی تھیں۔ جمی نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا اور چند لمحوں کے لئے سناٹا طاری ہو گیا۔ صرف باہر ٹریفک کا ہلکا ہلکا سا شور تھا۔ جمی نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ بولنے لگا۔
"ممی! ڈیڈی نے ریٹا کو فلیٹ رہنے کے لئے دیا ہے کرایے پر نہیں۔" مسز بیگ کی آنکھیں حیرانی سے پھیل گئیں "اور پھر۔ اور پھر آپ کے روم جانے کے بعد وہ خود بھی اس کے ساتھ اسی فلیٹ میں منتقل ہو گئے ہیں۔"
مسز بیگ آنکھیں پھاڑے جمی کو دیکھ رہی تھیں اور زندگی میں پہلی بار ان کا منہ کھلا تھا۔ لیکن کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

❖

بقیہ صفحہ ۴۸۔ مکتوبات

ممنون کرم ہوں کہ آپ شاعر کے قابل قدر رشتہ داروں سے نوازتے رہتے ہیں خدا کرے کہ علم و ادب کا یہ چراغ صدا روشن رہے۔ شاعر کا مفید سلسلہ "فکر امروز" بے حد وقیع ہے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی سے نیاز مندی کا شرف مجھے اپنی نوجوانی کے دنوں میں حاصل ہوا تھا۔ یہ نصف صدی پہلے کا ذکر ہے واقعی ان کی شخصیت بڑی عالمانہ کشش تھی ان کی شاعری اور [illegible] سے مستفیض ہونے والوں میں بڑے بڑے نام آتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ دو [illegible] برس پہلے جب کراچی میں بہ یادِ رفتگاں ایک ہفتہ بالالتزام سیمینار اور مشاعرہ منعقد ہوا تھا تو میں نے علامہ کی یاد میں ایک مقالہ ۱۹۳۰ء کے حوالے سے پیش کیا تھا۔ غالباً آپ کے علم میں ہوگا کہ مین پوری (یوپی) میں ایک شاندار طرحی محفلِ مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں علامہ موصوف کے علاوہ ۸۵ ممتاز شاعروں نے طرحی غزلیں پڑھی تھیں۔ اس مشاعرے کا گلدستہ میرے والد بزرگوار نے مجھے اس وقت عطا فرمایا تھا جب میں ۱۹۴۵ء میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ شعر اور ایک [illegible] میں محفوظ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کو بھی لکھ بھیجوں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تاباں ضیائی

میں کوئی شبیر ہوں مجھ کو دغا دینے سے کیا
عرصۂ امکاں کو ذہن کربلا دینے سے کیا

اب یہاں سارے حریفانِ بصارت ہو گئے
اب یہاں کوئی نیا سورج اگا دینے سے کیا

پہلے تو سر کو مرے روندا گیا پیروں تلے
اب مری خاک بدن کو مرتبہ دینے سے کیا

ہو چکی ناقدریٔ فن اور فن کاری بہت
اب زمیں و آسماں باہم ملا دینے سے کیا

وہ خدا ہے تو اسے تاباں سنا دو حالِ دل
اور پتھر ہے تو پتھر پر صدا دینے سے کیا

● ۱۷۴ - آزاد روڈ، سناور (ایم پی)

فاروق انجینئر

اگرچہ دل کا وہ کچا بہت ہے
عذاب ابرِ غم سہتا بہت ہے

یہی سیلاب میں زہراب ہوگا
ندی کا آب جو میٹھا بہت ہے

سلوکِ آہ و فغاں باہر کی کیسے
مرے اندر ہی کا نوحہ بہت ہے

جھلسنا دھوپ میں اپنا مقدر
وگرنہ راہ میں سایہ بہت ہے

کہیں تو بھی بکھر جائے نہ آب کے
مجھے اس بات کا دھڑکا بہت ہے

کبھی فاروق اس میں مت اترنا
سمندر یاس کا گہرا بہت ہے

● ڈی - ۲ - ۷، تھرمل کالونی، کوٹہ (راجستھان)



امان اللہ ساغر

سامنے اپنی خودی کو بھی پہچان کے منظر میں رکھ
دل کے احساسات کو الفاظ کے پیکر میں رکھ

تو ہوا کی دوستی سے آشنا ہو جائے گا
اک دیا سچ کا جلا اور اس کو اپنے گھر میں رکھ

اپنے بچوں سے سدا خوش چہرگی کے ساتھ مل
اپنے دن بھر کی تھکن کا بوجھ تو دفتر میں رکھ

اپنی صورت بھی نگاہوں میں سدا ابھرتی رہے
کچھ تو آئینہ مزاجی ہاتھ کے پتھر میں رکھ

آستیں میں اب تو خنجر کا چھپانا ہے محال
یہ روایت توڑ دے اب آستیں خنجر میں رکھ

کون جانے کب کسی طوفان سے پالا پڑے
یہ سمندر ہے، سفینے کو سدا لنگر میں رکھ

نصب ہیں تنقید کے خنجر فصیلِ ذہن پر
اب سنبھل کر پاؤں ساغرؔ فن کے بام و در میں رکھ

● آر - ۳۲ گارڈن ریچ روڈ - کلکتہ ۲۴

امتیاز نسیم ہاشمی

کہہ رہا ہے کوئی مجھ کو دور دریا پار سے
تو بھلا کیسے بچے گا موسموں کے وار سے

دور تک رکھتا نہیں آواز کا سایہ کوئی
چور ہیں سب بام و در اک خامشی کے بوجھ سے

چار سو پھیلے ہوئے ہیں خوف کے سائے مہیب
روح میری کانپتی ہے جسم کی دیوار سے

روشنی کے قافلوں کا کوئی بھی امکاں نہیں
ساری بستی ہے پریشاں رات کے کردار سے

زندگی اور سانس کا ہے حد سے نازک سلسلہ
کس جگہ کٹ جائے دیکھو وقت کی تلوار سے

● شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ



سیّد ریاض

سبز موسم کی طرح سب کی نظر میں رہنا
اتنا آساں تو نہیں دیدۂ تر میں رہنا

خواب آنکھوں میں لئے دھوپ نگر میں رہنا
ہم سے سیکھے کوئی اس طرح سفر میں رہنا

اپنی فطرت بھی ہے آوارہ مزاجوں ایسی
گھر میں رہتے ہوئے دشوار ہے گھر میں رہنا

ہم نے کوشش تو بہت کی کہ بھلائیں سب کچھ
یاد ماضی ہے کہ ہر لمحہ بھنور میں رہنا

جس طرف اٹھے قدم باب ظفر میں اٹھے
ہم سے ممکن ہی نہیں زیر و زبر میں رہنا

زندگی نام ہے چلتے ہوئے صحرا کا مگر
ہمسفر کوئی نہیں پھر بھی سفر میں رہنا

● چنیل ہائی اسکول، ممبرا، ضلع تھانہ ۶۱۲-۴۰۰ (مہاراشٹر)



محمّد حامد

وہ اب دن رات محرابوں کے اوپر رقص کرتے ہیں
مگر ہم ہیں کہ بس غاروں کے اندر رقص کرتے ہیں

وہ منزل تک پہنچ جاتا ہے لیکن ایک مدت تک
کٹیلے تار ایوانوں میں گھس کر رقص کرتے ہیں

اڑا دو اب انہیں گولی سے تاکہ کچھ بھرم ٹوٹے
کھلے میدان و صحرا میں جو اکثر رقص کرتے ہیں

ہتھیلی پڑھ نہیں سکتے تو پھر اپنا سبق کھولو
زمیں تا آسماں کھرے کی زد پر رقص کرتے ہیں

ہمیں رکھتے نہیں اسباب حیرانی جو تم خوش ہو
یہاں قاتل بہ طرز تیر و خنجر رقص کرتے ہیں

وہ کچھ کہتا نہیں چپ چاپ آنکھیں پھیر لیتا ہے
کہ اس کے چار سو منظر ہی خنجر رقص کرتے ہیں

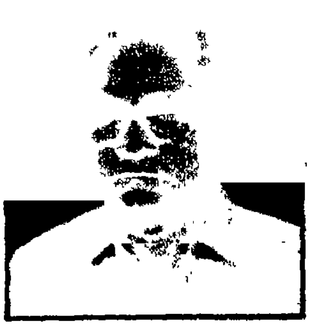
ہوا جاتا ہے کیا احساس ان لوگوں کو اب جاناں
جنہیں وہ جاں سمجھتے ہیں وہ پتھر رقص کرتے ہیں

● پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین کالج، مونگیر (بہار)

ابراہیم اشک

رفسانہ ، یوسف کالونی ، وانگی روڈ ، پربھنی-۴۳۱۴۰۱

گونگا



راجہ اور پرجہ کے بیچ خلیج بڑھتی جارہی تھی، صبح کی پہلی کرن کے ساتھ پیٹ بھرنے کے لئے روز کنواں کھودنے والے ہاتھ خوابوں کا کشکول لئے زندگی کی تلاش میں سرگرداں تھے راجہ اور اس کے حواریوں کے محلوں میں سونے اور چاندی کا بے تحاشہ اضافہ ہوتا جارہا تھا ملک کی دانش گاہیں راجہ کی چکاچوند کردینے والی امارت کے تسلّط سے گونگی اور بہری ہوگئی تھیں، فکر کی راہیں مسدود کردی گئی تھیں مستقبل کو سنوارنے والی نئی نسل مخصوص رنگوں کی اسیر ہو کر رہ گئی تھی، متاعِ لوح و قلم کے امین خریدلیے گئے تھے، تحریر و تقریر کی آزادی بظاہر سب کو میسّر تھی، لیکن وہ آواز جو راجہ اور اس کے حاشیہ برداروں کی سماعت خراشی کا باعث بنتی تھی، بڑی صفائی سے اسے دبا دیا جاتا تھا، راجہ کے ذرائع ترسیل و ابلاغ بیج بیج کر جنتا کے کانوں میں صور پھونکتے نہیں تھکتے تھے کہ دیش جلد ہی عارضی کٹھنائیوں کی دلدل سے باہر نکل آئے گا۔ عوام کے گھروں میں اگنے والی بھوک نے راجہ کی نیند حرام کردی ہے، وہ کوئی ایسا نسخہ دریافت کرنے کی فکر میں ہیں جس سے غربت کا خاتمہ ہو جائے، جدید راج کی پروپیگنڈہ مشنری جنتا پر افیون کا کام کررہی تھی دیش کا ہر باسی مردم گزیدہ ہو گیا تھا۔ اور اپنے دکھوں کی چادر اوڑھ کر قناعت کی نیند سو رہا تھا۔ لیکن دیش کے کچھ علاقوں میں آتش فشاں کے دہانے کھلنے لگے تھے، راجہ نے سنا تو سونے کا ملمع چڑھے اس کے وجود کی دیواریں ہلنے لگیں، اس نے فوری اپنے بازی گروں سے مشورہ طلب کیا، شاطر درباریوں نے راجہ کو ایک ایسا نسخۂ کیمیا بتایا کہ وہ خوشی سے اچھل پڑا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے جنتا کی دھارمک بھاؤنائیں تیز کردی گئیں شہر شہر، گاؤں گاؤں اور گلی گلی میں عوام ایک دوسرے سے کتوں کی طرح لڑنے لگے دوسری جانب غدّاروں کو کچلنے کے لئے پورا انتظامیہ حرکت میں آگیا۔ راجہ کے حکم کی تعمیل میں ریاست کی پولیس اور فوج باغی سروں کی تلاش میں نکل پڑی۔

کھیت سے واپسی میں اسے دیر ہو گئی وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سوچ رہا تھا کہ بیوی اور بچّہ گھر کے دروازے پر بے چینی سے اس کا انتظار کررہے ہوں گے۔ فصل کٹائی پر آگئی تھی، ہفتہ عشرہ میں اناج گھر پہونچ جائے گا۔ اس سال فصل اچھی ہوئی تھی، لہلہاتی فصل کو دیکھ کر اس کے دل میں چاند اتر آیا تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ بازار سے مہنگے داموں اناج خرید کر گزارا کررہے تھے۔ بہت سوچنے پر وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ جب کسان ڈھیر سارا اناج لے کر مارکٹ میں جاتا ہے تو مٹھی بھر پیسے کیوں اس کے ہاتھ لگتے ہیں اور وہ حسرت بھری نظروں سے اپنے اناج کو دیکھتے ہوئے چہرہ لٹکائے گھر واپس آجاتا ہے مگر جب اناج سے خالی ہو جاتا ہے تو تین گنا قیمت دینے پر بھی اناج نہیں ملتا۔ اسے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ ہر سال کپاس کی فصل پر کسان کے لباس میں پیوند کا اضافہ ہو جاتا ہے، کل ہی اس نے راجہ کی تقریر سنی تھی، جس میں اس نے کہا تھا کہ راحت کے دن اب زیادہ دور نہیں، غلّہ کی قیمتیں گھٹنے کا رجحان نظر آرہا ہے، راجہ کی جھوٹی تسلیوں نے عوام سے سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی چھین لی تھی۔ وہ جھوٹ کو اتنی بار دہرا چکا تھا کہ وہ جھوٹ جنتا کو سچ لگنے لگا تھا۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ تیز تیز قدم بڑھا رہا تھا کہ اچانک

ایک سنسناتی ہوئی گولی اس کے شانے کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے پناہ لینے کے لئے قریب کے گڑھے میں کود گیا۔ دوسرے ہی لمحے گولیوں کی باڑھ اس کے اوپر سے گزرنے لگی۔ اسے اپنی موت قریب نظر آرہی تھی۔ اس پر موت کا خوف اتنی شدت سے طاری ہوا کہ وہ شانے سے بہتے ہوئے خون اور تکلیف کو بھول گیا۔ وہ دم سادھے کئی گھنٹے پڑا رہا۔ اور جب چاروں طرف خاموشی چھا گئی تو وہ لڑکھڑاتا ہوا ٹھوکریں کھاتا اندھیرے میں گرتا پڑتا باہر آیا تو پولیس بندوقیں تانے سامنے کھڑی تھی۔

ایک مدت تک اس نے سورج کی روشنی نہیں دیکھی لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے سورج کی ساری تپش اس کے بدن میں سرایت کر گئی ہے۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کو نچوڑ کر ان میں گرم گرم سیسہ انڈیل دیا گیا ہے۔ ایذا رسانی سے وحشت زدہ ہو کر روح مٹی کے گھروندے سے آزاد ہونے کے لئے دروازہ تلاش کر رہی ہے۔ آنکھوں کی روشنی مدھم پڑنے لگی تھی۔ کئی بار اسے محسوس ہوا کہ ناقابل برداشت تکلیف سے نکلنے والی چیخ کا کسی نے گلا دبا دیا ہے۔ رات کی تکلیف بھگتے ہی کبھی برف کی سل اور کبھی تپتی ہوئی ریت اس کے پیروں کے گوشت کو چاٹ جاتی۔ اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کون ہے کہاں سے لایا گیا ہے۔ کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ بیوی بچے کی انتظار آنکھیں اس کے اندر مضمحل ہونے لگی تھیں۔ خود اس کی آنکھوں کی جوت بھی بجھنے کے قریب تھی — اسٹریچر پر اسے ڈالا گیا تو اس وقت سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ لیکن اس کو آسمان پر تاریکی کے سوائے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

ڈاکٹر نے کافی دیر تک اس کا معائنہ کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھتے ہوئے چیف کی طرف دیکھا جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ماتھے پر پڑی شکنوں میں اس کے اندر ہو رہی اتھل پتھل صاف جھلک رہی تھی۔ ڈاکٹر خاموش بیٹھا دائیں ہاتھ سے ٹیبل پر رکھے پیپر ویٹ گھما رہا تھا۔ چیف نے کھنکار کر اکھڑی اکھڑی آواز میں کہا۔

"ڈاکٹر صاحب مریض کا جلد سے جلد صحت یاب ہونا بے حد ضروری ہے!"

ٹیبل پر پیپر ویٹ کی گردش ایک دم رک گئی۔ ڈاکٹر نے یوں محسوس کیا جیسے گھڑی کی سوئی رک گئی ہو جیسے پیپر ویٹ کے ساتھ وقت کی گردش بھی تھم گئی ہے۔ اس نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔

"چیف صاحب! — مریض کی حالت بہت خراب ہے۔ اور میں۔ "

"نہیں ڈاکٹر صاحب ایسا مت کہئے۔ اس کا اچھا ہونا ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔ آپ کچھ بھی کیجئے۔ اس مریض سے ہمارے ڈپارٹمنٹ کا وقار وابستہ ہے۔" چیف نے دھواں دھواں لہجے میں کہا۔

"میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔ لیکن یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ڈاکٹر نے قلم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"پلیز ڈاکٹر صاحب — اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔ یہ شخص غداروں کی اس ٹولی کا سرغنہ ہے، جس نے ہمارے راجہ کے خلاف بندوق اٹھائی ہے۔ بڑی کوشش سے اس کو ہم نے گرفتار کیا ہے لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود اس نے اب تک زبان نہیں کھولی۔ ہمیں اس سے کئی اہم راز اگلوانے ہیں۔ ہم پہ روز بروز حکام بالا کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے سیئے ہوئے ہونٹ ہمیں کسی نہ کسی طرح کھلوانے ہیں۔ ورنہ ہم بے آبرو ہو جائیں گے۔ "

چیف نے ناہموار لہجے میں کہا اور اٹھ کر بے تابی سے ٹہلنے لگا۔

ڈاکٹر خالی خالی آنکھوں سے چیف کی بے چینی کو دیکھتا رہا اس کے وجود کے اندر سرد ہوائیں چلنے لگی تھیں اسے چیف کی وردی کا رنگ پھیکا پڑتا نظر آرہا تھا۔ اس نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور پہلو بدل کر آہستہ سے بولا

"لیکن — جناب — وہ تو — گونگا ہے۔۔۔"

مکتوبات

نظام صدیقی - ۵۰۰ - دائرہ شاہ محب اللہ بہادر گنج
آباد - یوپی -

آپ کا موضوع واقعۃً آج کا موضوع ہے [اداریہ
ہاں کا ممکن] انسان کے مستقبل کا موضوع ہے
صداقت کا چہرہ ہے اور خیر، اس کی روح ہے
نس، فنون لطیفہ، اور مذہب [روحانیت اور
روحانیات] تینوں کا جوہر اصل، تخلیقیت اور معنویت
- فنون لطیفہ، سائنس اور روحانیات کے درمیان
قوس قزح کا پل ہے - جینیئس خالق فن کار، مخلوق
اور اہل قاری یا صاحب دل ناقد کے درمیان بھی
مشترک تخلیقیت اور کثیر معنویت ہی ہے - مابعد
جدیدیت، مابعد ساختیات اور تعبیراتی تنقید یا قاری
اساس تنقید کا منتہا اصل بھی تخلیقیت اور کثیر معنویت
- معنی کشائی، معنی آفرینی، معنی آفرینی اور معنی
زی کا لامتناہی ہونا تخلیقیت ہی کی ارتقائی اور
وری شکل اور روح ہے - تخلیقیت روح تجربہ،
روح تغیر، روح زندگی، روح تخلیق، روح نمو اور
روح تحرک ہے - تخلیقیت، حیرت تمام اور رحمت
عالم ہے اس کے لئے ذات ETRE ، BETNOT
قوس حرا میں جمالیاتی اور معنیاتی ریاضت ناگزیر
تی ہے تو شاعرانہ آفاق COMMUN نت نئی تخلیقیت
کثیر معنویت و معنویت کا نافذ مار ہوتا ہے - مجھے
مسرت ہے کہ آپ کے نظریات اس ضمن میں کتابی
نہیں ہیں بلکہ وجودی اور تجربی ہیں یہ ایک جوہر یا سچے
صداقت، صف، خیر کا روحانی اور جمالیاتی مکاشفہ
ہے - آپ نے اپنے معنی خیز اداریے [جولائی ۹۹ء]
بڑی محبت اور بصیرت سے میرا بھی تذکرہ کیا ہے
آپ کی بارگاہ محبت و بصیرت میں ہدیۂ تشکر پیش
کر رہا ہوں - محبت سے محبت پیدا ہوتی ہے - مجھے
جدید کی تخلیقیت موجود جمالیات، معنویات اور اقدار
سے خالص نا آسودہ ایک ناموجود حسیات معنویات
اور قدریات کی تلاش، مدام تلاش کی ناقابل تسخیر
تخلیق اور نشاط روح سے سرشار ایک غیر مختتم نوذہنی
ہے جو سرہیت جمال، کمال اور زوال کی "آزادی
ید " NOSTALGIA کی متلاشی ہے یہ کسی بھی نوعیت
قید نظر کی قائل نہیں ہے - دراصل نو تخلیقیت
آزادی کا انعام ہے "نئی عروض شناسی" یا "
عروضی تخلیقیت سے مراد "اردو کے اپنے عروض
نہیں ہے - یہ اردو کے اپنے عروضی نظام سے بھی
ایک نئی تحقیقی عروضی جست ہے جو آج کے اصول
حقیقت REALITY PRINCIPAL اصول خواب
اصول نفس یا آہنگ سے ہم آہنگ ہو - اور نئے آفاق
عروضیاتی آہنگ سے بھی یہ آفاق ہر پل پھیلتا جا رہا

ہے اس کا آفاق رقص تخلیق یا آہنگ تخلیق مسلسل پھیلا
ہے دنیا آج ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے
صرف فنون لطیفہ ہی میں نہیں - اسی نامیاتی متحرک
آفاق امتزاجیت کو نہایت خوش آہنگی اور خوش
کیفیتی سے پیش کیا جا رہا ہے صرف لسانیات اور
ثقافت ہی میں نہیں، ماورائے لسانیات
META LINGUISTICS اور ماورائے ثقافت
یات کی تلاش کی جا چکی ہے اور متواتر کی جا رہی ہے
حد تو یہ ہے کہ فرانسیسی، اطالوی اور اسپینی کا لسانیاتی
نظام، انگریزی کے برخلاف، اردو ہندی سے مماثل
ہے مصوتوں کا نظام یکساں ہے - عالمی سطح پر مصوتوں
کا نظام VOWELS بیشتر قدرے مشترک کا حامل
ہے - مابعد جدید موسیقی اس سے بھرپور استفادہ
کر رہی ہے - اس عالمی گاؤں میں اردو اور ہندی کا
شاعر بہر کیف آباد و شاد ہے فی زمانہ اس کا بصری نظام
[VISUAL COMMUNICATION اور سماعی نظام]
AUDIAL COMMUNICATION باہمی تعامل و
انجذاب سے بے حد متحرک ہو گیا ہے اس کا سماعی اور
بصری تخیل، جہاں گیر ہو گیا ہے [ہندی میں اگیے جی
نے یہ کام کیا ہے انہوں نے نئی عروض شناسی پر ایک
عالمی سیمنار کیا تھا] مجھے ہند پاک کے اکثر شاعروں
کی "نئی عروض شناسی" کا جلوۂ نمو دستیاب ہوتا ہے جو
نئے عہد کے اصول حقیقت، اصول خواب، اصول نفس
یا آہنگ سے ہم آہنگ ہے اس کو امیر خسرو کے نفس
اور آہنگ سے ہم آہنگ ہونے کی ضرورت نہیں ہے
جب کوئی زمانہ اردو شاعری کو محض تفننی اور مجلسی
شاعری بنا کر رکھ دیتا ہے اردو اور فارسی کا بوسیدہ
عروضی نظام بیشتر روایتی ہے [مابعد جدید عربی
فارسی اور ترکی شاعری اس سے گناہ کش ہے] اردو کا
اپنا عروضی نظام، زندہ، نامیاتی اور متحرک روایت
ہے - لیکن نئی عروض شناسی یا نئی عروضی تخلیقیت
اس زندہ، تابندہ اور پائندہ روایت کے جینگ پوائنٹ
سے ایک نئی تخلیقیت افروز عروضی زقند ہے جمالیاتی
جوہر میں ایک آدھ قطرہ عروضی تخلیقیت رونما
ہوتی ہے - خود اردو کے اپنے عروضی نظام کو نیا
خون اور تازہ ہوا فراہم کرنے کے لئے ناگزیر ہے
کہ ہم اہل عرب کی فضولیات سے جلد از جلد دامن
کشاں ہوں - نو روز حافات کے گورکھ دھندوں
سے نکل آئیں اور ہندی الفاظ ہوں، اردو فارسی
کے الفاظ ہوں یا کسی بھی ہندوستانی یا عالمی زبان
کے تخلیقی حروف WORDS حسب ضرورت و استعمال
صوتی کیفیت و کمیت کے لحاظ سے یکساں صوتی قدر کا
کے حامل مانے جائیں - فی زمانہ نئے نجم الغنی اور

نئے سیماب اکبرآبادی چاہئیں، نئے عظمت اللہ خاں
نئے عبدالرحمن بجنوری، نئے آرزو لکھنوی اور نئے
میراجی کی ضرورت ہے - نئے عالمی اور قومی سیاق
میں ایک نئے اصول حقیقت کے تحت صرف اردو عروض
کی از سر نو تدوین کی ہی ضرورت نہیں ہے بلکہ وسیع
ترین سیاق و سباق میں اردو کی نئی عروض شناسی
کی ضرورت ہے آپ غلط فہمی کا شکار ہیں کہ معاصر
ہندی شاعری میں اب وزن و آہنگ کوئی مسئلہ نہیں
ہے - وہاں نئی شکل وجود پذیر ہو چکی ہے - نئی عروض
شناسی یا نئی عروضی تخلیقیت کی جمالیاتی آزادہ روی
اور نکتہ آفرینی کے نئے عالمی منظرنامے سے دہشت
زدہ ہو کر کسی مردہ روایات کے مقدسات میں پناہ
لینا مناسب نہیں ہے - آپ لوگوں کی نظمیں جب اوراق
(لاہور) میں نثر لطیف کے تحت شائع ہوتی ہیں تو مجھے
اچھا نہیں لگتا - آپ تو شاعر کا نثری نظم اور آزاد
غزل نمبر بھی شائع کر چکے ہیں - آپ لوگ احتجاج کیوں
نہیں کرتے ؟ شاید آپ کے پاس کوئی عروضی جواز نہیں
ہے - نثری نظم کے یگانۂ روزگار شاعر عباقرہ،
شارل بودلیئر اور بورخیس، کوئی ایک دن میں نہیں
ہو جاتا وہ زندگی بھر عروضی روایت کی زندہ روایت
کی بھٹی میں پس کر نئی عروضی نجات کو نشی کا حاصل
ہوتا ہے - پہلے سچی اور اچھی شاعری ہوتی ہے پھر
نئی عروض شناسی وجود پذیر ہوتی ہے - قرآن
گیتا، رگ وید، سلیمان کی غزل الغزلات، داؤد کی
مناجات - شنکر کی وگیان بھیرو تنتر اور آدی شنکر
کی سوندریہ لہری - میرا اور کبیر نے کسی روایتی اور
اور روایتی عروضی نظام کی اندھی بہری اور گونگی
تقلید کی ہے ؟ فکر امروز میں علامہ سیماب اکبرآبادی
کا یہ آخری جملہ مستقبل کا سمت نما ہے "وہ ہمیں کسی
نہ کسی طرح تقلید سے اجتہاد کی طرف بڑھنا چاہئے"
پیغمبروں سے بڑا مجتہد کوئی نہیں ہوتا - یہ رفیع تر
نثری نظموں کا جواز ہے لیکن رفیع تر نثری نظمیں
جمالیاتی جوہر میں ایک آدھ قطرہ پیدا ہوتی ہے -؟
ذات کے غار حرا سے صادر ہو کر ادب عالیہ کے
کعبۂ معنی و کیفیت پیدری کی پیشانی پر آویزاں
ہوتی ہے اس کا نیا اور انوکھا چہرہ سب سے الگ
متعلق ہوتا ہے یہ آب رواں پر انسانی دستخط
کے مترادف ہوتا ہے بلکہ ابدیت کے صفحے پر خدا کی
دستخط ہوتی ہے -

● **شہزاد منظر** - اے، ۲۷ - سواجدا اسکوائر
بلاک ۱۶، گلشن اقبال - کراچی - ۴۷

نئے شمارے میں گلزار کا افسانہ "دو دس پیسے اور
داتا" پڑھا گیا - گلزار خوب لکھ رہے ہیں

کستان میں بھی ان کے افسانے "فوزیہ" میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہیں۔ ادبی رسالوں میں پسند کیے جا رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے اور شعری مجموعہ بھی۔ فلمی دنیا میں اس قدر سرگرم اور مصروف رہنے کے باوجود جس طرح تخلیقی کام کے لئے وقت نکال لیتے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اندر سچا فن کار چھپا ہوا ہے جو ان سے لکھواتا رہتا ہے۔ ورنہ فلمی دنیا میں جانے کے بعد خالص ادبی کام کرنے کا کسے ہوش رہتا ہے؟ انہیں میری جانب سے مبارک باد دے دیجئے۔ کبھی بمبئی آنا ہوا تو ان سے ضرور ملوں گا۔

ستیہ پال آنند نے جو بحث چھیڑی ہے اس پر مزید گفتگو ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ ایک اہم ادبی اور ثقافتی مسئلہ ہے اس پر ماضی میں بھی بحث ہوئی ہے اور حال میں بھی بحث ہونی چاہیئے۔ اردو زبان و ادب پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اردو مخلوط زبان ہے اور ہند ایرانی ثقافت کے اشتراک اور ہندو مسلم مشترکہ کلچر کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے اس لئے اس میں (اس کی شاعری میں) اگر فارسی اثرات موجود ہیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے جیسا کہ ہندی پر سنسکرت اثرات نمایاں ہیں۔ ستیہ پال آنند کا خیال غلط ہے کہ ۵۰ء کے بعد اردو شاعری میں ہندوستانی اثرات نمایاں ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نظیر اکبرآبادی کے دور سے اردو میں ہندوستانی عناصر نمایاں ہیں ورنہ وہ ہولی اور دیگر ہندو تہواروں کے بارے میں کیوں نظمیں لکھتے؟ البتہ یہ درست ہے کہ اردو والوں میں ایک گروہ ضرور ایسا تھا (خصوصاً احیاء پرستوں کا گروہ) جو اردو کو زیادہ سے زیادہ عربی اور فارسی کی جانب اس کے قریب لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج پاکستان میں بھی یہ گروہ اردو کو زیادہ سے زیادہ معرب و مفرس بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان میں اردو کے بھارتیہ کرن (انڈین نائزیشن) کا عمل جس طرح شروع ہو چکا ہے اس کے باعث پاکستان اور ہندوستان کی اردو میں کافی فرق پیدا ہو چکا ہے اور آگے چل کر آئندہ مزید فرق پیدا ہو گا۔ میرا جی اور دیگر شاعروں نے اپنی نظموں میں جس طرح ہندو دیو مالاؤں کے کرداروں اور دیو مالائی تلمیحات کو استعمال کیا ہے اسے کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ اردو میں کئی ایسے محاورے ہیں جو خالص ہندو دیو مالا سے لئے گئے ہیں (جیسا کہ "فرعون تیلی ہو گا اور نرادھار ... وغیرہ) کیا یہ مثالیں اردو کے ہندوستانی نژاد ہونے کی دلیل نہیں ہیں؟

اسلم شہزاد ۔ ۲۲۰۰ ۔ [illegible] (بنگلہ دیش)

تاثرات میں اس مرتبہ آپ کی تحریر خاصے کی چیز ہے اردو زبان و ادب، اردو تہذیب اور اردو والوں کے حق

ہے آپ کے لفظوں کی آئینہ داری ہے۔ اس بار مکتوبات کا حصہ خاصا گرم ہے۔ شاہد ماہلی کی غزل کیسا ڈھنگ، سنہرا رنگ، میرا قافیہ ہوا ہو گیا ہے۔ اس کا کوئی جواز (سیماب صاحب کے نوٹ سے) پر کوئی وجہ تو نہیں؟

● کنور سین ۔ ای ۔ ۴۰، ویسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی۔

آپ کے اداریہ نے جی خوش کر دیا۔ آپ نے جس سلامتی، سنجیدگی اور سلجھے لہجے میں بات کی ہے اور اپنی تحریر میں استدلال کے اجالے کو کہیں بھی ماند نہیں پڑنے دیا۔ محض باتیں بنانے اور اپنے کو LIME LIGHT میں رکھنے کے لئے نت نئے حربے ایجاد کرنے والوں کے لئے آپ کا روشن ضمیر اداریہ ایک انتباہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ کے اداریے میں حسب معمول جوش ہے لیکن ہوش جوش پر غالب ہے۔ اردو کی کسی میرسی کا رونا رونے کی ضرورت نہیں۔ اردو ہندوستان کی ثقافت کا لازوال جز ہے۔ اس کو نہ تو اکیڈمیوں کے نام نہاد اردو نواز زندہ رکھ سکتے ہیں۔ نہ اس کی فرضی موت کا نوحہ لکھنے والے اس زبان میں خود کو زندہ رکھنے کی اپنی طاقت ہے جس کی تسخیر اس کے دشمنوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

آپ نے سو فیصدی درست فرمایا ہے کہ اردو شاعری میں ہندوستان کے کئی ہزار سال کی تہذیب رچی بسی ہوئی ہے۔ آپ نے تو آج لکھا ہے قبلہ سیماب صاحب نے تو یہی بات اپنے انتہائی مدلل اور مسحور کر دینے والے لہجے میں ۱۹۳۰ء میں کہی تھی۔ ان کی تحریر کی نرم صلابت ابھی تک آپ کے لئے ایک معیار ہے اور میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ آپ اس معیار کو عبور کر جائیں۔ سیماب صاحب کی تحریر میں جو رچی بسی غنائیت ہے اور لہجے میں جو دل کو موہ لینے والا گداز انکسار ہے۔ اس کو محسوس کرنا آپ کے لئے ازبس ضروری ہے۔ میری یہی رائے ہے۔

گلزار کی کہانی "دس پیسے اور دادی" پسند آئی۔

● اکبر حمید آبادی ۔ [illegible]

شاعر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے جب وہ زمانہ یاد آ رہا ہے، جب اعجاز صدیقی صاحب شاعر نکالا کرتے تھے چونکہ ان دنوں میں بمبئی میں زیر تعلیم تھا تو بسا اوقات ان سے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ عجب رکھ رکھاؤ کی شخصیت تھی ان کی بھی۔ یہ بات قابل ستائش ہے کہ آپ نے نہ صرف اتنے عرصے تک شاعر کو زندہ رکھا بلکہ اس کے حسن و جمال کی آب و تاب بھی برقرار رکھی۔ کہ اعلیٰ ادبی مذاق آپ کو ورثے میں ملا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مضامین نظم و نثر میں تنوع ہی کا نہیں بلکہ معیار کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ جو سونے پہ سہاگہ ہے۔

تازہ شمارے میں سردار جعفری کا مضمون ہمیشہ کی طرح ٹھوس، دلچسپ اور ذہن افروز ہے۔ حصۂ نظم بھی بہت ہی اچھی تخلیقات پر مشتمل ہے۔

شبنم رومانی اور باقر نقوی کی غزلیں پسند آئیں۔

● ظہیر غازی پوری ۔ باشمیہ کالونی، پنجاب (بہار)

آپ نے شمارہ نمبر ۲ کے اداریہ میں نہایت سنجیدہ انداز میں ان سچائیوں کا اظہار کیا ہے جو عصبیت پسند اور موقع پرستوں کی نظروں سے ہمیشہ اوجھل رہی ہیں۔ آپ نے ستیہ پال آنند کے سوال کو نصف صدی قبل مردہ سوال قرار دے کر ایک پوری داستان لکھ دی ہے جسے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیسیویں صدی تو کیا میں پچاس سال کی شاعری کا تفصیلی جائزہ پیش کر کے یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ شری آنند ایسے سرپھرے امریکہ و مغرب میں بیٹھ کر غور نہیں کرتے۔ بلکہ ان سے لکھوائی جاتی ہیں۔ اس شمارہ میں سردار جعفری کا مضمون تمام ترقی کے باوجود ان کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکا۔ اپنے بعد اگر وہ بعض لوگوں کے تذکرے کریں گے بھی تو اپنے لواحقین کے۔ اپنے حلقہ گرد کے یا اپنے پلیٹ فارم کے کچھ لوگوں کے۔ نظام صدیقی کا مقالہ "شرح و تفہیم کا مسئلہ" دعوت فکر دیتا ہے ارباب فکر نے اس کوچے میں مدت دراز تک قاری کے ساتھ ساتھ فن کاروں کو بھی بھٹکایا ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت اور بھی الجھ جاتا ہے۔ جب سچی شاعری کو ترک ہوئی اور علامت و استعارہ سازی کے نام پر گورکھ دھندا شاعری کو اعلیٰ و ارفع قرار دینے کی سعی کی جاتی ہے۔ غزلوں کا حصہ بہت جاندار ہے۔ صادق، اسلم، پرتپال سنگھ بیتاب اور مظہر اثر بیالوی کی غزلوں نے دیر پا تاثر قائم کیا۔ عبدالرحمٰن کی غزلیں تازہ کاری کی غماز ہیں۔ خطوط کا حصہ بھی بہت معلوماتی اور دلچسپ ہے۔

● شفیع مشہدی ۔ ۱۱۰ ار اے ۔ ۱۲ ۔ آفیسرز فلیٹ بیلی روڈ۔ پٹنہ ۱

شاعر کا تازہ شمارہ ہمیشہ کی طرح اپنی روایات اور معیار کے مطابق ہے۔ اس بار تاثرات میں آپ نے جن نکات کی وضاحت کی ہے ان سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا (ستیہ پال آنند کی بات اور ہے)

آپ نے بجا فرمایا ہے کہ کچھ لوگ محض خوش فہمی اور خبروں میں بنے رہنے کی شعوری کوشش ہی کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس شعوری کوشش میں وہ کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ تبھی تو شاعر کے تین صفحات پر سردار جعفری کی وضاحتیں سامنے آ گئیں۔ میرا خیال ہے کہ اتنی اہمیت دینے کی ضرورت بھی نہ تھی۔

اس بار کے منظومات میں عذرا نقوی کی کہانی [illegible] بے حد اچھی ہے بلکہ اسے مکمل شمارہ میں جگہ ملنی چاہیے دوسری کہانیاں شائع کر سکیں۔ شعر کا حصہ زیادہ اچھا ہے۔

● ثاقب عرفان: سائبان، ۴م - سی ۱۵، ۵، ۱۵، ایل - نوریڈ کراچی - (پاکستان) - ۵ ۰ ۰ ۵ ۰ ۷

جولائی کا شمارہ بھی اپنی سابقہ روایات کا امین ہے۔ تخلیق اور تزئین، ہر دو لحاظ سے مجھے پسند آیا۔ جولائی میں آپ کے علاوہ دو مندرکی کاوش بہت دور تک اپنا اعجاز کرتی دکھائی دیتی ہے۔ خدا کرے یہ دستک وہاں کے ارباب اقتدار کو بھی سنائی دے۔ حیدر ارحمان کی دونوں غزلیں بہت خوب ہیں بالخصوص یہ شعر دل کو چھوتا ہوا گزرا۔

کھنڈر پکارتے ہیں اعتبار کی فصیل کے
یہ بستیاں یہاں کے باغیوں کی نذر ہو گئیں

"اردو شاعری اور ہندوستان کی تہذیب" میں سردار جعفری نے کھل کر باتیں کی ہیں حالانکہ ایک مختصر مضمون میں اس کی گنجائش کہاں تھی! "زنجیر" عابد جعفری کے اس مشاہدے کا آئینہ دار ہے جو کناڈا میں مقیم شہریوں (بلکہ مغرب میں مقیم باشندوں) کا عکس ہے، خوبصورت عکس۔

● عذرا اصغر - ۴۰۶ - جی ۱۰/۱، اسلام آباد (پاکستان)

جولائی ۹۵ء کا شمارہ حسب سابق پڑھنے تعلق رکھتا ہے۔ بطور خاص گلزار کا افسانہ "دیمک چیے اڑ دادی" خوبصورت معاشرتی افسانہ ہے۔ جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں ابھی معاشرہ جڑا ہوا ہے پرانی قدریں ابھی باقی ہیں۔ تصنع اور بناوٹ کم ہے۔ عذرا نقوی کا "رین چیک" ایک ایسے المیے کی جانب متوجہ کرتا ہے جس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مگر کچھ بھی کہنا بے سود ہے۔ آنند ہر کا افسانہ "اودبچر رو پڑا" عقلی سطح پر جھانی چارے کی فضا پیدا کرتا ہے آج کے پر آشوب دور میں ایسے ادب کی تخلیق ضروری ہے اور اسی سے کہانی کار کا خلوص جھلکتا ہے۔ دلیپ کی "مقصود الہی شیخ" کا اور عابد جعفری کا "زنجیر" بھی اچھے اور دلچسپ افسانے ہیں۔ شاعری نے متاثر نہیں کیا۔

مجھے اندازہ ہے کہ اس گرانی کے دور میں آپ کتنی محنت کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت دے اور کامیابی سے ہمکنار کرے۔ اور شاعر یوں ہی منزلیں مارتا رہے۔ آمین۔

● محمود احمد قاضی - ملت کالونی، گلی ۲- راہوالی گوجرانوالہ (پاکستان)

یہ شمارہ بھی دوسرے عام شماروں کی طرح خاصے کی چیز ہے۔ اس کا LAYOUT اور مواد دونوں جاذب نظر اور فکر انگیز ہیں۔ مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک متحرک ذہن کا دخل ہے۔ مجھے اس کے افسانوں اور شاعری سے زیادہ اس کے مضامین اور مباحث

اور ادا سیے نے اپنی طرف متوجہ کیا کہ اس میں ادبی مرثیوں کے بجائے کچھ گہری باتیں کہی گئی ہیں۔ دوستوں کی کاوشیں اور آپ کی محنت دونوں داد کی حق دار ہیں بہر حال اس کے تمام تر مندرجات میرے لئے خوشی اور طمانیت کا باعث ہیں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

● نامی انصاری - ۲۹۵-۹۹ - نالا روڈ، چمن گنج - کانپور - ۱

آپ کا اداریہ اور سردار جعفری کا مضمون دونوں ہی مدلل طریقے سے ستیہ پال آنند کے اٹھائے ہوئے سوال کا جواب فراہم کرتے ہیں۔ آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "... کسی بھی معتبر شاعر کا مجموعہ اٹھا لیجئے۔ وہ شاعری ہندوستانی شاعری ہی معلوم ہوگی، عربی یا عجمی نہیں" دراصل اردو شاعری کا کوئی زمانہ ایسا گزرا ہی نہیں جس پر ہندوستان کی ہوا اور مٹی کا اثر نہ ہو۔

البتہ ہندو مذہب کے دیو مالائی تصورات کو اردو نے کم کم قبول کیا ہے اور شاید آنند صاحب کا یہی مطلب ہے۔ سردار جعفری صاحب نے جس طویل اور مفصل مقالے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ ان کو ضرور اور جلد لکھنا چاہیئے

● خورشید ملک - تادین نکلی، شاہجہانپور (یوپی)

جرعات پڑھ کر طبیعت خوش ہو گئی اور آپ کے قلم کی ناقابل اندازہ قوت محسوس کر کے اندرون قلب سے "واہ" نکلی۔ مبارک باد۔ آپ نے سب کو خوب جواب دیا ہے اردو کے اپنے عروض مروج نہیں ہو سکے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شاعروں نے فن شاعری پر زور نہ دے کر اپنے سیدھے تجربے کئے (مثلاً آزاد غزل، نثم وغیرہ) اور دیگر زبانوں کی اصناف کو اردو نے کی کوشش کرتے رہے (مثلاً ہائیکو، سانیٹ) دوہے، گیت وغیرہ) اس کا نتیجہ سامنے ہے کہ اردو شاعری بر بادی کے راستے پر گامزن ہے۔ ظاہر ہے کہ جاپانیوں کی طرح اسی وزن میں اردو میں ہائیکو ناممکن ہے۔ کیونکہ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جو جاپانی جانتا ہو۔ بس وہ انگریزی میں ترجمے ہی پڑھتے ہیں۔ اسی طرح سے سانیٹ دوہے وغیرہ بھی اردو میں وہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکے جو ان کو انگریزی یا ہندی میں حاصل ہے (اب تو انگریزی سے سانیٹ اور ہندی سے دوہے غائب سے ہو کر رہ گئے ہیں) دوسری اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کا کوئی نام لیوا اگر نہیں ہے۔ غالب میر وغیرہ نے تجربے نہیں کئے اسی لئے رہتی دنیا تک پسند کئے جاتے رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں جدیدیوں اور مابعد جدیدیت پرستوں نے شاعر کثیر تعداد میں پیدا کئے مگر اہمیت رکھنے والے شعراء انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

بہر حال ہر شاعر (خصوصاً ہندوستانی شاعر) اپنی شاعری میں ہندوستان ہی کا پس منظر رکھتا ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ اساطیری یا دیو مالائی واقعات ہی سے اپنی شاعری کو سجائے مکم از کم [illegible] ... ہاؤس یا امپائر اسٹیٹ بلڈنگ وغیرہ کو اپنا موضوع نہیں بناتا ہے۔ سردار جعفری نے خواہ مخواہ اپنا نظموں کے حوالے دیئے ہیں۔ اس طرح کے حوالے دوسرے شعراء کے ہاں بھی مل جائیں گے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شاعر ہندوستانی کلچر یا اس کی ہزاروں سال پرانی تہذیب سے اپنی شاعری کے ذریعہ رشتہ جوڑے۔ اگر خالص رومانی شاعر ہو تو کیا وہ ہندوستانی کلچر سے الگ ہو جائے گی؟ ہر تخلیق کار اپنی بنیادی فکروں میں وقت کا تصور رکھتا ہے پھر سردار جعفری کو یہ شکایت کیوں ہے کہ ان کے وقت کے تصور پر کسی نقاد نے قلم نہیں اٹھایا حصۂ نظم میں عذرا پروین کی نظم اچھی ہے۔ اسلم بدر زبیری کی نثری نظم کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا غزلوں میں مظفر حنفی کی غزل کا مقطع:

کتنا ہی عطر ملئے اس پر مبالغے کا
جھوٹی غزل مظفر پھر بھی نہیں مہکتی

اپنا جواب نہیں رکھتا ہے۔ شاید یہ آج کل کے نام نہاد شعراء پر بھرپور طنز ہے۔ مگر اس غزل کے دوسرے شعر میں تتلی نہیں مہکتی کی اصطلاح عجیب سی محسوس ہوتی ہے۔ شاید قافیے کی مجبوری آ گئی ہوگی۔ شجاع خاور کا یہ شعر بھی خوب ہے۔

بس میرا ایمان باقی رہ گیا ہے شیخ کا
اور عقیدت برہمن کی رہ گئی ہے تھال بھر

کہانیوں میں گلزار کی کہانی نے متاثر کیا خاص طور اس کے اختتام نے جو لطیف اثر ڈالا ہے، لاجواب ہے طاہر نقوی کی کہانی بور کرتی ہے۔ آنند ہر کی کہانی کوئی خاص اثر نہیں چھوڑتی۔ بقیہ کہانیاں بھی بس یوں ہی سی ہیں۔

● عذرا نقوی - P.O. BOX 51143 RIYADH-51143 (SA)

آپ کی تحریر جرعات کے تحت "کہاں کہاں سے الگ کر سکو گے تم مجھ کو" ایک ایسی تحریر ہے جو شاعر کے قارئین سے آگے بھی جانی چاہئے۔ چند صفحات میں آپ نے ان تمام باتوں کا احاطہ کر لیا جو اس ضمن میں آتی ہیں۔ اسی سلسلے کا سردار جعفری کا مقالہ حالانکہ صرف ان کی شاعری کے حوالوں تک محدود ہے لیکن بہت خوب ہے۔ نظموں میں محمد صلاح الدین پرویز کی نظمیں "برسات کے دو گیت" اور عذرا پروین کی نظم "عرفان گنبد کی" من موہنی ہیں۔ افسانوں میں گلزار نے منشی پریم چند کی یاد دلادی۔ مقصود الہی شیخ مختصر الفاظ میں بہت کچھ کہہ گئے۔ غزلیات میں باقر نقوی کی غزل پسند آئی۔

اسرار اکبر آبادی۔ ای۔ ۲۔ ۰۰۰ ہاؤسنگ پارک شیو نگر۔ آگرہ۔ (یوپی)

"اردو ادب میں ہندوستانی تہذیب" سے متعلق آپ نے نہایت ہی عالمانہ، جامع اور بلیغ انداز میں اپنے خیالات اور حقائق کا اظہار فرمایا ہے۔ مجھے طالب علمی کا وہ زمانہ یاد آگیا جب ملک کے باشندوں میں پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے رفقائے کار "وقار ملک و قوم" کے ساتھ ساتھ "بین الاقوامیت" کو زور و شور سے شہرت دے رہے تھے لیکن دوسری طرف "اردو زبان و ادب" پر بدیسی اور فرقہ پرست ہونے کے الزامی تیر تیزی سے برسائے جا رہے تھے۔ صوفیائے کرام سے چندر بھان برہمن تک اور برہمن سے سیماب و فراق اور ملکیش ہل۔ احمد تک ان تیروں سے سبھی گھائل ہو رہے تھے۔ اردو طلبا ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ہمیں اس طرح اپنے کو غیر بدیسی، الگ تھلگ اور کمتر سمجھنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ لیکن دل سے تو کہ ماننے ہی نہیں تھے۔ سوال تھا کہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کیا ہے؟ مطالعہ و مشاہدے سے معلوم ہوا کہ اشتراک دراوڑ، آریہ، ایرانی، یونانی، شکوں، کشانوں، ہنوں، عربوں، منگولوں، ترکوں، مغلوں اور یورپین اقوام کی تہذیبوں کا ملا جلا سنگم ہی ہندوستانی تہذیب و ثقافت ہے۔ اور یہ تہذیبیں آپس میں خلط ملط ہو کر اس طرح ایک تہذیب بن گئی ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ کرنا ناممکن ہے۔ ستیم، شیوم سندرم (THE TRUTH, THE GOODNESS THE BEAUTY) آج ہندوستانی تہذیب کا خالص اور قدیم قول معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ یونانی تہذیب کا قول ہے اور افلاطون سے منسوب ہے۔ فعال اور ترقی پذیر تہذیب و ثقافت کے لئے مفید لین دین کوئی عیب نہیں ہے۔ بلکہ قدرتی خوبی ہے یہ لین دین بنی نوع انسان کی تاریخ کے دور اول ہی سے جاری ہے۔ آج دنیا کی کوئی تہذیب مجرد نہیں ہے تمام ایک دوسرے سے متاثر ہیں۔ آگ کی دریافت اور پہیے کی ایجاد قدیم ترین ایک یا دو تہذیبوں میں ہوئی تھی۔ لیکن آج دنیا کی تمام تہذیبیں ان سے مستفید ہو رہی ہیں۔ عقائد کے اعتبار سے ہندوستانی تہذیب کا عہد قدیم ہلکے آستک وادی بھی ہے ناستک وادی بھی ہے۔ توحید بھی ہے شرک بھی ہے بت پرستی جائز بھی ہے۔ ناجائز بھی ہے۔ دنیا کو مایا بھی کہا گیا ہے اور یقین حق بھی۔ ۔۔۔ جنت و جہنم بھی ہے ۔۔۔ کا انکار بھی ہے۔ آدمی کو کمتر بھی بتایا گیا ہے اور شرودھی (اشرف المخلوقات بھی) بتایا گیا ہے

اور ایسا بھی ہے "سغات وادی" پر زور تائید بھی ہے اور تردید بھی ہے۔ سنسار کو ایک [illegible] [illegible] بھی کہا گیا ہے۔ مردوں کو جلایا بھی جاتا ہے اور دفن بھی کیا جاتا ہے (نا نو پنتھ) وغیرہ وغیرہ تاہم ہندوستانی تہذیب مرکز فلاح و بہبود انسانی [illegible] کے ارد گرد گھومتی ہے اور یہ خوبی نیچرل ہے۔ کیوں کہ انسان فطرتاً محبت و امن پسند ہے۔ سبھی انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں ان تمام باتوں کی روشنی میں جب اردو ادب کا جائزہ لیا گیا تو انکشاف ہوا کہ یہ اپنے ظاہر و باطن سے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا بہترین اور صحیح عکاس ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر اس طرح کے غلط سلط بیانات اس دور میں بھی کیوں شائع کرائے جاتے ہیں۔ اس کا جواب "جرعات" میں بھی موجود ہے اور اس خط کی سطور بالا میں بھی۔ افسوس ہوتا ہے کہ ایسے بیانات دینے والے اتنی سی بات نہیں سمجھتے ہیں کہ جب آدمی میں غیریت و فرق پیدا ہو جاتا ہے تو وہ ایک دوسرے سے خوف و دہشت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ بے اطمینانی اور بدگمانی کا ماحول بن جاتا ہے اور ملک و قوم کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اس بار "جرعات" بڑا دلچسپ ہے اور ساتھ ہی علمیت اور دانش مندی بھی ہے۔

قاضی فراز احمد۔ پوسٹ بکس ۲۱۰۱۰، دوحہ قطر

اداریہ یا جرعات کے سلسلے میں ایک گذارش کروں "ایسا نہیں کہ مجھے جواب دینا نہیں آتا، اور ۔۔۔ بہت سارے معاملات کو مجموعی افہام و تفہیم کے لئے قاری کی صواب دید پر چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ ایک انصاف پسند مدیر ہونے کا ثبوت ضرور دیا ہے۔ مگر آپ کے اندر کی بے باکی کا بھی اظہار ہو جاتا ہے۔ آپ کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ کو آپ کی ہمت کو آپ کے قلم کو لاکھ جو کمزور اور نا تواں سمجھ کر منافقانہ تعاون کی پیش کش کرتے رہے تھے اب ہکا بکا رہ گئے ہیں۔ محترم علی سردار جعفری اردو شاعری اور ہندوستان کی تہذیب ستیہ پال آنند کی خدمت میں انتہائی معذرت خواہانہ انداز میں سامنے آتے ہیں

واۓ بر جان سخن۔ گر بہ سخنداں نرسد

چہ جائیکہ "۔۔۔۔ کتنے شاعروں نے ہندوستان کی اس تہذیب سے رشتہ جوڑا جو کئی ہزار سال پرانی ہے" لکھنے والے کو سردار جعفری صاحب لکھتے ہیں!

"ستیہ پال میرے دوست ہیں۔ شاعری میں میرے (بڑے نہیں) چھوٹے بھائی ہیں اور صاحب علم و دانش ہیں ۔۔۔ اسے بسا آرزو کہ خاک شد "۔ بہرحال مضمون سے جی خوش ہوا۔ اداریے کے جملے آپ ہی ایک مثبت انداز میں ضرور مضمون لکھیں جس میں ستیہ پال صاحب کی صد سالہ تخلیقات کی تصویر بھی ہوں جو آئینے کی طرح نظر آئیں۔ آئینہ سازوں کو۔

راہی قریشی۔ بی ۳۔ ۲۹۔ ۱۴۹۵۔ ۔۔۔ کالونی کوٹھاری بھون روڈ۔ گلبرگہ ۵۸۵۱۰۲

"جرعات" کا لفظ لفظ آپ کی اردو دوستی اور وطن پرستی کا بین ثبوت ہے۔ تاہم اتنا طویل ۔۔۔ سپرد قلم کر کے آپ نے اپنا قیمتی وقت ضائع کیا ہے کیوں کہ "جرعات" کے پانچویں پیراگراف کی ابتدائی سطور ہی جناب ستیہ پال آنند کی حقیقت کے انکشاف کے لئے کافی ہیں۔ کاش ستیہ پال آنند یہ مشورہ قبول کریں کہ شاعروں اور اصناف ادب پر طنز کرنے کے بجائے وہ شاعروں اور اصناف ادب کا وسعت قلب و نظر کے تحت مطالعہ کرنے کی سعی کریں۔

سخاوت شمیم۔ گورنمنٹ پی ڈی ایم کالج کوٹ پتلی ۳۰۳۱۰۸

شاعر پابندی سے مل رہا ہے یہ آپ کی لگن اور کاوشوں ہی کا ثمر ہے نیز آپ کا ذوق سلیم شاعر کو مزید بہتر اور دلپذیر بنا رہا ہے۔ شمارہ مئی [جون] ۹۵ء میں علی سردار جعفری صاحب کا مضمون اور گلزار کی کہانی کا جواب نہیں۔ جرعات "کہاں کہاں سے الگ کر سکو گے تم مجھ کو" میں اردو زبان و ادب کے مسائل کو آپ نے بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ بشیر بدر کی غزل نے متاثر نہیں کیا۔

خلیل تنویر۔ گورنمنٹ میوزیم اودے پور۔ (راجستھان)

شاعر شمارہ جولائی میں آپ نے اپنے اداریے میں اپنی رائے کا اظہار بہت ایمانداری اور جرأت کے ساتھ کیا ہے۔ آپ کا یہ کہنا سو فیصد سچائی ہے کہ اردو شاعری میں ہندوستان کی کئی ہزار سال کی تہذیب رچی بسی ہے۔ ایک ایسی رنگا رنگ تہذیب جس میں ہزاروں سال کا ہندوستان دیگر زبانوں سے کہیں زیادہ دھڑک رہا ہے۔ لیکن یہ سب دیکھنے اور پرکھنے کے لئے تعصب کے گرد و غبار سے پاک دیکھنے والی آنکھ چاہیئے۔

آپ نے تحریر کیا ہے کہ اردو شاعری صرف غزل نہیں ہے اگر صرف غزلیہ شاعری ہی کا جائزہ لیا جائے تو اس کے موضوعات، تلمیحات، استعارے، علامتیں تک ہندوستانی ہیں۔ یہاں مجھے کلیم احمد مرحوم کی بات یاد آئی کہ "اردو غزل" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فارسی غزل کی نقال ہے دوسرے لفظوں میں اس غزل کے پیچھے جو جذبہ و احساس کام کر رہا ہے وہ بھی جذبہ و احساس کی نقل ہے۔ سوچنے کی بات

کر جس تہذیب نے فن تعمیر میں تاج محل اور موسیقی میں امیر خسرو کو پیدا کیا وہ شعر و ادب میں نقال کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن ستیہ پال آنند صاحب جیسے ادیب و شاعر اردو والوں کو ایسے مردہ سوالوں میں الجھائے رکھنا چاہتے ہیں۔ جو واقعی اہمیت نہیں رکھتے ہیں یہ سب اردو کے خلاف جو سازشیں ہو رہی ہیں اس کا ایک حصہ ہیں۔

● اے۔ اے۔ فاروقی۔ صدر ہاسپٹل۔ ہزاری باغ۔ (بہار)

آپ کے اداریہ نے دل پر ویسا ہی نقش چھوڑا جیسا آپریشن کے بعد جسم پر تا زندگی باقی رہ جاتا ہے یقیناً یہ اداریہ تاریخی نوعیت کا قرار پائے گا۔ مندرجات میں سردار جعفری کا مقالہ بہت وقیع ہے۔ بشیر بدر، منظر حنفی، شبنم سبحانی، شجاع خاور، حمیرا رحمان، شاہد ماہلی اور صادق کی غزلوں نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ عذرا پروین کی نظم "عرفان" گہری فکر کی تہہ دار معنویت کی حامل ہے۔ مجھے وزن میں کہی گئی آزاد نظمیں پسند آتی ہیں۔ منثور نظموں کے تحت شائع کردہ ظہیر غازی پوری کی نظمیں موضوعات اور اسلوب دونوں اعتبار سے معرکۃ الآراء ہیں۔ بے شک وہ عصر آگاہ شاعر ہیں۔

● نور دھو پارسے۔ مولا علی گلی، آکل کوٹ ۴۱۳۲۱۶۔ ضلع شولاپور۔

جولائی کا شمارہ مکمل تو نہیں پڑھا لیکن سیماب اکبر آبادی کا فکر امروز اور آپ کا اداریہ پڑھ لیا دونوں تحریریں پسند آئیں۔ اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر کے موضوع پر علی سردار جعفری کا مقالہ ان کی شاعری کے حوالے سے میری معلومات میں اضافے کا سبب ہوا۔ گلزار کی کہانی "دس پیسے اور دادی" اور دیگر کہانیوں نے میرا دل موہ لیا۔ مجموعی طور پر شاعر کا شری باب بہترین ہے۔

● شارق عدیل۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ یو پی۔

میں پور پور بسا ہوں وطن کی مٹی میں
کہاں کہاں سے الگ کر سکو گے تم مجھ کو

شمارہ ۵ میں جرعات کے مطالعے کے دوران ایک انجانی سی مسرت محسوس ہوئی۔ ادھر ادھر بھٹکے بغیر آپ اپنی بات بڑے کھا بنر رکھتے ہیں۔

● اقبال جاوید۔ ۳۸۔ رپن لین، کلکتہ ۔۱۶

محترم علی سردار جعفری کا مقالہ "اردو شاعری اور ہندوستان کی تہذیب" جو دراصل شری ستیہ پال آنند کے طویل خط کا جواب ہے۔ یہ مقالہ بہت ہی معیاری ہے اور مغز ہے اس سے قارئین کے شعور اور تخلیق کے بہت سارے دروازے کھلے ہیں۔

میں نے اپنے والد محترم ڈاکٹر جاوید نہال کی زبانی اکثر یہ سنتا آیا تھا کہ اردو کے معیاری رسالوں میں "شاعر" کا نام سر فہرست ہے لیکن افسوس اور معذرت کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کے رسالے کے معیار میں کچھ کمی آگئی ہے۔ خاص طور پر کہانی کے حصے میں مثلاً عابد جعفری صاحب کی کہانی "زنجیر"، محترمہ عذرا نقوی کی کہانی "ری چیک" اور جناب جعفر ولی شیخ کی کہانی "اکیلا پن" میں اثر کرنے والی کوئی بات نہیں پائی جاتی ہے اور ہلکی پھلکی سی لگتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تخلیق کاروں کو کہانی کی تیکنک اور فن کی گہرائی سے واقفیت نہیں (معذرت کے ساتھ) بلکہ یہ کہانیاں صرف STATEMENT OF FACT بن کر رہ گئی ہیں۔ دراصل گلزار کی کہانی "دس پیسے اور دادی"، آنند لہر کی کہانی "اور پتھر رو پڑا"، اور طاہر نقوی کی کہانی "دستک" ہی کہانی کے حصے کی جان ہیں۔

● احسان الحق۔ مغربی چمپارن۔ بگہا۔ ۱ (بہار)

تازہ شاعر شمارہ نمبر ۷ ماہ جولائی نظر نواز ہوا۔ اداریے میں آپ نے دو ٹوک بچی کھری اور دل کو لگتی باتیں مجتہدانہ اور ناقدانہ انداز میں اس طرح بیان کی ہیں کہ ان کا نقش برسوں دل و ذہن پر منقش رہے گا۔ صرف ۲۵ برس نہیں گزشتہ ۵۰ برسوں کا ادبی خصوصاً شعری سرمایہ کھنگالا جائے تو ہر شاعر کے یہاں وہ جو باس ملے گی جسے حب الوطنی دیش بھگتی اور سرزمین وطن سے والہانہ وابستگی کا نام دیا جاتا ہے۔ میں صرف بہار کا ہی ذکر کروں تو علامہ سرور کا بڑا پرویز شاہدی، ظہیر غازی پوری، علامہ ناوک حمزہ پوری اور فرحت قادری کے یہاں وافر کلام مل جائے گا کہ اس کا بوجھ شری ستیہ پال آنند کا اٹھانا دشوار (بلکہ ناممکن) ہو جائے گا۔

سردار جعفری کا مضمون علمی بھی ہے اور معلوماتی بھی مگر وہ اپنے میں اور ہم مشربوں یا ہم نواؤں کے حصار سے کبھی باہر نہیں نکل سکے۔ انہوں نے کبھی پڑھنے دیکھنے اور جاننے کی سعی نہیں کی۔ کاش وہ اپنے لب کے لوگوں کی غیر معمولی ادبی خدمات کا تہہ دل سے اعتراف بھی کرتے۔ نظام صدیقی کا مقالہ اہم ہوتے ہوئے بھی لفظوں کی طلسمی بازی گری کا شکار ہو کر رہ گیا ہے غزلوں میں حمیرا رحمان اور صادق نے اپنے لب و لہجے سے متحیر کر دیا۔ ان دونوں کو مبارکباد۔

● شہاب اختر شہاب۔ کلکتہ کالا چند اسٹورس ایپرا اپنچی جھریا (بہار)

جولائی کے شمارے میں مکتوبات کے تحت صلاح الدین پرویز نے بہت سچی مشورہ دیا ہے۔ میری بھی خواہش ہے کہ سبھی مدیران رسائل کو اس کا ڈھنگ لینا چاہئے تاکہ ادب ادب ہی رہے۔ ادب برائے انا پرستی نہ ہو جائے۔ کشتی کے لئے اکھاڑے بہت ہیں۔ ذاتی رنجشیں یہاں کیوں نکالی جائیں۔ نظموں کا حصہ بہت ہی اچھا بن پڑا ہے۔ صلاح الدین پرویز کی دونوں نظمیں پسند آئیں۔ گلزار کا سیریل ڈی ڈی ایڈ ایک کہانی اور مل آرہا ہے۔ یہ کافی ادبی ہوتا جا رہا ہے کاغذ سے اٹھ کر ادبی کہانی زندگی کے ساتھ جب گفتگو کرتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ بس یہی ادب ہے۔ گلزار کی کہانی "دس پیسے اور دادی" بہت متاثر کرتی ہے۔ کہانی کا انداز، بیان اور پلاٹ بہت مختلف ہے ان کا منفرد رنگ ان کی روشنائی سے جا بجا جھلک اٹھتا ہے۔

● کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی۔ این۔ ۲۳۹۔ گریٹر کیلاش۔ ۱، نئی دہلی ۴۸

شاعر جولائی کا سرورق نہایت ہی دلکش اور خوشگوار ہے۔ آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح جاندار ہے علی سردار جعفری صاحب کا مقالہ ہر لحاظ سے معلوماتی اور پر مغز ہونے کے ساتھ ستیہ پال آنند کے خط کا خوبصورت جواب بھی ہے۔ نظم و نثر دونوں معیاری ہیں۔ البتہ صلاح الدین پرویز کا خط ناگوار گزرا۔

● عبدالقوی ضیاء
1A–AUBER AVE
SUDBURY ONTARIO
CANADA P3A 4A7

اپنی بات، جرعات، [کہاں کہاں سے الگ کر سکو گے تم مجھ کو] سے شروع کرتا ہوں۔ یہ تین صفحے دراصل ستیہ پال آنند کے ایک خط [۲ رخط باتیں ہزار] کے جواب میں بڑی ہنرمندی سے سیاہ کئے ہیں۔ آنند جی میرے پسندیدہ تخلیق کاروں میں سے ہیں۔ میں ان کی نگارشات کو ہمیشہ توجہ اور دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ ان سے جب کبھی فون پر باتیں ہوتی ہیں تو پھر وہ کہتے رہتے ہیں اور میں گوش بر آواز رہتا ہوں وہ ذرا متنازعہ قسم کی شخصیت ہیں۔ دو ٹوک سے ہٹ کر بات کرتے ہیں اور چھیڑ خوباں سے چلی جائے میں اعتقاد رکھتے ہیں۔ غزل پر اس سے پہلے بھی بڑے کڑے اور کٹھن وقت آئے مگر وہ ان سب کو برداشت کر گئی۔ کلیم الدین احمد یا جوش یا ن م راشد اور بہت سے ترقی پسند مصنفین جو غزل کی مذمت سے باز نہ آئے۔ مگر آخر میں خود ن م راشد نے غزل کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ جوش نے تو باقاعدہ غزلیں لکھی ہیں۔ غزل ایک ایسی ہرجائی صنف ہے جو لاکھ صدمے

اشاعت کے بعد صحت مند، توانا و تندرست رہتی ہے۔ آنند صاحب، احمد ہمیش کے بہت پرانے جاننے والے مجھ سے بھی کہتے رہتے ہیں کہ احمد ہمیش سے رابطہ قائم کروں۔ مگر اور بھی دکھ ہیں زمانے میں۔ آپ کے وجوہات ہیں۔ جرأت ہے۔ بے باکی ہے۔ حق گوئی ہے۔ لیکن کہیں کہیں بیچ میں جھلاہٹ اور جھنجھلاہٹ بھی نظر آتی ہے۔ علی سردار جعفری کا جواب آنند صاحب کو بصورت اردو شاعری۔ اور ہندوستانی تہذیب، اپنی جگہ ایک معیاری ادبی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ نظام صدیقی نے اپنے مضمون شرح و [illegible] تفہیم و [illegible] کے مسائل کا احاطہ خاصی ہنرمندی کے ساتھ کیا ہے۔ بہت سی باتیں اختلافی ہیں۔ ان کا پتہ موجود ہے۔ براہ راست رابطہ قائم کروں گا۔

گلزار کا افسانہ "دس پیسے اور دادی" ان کی شاعری کی طرح انسانی رشتوں اور اخلاقی آدرشوں کا تجزیہ پورے احساسات کے ساتھ کرتا ہے۔ ان کے طرزِ نگارش میں جو ایک اچھوتا پن ہے اس کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ گلزار کی آواز اب نئی نہیں رہی اور ان کا لہجہ بھی غیر مانوس نہیں ہے۔ مقصود الٰہی شیخ کا "اکیلا پن" افسانچے کی حیثیت رکھنے کے باوجود انہوں نے موضوع کو پوری طرح گرفت میں لیا ہے اور نیم افسانوی انداز میں پیش کیا ہے وہ بھی اس طرح کہ پڑھنے والے کے دل سے بھی ہوک اٹھنے لگتی ہے۔ آج کے افسانہ نگاروں میں ان کا ایک موقر مقام ہے۔ عابد جعفری کی کہانی میں کردار نگاری کے اجزا سرے سے مفقود ہیں۔ بلکہ ہلکا پھلکا بیانیہ انداز ہے۔ اختتام البتہ شدت تاثر پیدا کرتا ہے۔ طاہر نقوی کی کہانی میں سب کچھ ہے، افسانوی رنگ نہیں۔ بڑا اکھڑا اکھڑا پن برستا ہے۔ اس بار غزلوں کا حصہ دل لبھانے والا ہے۔ بشیر بدر، مظفر حنفی، شبنم رومانی، شاہد ماہلی، حمیرا رحمٰن، شجاع خاور یہ سب نئے پرانے غزل گو کی حیثیت سے قابلِ اعتبار سمجھے جاتے ہیں۔

باقر نقوی کا یہ شعر:

میرا جسم ہے سونے چاندی کا
میرا مسکن نگر میں ہے ڈیرا
مگر ایک خلش ہے سینے میں
ابھی ایک انگارہ دل میں ہے

خود شاعر کے اندر جھانکنے اور اس کے داخلی سفر کو دریافت کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

صہبا طارق کا یہ شعر:

[illegible] سے آرزو نے صبا
[illegible]

سرپرستی کی گہرائی کا پتہ دیتا ہے۔ نظموں میں ظہیر غازی پوری کا [illegible] احساس کو جھنجھوڑتا ہے۔ عزیز اندوری نے [illegible] اور ہیں، جو اختلافی کیفیات ہیں۔ ان کو چابک دستی سے ابھارا ہے۔ عذرا پروین، شبنم عشائی اور [illegible] زبیری کی نظموں میں نسوانی حسیت اور استعاراتی نظام مختلف انداز سے ابھرا ہے۔

● ستیہ پال آنند — 606 ADAMS STREET
HERNDON VA 22070
U.S.A.

آپ کا اداریہ میں نے اور یہاں کے ادبی حلقوں میں میرے احباب نے بہت غور سے پڑھا ہے۔ احمد ہمیش کے حوالے سے میرے کچھ OFF-THE-CUFF ریمارکس کے بارے میں آپ کو مدیر کے طور پر لکھنے کا حق حاصل ہے۔ میں اس سے مختلف نظریہ رکھنے کے باوجود اس کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن آپ جذباتیت کی رو میں بہہ گئے ہیں جو شاید صحیح نہ ہو۔ [illegible] سے الگ نہ کر سکو گے تم مجھ کو۔۔۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ آپ نے زبان کی لسانی اور تاریخی اہمیت، نسل، قومیت اور مذہب سے موخرالذکر کو چن کر الگ کر لیا ہے اور اسی کو فوقیت دے کر اپنے IDENTITY CRISIS سے بات شروع کی ہے۔ اور پھر مجھ جیسے (اور مجھ جیسے کچھ اور) لوگوں کو کم فہم اور اردو ادب (شعری ادب کے حوالے سے بھی) کی تاریخ سے نابلد محض سمجھتے ہوئے، حوالہ اور حواشی سے اپنی بات سمجھاتے ہوئے اسی کرائسس پر بات ختم کر دی ہے۔

آپ کو بطور مدیر یہ حق بھی حاصل ہے کہ آپ [illegible] سے قطع نظر ذاتیات کی سطح پر کسی ادیب کے بارے میں ناانصافی سے کام لیتے ہوئے سستی شہرت کے حصول کے لئے، خبروں میں بنے رہنے کے لئے فلمی سکینڈلوں کے گھڑنے والے لوگوں کی طرح شوشہ چھوڑنے والے کا خطاب دیں۔ ان حوالوں اور حواشی سے قطع نظر جو آپ کے مضمون میں ہیں۔ کیا کوئی بھی ذی ہوش قاری اس بات سے منکر ہو سکتا ہے کہ اردو شاعری (غزل اور صرف غزل کے حوالے سے) کی تاریخ نے اس زبان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور صرف ایک صیغے کی زبان کا [illegible] میں ان حضرات کا بہت ہاتھ ہے جو اس صدی کے شروع سے لے کر آج تک اردو شاعری کی تاریخ کا بکھان کرتے آئے ہیں۔

مغربی تنقید میں ایک بات لطیفہ گوئی کی طرح عام ہے کہ جس تنقیدی مضمون میں آپ حوالہ جات اور حواشی کی بہتات پائیں گے، اس میں متن یا تو سرے سے ہی مفقود ہوگا یا مضمون نگار اپنے تعصب کا دفاع کرنے میں اس قدر الجھا [illegible] سے حقوق

کی قربانی دینے میں عار نہیں ہو گا۔

بڑی ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہنے کی اجازت [illegible] کہ اگر آپ اپنے اداریے میں جذباتی اور یک طرفہ [illegible] اختیار کرنے کی وجہ سے چوک گئے ہیں تو [illegible] اتنا طویل بیان دینے کی ضرورت قطعاً نہیں تھی۔ اگر آپ اس نظریہ کا دفاع بھی کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستانی شاعری کی ایک شاخ، یعنی اردو شاعری میں بھی ایک صنف یعنی غزل کے حوالے سے شاعروں نے ہندوستان کی تاریخ (جو آریوں کی ہندوستان میں آمد سے کر، رامائن، مہابھارت، چندر گپت، وکرمادتیہ، اشوک، بابر، اکبر، اورنگ زیب اور اس کے بعد انگریزوں کی حکومت تک پھیلی ہوئی ہے) کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ تو جذباتی رو میں بہنے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

اگر آپ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اردو شاعروں نے انیسویں صدی کے شروع سے کر آزادی وطن تک بلکہ اس کے بعد بھی لگ بھگ ۲۵ برس اور، اپنی [illegible] شاعری میں ہندوستان کے پہاڑوں، میدانوں، [illegible] گرمی، برسات، قحط، خشک سالی، سیلاب، [illegible] اور طاعون کی وباؤں، درختوں، پھلوں، پھولوں، پوشاکوں، کھانوں، میلوں، عرسوں، تاریخی شہروں، قلعوں، فصیلوں، میناروں کا سامنے کے الفاظ [illegible] یعنی COUNT NOUNS میں [illegible] کے طور پر ذکر کیا ہے تو بھی بغیر کسی تردد کے، جذبے کی شدت میں مغلوب ہو کر رقت آمیز لہجہ اختیار کئے بغیر یہ بات کہی جا سکتی تھی۔ اور شاید کسی حد تک آپ کے حوالہ جات اور حواشی مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتے کہ میرے تحقیقی PARAMETERS شاید ٹھیک پیمائش نہیں کر پائے۔ مگر آپ [illegible] کہتے تو ان چند شعراء کو چھوڑ کر (جن میں آپ کے دادا مرحوم سیماب اکبر آبادی کا نام نامی [illegible] آتا ہے) کتنے فی صد اردو شاعروں نے [illegible] اودھی، کھڑی بولی، چھتیس گڑھی، پنجابی، [illegible] باشندوں کی [illegible] زبان میں شاعری [illegible] نام نکلے والے۔ سینکڑوں ہزاروں شاعروں کی [illegible] سے استفادہ کیا ہے تو بھی کسی حد تک آپ کے [illegible] کئے گئے حوالہ جات [illegible] کچھ سے کہیں کچھ غلط ہوا ہے۔ آپ [illegible] میں کچھ ایسی بات کہنے [illegible] اور [illegible] سے کہ [illegible] کرام نے (اختر [illegible]) [illegible] زبانوں کو اپنایا [illegible] شاعری [illegible] میں [illegible]

کی بات کی صداقت پر ایمان لے آتا، اس لئے تھوڑی سی فکر کیا جو یہ التماس کر رہے ہیں کہ ۱۹۲۰ کی شاعری کا میرا علمی تجزیہ کیا جائے۔ اگر آپ صرف ملبوسات کو ہی لیجئے اور ثابت کیجئے کہ کلاہ، دستار، قبا، عمامہ، کلغی، جبہ، قبا وغیرہ عربی اور عجمی ملبوسات کا ذکر تو اردو غزل میں خال خال ملتا ہے۔ ہاں۔ ہندوستانی ملبوسات کا ذکر عام ہے تو شاید آپ کے حوالہ جات میری سمجھ میں آجاتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور آپ صرف اور صرف جذباتی بیانات سے کام لے کر اپنے تھیسس کا دفاع کرتے گئے۔

۱۹۷۵ء میں میرے پراجیکٹ کے سلسلے میں ہی ایک طالبہ کے پاس یہ TERM PAPER تھا کہ اردو کی غزلیہ شاعری صرف تین شاعروں (غالب، ذوق، داغ) کے حوالے سے یہ ہندوستانیت سے کس قدر لبریز ہے تو اس نے جو تحقیقی پیمانے استعمال کئے ان میں COUNTS کی جغرافیائی اور تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی ROOTS کا پیمانہ بھی تھا۔ کمپیوٹر کی مدد سے FREQUENCY COUNT میں ان تین بزرگ شاعروں (جن کے بغیر اردو کے شعری ادب کی تاریخ نامکمل ہے) کی غزلیات میں اسی فیصد سے نوے فیصد تک سامنے کے اسلامی شعاریہ اور رنگ ڈھنگ سو فیصد تک ہی ان کا استعاراتی استعمال عربی یا عجمی سرزمین سے متعلق پایا گیا۔

تاریخ ایک سنگین حقیقت ہے۔ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ تارا چرن رستوگی صاحب اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ اگر میں بدھ مت کے بارے میں کچھ اندراج اپنی کتاب میں دے دیتا تو بہتر رہتا۔ اردو کا غیر مسلم شاعر اردو میں ہمیشہ دو نمبر کا شہری رہتا ہے۔ مجھ سے ہزار اختلاف رکھنے کے باوجود میں اس انسان کی قدر کرتا ہوں کہ اس نے (ایک ذاتی خط میں ہی سہی) بات کو کھل کر کہنے کی جرأت تو کی ہے حالانکہ میں ان کی اس بات سے بھی اختلاف رکھتا ہوں کیونکہ میں نے خود کو کبھی دو نمبر کا شہری محسوس نہیں کیا لیکن اس بات کا کیا کیا جائے کہ اگر تارا چرن رستوگی جیسے بزرگ شاعر اور نقاد بھی یہ سوچنے پر مجبور رہیں، تو کہیں اس بات میں سچائی برابر کی سہی۔ سچائی کا عنصر ضرور ہے۔

تاریخ، میں نے پہلے عرض کیا، ایک سنگین حقیقت ہے یہ بات اپنے اداریے میں آپ کو لکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا کہ آپ کو اردو کی عربی اور عجمی بنیادوں کی منصوبی پر فخر ہے اور اصل میں یہی شاعری کی ہے جو اپنی بنیادوں پر ایک عظیم عمارت کی طرح استوار کھڑی ہے کہ خود اس بات پر فخر ہے کہ میں منظم انڈو آریائی تہذیب کی کوکھ سے پیدا ہوا۔ ایک پنجابی نژاد ہونے کے ناطے، انڈو پرشین تہذیب کی گود میں پل کر جوان ہوا شاید اسی لئے میں ایک ایسا WORLD VIEW بنانے میں کامیاب ہو سکا جس میں ایک تقابلی FRAME OF REFERENCE ہیں آپ کسی بھی زبان کے ادب کو دیکھ پرکھ سکتے ہیں۔ آپ، میں کہنے کی جرأت کرتا ہوں اپنے اداریے کی APPROACH اور EXECUTION دونوں میں چوک گئے۔ دفاع کی ضرورت نہیں تھی۔ اس بات کی قطعاً ضرورت نہیں تھی کہ آپ حوالہ جات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ کس کس ہندوستانی اردو شاعر نے، کن کن برسوں میں، کتنے اشعار میں اپنے ہندوستانی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اردو کے شعری ادب کی تاریخ سے (آپ کے قول کے مطابق) ناواقف ہوتے ہوئے بھی میں آپ سے کہیں زیادہ حوالہ جات فراہم کر سکتا ہوں جن میں اردو شاعروں نے ہندوستان سے، اس کی تہذیب سے، اس کے رسم رواج سے اپنی محبت کا ذکر کیا ہے لیکن اس سے کیا ثابت ہو سکتا ہے؟

افتخار امام صدیقی بھائی جان، اس بات کی ضرورت نہ آپ کو پہلے تھی، نہ اب ہے۔ یہ ایک EXERCISE IN FUTILITY ہے۔ ایسے موضوعات ہم اکثر اپنے طالب علموں کو ان کے TERM PAPERS کے لئے دیتے ہیں۔ سیماب اکبرآبادی کے کلام میں علاقائی اور مقامی زبان کے الفاظ اور ان سے پیدا شدہ امیجری، لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ یہ دفاع دینے کی ضرورت آپ کو کیوں پیش آئی؟ کیا میں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے خلاف کوئی بات کہی تھی؟ کیا میں نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب، کثرت میں وحدت اور PLURI CULTURAL معاشرے سے منکر ہوں؟ کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اردو کے مسلمان شاعروں نے صرف مسلمان ہونے کا ثبوت دیا ہے؟ میں نے تو صرف یہ عرض کیا تھا (اور وہ بھی آج سے کئی بلکہ ۲۲ برس پہلے احمد ہمیش سے ہوئی ایک بات چیت کے حوالے سے) کہ نثر کی نسبت نظم کے تانے بانے (میری مراد غزلیہ شاعری سے تھی!) عربی اور عجمی امیجری کی بنیاد ہے اور اردو شعرا آج سے چوتھائی صدی پیشتر تک، ہندوستان کی قدیم تہذیب، زبانیں، لوک ادب اور علاقائی کلچر سے نسبتاً ناواقف رہے ہیں اور اگر واقف رہے بھی ہوں تو اس کا شعری اظہار کرنے سے کتراتے رہے ہیں۔ جہاں ۱۹۲۵ سے ۱۹۶۰ء تک کی اردو نثر میں آپ کو ہندوستان کی (شہری اور قصباتی بھی، یہ لکھ کر پریم چند کے بعد دیہات سے اردو ادب کا تعلق کٹ گیا تھا) بو باس کو برتنے کا رویہ ملتے ہوئے کرشن چندر، عباس، منٹو، وغیرہ کتنے درجن نام گنوائے جائیں گے، وہاں (فراق، سیماب اور چند دیگر بزرگوں کو چھوڑ کر) آپ کو کتنے اردو شاعر ملیں گے۔ جو (غزل کے سیاق وسباق میں) عربی اور عجمی امیجری اور استعاروں سے اوپر اٹھ سکے ہوں؟ یقیناً کچھ نام ہیں لیکن وہ ترقی پسند تحریک کے ماند پڑ جانے کے بعد کی نسل کے ہیں۔

سردار جعفری صاحب کا مضمون (شاید یہ ایک نئے جاندار سلسلے کی پہلی کڑی ہے) ان کی اپنی شاعری کے بارے میں ہے۔ آپ کے اداریے میں اور سردار جعفری صاحب کے مضمون میں فرق صرف یہ ہے کہ سردار نے ایک دنیا دیکھی ہے، ایک جہان کھنگالا ہے اور ایک صدی کے تین چوتھائی حصے سے منسلک رہے ہیں۔ اس لئے وہ ہندوستان سے باہر کی دنیا کے سیاق وسباق میں (ناظم حکمت کا حوالہ اسی سلسلے میں ہے) اردو شاعر کی اس کج ادائی کو دیکھ سکتے ہیں کہ وہ (یعنی اردو شاعر) ہندوستان کے ہو کر بھی روایتاً اور عادتاً ہندوستانی نہیں رہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے اردو شاعروں کا فارسی کلام (غالب اور اقبال مستثنیٰ نہیں ہیں) آج فارسی بولنے والوں کو قابل قبول نہیں؟ اس کلام کا محاورہ سعدی، رودکی اور جامی سے تو ملتا ہے لیکن ہم عصر فارسی شعراء سے اور پڑھنے والوں کی زبان سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ فارسی کے حوالے سے ہمارے شعراء اس وقت سے ہی بند ہو کر STRATIFIED اور OSSIFIED ہو گئے جب ان کے آبا و اجداد ایران سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ خیر یہ تو ایک اور OFF-THE-CUFF ریمارک تھا اور آپ مجھے یہ کہنے پر ایک بار پھر ملون قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن میں نے ایرانی نژاد اساتذہ اور طلبہ سے درجنوں بار غالب اور اقبال کا فارسی کلام پڑھنے کے بعد اسی قسم کے جملے سنے ہیں "وہ ۱۷ویں صدی کی شاعری ہے۔ آپ ان لوگوں کو کہاں سے نکال لائے؟" ہجرت کے نسل در نسل STRATIFICATION اسی ایک جگہ میں منجمد ہونے کی کیفیت کا نام ہے۔ جس میں آپ کے آبا و اجداد اپنے وطن چھوڑ کر آئے۔ میں اصل موضوع سے شاید بھٹک گیا ہوں۔ سردار جعفری کے مضمون کے بارے میں بات ہو رہی تھی اس سلسلے میں

گو سردار جعفری ہم عصر شعرا سے بہت کمتر ہیں
بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں - لیکن نظم کے شاعر
ہوتے ہوئے بھی ان کی نظمیں (اس حوالے سے) فیض
احمد فیض کی نظموں کی زبان اور امیجری سے مختلف
ہیں اس لئے کہ فیض نے غالب اور سودا کی اختراعات
اور تلمیحات کی
PERMUTATION AND
COMBINATION
سے کام لیا ہے - جب کہ سردار اپنے
تئیں ایماندار رہے ہیں - مجھے اس بات کا احساس
ہے کہ میں نے اپنے دوست عزیز میں مشہور خاکہ نما
مضمون میں انہیں دوسرے لوگوں کے زمرے میں رکھ
کر ان سے زیادتی کی ہے - سردار جعفری ایک فرد
واحد نہیں ایک INSTITUTION ہیں
میں لندن میں تھا جب برسوں پہلے برٹش اوپن
یونیورسٹی میں ایک لیکچر دینے کے لئے میں نے ڈاکٹر
ملک راج آنند کو مدعو کیا تھا - لیکچر کے بعد ہم لوگ
ملٹن کینز (یونیورسٹی کے صدر دفاتر) سے چالیس
میل دور ایک دوست کے ہاں کھانے پر مدعو تھے
جہاں فیض بھی آنے والے تھے - ڈاکٹر آنند نے (میں
انہیں انکل ملک کہتا ہوں) کھانے کی میز پر فیض کی
موجودگی میں مجھ سے یہ سوال کیا - "اچھا یہ بتاؤ، تم
زندہ اردو شاعروں میں کس کو سب سے بڑا شاعر
مانتے ہو؟ ———— تو میں
نے بغیر کسی پیش و پس کے جواب دیا - "سردار جعفری کو"
فیض ذرا سا جھینپے، مسکرائے اور کہا "مجھے تو یہ دوئم
درجے کے شعرا میں بھی شریک نہیں کرتے!"
ان دنوں امریکہ کے اخبارات میں اردو کے کر
دار و مسئلے پر ایک بحث چھڑی ہوئی ہے - ایک تراشہ
آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں - واضح رہے کہ
مکتوب نگار معمولی علمیت کے پروفیسر نہیں ہیں
انگلینڈ اور امریکہ کے درس و تدریس کے حلقوں میں
جانے پہچانے جاتے ہیں - ان کا مکتوب خود ہی ایک
واضح دستاویز ہے اور میری حاشیہ آرائی کا محتاج
نہیں ہے -

Academic Sees Urdu as Muslim Language

My Indian host in America has brought to my attention the recent controversy regarding Urdu, and also convinced me to respond.

It is true that a language transcends religion but still most Muslims do regard Urdu as a Muslim language and that is why Urdu was made the official language of Islamic Pakistan even though Bengali was spoken by an absolute majority. Bengali was regarded as a Hindu language. Muslims demand Urdu because they identify it with Muslim culture. Denying it will be a mere delusion. Edward Said, professor of comparative literature at Columbia University, and most other Muslim scholars regard Arabic, Persian, Turkic and Urdu as the four great Islamic languages.

No doubt, Urdu was developed in India and is an Indian language. The real controversy, as I see is, whether it is a Muslim or a Hindu language. I do not see anything wrong in Hindus accepting Urdu to be a Muslim language. It is neither bigoted nor narrow minded.

Indian languages from Sanskrit to Hindi and others have gone through many natural changes but Urdu did not undergo such a natural change. It was imposed and was resented because of the Islamic chauvinism associated with it. During the successive Muslim rules, it had been sacrilegious to study, develop or propagate what had been the very essence of the Hindu life and Urdu was seen as a part of it.

True, many Hindus have written admirably in Urdu. It is only to the Hindus credit. But most writers in Urdu have been Muslims. All Hindu religious literature, even by Muslims like Raskhan and Jayasi during the Muslim period, was written in Hindi or its various dialects.

To point out that Hindi does not have many suitable words and has borrowed heavily from Urdu is just ridiculous. Language is a living thing and constantly changing, and Hindi is no exception. Calling names and talking about Bara Billa and Bari Chidiya only trivializes the issue and shows lack of insight into the facts of history.

Richard F. Wilcox

(A retired Briton born and brought up in India, Richard F. Wilcox has taught Indian history at several colleges in U.K. and Australia. Professor Wilcox is fluent in Hindi and Urdu).

Middlesborough, U.K.

[THE WASHINGTON TIMES]

● منصور الٰہی شیخ - [illegible]
RAAJ HOUSE UNIT E1 [illegible] BUILDINGS
کچھ اندازہ تو تھا مگر جولائی کے شمارے میں اہم
عصر اور ادب کی [illegible] نے
ہوش خطا کر دیئے - آپ نے یہ کیسے جناتی کام
کر ڈالا - خدا آپ کی عمر دراز کرے - اردو کی تاریخ
میں آپ نے اپنا نام جلی حروف میں لکھوا لیا -
[illegible] بہت شدت سے [illegible]

کرنے کا مشتاق ہوں - مجھے قوی امید ہے کہ پوری
اردو دنیا بھی [illegible] - تمام عالم کے [illegible]
میں آپ کو پیش کش [illegible] - آپ نے
بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے - آپ نے [illegible]
میں پاکستان اور [illegible] کی آمد کی خبروں میں [illegible]
کیا محمد اسلام امجد، عطا الحق قاسمی اور منصور
آفاق وغیرہ کو - راوی ایوارڈ دینے [illegible]
یہاں کسی تقریب میں آپ کے اس کارنامے [illegible]
"راوی ایوارڈ" دیا جائے تو آپ ہمیں [illegible]
کا اعزاز دیں گے؟ یہ ایوارڈ ایک پر [illegible]
ہمارے جذبات کا پرتو ہوگا -

● رفیق اعظم - رتن پورہ، اوجھا ٹولی چھپرہ
(بہار)

شمارہ میں بشیر بدر کی غزل دیکھ تو اچھی
مگر پڑھنے پر یہ بھی احساس ہوا کہ اب بشیر بدر کو
شاید کہنے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا ہے - وہ صرف
لکھنے کے لئے لکھ رہے ہیں - نظام صدیقی [illegible]
شرح و تعبیرات اور تفہیم و ہیئت کا مسئلہ [illegible]
مقصد ابہام ہوگا مگر میرے لئے کوتاہ رہا - میں اب
تک FREUD کو فرائیڈ پڑھتا آیا
ہوں - مضمون میں فروئیڈ پڑھ کر کچھ عجیب سا لگا
شاید اردو میں فرائیڈ ہی پڑھا جاتا ہے - احمد [illegible]
اور ہندوستان کی تہذیب، علی سردار جعفری [illegible]
خود ان کی اپنی شاعری پر خاطر خواہ روشنی ڈالتی ہے
اور علی سردار جعفری کو بہتر طور پر سمجھنے میں معاون
ہے اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ شاعری کا اس
مٹی سے جڑا ہونا اشد ضروری ہے جس سے وہ
پیدا ہوتی ہے - گلزار کی کہانی "دس پیسے اور
دادی" زبان کے لحاظ سے دلچسپ ہے - تھیم
کے لحاظ سے پرانی ہے - کہانی خود ساختہ [illegible]
کا اختتام بھی میں آ جاتا ہے - صلاح الدین پرویز کے
"برسات کے دو گیت" میں سے پہلا گیت [illegible]
"مرد جاسکے ہا، میرا روال [illegible]"
عذرا پروین، شبنم عشائی اور ناصر [illegible]
کی نظمیں بھی پڑھنے پر مجبور کر رہی ہیں -

◆

[illegible] ۹۰ [illegible]
[illegible]
[illegible] - آپ کا [illegible]
[illegible] - [illegible] (پاکستان)
[illegible]
[illegible]

اگست ۹۵

● پیام لعل۔ کمرہ ۲۲۹۰، اندرا نگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶

شاعر کے جولائی اگست کے شمارے آگے پیچھے ملے جن میں ایک جگہ کہکشاں ہم عصر اردو ادب نمبر (دو جلدوں میں) کے مندرجات کا مختصر سا اعلان تھا۔ شاید اس سے پہلے اردو ادب کی صحافت میں اتنا بڑا کارنامہ دو تین ہی رسائل نے انجام دیا ہوگا۔ مثلاً نقوش کا منتخب افسانہ نمبر (دو جلدوں میں) پاکستانی منتخب ادب (چار جلدوں میں مرتب رشید امجد) اور فنون کا منتخب غزل نمبر (مرتب احمد ندیم قاسمی) اور ابھی حال میں افکار کراچی نے گزشتہ ۴۵ برسوں میں افکار میں چھپے ہوئے افسانوں، منظومات اور تنقیدی مضامین کا انتخاب (تین جلدوں میں) پیش کیا ہے۔ مضامین نظم و نثر اور موضوعات کے تنوع میں شاعر کی حیثیت منفرد ہوگی اس لئے کہ اس کا نمبر انتخاب پر مشتمل نہیں ہے بلکہ ساری تخلیقات خاص طور پر لکھوائی گئی ہیں۔

اگست کے شمارے میں تین افسانے اور ایک مزاحیہ قابل ذکر ہیں۔ دلیپ سنگھ کی ہر تحریر میں ایک تازگی اور ایک نئی شگفتگی ہوتی ہے۔ رسالہ کا انشائیہ بے حد دلچسپ ہے۔ افسانوں میں صدیق عالم کا "چور دروازہ" ایک گہری معنویت کا حامل ہے۔ بے جان چیزوں یا جانوروں اور پرندوں کو علامت بنا کر انسانی جذبات کی پیش کشی ایک مشکل تخلیقی عمل ہوتا ہے۔ کافی عرصہ پہلے مدن مراری لال نے [illegible] کی افسانہ کبوتروں کے بارے میں لکھا تھا۔ گزشتہ سال عابد سہیل نے ایک کتے کی نفسیات کا بہت باریک بینی سے مشاہدہ کر کے ایک اعلیٰ درجے کا افسانہ "ایک محبت کی کہانی" پیش کیا۔ امید ہے صدیق عالم کی کہانی عرصہ تک زیر بحث رہے گی۔ اس شمارے کی دوسری اچھی کہانی ظہیر رفیق کی "باکس نمبر ۷" اور دس [illegible] ہے اس کا انجام بھی اگرچہ صدیق عالم کی کہانی جیسا بیٹے سے محرومی سے متعلق ہے۔ لیکن ظہیر رفیق کی کہانی کی معنویت اور موضوعیت بالکل مختلف ہے۔

مرزا حامد بیگ کی کہانی "آوازیں، ایک جانی پہچانی اسراریت لئے ہوئے ہے جو اکثر و بیشتر نیر مسعود کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ موجودہ دور میں افسانوں میں اس قسم کی فضا سازی کا کام [illegible] آؤٹ آف ڈیٹ ہو گیا ہے۔ جب تک ان میں چھپی ہوئی معنویت کو زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا جائے۔ اس شمارے کا آخری [illegible]

کا یہ کئی لحاظ سے دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔

✓ شاعر کے دو شمارے موصول ہوئے۔ جی خوش ہوا شاعر ہندوستان کا وہ واحد پرچہ ہے جو پابندی اور سلیقے سے ادبی دنیا میں اپنا [illegible]۔ شبنم رومانی
(پاکستان)

✓ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ شاعر کی صورت میں آپ نے اردو ادب ہی کا نہیں خاندانِ سیماب کا بھی علم بلند کر رکھا ہے۔ حضرت اعجاز صدیقی، علامہ سیماب اکبرآبادی، جہاں استاد داغ دہلوی اور خاقانیِ ہند استاد ذوق جیسے عہد ساز اور ادب پرور حضرات کی روایتوں کو آپ نے زندہ اور روشن رکھنے کا جو فریضہ انجام دیا ہے اور دے رہے ہیں۔ دور دور تک اس کی مثال نہیں ملتی
نذیر فتح پوری (پونہ)

✓ اس شمارے میں علی سردار جعفری صاحب کا مضمون بہت بھرپور ہے۔ وہ بذات خود اپنی تحسین کے لائق ہیں۔ ان کے طویل مقالے کا انتظار رہے گا۔ آپ کی نظموں کے لئے میرا خط شائع کر کے آپ نے مجھے خوشی دی ہے۔
اسنیٰ بدر زبیری (بھیر پور)

✓ شمارہ بہت خوب ہے۔ خاص طور پر محمد صلاح الدین پرویز کے دو گیت۔ عذرا پروین اور شبنم عشائی کی نظموں نے بہت متاثر کیا ہے۔
آشا پربھات (سیتا مڑھی)

● مختار شمیم۔ ایف ۲، گورنمنٹ گرلز کالج کیمپس، اندور

شاعر کے تازہ شمارے کا سرورق دلکش ہے بھئی! حامد اقبال صدیقی بہت اچھا شاعر ہے میاں حامد کی حوصلہ افزائی ضروری ہے ان کو خوب شائع کیجئے۔ اور دیگر ادبی رسائل میں بھی ان کی تخلیقات بھجوائیے۔ ان کی تازہ غزل نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ ظفر گورکھپوری، نشتر خانقاہی اور سجاد مرزا کی تخلیقات بھی پسند آئیں۔ شاعر کا تازہ شمارہ متوازن اور معیاری ہے۔

● تاباں ضیائی۔ ۱۷۲، آزاد روڈ، سناود ۴۵۱۱۱۱۔ (ایم پی)

اگست کا شمارہ موصول ہو گیا ہے جو شاعر کی خصوصیت ہوتی ہے وہ تو اس میں موجود ہے مگر اس بار بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے جس کے لئے آپ سب کچھ صفحہ اپنی میں لکھ چکے ہیں۔ حامد اقبال صدیقی کی تصویر دیکھ کر آپ سے وابستہ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ غزل تو اچھا ہے۔ ملاحظہ کیجئے رفعت خیری کی غزل کا پانچواں شعر۔ لفظ درمیان ہی میں "د" میں "ر" ہے۔ درمیاں میں کہنا درست نہیں۔ آج کل ناسمجھ شعراء کچھ ایسی جوڑ توڑ میں ہیں کہ [illegible] کرتے رہے تو ایک دن فن کہلائے گا۔

● اختر سعید خاں۔ ۲۰، اندرون اتوارہ، بھوپال

عزیزی حامد اقبال، دعائے دلی۔ اگست کے شاعر میں تمہاری غزل۔

کوئی نہیں تھا ہنر آشنا تمہارے بعد

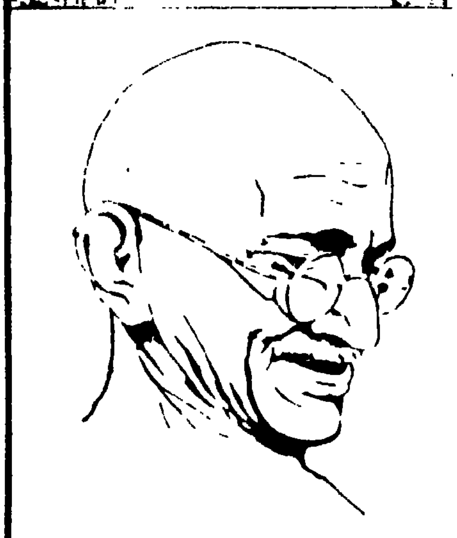
پڑھی اور بار بار پڑھی۔ غزل میں ایک دو شعر تو سبھی نکال لیتے ہیں تمہاری تو پوری کی پوری غزل اچھی ہے دل کو چھو لینے والی، ذہن پر نقش ہو جانے والی۔ ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح۔ احساسات و جذبات کی پیکر تراشی۔ ہاں یہی ہے وہ غزل جس کو میری آنکھیں ڈھونڈتی ہیں۔ تمہاری غزل پڑھ کر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ پچھلے تیس برسوں سے غزل کے ساتھ جو ناانصافی ہوتی چلی آ رہی ہے، وہ ختم ہو کر رہے گی اور غزل پھر سنبھالا لے گی۔ تم پاس ہوتے تو تمہاری پیشانی چوم کر دعا دیتا۔ [illegible] پائندہ باشی

● تاج سعید۔ مکتبہ ارژنگ، پوسٹ بکس نمبر ۲۴۳، پشاور (پاکستان)

آپ نے پرنیکار ستوگی کا جو نقش شاعر کے ٹائٹل پر دیا ہے، یہ پہلے نقوش (لاہور) کے اقبال نمبر میں اسلم کمال اپنے رنگ میں شائع کرا چکے ہیں۔ اس میں تھوڑی سی تبدیلی ہے۔ ساتھ میں ایک آدمی کا ہیولا بھی ہے جو وہاں نہیں ہے۔ وہاں بایاں ہاتھ اوپر اٹھا ہوا ہے اور اس میں کتاب ہے۔ بہرحال یہ اصل کس کی تخلیق ہے، آپ ان سے ہی پوچھئے کہ اقبال نمبر تو، اقبال صدی میں نکلا تھا۔ [آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ شاعر کے قارئین ضخیم [illegible] نمبر ۱۹۷۵ کے اس سرورق کو آج تک نہیں بھولے ہیں جسے اسلم کمال نے نقش کیا تھا۔ نقوش کے (اقبال نمبر) اندرونی ابواب کے سرورق بھی یادگار رہے۔ اسلم کمال برصغیر کے چند باکمال مصوروں میں سے ایک ہیں جبکہ پرنیکار ستوگی ایک کم سن لڑکی ہے اور [illegible] مصور ہے۔ ان کا سرورق ڈیزائن اسلم کمال کے نقش سے ماخوذ ہے یہ نئی فنکارہ جس نے حال ہی میں اردو زبان بھی سیکھی ہے اور اردو میں بہت اچھا خط بھی لکھتی ہے شاعر کے سرورق مصور غلام [illegible] کی شاگرد ہے اور اپنے آپ میں خاصے امکانات روشن کر رہی ہے۔ — ادارہ]

● آفاق صدیقی۔ [illegible]
کراچی۔ پاکستان

بقیہ صفحہ [illegible] پر دیکھئے



میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے چاروں طرف
دیواریں ہوں اور کھڑکیاں بند ہوں۔ میں چاہتا
ہوں کہ سب ملکوں کی ثقافتوں کی ہوائیں زیادہ
سے زیادہ آزادی کے ساتھ یہاں گھومتی رہیں
لیکن میں نہیں چاہتا کہ میرے پاؤں اُن
میں سے کسی لہر سے اکھڑیں۔

مہاتما گاندھی

مہاتما گاندھی کا 126 واں یوم پیدائش
2 / اکتوبر 1995

davp 95/363

D. NO. MH BY SOUTH- 518 — Price Rs. 7/=

THE "SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 004

Years of Publication * Publishing Date 27-28 * Issue DECEMBER 1995 * Tel. No. 382 99 04

Registererd with the Registrar of Newspapers at R.N. No. 14482/57.